ہفت روزہ
الجمعیۃ
نئی دہلی
کا
محدث اعظمی نمبر
بیادگار
ابوالمآثر محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی نوراللہ مرقدہ
امیر الہند اول امارت شرعیہ ہند
المتوفی: ۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶ر مارچ ۱۹۹۲ء
فروری ۲۰۱۹ء
جمادی الثانی ۱۴۴۰ھ
ترتیب وپیشکش
محمد سالم جامعی
ایڈیٹر ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی
معاون خصوصی
ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی
شائع کردہ
ہفت روزہ الجمعیۃ مدنی ہال، ۱- بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی-۲
قیمت -/200 ₹

تاثرات

امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ

[درج ذیل تحریر ایک یادگار ہے جو ''حیات ابوالمآثر'' جلد اول کے لیے ارقام فرمائی گئی تھی، جس کا پہلا ایڈیشن ۱۴۲۰ھ = ۲۰۰۰ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اس سے حضرت محدث الاعظمیؒ کے علمی وفکری مقام اور ان کے علومرتبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ امید ہے کہ اس کی روشنی میں حضرت محدث الاعظمیؒ کے بلند مقام اور جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ آپ کے قلبی لگاؤ کو سمجھنے میں مدد ملے گی]۔

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ!

احقر کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ امیر الہند اول محدث کبیر علامۂ جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کے حالات زندگی، اور ان کی علمی وتحقیقی خدمات کا مفصل تذکرہ حضرت کے نواسے عزیزم مولوی مسعود احمد صاحب سلّمہٗ نے نہایت کاوش اور تحقیق کے ساتھ بہت اچھے انداز میں مرتب کیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس صدی میں حضرت امیر الہند قدس سرہ اہل علم کی صفوں میں اور علم وتحقیق کے میدان میں، بالخصوص فن حدیث اور اس کے متعلقات میں، جس درجہ اہمیت کے حامل تھے، اسے سب جانتے ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ حضرت والا کے خاص قدر دانوں میں تھے۔ ان کی خدمات کا دائرہ اس صدی کے تین چوتھائی حصہ پر محیط ہے، ان کی بارگاہ علم میں عرب وعجم نے زانوئے ادب تہ کیا ہے، اور اخیر دور میں شدید ضعف اور بڑھاپے کے باوجود، نہایت نازک حالات میں ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کی سربراہی جس طرح آپ نے فرمائی ہے، وہ ایک یادگار اور قابل فخر کارنامہ ہے۔ حضرت کی وفات کے بعد علم ودین اور ملک وملت کے وسیع دائرۂ خدمت میں بہت زیادہ خلا ہوا ہے۔

یہ ہم سب پر قرض تھا کہ حضرت کے حالات وسوانح کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا۔ بہت زیادہ قابل مبارک باد ہیں برادر محترم مولانا رشید احمد صاحب - خلف اکبر حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ - کہ انھوں نے اس پر توجہ کی، اور اپنی نگرانی میں یہ بیش قیمت دستاویز مرتب کروائی اور اس کی اشاعت کا انتظام وانصرام کیا، اور بہت ہی سعادت وخوش بختی ہے عزیزم مولوی مسعود احمد سلّمہٗ کی کہ انھوں نے اپنے عظیم المرتبت نانا کے احوال ووقائع مرتب کیے۔

اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل وکرم سے قبول فرمائے، اور تمام ملت اسلامیہ کے لیے نافع اور رہنما بنائے۔ آمین، فقط:

اسعد غفرلہ

(جامع) مسجد رشید، دار العلوم دیوبند

۲۳ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

فہرست مضامین

Phone: { 23311456
23317729
Jamiat Ulama-i-Hind
1-Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110 002
E-mail : juh.org2010@gmail.com

جمعیۃ علماء الہند

پیغام

امیر الہند مولانا قاری سیّد محمد عثمان منصور پوری

صدر جمعیۃ علماء ہند

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ امیر الہند اوّل محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی حیات و خدمات سے عوام کو روشناس کرانے کے لیے ہفت روزہ الجمعیۃ ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

حضرتؒ عالم اسلام کے نامور محدث، صاحبِ بصیرت فقیہ، متبحر عالم، جلیل القدر مصنف اور علم حدیث کے ایک عظیم محقق تھے۔ ہندو پاک ہی نہیں بلکہ مصر و شام ،حجاز و عراق وغیرہ بلاد اسلامیہ کے علماء و فضلاء فن حدیث میں ان سے استفادہ کو فخر و سعادت تصور کرتے تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے اور جب ۱۹۸۶ء میں امارت شرعیہ ہند کا قیام عمل میں آیا تو ہندستان کے ارباب حل وعقد نے بالاتفاق موصوف کو امیر الہند منتخب کیا تھا۔

ایسی عظیم شخصیت پر ہونے والی اس اشاعت کے لیے میں اپنی طرف سے اور تمام جماعتی احباب وکارکنان کی طرف سے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں ۔اللہ رب العزت اسے شرف قبولیت سے نوازے اور حضرتؒ کی خدمات کو ہم سب کے لیے مشعلِ راہ بنائے (آمین)

(امیر الہند حضرت مولانا) محمد عثمان منصور پوری (صاحب)

صدر جمعیۃ علماء ہند

Phone: { 23311455
{ 23317729

Jamiat Ulama-i-Hind
1-Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110 002
E-mail : juh.org2010@gmail.com

جمعیۃ علماء الہند

پیغام

حضرت مولانا سیّد محمود اسعد مدنی مدظلہٗ

ناظمِ عمومی جمعیۃ علماء ہند

مجھے یہ معلوم ہو کر حد درجہ مسرت ہوئی کہ ہفت روزہ 'الجمعیۃ' محدثِ جلیل ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی حیات و خدمات پر جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام ۲۴ر فروری ۲۰۱۹ء کو بنارس میں منعقد ہونے والے سیمینار کے موقع پر 'محدث اعظمی نمبر' کے نام سے اپنا ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

محدثِ اعظمیؒ صرف برصغیر میں ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں فقہی بصیرت اور علم حدیث میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ملک کے بڑے بڑے علماء فن حدیث اور علم حدیث کے موضوع پر ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ وہ جمعیۃ علماء ہند اور اس کی تحریکوں سے ہمیشہ وابستہ رہے۔

ایسی عظیم و ممتاز شخصیت کی حیات و خدمات اور ان کے راہ عمل سے عوام کو متعارف کرانے کے لیے ہفت روزہ 'الجمعیۃ' کی یہ اشاعت یقیناً قابلِ مبارک باد ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہفت روزہ 'الجمعیۃ' کی یہ خصوصی اشاعت اپنے عظیم مقصد میں بہرحال کامیاب ہوگی۔ میں ادارہ کی اس خدمت کی بارگاہِ ربّ العزت میں قبولیت کے لیے دعا گو ہوں۔

(مولانا) محمود اسعد مدنی (صاحب)
ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ ——— محمد سالم جامعی

محدث اعظمیؒ نمبر

امارتِ شرعیہ ہند کے امیرِ اوّل دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ، جمعیۃ علماء ہند کی مجلسِ عاملہ کے رکن رکین اور عالم اسلام کے معروف محقق ومحدث ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی قدس سرہٗ کے حالات ان کی وسیع تر علمی ودینی خدمات اور قومی وملّی سرگرمیوں کے تعلق سے ہفت روزہ ’الجمعیۃ‘ کی یہ خصوصی اشاعت ’محدثِ اعظمی نمبر‘ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

امیرالہند اوّل حضرت محدثِ اعظمی نوراللہ مرقدہٗ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اور نہ ہی یہ خصوصی اشاعت اس مقصد کی تکمیل کرسکتی ہے۔ اس مجلّہ خصوصی کی اشاعت کا مقصد توصرف یہ ہے کہ ملت اسلامیہ حضرتؒ کے دینی، علمی اور عملی کارناموں سے روشنی حاصل کر کے اپنے قلوب کو منوّر کرسکے۔

حضرت محدّثِ اعظمیؒ اپنے وقت کی ایک ممتاز عالمی وعلمی شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فطانت وذکاوت پہلے ہی عطا فرمائی تھی جسے دارالعلوم دیوبند میں حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ جیسے استاذ نے اپنے گرانمایہ علوم وفنون سے مزید جلا بخش دی۔ مولانا اعظمیؒ اگرچہ تمام ہی علوم وفنون کے شہسوار تھے مگر علم حدیث وفقہ ان کا خاص موضوع تھا۔ حدیث وفقہ کے موضوع پر دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف فرمائیں اور حدیث کے ایک درجن سے زائد عربی مخطوطات پر تعلیق وتحقیق کا کام انجام دیا جو ایک شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا اعظمیؒ کی ان تصنیفات کو اللہ تعالیٰ نے جو قبولیت عطا فرمائی ہے دورِ حاضر میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

حضرت محدّثِ اعظمیؒ نے ایک طویل عرصہ تک اپنے وطنِ مالوف کے مدارسِ دینیہ میں حدیث، فقہ اور تفسیر کے گراں بہا موتی بکھیرے اور پھر آخر میں علم حدیث کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار فرمالی۔ امیرالہندؒ نے علمی انہماک کے ساتھ ساتھ تحریکات میں بھی حصہ لیا۔ آزادی سے پہلے جمعیۃ علماء ہند کی قیادت میں جنگ آزادی میں شرکت کی اور اپنی جواں عزم جدوجہد کے ذریعہ انگریزی سامراج کی راہ میں ایک آہنی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے۔ آزادی کے بعد کانگریس کی اعلیٰ قیادت بالخصوص پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار پر ۱۹۵۲ء کے پہلے جمہوری انتخاب میں اپنے حلقہ سے حصہ لیا اور بلاکسی جدوجہد کے شاندار طریقے پر کامیاب ہوکر ریاستی اسمبلی میں پہنچے۔ آپ مسلسل پانچ سال تک اسمبلی کے رکن رہے اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے طفیل حکمراں پارٹی اور اپوزیشن سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

حضرت محدّثِ اعظمیؒ کا ملک وبیرونِ ملک کے مؤقر تعلیمی ودینی اداروں سے خاص تعلق تھا۔ تقریباً چالیس سال تک مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے اہم رکن رہے۔ مصر وعرب اور کویت کے علمی ودینی حلقوں میں آپ کا ایک اہم مقام تھا۔

آزادی سے پہلے جمعیۃ علماء ہند نے بار بار اس بات کی کوشش کی کہ ہندستان کے مسلمان اپنی اسلامی زندگی گزارنے اور اپنے آپ کو انتشار وافتراق سے بچانے کے لیے ایک امیر منتخب کرلیں مگر انگریزی سامراج اس تحریک کو چونکہ اپنی موت تصور کرتا تھا اس لیے اس نے اس تحریک کو اپنی جابرانہ طاقت کے ذریعہ کامیاب نہیں ہونے دیا۔ جن لوگوں نے اس جدوجہد میں حصہ لیا مولانا اعظمیؒ ان میں پیش پیش تھے۔ پھر آزادی کے بعد جب بھی اس مسئلہ پر غور کیا گیا مولانا اعظمیؒ کی رائے ہمیشہ اس کی تائید میں رہی۔ آزادی پر چالیس سال گزرجانے کے بعد جب یہ مرحلہ آیا کہ امت مسلمہ اپنے اس دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرلے اور اس کے لیے ۲رنومبر ۱۹۸۶ء کو جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے علماء ومفتیانِ کرام پر مشتمل ایک کل ہند نمائندہ اجتماع بلایا گیا جس میں امارتِ شرعیہ ہند کے قیام کا عظیم اور تاریخ ساز فیصلہ کیا گیا۔ اجلاس میں انتخابِ امیر کا مسئلہ سامنے آیا تو مولانا اعظمیؒ کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے غیبوبت کے باوجود مکمل اتفاقِ رائے کے ساتھ تمام علماء، صلحاء اور مفتیانِ عظام کی نظرِ انتخاب جس شخصیت پر پڑی وہ مولانا اعظمیؒ کی شخصیت تھی۔ چنانچہ مکمّل اتفاق اور سمع وطاعت کے عہد کے ساتھ مولانا اعظمیؒ کو

امیر الہند منتخب کیا گیا جس پر وہ تادم واپسیں متمکن رہے۔
امیر الہند منتخب ہوجانے کے بعد مولانا اعظمیؒ نے واقعہ تو یہ ہے کہ اس منصب کی لاج رکھ لی، انھوں نے اپنے تقریباً پانچ سالہ دورِ امارت میں امت مسلمہ کی جس طرح رہنمائی فرمائی وہ آنے والی نسلوں کے لیے بلا شبہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔
حضرت محدثِ اعظمیؒ نے مسلسل نصف صدی سے زائد عرصہ تک جس عزم و استقلال کے ساتھ دینی، علمی اور قومی وملّی خدمات انجام دیں وہ ملّی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ آپ کی زندگی علم وعمل، اخلاص وتقویٰ، دیانت وامانت، ذہنی وقلبی پاکیزگی، اتباعِ سنت، صبر وتحمل، استقلال واستقامت، فکری بالیدگی، قوتِ جہد وعمل اور وضعداری وسادگی کا نمونہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تصنیف وتالیف اور جمع وترتیب کی جو عظیم الشان صلاحیت عطا فرمائی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کی نصف صدی سے زائد دینی، علمی وتصنیفی خدمات اور آپ کے اوصافِ جمیلہ بلا شبہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اس لیے آپ کے پاکیزہ خیالات وافکار اور آپ کی حیات وخدمات کے نقوش کو عام کرنا اور آنے والی نسلوں کو ان سے روشناس کرانا آج ہماری سب کی ذمہ داری ہے۔ حضرت مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے اہداف اور ان کا مشن ہمارے سامنے ہیں جنھیں پورا کرکے ہم حضرتؒ کی روح کو تسکین پہنچا سکتے ہیں اور یہی ہماری طرف سے حضرتؒ کے لیے سب سے بڑا خراجِ عقیدت ہے۔

ہم یہاں حضرتؒ کی زندگی پر کچھ لکھنا نہیں چاہتے۔ اس خصوصی اشاعت کے مضمون نگار حضرات نے جو کچھ لکھا وہ زیرِ نظر نمبر میں موجود ہے۔ اس نمبر میں بتوفیق خداوندی اتنے واقعات اور حالات آ گئے ہیں جن کا ہمیں گمان بھی نہیں تھا اور جن کو اگر پھیلا دیا جائے تو ضخیم ضخیم کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ مضامین میں گہرائی اور گیرائی کے علاوہ تنوع بھی بڑی حد تک موجود ہے۔ اس خصوصی اشاعت کے مضمون نگاروں کی اکثریت ان حضرات پر مشتمل ہے جنھیں کسی نہ کسی طرح حضرتؒ کے فیوض وبرکات اور آپ کے فیض کرم سے اکتساب کا موقع ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مضامین میں تنوع کے باوجود یہ بات بطور قدرِ مشترک موجود ہے کہ ہر مضمون کی ہر سطر اور ہر سطر کا ہر لفظ خلوص ومحبت اور عقیدت ووارفتگی کے جذبہ سے بھرا ہوا ہے۔

ہمیں احساس ہے اور شرمندگی بھی کہ اس خصوصی اشاعت کو حضرتؒ کے چاہنے والوں تک پہنچانے میں کافی تاخیر ہوگئی ہے۔ حضرتؒ کے ساتھ عوام وخواص کو جو عقیدت ومحبت تھی وہ آپ کے وصال کے بعد سیلاب بن کر اُمڈ پڑی اور نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام تک پھیل گئی۔ عالم اسلام نے آپ کی رحلت کو ملتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا المیہ سمجھا اور یکبارگی سب کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، اس کا تقاضہ تھا کہ حضرتؒ کے وصال کے فوراً بعد مجلّہ خصوصی کی اشاعت کو عملی جامہ پہنا کر حضرتؒ کے متوسلین منتسبین اور ملت اسلامیہ کی اشکبار آنکھوں کے لیے سامانِ تسکین مہیا کیا جاتا مگر 'کل امر مرھون باوقاتھا' کے مصداق چونکہ اس کے لیے یہی وقت مقدر تھا اس لیے ہم اس تاخیر کے لیے صرف معذرت ہی کر سکتے ہیں اور اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی یہی مشیت تھی

'محدثِ اعظمی نمبر' کی یہ اشاعت ہمارے خوابوں کی مکمل تعبیر نہیں ہے، ہم اپنی اس کارکردگی پر مطمئن اور مسرور بھی نہیں ہیں مگر حضرت محدثِ اعظمی قدس سرہٗ کی ذات گرامی سے منسوب اس خصوصی اشاعت کو ہم ہفت روزہ الجمعیۃ اور اپنی زندگی کا ایک اہم باب ضرور تصور کرتے ہیں اور اس کے لیے ہم اپنے پروردگار کے بے پایاں شکر گزار ہیں۔
راقم الحروف ان تمام حضرات کا جنھوں نے اس خصوصی نمبر کی اشاعت میں کسی بھی طرح کا تعاون دیا ہے بے حد شکر گزار ہے، خاص طور پر حضرت محدثِ اعظمیؒ کے نواسے جناب ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی کا خلوص دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی شبانہ روز جد وجہد کے ذریعہ اتنے کم وقت میں مضامین کی فراہمی، ان کی کمپوزنگ اور تصحیح کا مشکل فریضہ انجام دے کر ہمیں یہ حوصلہ بخشا کہ یہ خصوصی اشاعت منظر عام پر آسکی۔ اللہ تعالیٰ جملہ معاونین بالخصوص ڈاکٹر مسعود اعظمی صاحب کی اس پرخلوص سعی کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور دین ودُنیا میں اس کا بہتر صلہ عطا فرمائے، آمین۔ □□

ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ کے وصال پر ملک وبیرونِ ملک کے علماء، صلحاء، اربابِ علم وفن اور بہت سی علمی وسیاسی قدآور شخصیتوں کے اظہارِ تعزیت کے خطوط، ٹیلی گرام اور بیانات کا سلسلہ کافی طویل ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے محض چند اہم عالمی وقومی شخصیتوں کے تعزیتی بیانات شامل اشاعت کیے جا رہے ہیں۔

فدائے ملت حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ

نائب امیر الہند حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی ایم پی مدظلہٗ صدر جمعیۃ علماء ہند نے امیر الہند محدثِ جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ کے انتقال پُرملال کے حادثۂ جانکاہ پر اپنے دلی رنج وکرب کا اظہار کرتے ہوئے اسے ملت اسلامیہ کے ایک زبردست قومی، ملّی اور علمی نقصان سے تعبیر کیا ہے۔ مولانا مدنی بسلسلۂ اعتکاف ومشاغلِ رمضان دیو بند میں مقیم ہیں اس لیے مولانا مدنی تو تجہیز وتکفین میں شرکت کے لیے نہ جا سکے تاہم آپ کی ہدایت پر مولانا اسجد مدنی ناظم جمعیۃ علماء ہند کی قیادت میں جمعیۃ علماء ہند کا ایک سہ رکنی وفد اسی دن شام کو مئو کے لیے روانہ ہو گیا جو تجہیز وتکفین میں شرکت کے بعد مرکزی دفتر واپس آ گیا ہے۔ مولانا مدنی نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ امیر الہند مولانا اعظمیؒ عالمِ اسلام کے ایک مقتدر علمی ودینی رہنما تھے۔ ان کے انتقال سے ملت اسلامیہ اپنے ایک عظیم سرپرست سے محروم ہو گئی ہے۔ امیر الہندؒ کی قومی وملّی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے نائب امیر الہند نے کہا کہ انھوں نے امیر الہند کی حیثیت سے مسلمانوں کی شرعی تنظیم کے لیے جو نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک قابل تقلید مثال ہوگا۔

مولانا اعظمیؒ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ عالم اسلام کے ممتاز عالم، بلند پایہ فقیہ اور محدث تھے۔ حدیث وفقہ کی دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ حدیث کی ایک درجن کے قریب عربی مخطوطات پر تعلیق وتحقیق کا کام انجام دیا ہے جنھیں پوری اسلامی اور علمی دُنیا میں قبولیتِ عام حاصل ہو چکا ہے اور جنھیں عالم اسلام کے اہم اداروں نے شائع کیا ہے۔ مولانا مرحوم ایک عظیم محدث ہونے کے ساتھ جنگ آزادی کے مجاہد بھی تھے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک یوپی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔

امیر الہند مرحوم کا مختلف علمی ودینی اداروں سے تعلق تھا۔ آپ دار العلوم دیو بند اور جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رکین تھے۔ ان کے علاوہ عالمِ اسلام کے متعدد اہم اداروں میں آپ ملتِ اسلامیہ ہند کی نمائندگی کا فریضہ انجام دے چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ مولانا مدنی نے مدارسِ دینیہ کے ذمہ داروں، جماعتی احباب ومتوسلین اور جمعیۃ علماء ہند کی تمام شاخوں سے بالخصوص اور پوری ملت اسلامیہ سے بالعموم اپیل کی ہے کہ وہ امیر الہند مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں۔

فضیلۃ الشیخ عبد اللہ سبیّل (امام حرم، مکہ مکرمہ) —— ٹیلی گرام

ہم آپ کے والد محترم کے حادثۂ وفات کی خبر سن کر بہت زیادہ رنجیدہ ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ (ریاض، سعودیہ عربیہ)

حضرت مولانا کی وفات عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت ہے، یہ مرضی الٰہی ہے کہ اس نے آپ کو اپنے جوار میں بلا لیا، میں پریشان کن سفر میں تھا، اور مسلسل کاموں میں گھرا ہوا رہا، اس لیے تاخیر سے یہ خط لکھ رہا ہوں، حالانکہ میرا دل مولانا کے انتقال سے انتہائی غمزدہ تھا، "الشرق الأوسط" میں جب انتقال کی خبر پڑھی، تو مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ چند ماہ ہوئے کہ میں نے مولانا مرحوم کو ایک خط لکھا تھا، جس میں میں نے اپنے دوست محمد رشید اور اپنے بیٹے سلمان کے لیے روایت حدیث کی اجازت طلب کی تھی، اگر وہ خط ملا ہو اور اس وقت مولانا زبانی گفتگو سے معذور رہے ہوں اور میرا خط سننے کے بعد اشارے سے بھی اجازت دی ہو تو مجھے مطلع کر دیں، کیونکہ حدیث میں بھی اور خود ہمارے امام ابو حنیفہ کے نزدیک بھی "الإشارة أشهر طرق التعريف" کی

صراحت ہے، اگر بات پوری ہوگئی تو مجھ کو بتایئے تا کہ میں اجازت طلب کرنے والے عزیزوں اور دوستوں کو اجازت کی اطلاع دیدوں۔ میرے دوست الشیخ محمد عوامہ نے بھی آپ کو خط لکھا ہے اور مولانا مرحوم کے کچھ رسائل آپ سے وہ لینا چاہتے ہیں تا کہ مولانا کی یاد تازہ رہے۔

الشیخ محمد عوامہ (مدینہ منورہ)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی وفات کی خبر ملی، آپ تنہا اس مصیبت میں گرفتار نہیں ہیں، بلکہ یہ تمام امت مسلمہ کے لیے بڑی مصیبت ہے أعلی اللہ مقامہ في علیین، مولانا کی حیات میں علمی حلقوں میں کوئی خلا محسوس ہی نہیں ہوتا تھا لیکن آپ کے انتقال کے بعد اب ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اس کا پُر ہونا موجودہ حالات میں ممکن نظر نہیں آتا۔

مولانا مرغوب الرحمٰن (مہتمم دارالعلوم دیوبند) — ٹیلی گرام

حضرت مولانا کے سانحۂ ارتحال پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ٹیلیگرام میں بتایا کہ آج ہم نے عالم اسلام کے سب سے بڑے محدث کو کھو دیا اور ہماری صفوں میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اب اس خلا کا پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی (ندوۃ العلماء لکھنؤ)

بڑی شرمندگی اور احساسِ تقصیر کے ساتھ تعزیت کا یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں، میری صحت تقریباً ایک ماہ سے زیادہ کمزور اور متاثر ہے، اس حالت میں نہ ہوتی تو قدیم تعلقات اور جانے والے کی جلالتِ شان اور حقوق کی بنا پر میں تعزیت کے لیے حاضر ہوتا لکھنؤ میں نہ ہونے کی وجہ سے مجھے کسی قدر تاخیر سے اطلاع ملی جس دن سے یہ خبر سنی ختم خواجگان کے بعد جو روزانہ نماز عصر کے بعد ہوتا ہے حضرت مولانا کے لیے دعاء مغفرت ورفع درجات ہوتی ہے، انشاء اللہ دارالعلوم کھلنے پر اہتمام سے ایصال ثواب بھی کیا جائے گا۔

ڈاکٹر محمد طاہر نورلی (مکہ مکرمہ)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خبر وفات سے انتہائی صدمہ پہنچا، آپ کی وفات سے امت اسلامیہ ایک عظیم المرتبت عالم اور ایک ایسے امام وقت سے محروم ہوگئی جس نے عظیم الشان علمی خدمات انجام دیں، اور احادیث رسول کی حفاظت کے لیے اہم ترین کارنامے انجام دیئے، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ خداوند قدوس ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں بلند مقام دے۔

مولانا برہان الدین سنبھلی (استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

محدث جلیل مخدومنا مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے حادثۂ وفات کی خبر حقیقۃً علمی حلقوں کے لیے صاعقہ اثر ثابت ہوئی، اس حادثے سے ہندوستان کا وہ امتیاز بظاہر اب ختم ہوگیا جس کا اعتراف علامہ رشید رضا مصری نے برملا کیا تھا کہ اس آخری دور میں علم حدیث کی خدمت کا سہرا ہندوستان کے سر بندھا، اس لیے یہ خسارہ صرف ایک خاندان یا ایک ملک کا نہیں، بلکہ پورے برصغیر کا خسارہ ہے۔

مفتی نظام الدین (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)

صدمہ جانکاہ کی خبر نے کچھ دیر کے لیے مدہوش کردیا، حضرت سے احقر کو جس قدر محبت وعقیدت تھی، اس کو زبان وقلم ادا کرنے سے قاصر ہیں اور بجز صبر چارہ نہیں، حضرت کا سانحۂ ارتحال محض ایک کنبہ وخاندان کے لیے نہیں، بلکہ سارے عالم اسلام کے لیے ہے۔ آپ کی ذات گرامی عالم اسلام میں مغتنمات روزگار اور بے مثال تھی، ممتاز ترین علماء میں بھی انگلیوں پر گنے چنے چند افراد کے اندر بھی ممتاز ونمایاں تھی۔

مولانا محمد رابع حسنی ندوی (استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

حضرت مولانا بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے اور فن حدیث میں ان کا مقام بہت بلند تھا، ان کی وفات سے علوم حدیث کے حاملین اور مسلمان

علماء اور رہبران ملت کی صف میں غیر معمولی نقصان ہوا ہے، جس کی تلافی جلد مشکل ہے۔ حضرت مولاناؒ کی شفقتوں سے میں ذاتی طور پر متمتع ہوا ہوں اور عقیدت و محبت کا بہت قریبی تعلق رکھتا رہا ہوں، اور ان کو اپنا استاذ سمجھتا رہا ہوں اور ان کے وجود کو ملت اسلامیہ کا قیمتی سرمایہ تصور کرتا رہا ہوں۔

مفتی ظفیر الدین (دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

ہم سب کا محور و مرکز جاتا رہا، ہمارا علمی ماویٰ ختم ہوگیا، ہمارا آفتاب و ماہتاب روپوش ہوگیا، وہ گو تنہا تھے مگر ایک جماعت اور پوری اکیڈمی پر بھاری تھے، ہم جیسے ہزاروں کے استاذ تھے، مربی تھے، پیشوا تھے، ہمارے درد اور بیماریوں کی دوا اور شفاء تھے، کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے سب کچھ مولانا ہی تھے، ہمارے ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر بلکہ عرب و عجم کے مایۂ ناز محدث جلیل، علوم نبوی کے ماہر و حامل اور محدث کبیر تھے، جن کی مہارتِ علم نبوت پر علماء کرام کو فخر تھا اور سر اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ علم حدیث کا ایسا استاذ، رہنما دوسرا نظر نہیں آتا۔

مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی (دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

مجھے اس وقت رہ رہ کر حضرۃ الاستاذ مولانا مرحوم کے کمالات، ان کی خوبیاں اور دوسری بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں، میرے ساتھ کس درجہ تعلق و محبت اور شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ آہ! میں آج اپنے مربی و مشفق اور سب سے بڑے محسن و معتمد استاذ اور روحانی باپ سے محروم ہوگیا۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

مفتی منظور احمد مظاہری (قاضی شہر کانپور)

حقیقت یہ ہے کہ علم و فضل کا آفتاب غروب ہوگیا، استاذ الاساتذہ، مرجع العلماء کی جدائی اور ان کے فیوض علمیہ سے محرومی پر علماء برسوں آنسو بہاتے رہیں گے، اب کون ہے جو اہل علم کے لیے وجہ تسکین بنے گا۔ اللہ اپنے خزانہ غیب سے کوئی فرد جلیل کا مثل نہیں تو قریب المثل عطا فرمادے، دل و دماغ افسردہ ہیں، قلم میں کوئی طاقت باقی نہیں رہی کہ اس وقت مزید کچھ عرض کرسکوں، اس وقت تو جی چاہتا ہے کہ کوئی مرد حقانی ہمیں تعزیت کرتا، ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی (مہتمم دارالعلوم دیوبند)

میرے سامنے محدث کبیر مولانا الاعظمی کے ذاتی حالات کے بجائے صرف ان کے علمی کارناموں کا تذکرہ کیا جاتا اور میں ذاتی طور پر مولانا سے واقف نہ ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ ان عظیم علمی کارناموں کی نسبت جس شخصیت کی طرف کی جارہی ہے وہ یقیناً چھ سات صدی پہلے کی ہوگی، وہی ہر بات میں حدیثوں کا تذکرہ، وہی ایک ایک لفظ کی تحقیق پر موشگافیاں، وہی رجالِ روایت کی چھان بین اور کرید جو کبھی ہمارے اسلاف بالخصوص محدثین کا طرۂ امتیاز تھا، حضرت مولانا بھی ٹھیک اسی نہج پر سوچ رہے تھے اور اپنے علمی کارنامے انجام دیتے رہے۔ قدیم محدثین جس طرح دنیا کی تمام دلچسپیوں سے صرف نظر کر کے صرف قلم کاغذ اور دوات کے ہوکر رہ گئے تھے، انقلابات آتے رہے، حکومتیں بدلتی رہیں، ایوان خلافت ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنتا رہا، کوئی پستی اور گمنامی کے غار سے نکال کر حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز کیا جارہا ہے اور کسی کو بام ثریا سے اتار کر تحت الثریٰ میں دفنایا جارہا ہے، اہل علم پر عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔ ہجرت اور روپوشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیے جارہے ہیں، لیکن سارے خلفشار کے باوجود علوم نبوت کے دیوانے اپنے خس پوش مکانوں میں چراغ جلائے احادیث لکھ رہے ہیں، اس کی صحت و ضعف کا فیصلہ کررہے ہیں، اس کی سندوں کا تجزیہ کررہے ہیں، کون ثقہ ہے کون ضعیف؟ کون کذاب اور وضاع ہے؟ اور کون منکر روایتیں بیان کرتا ہے؟ ان کو اپنے جھونپڑے سے باہر اٹھنے والے طوفانوں کی خبر تک نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے مولانا اعظمی بھی شاید اسی دور کے ایک بزرگ تھے جو اس صدی میں پیدا ہوئے، تصحیح متون اور تعلیق و تحشیہ تو صرف اسی علمی بصیرت کے نتیجہ میں تھی جو علم حدیث کے سلسلہ میں آپ کو حاصل تھی، قدرت ان سے کام لے رہی تھی اور وہ اپنے وسعت مطالعہ کے نتیجہ میں انجام دے رہے تھے، وہ احادیث نبوی کے مزاج داں تھے۔ اب تو یونیورسٹیوں میں ہر طالب علم ایک کتاب کے مختلف مخطوطات کا تقابلی مطالعہ کررہا ہے اور تصحیح متون کا کام کررہا ہے، جب کہ علم حدیث کی گہرائی و گیرائی کی اس کو ہوا تک نہیں لگی ہے، اس کی نگاہ الفاظ و حروف تک محدود ہے اور کلام نبوت کا مزاج داں ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

مولانا سید احمد ہاشمی (ناظم عمومی ملی جمعیۃ علماء، دہلی)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی شیخ الحدیث اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ بیسویں صدی کے اختتام اور پندرہویں صدی ہجری کے اوائل

کا یہ ایسا عظیم حادثہ ہے، جس کی تلافی بظاہر ممکن نہیں، یہ شمع شاید آخری شمع تھی، دور تک اندھیرا اور سناٹا نظر آتا ہے، افسوس کہ اسلاف کی یہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی فیاویلاہ، ویاحسرتاہ۔

مولانا اقبال احمد ندوی (مبعوث دارالافتاء ریاض) نائیجیریا

حضرت مولانا کے حادثہ وفات کی خبر ملی، یہ صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت بن گیا، یہ عظیم حادثہ آپ پر تنہا نہیں گذرا ہے، بلکہ عالم اسلام اس صدمہ سے دوچار ہے، مولانا مرحوم نے اپنے قلم اور اپنی زبان کو حدیث نبوی کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ بلا خوف لومۃ لائم اپنے عہد شباب سے سفر آخرت کے وقت تک اس کام میں لگے رہے، مولانا ہمارے لیے بہت بڑا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں، جو حدیث نبوی عمل اسلامی اور فکرِ اسلامی کے میدان میں ہے۔ آپ کی وفات سارے عالم اسلام کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے ؎

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مولانا بدرالحسن القاسمی (الصفات، کویت)

حضرت مولانا کی وفات کا غم پوری امت کا غم ہے، ایسی باکمال ہستیاں تاریخ میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں، مولانا مرحوم کے علمی کارناموں کی بہت بڑی اہمیت ہے، کاش ان پر کوئی کام کرتا، معلوم نہیں انھوں نے کیسے کیسے علمی جواہر چھوڑے ہیں؟

مولانا عبدالخالق (زلفی، سعودیہ عربیہ)

ایک خط کے ذریعہ حضرت مولانا کے انتقال کی اندوہناک خبر ملی، جس کو پڑھ کر دل چور چور ہو گیا، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ شب و روز دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

مولانا ظفر احمد (عدن، یمن)

مولانا کے سانحۂ ارتحال کی خبر پڑھ کر بے حد صدمہ ہوا مئو کی سرزمین سے ایک بہت بڑی ہستی چلی گئی، جس پر لوگوں کو ناز تھا۔

مولانا محمد سعید (ریاض، سعودیہ عربیہ)

مسلمانوں کیلئے عموماً اور ہم لوگوں کے لیے خاص طور پر بہت بڑا ملی و علمی حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔

ضیاء الرحمٰن انصاری (سابق مرکزی وزیر حکومت ہند)

حضرت اقدس کے انتقال نے علمی حلقہ میں جو خلا پیدا کر دیا ہے، اس کا پُر ہونا ناممکن نہیں تو اس دور قحط الرجال میں دشوار اور محال ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کی قبر اطہر کو منور فرمائیں اور اپنے جوار رحمت میں قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر ابوالليث (مکہ مکرمہ)

مولانا دیوبندی برادری کے تاج تھے، دیوبندی خاتم کے نگینہ تھے، مایہ ناز عالم، محدث و ادیب اور جامع کمالات مصنف تھے، مولانا نے جو خلا چھوڑا ہے وہ میرے علم کی حد تک خلاء ہی رہ جائے گا، نہ ویسا اب کوئی محقق ہے، نہ ویسا محدث، نہ ویسا کوئی باکمال مصنف۔

مولانا عبدالعلیم فاروقی (دارالمبلغین لکھنؤ)

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مولانا مرحوم ہم سب کے مخدوم و مطاع، عالم اسلام کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ اس دور کی تاریخ حدیث ان کے تذکرے کے بغیر کسی طرح مکمل نہیں ہوسکتی، انشاء اللہ اس سلسلے میں ان کی مساعی اور بے نظیر خدمات عند اللہ مقبول ہیں اور دنیا میں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں، کاش ہم بے توفیقوں کو ان کے علوم و فیوض کا کوئی ذرہ نصیب ہو جائے، جدامجد امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی سے حضرت کو جو قربت و اُنس تھا، اس سے آنجناب واقف ہوں گے، نہ معلوم کتنی علمی و تحقیقی کتابیں صرف امام اہلسنت کے ایماء پر تحریر فرمائیں۔ ▭▭

محدث اعظمی نور اللہ مرقدہٗ کے سانحۂ ارتحال پر ملک وبیرونِ ملک کے بہت سے اخبارات وجرائد نے تعزیتی اداریے شائع کیے تھے۔ صفحات کی تنگ دامانی کی وجہ سے صرف چند اداریتی تحریروں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔(مرتب)

شبِ تاریک ہی میں ماہِ کامل کی کمی محسوس ہوتی ہے

آہ! امیر الهند

قحط الرجال کے اس دور میں کسی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والی کوئی اہم شخصیت اُٹھ جاتی ہے تو اس کی جگہ لینے والا کوئی دُور دُور بھی نظر نہیں آتا اور ایک ایسا خلا پیدا ہوجاتا ہے جو پُر ہوتا نظر نہیں آتا، پھر بعض شخصیتیں ایسی غیر معمولی اور ہمہ پہلو ہوتی ہیں جن سے بہت سی تحریکیں، جماعتیں اور ادارے وابستہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ایسی شخصیتیں اگر جدا ہو جائیں تو اس کا اثر پوری زندگی، پورے معاشرہ اور پورے ماحول پر پڑتا ہے اور ان کی جدائی سے پیدا ہونے والا بھیانک خلا واقعی پُر ہونا مشکل ہوجاتا ہے۔ ان کی موت ایک عالَم کی موت بن جاتی ہے اور تاریخ اور روایت کا جو باب بند ہوجاتا ہے پھر وہ کھلنے کا نام نہیں لیتا۔ امیر الہند محدث جلیل ونمونۂ اسلاف حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کے انتقال پُرملال نے ہماری ملّی واجتماعی زندگی اور علمائے امت کی اگلی صفوں میں ایک ایسا ہی کرب انگیز اور افسوسناک خلا پیدا کر دیا ہے جس کے پُر ہونے کی بظاہر حالات ایک طویل عرصہ تک کوئی امید نہیں ہے۔

حضرت امیر الہندؒ اپنی گوناگوں علمی وعملی صفات کی وجہ سے ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ آزادی سے پہلے جہاں انھوں نے علمائے حق کے پرچم تلے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے کر اپنے ہمعصر علماء کے ساتھ انگریزی سامراج کا مردانہ وار مقابلہ کیا وہیں اپنے اسلاف کی سنت کو زندہ رکھنے کے لیے دینی وعلمی حلقوں کو بھی ماند نہیں پڑنے دیا۔ اپنے وطنِ مالوف قصبہ مئوناتھ بھنجن کے مشہور اور مردم خیز ادارے دارالعلوم سے فراغت کے بعد اپنے اساتذہ کے حکم پر اسی دارالعلوم میں سلسلۂ تدریس شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک میں آزادی کے پروانے مجتمع ہوکر انگریزی سامراج پر نومولود جمعیۃ علماء ہند کی قیادت میں شب خون کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ یہیں سے حضرت امیر الہندؒ کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد جب ملک میں پہلا جمہوری انتخاب ہوا تو کانگریس کی اعلیٰ قیادت نے بصد اصرار امیر الہندؒ کو یوپی اسمبلی کی رکنیت کے لیے نامزد کیا۔ آپ کے نام پر الیکشن لڑا اور کانگریس کو اس میں کامیابی ملی۔ ۱۹۵۷ء تک آپ یوپی اسمبلی کے رکن رہے، اسی دوران مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی فرمائش واصرار پر آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بخاری کا درس بھی دیا۔ ۱۳۷۵ھ سے تادمِ واپسیں امیر الہندؒ عالم اسلام کے ممتاز ادارے دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ اور ملت اسلامیہ ہند کی مؤقر وفعال تنظیم جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے اور پھر جب وہ وقت آیا کہ مسلمانوں نے محسوس کرلیا کہ شریعت میں مسلمانوں کو ایک منتشر گروہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک منظم اور مربوط زندگی گزارنا ضروری ہے اور اپنے اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام ۲ نومبر ۱۹۸۶ء کو نئی دہلی میں علماء وفقہاء اور اصحابِ رائے اہلِ علم حضرات کا ایک کل ہند نمائندہ اجتماع منعقد کرکے امارت کے کام کو کل ہند پیمانے پر انجام دینے کا فیصلہ کیا تو اس 'امارتِ شرعیہ ہند' کے امیر کے لیے ہر شخص کی نظر آپ ہی کی طرف گئی اور مکمل اتفاق رائے اور سمع وطاعت کے پرزور عہد کے ساتھ مولانا اعظمیؒ کو ہی کل ہند امیرِ شریعت منتخب کیا گیا جس کی ذمہ داریوں کو وہ آخری سانس تک نبھاتے رہے۔ بحیثیت امیر الہند مولانا اعظمیؒ نے ملت کی جو رہنمائی کی اور اسے جو نقوش فراہم کیے انشاء اللہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے رہنما خطوط کا کام دیں گے۔

باوجودیکہ مولانا اعظمیؒ دارالعلوم دیوبند سے طبعی علالت کی وجہ سے حسبِ خواہش کچھ زیادہ کسبِ فیض نہیں کر سکے تاہم تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دو سال کی مدت میں ان کے حساس ذہن نے علامہ کشمیریؒ جیسے ذکی وفہیم استاذ کی زیر تربیت علمائے دیوبند کے مذاق کو اپنے اندر اس طرح جاگزیں کرلیا تھا

کہ آخر تک اس کا رنگ غالب رہا اور باوجود اس بات کے کہ ان کی قیام گاہ ایک مستقل دارالعلوم کی حیثیت رکھتی تھی وہ طلباء کو حصولِ علم کے لیے دارالعلوم دیوبند کی ترغیب میں کسی پس وپیش سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ خود بھی جب تک بہت زیادہ معذور نہیں ہوگئے دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ اور جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی میں شرکت اپنے لیے باعث افتخار خیال فرماتے تھے اور شاذونادر ہی ایسا ہوتا کہ آپ کسی وجہ سے تشریف نہ لاسکتے جس پر وہ اظہارِ افسوس بھی فرماتے رہتے۔

کچھ لوگ مرتے ہیں تو ایک آنکھ بھی ان پر رونے والی نہیں ہوتی، بعض لوگ مرتے ہیں تو احباب واقرباء کا ایک محدود حلقہ ان پر آنسو بہا لیتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی مرتے ہیں کہ پوری فضا اِدھر سے اُدھر تک غمناک اور پر ملال نظر آنے لگتی ہے اور ان آنکھوں کو گننا ناممکن ہوجاتا ہے جو اس مردِ مومن کے سوگ میں نمناک واشکبار رہیں۔ بلا شبہ حضرت امیر الہند مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ ایسی ہی ایک بلند مرتبہ اور ذی شان ہستی تھے۔ امیر الہندؒ کی موت نے نہ صرف مئو، اعظم گڑھ، مشرقی یوپی، ہندستان بلکہ پوری اسلامی دُنیا کو ایک ایسے کرب میں مبتلا کردیا ہے جو عرصہ تک محسوس کیا جاتا رہے گا۔

امیر الہند ایک عرصہ سے بیمار اور ضعف وپیرانہ سالی کی وجہ سے اگرچہ صاحبِ فراش تھے مگر دیکھنے والے جانتے ہیں کہ اس حال میں بھی ان کا اوڑھنا بچھونا حدیث وتفسیر کے گرانمایہ علوم وفنون کی وہ کتابیں ہی تھیں جو انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں، ضعف ونقاہت کے باوجود امارتِ شرعیہ ہند کے کاموں کی نگرانی اور انھیں آگے بڑھانے کے لیے مفید مشوروں کا سلسلہ تادم آخر جاری رکھا۔

رمضان المبارک کے عشرۂ رحمت کے اختتام پر مولانا کا انتقال ہوا۔ یہ بات خود آپ کی مغفرت کی بشارت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملت اسلامیہ کو بھی انتہائی اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ دعا کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس مردِ مومن کے ساتھ رحمت ومغفرت کا خصوصی معاملہ فرمائے اور امت کو ان کا جانشین اور نعم البدل عطا فرمائے، آمین! ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

(ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی)

سخنہائے گفتنی

حالات اور ماحول تاریخ ساز شخصیتوں کی تخلیق میں اہم رول ادا کرتے ہیں، حوادث اور آلام ومصائب کا کالا غبار جب فضاؤں پر چھا جاتا ہے، مشکلات اور دشواریوں کی شب دیجور امنگوں اور حوصلوں پر سیاہ چادر بن کر چھا جاتی ہے؛ تو علم وعمل کے آسمان پر ان گنت ستارے جگمگانے لگتے ہیں، ان کی ہلکی ہلکی کرنیں بتدریج اس سیاہ چادر کو چھلنی بناتی رہتی ہیں اور پھر صبح بیداری علم وعمل کے دمکتے ہوئے سورج کے استقبال کے لیے تیار ہوجاتی ہے اور پھر ہر طرف جھما جھم روشنی برسنے لگتی ہے، ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء پر تمام ہوتی ہوئی صدی پر نظر ڈالیے، کون سی مصیبت ہے جو مسلمانوں پر نہیں ٹوٹی، اور کون سی قیامت ہے جو ان کے سروں پر نہیں گذری؛ لیکن اس نوے سالہ دور میں جتنی عظیم المرتبت شخصیتیں پیدا ہوئیں، پچھلی کئی صدیوں میں اس کی مثال نہیں ملتی، صف بہ صف قد آور شخصیتیں ملیں گی، علماء ومشائخ قطار در قطار نظر آئیں گے، خانقاہوں میں اور ادسحر گاہی کے لاہوتی نغمے گونج رہے تھے، مدارس کی چہار دیواریاں قال اللہ وقال الرسول کی زمزمہ سنجیوں سے معمور تھیں، ایسا محسوس ہونے لگا جیسے جسد ملت میں ایک نئی روح دوڑنے لگی، یہ وہ علماء ومشائخ تھے جنھوں نے ہندوستان کی مذہبی تاریخ پر زبردست اثر ڈالا، اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی محدث جلیل حضرت العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی ذاتِ گرامی تھی، جو ۱۶/ مارچ ۱۹۹۲ءکو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کرگئی، ان کے سفر آخرت کے بعد ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے لَعَلَّ اللّٰہَ یُحدِثُ بَعدَ ذٰلِکَ اَمراً۔

....

محدث اعظمی کا علم وفضل، حدیث وعلوم میں ان کا درجۂ کمال، ان کی فقہی بصیرت ہر شک وشبہہ سے بالاتر تھی، وہ احادیث نبوی کے مزاج داں، رمز شناس تھے؛ ان کی نگاہ دقیقہ رس، ان کا ذہن رمز شناس تھا؛ انھوں نے اپنے علمی سفر میں ایسے نقوش قدم چھوڑے ہیں جو مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوں گے، اہل علم ان کی روشنی میں اپنا علمی سفر پورے یقین واعتماد کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے، مولانا مرحوم نے بڑی حد تک گمنامی کی زندگی بسر کی، لیکن یہ گمنامی عوامی زندگی تک محدود تھی، اکابر علماء ومشائخ اور مشاہیر اہل علم کی مقدس محفلوں میں ان کا نام ہمیشہ عظمت واحترام

سے لیا جاتا رہا، ان کے سامنے اعزاز و اکرام کی اونچی سے اونچی کرسی پیش کی گئی، بلند ترین منصبوں کی پیش کش کی گئی، لیکن انھوں نے ان کی جانب ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور نہایت بے نیازی کے ساتھ اپنے گوشۂ خلوت کی طرف لوٹ آئے، ان تمام پیشکشوں کے باوجود وہ کبھی بھی کسی مشہور اور ہمہ گیر شہرت کے مالک ادارے سے وابستہ نہیں رہے، وہ حتی الامکان ایسے بلند منصبوں سے دامن کش رہے جو راتوں رات ان کی شہرت کو شہپر جبریل عطا کردے۔

ان کے غیور دل نے تواضع اور انکساری کی چادر اوڑھ کر گمنامی کی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی اور شہرت اور نام ونمود کی قباء زرنگار کو ان کے دل کے کسی گوشے میں ایک لمحہ کے لیے بھی وقعت واعتبار حاصل نہ ہوسکا، لیکن اس کے باوجود ان کی ہمالیائی شخصیت علمی وفنی مجلسوں میں ہمیشہ انتہائی مرعوب کن رہی، ان کے آستانۂ علم وتحقیق پر ہر سر خم، اور ہر گردن جھکی ہوئی نظر آئی۔

....

اگر کسی فقہ اکیڈمی میں کسی مسئلہ پر دھواں دھار بحثیں چل رہی ہوں، دلائل وبراہین کے قد آور مجسمے کھڑے کیے جا رہے ہوں، فقہی بصیرت کے جوش میں بحث کرتے ہوئے کوئی زبان نہ رکتی ہو نہ تھکتی ہو، اسی ماحول میں ان کے کانوں میں چپکے سے کہہ دیا جائے کہ محدث اعظمی یہاں آگئے ہیں، تو یک بیک پُرشور مجلس پر شہرخموشاں کا سناٹا چھا جائے گا، دلائل وبراہین کے اچھلتے کودتے مجسمے لاشۂ بے جان اور جسد بے روح بن کر رہ جائیں گے، اور جوش وخروش کا پارہ یک بیک نازل ہوجائے گا؛ کیوں کہ محدث اعظمی کی فقہی بصیرت اور ان کی ہمالیائی شخصیت کے سامنے نہ کسی زبان میں یارائے تکلم رہ جائے گا اور نہ ہونٹوں کو مجال گفتگو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تجربات ومشاہدات کی روشنی میں کہہ رہا ہوں، دو درجن علماء وفقہاء نے لکھنؤ میں کچھ خاص مسائل پر تین دنوں کی بحث اور مذاکرہ کے بعد کچھ محقق ومدلل اور متفقہ فیصلے کیے، اور اس کے درست اور برحق ہونے پر ہر ایک کو ان کی فقہی بصیرت نے مطمئن کردیا تھا؛ لیکن جب یہی متفقہ فیصلہ حضرت محدث اعظمی کی خدمت میں تصویب کے لیے پیش کیا گیا، تو چند جملوں میں یہ محققانہ فیصلہ تارعنکبوت ثابت ہوا، جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا، مولانا اعظمی کا فیصلہ حرف آخر ثابت ہوا، جن لوگوں کے سامنے اپنے نقطۂ نگاہ پر دلائل وبراہین کا انبار تھا وہ گرد وغبار کی طرح ہواؤں میں اڑ گیا، اور پیاسے کے لیے سراب ثابت ہوا، اور خود فیصلہ کرنے والوں نے پوری بشاشت کے ساتھ اس فیصلہ کو قبول کیا۔

....

بات پر بات یاد آرہی ہے، ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند سالانہ اجلاس سہارن پور میں ہوا، اس میں دوسرے مسائل کے ساتھ امارت شرعیہ کا نظام قائم کرنے کا مسئلہ پیش ہوا، ورکنگ کمیٹی ایک مسئلہ پر متفق ہوگئی، مگر علماء سہارنپور کو دلائل کی بنیاد پر اس سے اختلاف تھا اور یہ اختلاف تحریری طور پر ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش بھی کردیا گیا، ارکانِ عاملہ میں برہمی پیدا ہوگئی، علماء سہارنپور اور مجلس عاملہ دونوں کو اپنے اپنے نقطۂ نگاہ پر اصرار تھا، اور محاذ آرائی کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا، جلسہ کی صدارت دنیائے اسلام کی ایک مقتدر شخصیت انجام دے رہی تھی، وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی، صدر نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے اس فیصلہ کو کالعدم قرار دے کر آئندہ کے لیے ملتوی کرنے کا حکم دیا اور یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کرائی کہ جمعیۃ علماء کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے جب بھی کوئی فقہی مسئلہ پیش ہو تو محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی سے استصواب کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا، یہ تجویز پوری مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر منظور کی جب کہ مولانا اعظمی اجلاس میں موجود بھی نہیں تھے۔ یہ مولانا اعظمی کی فقہی بصیرت پر کلی اعتماد اور ان کے فضل وکمال کا اعتراف کئی درجن عظیم المرتبت علماء ومشائخ کی مجلس میں کیا جا رہا ہے اور کسی کو اس سے مجال اختلاف نہیں تھا۔

....

جب بات امارت کی چل پڑی ہے تو ایک بات اور بھی عرض کردوں، پچھلے چار پانچ برسوں میں نظام امارت قائم کرنے پر بڑی سرگرمی سے غور کیا جانے لگا تھا، ہندوستان کی ایک موقر تنظیم نے اس کی تفصیلات پر غور کرکے امیر الہند کے انتخاب کا فیصلہ کرلیا، جمعیۃ علماء ہند بھی ہندوستان میں امارتِ شرعیہ کے قیام کے امکانات کا جائزہ لے رہی تھی، دوسری تنظیم نے تین ماہ بعد کی ایک تاریخ مقرر کردی کہ اس تاریخ میں کل ہند اجتماع بلا کر اس میں ہندوستان کے لیے ایک امیر کا انتخاب کیا جائے گا، جمعیۃ علماء چونکہ عرصہ دراز سے اس مسئلہ پر غور کررہی تھی اور بار بار مجلس عاملہ کے سامنے یہ مسئلہ آتا رہا، اس نے بھی ایک امیر الہند منتخب کرنے کا فیصلہ کرلیا اور ایک ماہ کے اندر ایک نمائندہ اجلاس دہلی میں بلا کر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کو امیر الہند کے اس عظیم منصب پر جوش وخروش سے بھری ہوئی فضا میں بٹھا دیا۔

دوسری تنظیم نے جب اپنا کل ہند اجتماع مقررہ تاریخ پر کیا اور اس میں امیر الہند کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا، تو اس شخصیت کی تلاش ہوئی جس کے فضل

وکمال اور علم وتحقیق اور فقہی بصیرت پر مکمل اعتماد کیا جاسکے اور سارے ملک کو اس پر متفق کیا جاسکے، جب جستجو کی نگاہیں پورے ہندوستان کا جائزہ لینے کے بعد تھک گئیں اور ایسی قدآور شخصیت کوئی نظر نہیں آئی تو انتخاب امیر کے مسئلہ کو غیر معین مدت تک کے لیے ملتوی کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا، یہ التوا ضابطہ کا التوا تھا؛ کیونکہ بلا استثناء ہر دل کہہ رہا تھا کہ اب امیر الہند کا ہماری طرف سے انتخاب بے معنی ہے۔ جب سورج طلوع ہوگیا تو پھر چراغ جلانے سے کیا حاصل؟

....

مولانا اعظمی از ہر ہند دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور شاید چار دہائیوں تک رہے، ارکان شوریٰ میں ہر ایک علم وفضل، علم وتحقیق اور زہد وتقویٰ اور علمی بصیرت میں اپنا اپنا ایک مقام رکھتا تھا، اس لیے جب ارکان شوریٰ دارالعلوم میں جمع ہوجاتے تھے تو پورے ملک میں آسمان فضل وکمال کے جتنے درخشندہ ستارے تھے وہاں جمع ہوجاتے، تو ایسا محسوس ہوتا کہ علم وفن کی ایک کہکشاں طلوع ہوگئی، مولانا اعظمی بھی اسی درخشاں کہکشاں کے ایک روشن وتابندہ ستارے تھے، ہر ستارہ کی اپنی چمک دمک اور آب وتاب تھی، یہ سب ستارے مل کر ایک جگمگاتی ہوئی کہکشاں کی شکل اختیار کرلیتے تھے؛ لیکن ایسا بہت ہوتا تھا کہ مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوتا تو مسندِ صدارت پر مولانا اعظمی ہی رونق افروز ہوتے تھے؛ کیونکہ سارے ستاروں میں سب سے تابندہ تر ستارہ کی حیثیت آپ کی شخصیت تسلیم کی جاچکی تھی۔

محدث اعظمی کی فقہی بصیرت اہل علم میں اُسی طرح ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی جس طرح حدیث اور علوم حدیث میں آپ کا فضل وکمال مسلّم تھا دارالعلوم دیو بند کے مفتی اعظم کا منصب ہندوپاک اور بنگلہ دیش ہی نہیں، بلکہ سارے عالم اسلام میں اپنی ایک عظمت اور امتیاز رکھتا تھا، اس عظیم منصب پر کبھی مفتیٔ اعظم مولانا عزیزالرحمٰن عثمانی فائز تھے اور کبھی مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندی رونق افروز تھے؛ لیکن ایک وقت آیا کہ اس عظیم منصب کے لیے کسی عظیم شخصیت کی تلاش ہوئی جو اس بلند منصب کے شایان شان ہو، تو اہل علم، اکابر علماء اور مشائخ کی نگاہ انتخاب محدث اعظمی پر پڑی؛ لیکن اسی کے ساتھ ان اکابر کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ وہ شخصیت ہے جو اپنے خام اور سفالہ پوش مکان کی کچی زمین پر چٹائیوں کے فرش پر بیٹھ کر بھی شاہانہ مزاج رکھتی ہے، استغناء اور بے نیازی اس کا جوہر ذاتی ہے، اس کی طرف سے طلب اور درخواست کا تصور بھی ناممکن ہے، اس کے آستانے پر حاضر ہوکر اس کو راضی کرنا بھی کچھ آسان نہیں ہے، مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ جن کی دیدہ وری نے ان کو حکیم الامت کا خطاب دلایا تھا، وہ دقیقہ رس اور نکتہ بیں نگاہوں کے مالک تھے، انھوں نے اس جوہر قابل کو پہچانا اور ہر قیمت پر ان کو دارالعلوم میں لانے کی تدابیر اختیار کی، کیونکہ انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ہندوستان میں کوئی شخص اس عظیم ذمہ داری کو اٹھا سکتا ہے تو وہ مولانا اعظمی ہی ہوسکتے ہیں، اگر وہ اس منصب پر آجاتے ہیں تو اس منصب کی عظمت میں اور اضافہ ہوسکتا ہے، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ کی معیت میں حضرت مولانا اعظمی کے یہاں تشریف لانے کا پروگرام طے ہوگیا، وہ شیخ الاسلام جن کی جوتیاں سیدھی کرنی ہزاروں علماء اپنے لیے ذریعہ عزت وافتخار سمجھتے تھے، ان گنت مدارس کے شیوخ حدیث اور دوسرے اہل علم جس شخصیت کی راہ میں دیدہ ودل فرش راہ کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ تھے، وہ شخصیت شریک سفر تھی، ہزاروں ارادتمند حیرت زدہ کہ آخر وہ کون سی ایسی عظیم شخصیت ہے جس کے لیے خود حضرت شیخ الاسلام زحمتِ سفر برداشت کررہے ہیں، آستانہ مدنی سے وابستہ علماء ومشائخ زبان حال سے کہہ رہے تھے ؎

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو کجا بہر تماشا می روی؟

لیکن جوہر کو جوہری پہچانتا ہے، ان دونوں بزرگوں نے مولانا اعظمی کے سامنے اپنا مقصدِ سفر ظاہر کیا؛ لیکن عہدہ ومنصب کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر خدمتِ حدیث نبوی کو آپ نے ترجیح دی، اور معذرت فرمادی، ہندوستان کی ان دو مایہ ناز شخصیتوں نے مفتی اعظم دارالعلوم دیو بند کے عظیم منصب کی پیشکش کرکے اس حقیقت کا اظہار فرمادیا کہ عہد حاضر میں مولانا اعظمی جیسا کوئی فقیہ اور صاحب بصیرت عالم ہندوستان کی سرزمین پر نہیں ہے، یہ اعتراف ہزاروں صفحات کی مدح سرائیوں سے کہیں زیادہ قیمتی اور جامع ہے۔

....

یادوں کا سلسلہ ابھی کچھ اور دراز ہے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث کا منصب اپنی خصوصیات وامتیازات کی وجہ سے سب سے اہم ہے اور سب سے عظیم منصب ہمیشہ سے شمار کیا جاتا رہا ہے، ہندوستان کی مایہ ناز شخصیتوں نے اس منصب کو سنبھالا اور اس کا حق ادا کردیا، اس عظیم منصب پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور آخر میں فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب ؒ نے زینت بخشی اور اس منصب کو مزید وقار وعظمت عطا کیا، اس سنہری زنجیر کی ہر کڑی طلاء ناب کی ہے اور زر خالص ہے، حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب ؒ نے سفر آخرت اختیار فرمایا تو اربابِ شوریٰ نے پورے ہندوستان پر نظر ڈالی؛ لیکن ہر طرف سناٹا ہی سناٹا نظر

آیا، حالانکہ علم وفضل کی مسندیں آباد تھیں، حدیث نبوی کی زمزمہ سنجیاں مدارس کی چہاردیواریوں میں سنی جارہی تھیں؛ لیکن یہ مدارس علاقائی تھے، اور شیخ الحدیث کی تلاش ہے ایک بین الاقوامی یونیورسٹی کے لیے ایک بار نگاہیں اس سلسلۃ الذہب کی طرف جارہی ہیں جس زنجیر کی پہلی کڑی حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ گرامی ہے اوراس کی آخری کڑی فخر المحدثین کی ذاتِ اقدس، نگاہ جستجو حیران اور متحیر، اور کہہ رہی ہے

ع ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

نگاہیں ہندوستان کی شمال وجنوب اور مغرب ومشرق کی سرحدوں تک کا جائزہ لے کر واپس لوٹیں، تو مجلس شوریٰ کے اس فرد جلیل پر آکر مرکوز ہوگئیں جس کو علمی دنیا محدث جلیل، محدثِ عصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے نام سے جانتی ہے، جس کا غلغلۂ شہرت ہندوپاک کی سرحدوں سے گذر کر حجاز کے ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے وادی نیل تک پہنچ چکا ہے، اس منصب کو قبول کرنے کی سفارش کی گئی کہ آپ اس منصب کو قبول فرما کر ہماری مشکل کو حل فرمائیں؛ لیکن وہی بے نیازی، وہی شانِ استغناء بلند منصوبوں سے احتراز اور دوری، اپنے چٹائیوں کے فرش کو اطلس وکمخواب پر ترجیح دینے والے کی تواضع اور خاکساری نے نہایت نرم لفظوں میں معذرت کردی، خدمت حدیث نبوی اور گوشۂ تنہائی یہی دونوں حاصل زندگی بن کر رہ گئے۔

....

اب تک طائرفکر ہندوپاک کی سرحدوں میں محصور رہا، اب شہبازفکر کو عرب دنیا کی فضاؤں میں پرواز کا موقعہ دیا جائے۔ حجاز اور شام کا نامور عالم، علماء احناف کا سرخیل، حدیث وعلوم حدیث کا ماہر کامل جس کو علمی دنیا شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے نام سے خوب جانتی اور پہچانتی ہے، جنھوں نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی الرفع والتکمیل جونول کشور پریس سے صرف ۳۰ صفحوں میں شائع ہوئی تھی، اس کو پھیلایا تو ۴۹۴ صفحات میں علوم ومعارف کے لعل وجواہر بکھیر دیئے، مولانا ظفراحمد تھانوی نے اعلاء السنن پر جو مقدمہ لکھا تھا اس کو تعلیق وتحشیہ سے آراستہ کرکے ایک مستقل اور جامع کتاب بنادیا، ان دونوں کتابوں کو ان کے کلکِ گہر بار نے ابن الصلاح کی ''علوم الحدیث'' اور ابوعبداللہ الحاکم کی ''معرفۃ علوم الحدیث'' کے ہم پلہ اور ہم سر بنادیا، اور جب درس حدیث کے لیے مملکت سعودیہ کی یونیورسٹی میں بیٹھے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ جوامع الکلم کی عملی تفسیر پیش کردی اور اپنے علم وفضل سے مصر وحجاز کی علمی فضاؤں کو علوم ومعارف کی خوشبوؤں سے بھر دیا، اور جب انھوں نے سفر ہندوستان کا ارادہ کیا تو ان کے مقاصد سفر دو تھے ایک فخر ہندوستان مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی قبر پُرانوار واقع انوار باغ لکھنؤ پر حاضر ہوکر فاتحہ خوانی، اور دوسرے محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی سے شرف ملاقات اور سند حدیث واجازت لینے کا جذبہ۔ عبدالفتاح ابوغدہ ہندوستان تشریف لائے اور اپنے دونوں مقاصد میں کامیاب ہوئے، پہاڑیوں سے گھرے ہوئے علاقے میں رہنے والا ایک عظیم اور قدآور عالم جب ہندوستان آیا تو ہمالیہ کی بلندی کا صحیح اندازہ ہوا اور مولانا اعظمی کی ہمالیائی شخصیت کی آستاں بوسی کو اپنے لیے سرمایۂ فخر تصور کیا اور مولانا اعظمی کی زندگی کے اخیر لمحہ تک اس عقیدت وارادت اور تعلق کو نہ صرف اپنی ذات تک محدود کرکے باقی رکھا؛ بلکہ اپنے علمی دوستوں اور اپنے صاحبزادے کے لیے اجازت حدیث کی درخواست بھی کی، محدث اعظمی کے نام حضرت شیخ کے خطوط کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں محدث اعظمی کو کتنا بلند مقام حاصل تھا۔

سرزمین مصر ہمیشہ سے علم وفن کا گہوارہ رہی، یہاں ہر دور میں تاریخ ساز شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں، عصر حاضر میں ایک اور عظیم شخصیت پیدا ہوئی، جس نے مشہور مفسر ومؤرخ طبری کا جذبہ اور حوصلہ پایا تھا، طبری نے اپنے تلامذہ سے کہا کہ میں ایک تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، جو تیس ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی، شاگردوں نے عرض کیا کہ ہمتیں پست ہوگئی ہیں، جذبہ علمی سرد پڑتا جارہا ہے، اتنی ضخیم کتاب کون پڑھے گا؟ کچھ دنوں کے بعد جب تفسیر مکمل کرچکے تھے، اپنے تلامذہ کے سامنے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ میں ایک مفصل اسلامی تاریخ قلم بند کرنا چاہتا ہوں، اس کے تیس ہزار صفحات ہوں گے، طلبہ نے پھر وہی عذر کیا تو انھوں نے مجبوراً اپنی تفسیر مختصر کرکے چار جلدوں میں لکھی اور اپنی تاریخ مختصر کرکے ۱۳ جلدوں میں تمام کردی۔ جدید مصر کے ایک محقق عالم احمد شاکر طبری ہی کا حوصلہ لے کر اٹھتے ہیں اور مسند احمد بن حنبل کی شرح کا آغاز اسی جذبے اور حوصلے کے ساتھ کرتے ہیں، معلوم نہیں کتنی جلدوں تک پہنچانا چاہتے تھے، مگر پندرہ جلدوں تک پہنچتے پہنچتے سفر آخرت کا مرحلہ سامنے آگیا اور کتاب نامکمل رہ گئی۔

یہی مصر کے محقق عالم ایک دن اپنے تصنیفی مشغلہ میں مصروف تھے کہ ان کو ایک گمنام عالم کا لفافہ ملا، کھولا تو اس میں ان کی شائع شدہ جلدوں میں ان کے تسامحات کا مفصل ومدلل تذکرہ تھا۔ یہ تبصرہ، یہ تنقید اتنی عالمانہ اور محققانہ تھی کہ احمد شاکر حیرت زدہ رہ گئے، انھوں نے اپنی کتاب پر نظر ثانی کی، ان استدراکات میں بڑا وزن محسوس ہوا، کوئی مصنف اپنی تصنیف پر نکتہ چینی اور اعتراض برداشت نہیں کرتا، مگر شیخ احمد شاکر کے خلوص اور جذبۂ تحقیق اور

تلاشِ حق کی داد دیجئے کہ ان اعتراضات کو اسی گمنام عالم کے لفظوں میں اپنی کتاب میں نقل کیا اور داد تحسین سے نوازا، ان کا شکریہ ادا کیا اور اس گمنام عالم کو شکریہ کا خط لکھ کر درخواست ہی نہیں کی؛ بلکہ تقاضا کیا کہ مزید جلدوں کو پڑھ میری غلطیوں پر متنبہ کیا جائے، تو میں ممنون ہوں گا۔

وہ گمنام عالم کون تھا؟ وہ یہی محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ تھے، جو اس وقت مفتاح العلوم شاہی مسجد کٹرہ کی پوربی دیوار سے متصل ایک نہایت ہی بوسیدہ خام سفالہ پوش چھوٹے سے کمرے میں علوم ومعارف کے جواہر لٹا رہے تھے، اور حجاز ومصر کے اہل علم کے سامنے ابھی کوئی تحقیقی کارنامہ نہیں آیا تھا، یہ تو اس دور کے بہت بعد کا واقعہ ہے کہ قدیم مخطوطات کو آپ نے تعلیق وتحشیہ سے آراستہ کرکے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا۔

....

حضرت محدث اعظمی کی ذات لعل بدخشاں تھی، جتنی ہی تاریکی میں رکھا جائے گا، اتنی ہی اس کی چمک دمک اور آب وتاب میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ خود اس ظلمت کدہ کو بقعہ نور بنادے گا، محدث اعظمی کی ذات گرامی بھی کچھ ایسی ہی تھی، ساری زندگی گوشۂ خلوت میں بڑی حد تک گمنامی کی زندگی بسر کی؛ مگر وہیں سے وہ مملکت علم وتحقیق میں حکمرانی کررہے تھے، ان کے نام کا سکہ چلتا تھا، ہر شخص ان کا نام عظمت واحترام سے لیتا تھا، اکابر علماء نے ان کے قدوقامت کو ناپا اور مرعوب ہوئے۔ ان کے علم، ان کے فضل وکمال کو جانچا پرکھا تو متاثر ہوئے، ان کے مقام ومرتبہ کی بلندیوں کی جانب نگاہیں اٹھائیں، تو سروں سے دستارفضیلت گرگئی۔

یہ علم، یہ فضل، یہ کمال، اور ان کے سینہ میں علوم ومعارف کا پوشیدہ خزانہ خداداد تھا، موہبت الٰہی تھا، ایسی شخصیتیں تاریخ میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں، تاریخ وہ خود بناتے ہیں، اس لیے تاریخ ان کو خود ہمیشہ یادرکھنے پر مجبور ہوتی ہے۔

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی!

(سہ ماہی مجلہ ترجمان الاسلام بنارس)

محدّث العصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی عرصہ سے موت وحیات کی کشمکش میں گرفتار تھے، راقم ۲۳ر فروری کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کی دعوت پر کلیۃ فاطمۃ الزہرا کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے مئو گیا، تو مولانا الاعظمی کی عیادت کے لیے بھی حاضر ہوا، لیکن ڈاکٹروں نے ملنے جلنے پر سخت پابندی لگا رکھی تھی، میری خواہش پر صاحبزادہ محترم مولانا رشید احمد صاحب (نے) دیدو زیارت کا موقع مہیا کردیا، لیکن اس وقت محدث کبیر نہ بات چیت کرتے تھے اور نہ آنکھیں کھولتے تھے، چندروز بعد مولانا رشید احمد صاحب نے خط سے اطلاع دی کہ اب بھی وہی کیفیت ہے، بلکہ صحت مزید خراب ہوتی جارہی ہے، میں پھر عیادت کے لیے جانا چاہتا تھا کہ ۱۱ر رمضان المبارک کو حادثہ جانکاہ کی اطلاع آگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محدث العصر نے طویل عمر پائی اور مصروف علمی زندگی گزاری، وہ ۱۳۱۹ھ میں پیدا ہوئے، ''اختر حسن'' تاریخی نام تھا۔ گھریلو تعلیم کے بعد انھوں نے مئو سے ملحق قصبہ بہادر گنج کے مدرسہ میں داخلہ لیا، جہاں مولانا عبدالغفار عراقی کے بھائی مولانا ابوالحسن عراقی سے کسب فیض کرنے کے بعد مظہر العلوم بنارس میں داخلہ لیا، حصول تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند کا سفر دوبار کیا، مگر دونوں بار طبیعت خراب ہوجانے کی وجہ سے واپس چلے آئے اور دارالعلوم مئو ہی میں مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی کی خدمت میں رہ کر دورۂ حدیث مکمل کیا۔ فراغت کے بعد یہیں درس وتدریس کی خدمت پر مامور ہوگئے، پھر مئو کے دوسرے بڑے مدرسہ جامعہ مفتاح العلوم سے وابستہ ہوئے اور اس کے صدر مدرس بھی رہے، یہاں سے علیحدہ ہوئے تو خود المعہد العالی ومرقاۃ العلوم کی داغ بیل ڈالی، جو اب مئو کے بڑے مدرسوں کی صف میں آگیا ہے۔

مولانا کا اصل مشغلہ درس وتدریس تھا، ان کے بے شمار تلامذہ اس برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں، جن میں مولانا محمد منظور نعمانی اڈیٹر الفرقان اور مفتی ظفیر الدین صاحب بھی ہیں۔ تاہم تحریر وتصنیف کا کام بھی وہ برابر انجام دیتے رہے اور انھیں اس کا اچھا سلیقہ اور عمدہ ذوق تھا۔ حدیث واسماء الرجال ان کا خاص فن تھا اور اس پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، مخطوطات سے بھی انھیں بڑا شغف تھا، ان کا مہتم بالشان کارنامہ احادیث کی بہت سی ان نادر کتابوں کی اشاعت ہے جو مخطوطہ ہونے کی بنا پر اہل علم کی دسترس سے باہر تھیں۔ مولانا نے ان کو ان کے مختلف نسخوں کی مدد سے مقابلہ، تصحیح وتعلیق اور مفید حواشی

کے ساتھ شائع کرکے اصحاب علم وتحقیق پر بڑا احسان کیا۔ انھوں نے جن کتابوں کو اڈٹ کیا ہے ان پر عالمانہ مقدمے بھی لکھے ہیں، جن میں مصنف کے حالات وکمالات کے علاوہ ان موضوعات پر پہلے اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ کرکے زیر اشاعت کتاب کی اہمیت وعظمت دکھائی ہے، حواشی وتعلیقات میں مختلف نسخوں کے فرق واختلاف اور متن میں درج آیتوں اور حدیثوں کی تخریج، رجال واسناد کی تحقیق، مشکل وغریب الفاظ اور مشکلات حدیث کی تشریح کی گئی ہے، دوسری مشہور ومتداول کتابوں کی حدیثوں سے زیر نظر کتابوں کی مطابقت یا اختلاف کو ظاہر کرکے ان کی صحت وخطا کا فیصلہ کیا ہے، شروع میں مخطوطہ کے بعض صفحوں کا عکسی فوٹو اور متعدد فہرستیں دے کر استفادہ ومراجعت کو آسان کر دیا ہے، اس طرح کی جو کتابیں مرتب کی ہیں ان کے نام یہ ہیں:

مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، کتاب السنن (حافظ سعید بن منصور) کتاب الزہد والرقائق (عبداللہ بن مبارک) مجمع بحار الانوار (ملا محمد بن طاہر پٹنی) الحاوی علی رجال الطحاوی وغیرہ۔

آخرالذکر رجال طحاوی پر خود مولانا کی بلند پایہ علمی وتحقیقی تصنیف ہے۔

اردو میں بھی مولانا کی متعدد تصانیف ہیں جو اکثر ردو مناظرہ میں ہیں، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

(۱) اعیان الحجاج (دو جلدیں) (۲) نصرۃ الحدیث (۳) الاعلام المرفوعہ (۴) رکعات تراویح۔

مولانا سلیس، شگفتہ، پُر مغز اور حشو زوائد سے پاک اردو لکھتے تھے، جو ”قلّ و دلّ“ کا نمونہ ہوتی تھی۔

مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے معارف اور برہان میں متعدد محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں، ان میں سے اکثر میں کسی مصنف یا مقالہ نگار کی فرو گذاشتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ بڑے بیش قیمت ہیں جن سے علمی وتحقیقی کام کرنے والے بے نیاز نہیں ہو سکتے، اس لیے معارف میں چھپنے والے ان کے مضامین کی ایک فہرست دی جاتی ہے:

جواد ساباط (جلد ۱۲ عدد ۴) دو متبرک اجازت نامے (جلد ۴۰ عدد ۶) تخریج زیلعی (جلد ۴۶ عدد ۱) الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ (جلد ۶۶ عدد ۲) مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے (جلد ۷۳ عدد ۱) پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (جلد ۷۴ عدد ۴و۵) قاضی رشید بن زبیر غسانی اسوانی مصری مصنف الذخائر والتحف (۱) (جلد ۷۸ عدد ۶) دینور ومشائخ دینور (جلد ۹۶ عدد ۴) ابو عبید کی غریب الحدیث (جلد ۱۰۰ عدد ۴) غریب الحدیث (جلد ۱۰۱ عدد ۲) فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (جلد ۱۲۳ عدد ۴)۔

مولانا متبحر عالم اور بلند پایہ محدث تھے اور اس حیثیت سے ہندوستان ہی نہیں، بلکہ عرب ملکوں میں بھی وہ بے نظیر تھے، فقہ حنفی پر بھی ان کی وسیع نظر تھی جس کی تائید وحمایت میں پیش پیش رہتے تھے۔

لگن اور خاموشی سے علم ومذہب کی خدمت ہی مولانا کا مشن تھا اور اسی سے ان کو طبعاً مناسبت بھی تھی، لیکن ان کا رجحان آزادی واتحاد کی تحریک کی طرف رہا اور وہ کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند سے عملاً وابستہ بھی تھے، ۱۹۵۲ء میں مئو کے حلقہ سے کانگریس نے انھیں اسمبلی کے لیے اپنا امیدوار بنایا جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس زمانہ میں اسمبلی کی ممبری باوقار سمجھی جاتی تھی، تاہم مولانا جیسے علمی آدمی کو اس سے کوئی مناسبت نہیں تھی، اس لیے ان کا زیادہ وقت ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں گزرتا تھا، اس سے فائدہ اٹھا کر ندوہ کے ارکان نے انھیں درس حدیث کی خدمت تفویض کردی، جس کو وہ بلا معاوضہ انجام دیتے رہے؛ مگر دوبارہ انتخاب میں امیدوار ہونا پسند نہیں کیا۔ مولانا کی طویل علمی وتحقیقی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے ۱۹۸۴ء میں انھیں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ عطا کیا تھا۔

سیاست میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مسلک سے قریب ہونے کی بنا پر مولانا اسعد مدنی سے بھی ان کو عزیزانہ تعلق تھا، چند برس قبل امارت شرعیہ ہند نے ان کو امیر الہند منتخب کیا تھا۔ بیعت واجازت کا تعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تھا۔ مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور دونوں بزرگ ایک دوسرے کے فضل وکمال کے معترف تھے۔ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کے بڑے عظمت شناس تھے، دارالمصنفین آتے تو مولانا سے ملاقات کے لیے مئو بھی تشریف لے جاتے۔ شروع ہی سے مولانا اعظمی کا تعلق دارالمصنفین سے بھی تھا جو آخر تک قائم رہا، حضرت سید صاحب ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے اور اپنی بعض تحریروں کو اشاعت سے پہلے ان کے پاس بھیجتے اور ان کے مشورے کے مطابق ان میں ردو بدل بھی فرماتے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم بھی ان کا بڑا اکرام کرتے۔ چند برس قبل ان

کو دارالمصنفین کی وقف کمیٹی کی رکنیت پیش کی گئی تو انھوں نے اس کو بخوشی منظور کر لیا۔

مولانا اس برصغیر ہی نہیں، پوری اسلامی دنیا میں اپنے علمی و دینی کارناموں کی وجہ سے مشہور و مقبول تھے، انھوں نے کئی مسلم ملکوں کا علمی سفر بھی کیا تھا۔ عرب ممالک کے ممتاز فضلاء سے ان کے روابط تھے، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ان کے بڑے مداح تھے۔ شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلو پیڈیا لاہور بھی ان کے بڑے قدردان تھے، ایک دفعہ وہ دارالمصنفین تشریف لائے تو مولانا سے ملنے مئو بھی گئے۔

اپنے وطن میں مولانا کو جو مقبولیت حاصل تھی، اس کا اندازہ ان کے جنازہ سے ہوا، جس میں شرکت کے لیے دارالمصنفین سے راقم اپنے رفیق کار مولوی محمد عارف عمری اور مولوی احتشام علی ندوی کے ساتھ گیا تھا۔ مئو کے ہر گلی کوچہ میں آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے، ہم لوگ بڑی زحمت سے مولانا کی قیام گاہ (پٹھان ٹولہ) پہنچے، لیکن دیدوزیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ ریلوے کے بڑے اور وسیع میدان میں جنازہ کی نماز کا اہتمام کیا گیا تھا، مولانا ہی کے ایک ہم نام اور اپنے اہل تعلق مولوی حبیب الرحمٰن ندوی کی معیت میں ریلوے میدان گئے، جہاں اتنے لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی جن کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا، البتہ بعض لوگوں کو جب یہ کہتے سنا کہ مئو میں ابھی تک کسی کے جنازہ میں نہ اتنا بڑا مجمع ہوا تھا اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے، تو ہم نے بھی اپنے دل میں کہا یہ اس عہد کے امام زیلعی اور ملا علی قاری کا جنازہ ہے، جن کی زبان و قلم ہمیشہ احادیث کی شرح و ترجمانی اور ان کی مشکلات و غوامض کو حل کرنے میں مصروف رہے ہیں اور جن کا وجود گرامی علوم نبوی ؑ کی خدمت و فروغ اور نادر و نایاب کتب احادیث کی طبع و اشاعت کے لیے وقف رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں علم و دین اور احادیث نبویؐ کے اس خادم کے مراتب و درجات کو بلند کرے۔

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ)

جیّد عالمِ دین، مفکر اسلام، محدثِ کبیر علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

عالم اسلام کی بلند پایہ علمی شخصیت محدث کبیر، فقیہ و نامور مصنف اور تحریکِ آزادی کے ممتاز مجاہد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی طویل علالت کے بعد دسویں رمضان المبارک بروز دوشنبہ عین افطار کے وقت سے پہلے کی مبارک ساعت میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا کی وفات کا یہ المناک سانحہ حضرت کے اپنے آبائی وطن مئوناتھ بھنجن میں ۹۵؍ برس کی عمر میں ۱۶؍ مارچ کو شام ۶ بجکر ۷ منٹ پر پیش آیا۔ وفات حسرت آیات کی خبر پورے شہر، قرب و جوار ملک اور بیرون ملک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مشرقی اتر پردیش کے تقریباً تمام ہی اضلاع اور سبھی علاقوں سے عقیدت مندوں اور سوگواروں کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ اور بھاگلپور سے جن کی تعداد اگلے دن تدفین کے وقت تک لاکھوں میں ہوگئی، مئو کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا ہجوم نہیں دیکھا گیا، سارا شہر افسردگی اور غم واندوہ کی تصویر بن گیا۔ بیوپار منڈل نے عام بند کا اعلان کر دیا، تمام کاروباری ادارے بند ہو گئے۔

جنازہ دن میں تقریباً بارہ بجے روانہ ہوا، جو خاص شاہراہوں سے ہوتا ہوا ریلوے گراؤنڈ پہنچا، جنازہ اور تدفین میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم عقیدتمندوں کی بھی بڑی تعداد شامل تھی۔ نماز جنازہ مولانا عبدالجبار اعظمی نے پڑھائی۔ اس موقع پر ازدحام کو کنٹرول کرنے کے لیے ضلع انتظامیہ کی جانب سے زبردست اہتمام کیا گیا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اسلام کے ممتاز عالم و بلند پایہ فقیہ اور محدث ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث و فقہ پر دو درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ، جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ اور عالم اسلام کے دوسرے بہت سے اداروں کے رکن تھے۔ حدیث کی اہم کتابوں پر تحقیق و تعلیق کا کام کیا۔ آپ کی اہم کتابوں میں مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی، سنن سعید بن منصور، المطالب العالیہ اور کتاب الزہد والرقائق وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا مرحوم کا تاریخی نام ''اختر حسن'' رکھا گیا تھا، لیکن آپ حبیب الرحمٰن کے نام سے مشہور ہوئے۔ علامہ نے سب سے پہلے مئو کی قدیم دینی درسگاہ دارالعلوم ہی میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دیگر مراکز علمی میں اپنے وقت کے جلیل القدر علماء سے فیض حاصل کرتے ہوئے ۱۳۳۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ (اضرت کا سال فراغت ۱۳۳۴ھ نہیں بلکہ ۱۳۴۰ھ ہے، دیوبند میں چند مہینے پڑھنے کے بعد دارالعلوم مئو سے فراغت حاصل کی تھی) اور مظہر العلوم بنارس و دارالعلوم مئوناتھ بھنجن میں تشنگان علوم اسلامیہ کو تسکین فراہم کرنے لگے، بعض وجوہات کی بنا پر

۷ ۱۳۴۴ھ میں جامعہ مفتاح العلوم کی بنیاد ڈالی جس میں شیخ الحدیث اور صدر مدرس کی حیثیت سے تادم آخر خدمات انجام دیتے رہے۔ (بعض وجوہات کی بنا پر ۱۳۹۷ھ کے لگ بھگ مفتاح العلوم سے مفارقت اختیار کرلی تھی، اور ۱۳۹۹ھ میں المعهد العالی ومرقاۃ العلوم قائم کیا تھا)

علامہ کا اصل رجحان فن حدیث سے متعلق غیر مطبوعہ کتابوں کو مرتب کر کے عوام کے سامنے پیش کرنے کی طرف تھا۔ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے برصغیر کے علاوہ عرب ممالک اور پورے عالم اسلام میں قدرومنزلت کے مالک بن گئے تھے۔ اس وقت فن حدیث، رجال حدیث اور متعلقات حدیث میں امتیازی مقام حاصل تھا، فن حدیث میں آپ کا اہم اور تحقیقی مشہور کارنامہ مصنف عبدالرزاق کی اشاعت ہے، جو گیارہ ضخیم جلدوں میں عربی میں ہے، بعض مسائل پر ایسی محققانہ کتابیں تصنیف کیں کہ حرف آخر بن گئیں۔ رکعات تراویح کے موضوع پر خالص علمی اور تحقیقی انداز میں بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق ؓ کے بعد سے تیرہویں صدی کے آخر تک دنیا کی کسی مسجد میں تراویح کی صرف آٹھ رکعتیں نہیں پڑھی گئیں۔ ایک مجلس کی تین طلاقوں کی شرعی حیثیت اور اس کے بارے میں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا تحقیقی جواب احادیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں دیتے ہوئے ایک کتاب الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ ترتیب دی۔

حضرت علامہ نے اپنے آخری دور میں مئو ہی میں مرقاۃ العلوم کے نام سے ایک اور مقتدر درسگاہ قائم کی، جہاں علم حدیث، فن رجال اور فقہ کے فارغین کو تحقیق اور ماہرانہ ریسرچ کی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں اور مولانا بذات خود ان فضلاء کو اپنے علمی تبحر سے فیضیاب فرماتے تھے۔ چند سال قبل ممتاز علماء کرام، محدثین عظام اور مفتیان شرع متین کے اجتماع نے دہلی میں امیر الہند منتخب کیا تھا۔ تاکہ سیکولر ہندوستان میں مسلمانوں کی شرعی رہنمائی کی جاسکے، امارتِ شرعیہ کا کل ہند نظام آپ ہی کی نگرانی میں قائم کیا گیا۔ غیر سیاسی مزاج کے باوجود پنڈت نہرو کے اصرار پر اترپردیش اسمبلی کے لیے الیکشن میں کھڑے تو ہو گئے، مگر ہر جگہ واضح الفاظ میں اعلان کرتے رہے کہ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں؛ اس لیے اگر مجھے اسمبلی کے لیے منتخب کریں تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں، اس کے باوجود بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ اندرا گاندھی سعودی عرب گئیں تو شاہ خالد سے پوچھا کہ ہندوستان آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہے؟ شاہ خالد نے کہا آپ حدیث کی فلاں کتاب پر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی سے حاشیہ لکھوادیں۔ واپسی میں اندرا گاندھی نے عرض کیا میں آپ کے بھروسہ پر شاہ خالد سے وعدہ کر آئی ہوں امید ہے کہ آپ مجھے شرمندہ نہ ہونے دیں گے۔ اور مولانا نے یہ کارنامہ بحسن وخوبی انجام دیا۔ پسماندگان میں دو صاحبزادے مولانا رشید احمد اور مولانا سعید احمد کے علاوہ چار صاحبزادیاں ہیں۔

(ہفت روزہ 'نئی دنیا' دہلی)

بزم علم وفضل کی ایک شمع فروزاں گل ہوگئی

یہ غم انگیز خبر ناظرین ''الرشاد'' کو مل چکی ہوگی کہ نادرۂ روزگار عالم، منبع علم وفضل اور محدث وقت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے دس رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶؍مارچ ۱۹۹۲ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی ذات نہ صرف علوم دینیہ اور فن حدیث میں سند کی حیثیت رکھتی تھی، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی ذات گرامی سے ہندوستان میں بزم علم وفضل کی آبرو قائم تھی، کسی عربی شاعر نے اپنے قبیلہ کے سردار کی موت پر یہ شعر کہا تھا ؎

وما كان قيس هلكه هلك واحد　　ولكنه بنيان قوم تهدما

یہ شعر ممکن ہے کہ اس کے قبیلہ کے لیے صحیح رہا ہو، مگر مولانا کی ذات واقعی ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے اس کا مصداق ہے۔

ہندوستان میں علوم دینیہ اور خاص طور پر فن حدیث کی علمی، تحقیقی اور تدریسی خدمات اس وقت سے انجام پارہی تھیں، جب پورے عالم اسلام پر علم وتحقیق کے اعتبار سے بڑی حد تک سکوت طاری تھا، افسوس ہے کہ اس وقت ہندوستان میں اس سلسلۃ الذہب کی ایک ایک کڑی یکے بعد دیگرے ٹوٹتی جارہی ہے اور ان کی جگہ پُر نہیں ہو پارہی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ کی ذات گرامی اس سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی تھی، جو ان کی وفات سے ٹوٹ گئی۔ مولانا مرحوم کی ذات سے اس وقت ہندوستان میں علم حدیث کا فنی اور تحقیقی جو ذوق قائم تھا، اب ہم اس سے محروم ہو گئے ہیں۔ خدا کرے مولانا عبیداللہ رحمانی مدظلہ

تا دیر سلامت رہیں، جو اس سلسلہ کی شاید آخری کڑی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیؒ کے علمی و تحقیقی کاموں کا وزن ان کی کمیت کے اعتبار سے نہیں، بلکہ ان کی کیفیت کے اعتبار سے ہے۔ مصنف عبدالرزاق جس سے استفادہ بلکہ اس کی دید کے لئے ایک مدت سے اہل علم کی آنکھیں ترس رہی تھیں، مولانا کی علمی و تحقیقی کاوش سے وہ منظر عام پر آ گئی اور اس سے عام اہل علم کے لیے استفادہ ممکن ہوسکا، افسوس ہے کہ مولانا نے اس پر جو قیمتی مقدمہ لکھا تھا، وہ کتاب کا جز نہ بن سکا، علم نہیں کہ وہ اب کس مرحلہ میں ہے۔ (افسوس ہے کہ مصنَّف عبدالرزاق کا مقدمہ لکھا نہیں جا سکا تھا) اس سے پہلے مسند حمیدی بھی مولانا کی تحقیق سے شائع ہو چکی ہے۔

اس کے علاوہ اردو زبان میں بھی مولانا کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں رکعات تراویح اور اعیان الحجاج کافی مشہور رہیں۔

مدرسہ مفتاح العلوم کی داغ بیل جن تین حضرات نے ڈالی ان میں ایک مولانا مرحوم بھی تھے، ایک مدت تک انھوں نے اس میں درس بھی دیا، مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مرحوم کے انتقال کے بعد وہ کئی سال اس کے ناظم بھی رہے، مگر ان کے مزاج کے خلاف کچھ ایسی باتیں پیش آئیں جس سے کنارہ کش ہو گئے اور ایک علٰحدہ مدرسہ مرقاۃ العلوم کے نام سے قائم کیا، جس کے احاطہ ہی میں مولانا کی تدفین عمل میں آئی۔

مولانا سے راقم الحروف کو اس وقت سے تعلق خاطر ہے جب وہ حضرت الاستاذ سید سلیمان ندوی کی خدمت میں تشریف لایا کرتے تھے، بسا اوقات وہ دارالمصنفین میں کئی کئی دن قیام کرتے تھے اور بیشتر وقت ان کا کتب خانہ میں گزرتا تھا، حضرت سید صاحب ان سے بڑی محبت فرماتے تھے اور ان کے لیے کتب خانہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھنے کا حکم فرماتے۔ بحمد اللہ ان کی مطلوبہ کتابوں کے نکالنے میں اکثر راقم الحروف معاون رہتا تھا اور اس سلسلہ میں کچھ استفادہ کا موقع بھی ملا، اس تعلق کی بنا پر جامعۃ الرشاد کی نئی عمارت کے سنگ بنیاد کے موقع پر ان کو دعوت نامہ بھیجا، تو کئی علماء کے ساتھ تشریف لائے اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور متعدد دیگر علماء کے ساتھ سنگ بنیاد میں شریک رہے۔ اس کے بعد بھی کئی بار ان کی تشریف آوری ہوئی اور انھوں نے اپنے تاثرات بھی لکھے اور زبانی بھی ہدایات دیتے رہے۔

مولانا نے علم حدیث میں حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ سے استفادہ کیا تھا اور انھیں کا تحقیقی رنگ ان پر غالب رہا، اس بنا پر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ان کو دارالعلوم میں بحیثیت استاذ حدیث کئی بار لانے کی کوشش کی، مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے، البتہ اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر زندگی بھر رہے۔

عموماً علم کا پندار اپنی باطنی اصلاح سے غافل کر دیتا ہے، مگر غیر معمولی علم و فضل کے باوجود مولانا نے ہمیشہ اپنے تزکیۂ باطن کی بھی فکر رکھی، یہ تو علم نہیں ہے کہ وہ کس سے بیعت تھے، مگر حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ سے ان کو خاص تعلق تھا اور ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ مولانا جب فتح پور سے الٰہ آباد منتقل ہو گئے، تو مولانا اعظمیؒ کے اصرار ہی پر ہر پندرہویں دن مئو تشریف لایا کرتے تھے، یہ سلسلہ کئی مہینہ چلتا رہا۔ میں نے خط کے ذریعہ مولانا فتح پوری سے بیعت کی درخواست کی تو جواب میں فرمایا کہ جب میں مئو آؤں تو ملو، چنانچہ وہ مئو تشریف لائے مگر مجھے اس کا علم نہیں ہوسکا۔ ایک دن قیام کے بعد حضرت مولانا اعظمیؒ سے فرمایا کہ کسی آدمی کے ذریعہ مجیب اللہ کو اعظم گڈھ سے بلوایئے، چنانچہ مولانا نے ایک خصوصی آدمی بھیج کر مجھے بلوایا اور مولانا فتح پوری نے مولانا اعظمی کی موجودگی میں تہجد کے بعد راقم الحروف کو بیعت فرمایا۔

مولانا فتح پوری کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھیؒ کی خدمت میں آمد و رفت رکھی، وہ الٰہ آباد میں کئی کئی دن حضرت پرتاب گڑھی کی خدمت میں مدرسہ بیت المعارف میں قیام فرمایا کرتے تھے، حضرت مولانا پرتاب گڑھی بھی مولانا اعظمی کی حد درجہ قدر دانی اور ان کی مہمان نوازی کا اہتمام فرمایا کرتے تھے، ان دنوں راقم الحروف کا مولانا اعظمی کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بعد مولانا اعظمی کی دوسری شخصیت تھی کہ اپنے غیر معمولی علم و فضل اور بین الاقوامی شہرت کے باوجود کسی وقت بھی اصلاح باطن سے اپنے کو بے نیاز نہیں سمجھا۔

واقعہ ہے کہ یہ رتبۂ بلند ہر صاحب علم کو نہیں ملتا۔ ان کی وفات سے ہندوستان میں جو علمی و دینی خلا پیدا ہوا ہے، شاید وہ ایک مدت تک پورا نہ ہو سکے، یوں اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز

(ماہنامہ الرشاد، اعظم گڈھ)

حضرت محدث الاعظمیؒ: سوانحی نقوش

ترتیب: **مسعود احمد الاعظمی**

- ۱۳۱۹ھ = ۱۹۰۱ء مئو، یو۔پی میں ولادت ہوئی۔
- والد کا نام مولانا محمد صابر بن عنایت اللہ اور والدہ کا ام کلثوم تھا۔
- والد جید عالم دین اور ولی صفت بزرگ تھے، ان کے زیر سایہ نشوونما اور ابتدائی تعلیم وتربیت پائی۔
- بہادر گنج (ضلع غازی پور)، گورکھپور، بنارس اور دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ بیماری کی وجہ سے دیوبند سے واپس ہوگئے اور دارالعلوم مئو میں حضرت شیخ الہند کے شاگرد مولانا کریم بخش سنبھلی کے پاس صحاح ستہ پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔
- ۱۹۱۸ء میں ملا اور ۱۹۱۹ء میں ملا فاضل کا امتحان دے کر اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے۔
- ۱۳۳۸ھ = ۱۹۲۰ء میں فراغت سے پہلے ہی مظہر العلوم بنارس میں ایک سال تدریسی خدمت انجام دی۔
- ۱۳۴۰ھ = ۱۹۲۲ء میں تعلیم سے فراغت پائی۔

اساتذہ:

مولانا عبدالغفار عراقی مئوی -متوفی ۱۳۴۱ھ-، مولانا کریم بخش سنبھلی -متوفی ۱۳۶۱ھ-، علامہ انور شاہ کشمیری -۱۳۵۲ھ-، مولانا شبیر احمد عثمانی -متوفی ۱۳۶۹ھ-، مولانا اصغر حسین دیوبندی -متوفی ۱۳۶۴ھ-، مفتی عزیز الرحمن عثمانی -متوفی ۱۳۴۷ھ-، مولانا رسول خاں ہزاروی -متوفی ۱۳۹۱ھ-، مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی -متوفی ۱۳۴۵ھ-، مولانا ابوالحسن مئوی -متوفی ۱۳۶۱ھ-، مولانا محمد صابر مئوی -۱۳۶۷ھ-، حافظ عبداللہ عرف دُولہ، مولانا عبدالرحمن مئوی، مولانا عبدالحق پیلی بھیتی، مولانا عبدالعزیز مئوی۔

درس وتدریس اور دیگر سرگرمیاں:

- ۱۳۴۰ھ تا ۱۳۴۴ھ دارالعلوم مئو میں۔
- ۱۳۴۴ھ تا ۱۳۴۷ھ مظہر العلوم بنارس میں۔
- ۱۳۴۷ھ = ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں مدرسہ مفتاح العلوم کی نشاۃ ثانیہ کی اور اس کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔
- ۱۳۶۴ھ = ۱۹۴۵ء میں دارالعلوم دیوبند کی صدارت افتاء کے لیے پیشکش کی گئی۔
- ۱۳۶۵ھ میں والد کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔
- ۱۳۷۱ھ = ۱۹۵۲ء کے پہلے جنرل الیکشن میں یو۔پی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔
- ۱۳۷۱ھ = ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے۔
- ۱۹۵۳ء میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔
- ۱۹۵۴ء میں مجلس انتظامی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن منتخب ہوئے۔
- ۱۳۷۷ھ = ۱۹۵۷ء میں اسمبلی کی رکنیت کا اختتام ہوا۔
- ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۷ء میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی تشکیل نصاب کمیٹی کے رکن ہوئے۔
- ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۸ء میں دارالعلوم دیوبند سے صدارت تدریس کے لیے پیشکش ہوئی۔
- ۱۳۸۸ھ = ۱۹۶۸ء میں حکومت کویت کی طرف سے وہاں رہ کر الموسوعۃ الفقہیۃ کا کام کرنے کے لیے پیشکش ہوئی۔
- ۱۹۷۱ء میں دائرۃ المعارف العثمانیہ کی لٹریری کمیٹی کے ایڈوائزر منتخب ہوئے۔
- ۱۹۷۴ء میں جامع ازہر مصر سے دعوت دی گئی۔
- ۱۹۷۵ء میں اور اس کے بعد ایسے نامناسب حالات پیدا ہوئے کہ مدرسہ مفتاح العلوم مئو سے علاحدگی اختیار کر لی۔
- ۱۳۹۹ھ = ۱۹۷۹ء میں المعہد العالی ومرقاۃ العلوم کی داغ بیل ڈالی۔
- ۱۹۸۴ء میں علمی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ایوارڈ تفویض کیا گیا۔
- ۱۴۰۷ھ = ۱۹۸۶ء میں پہلے امیر الہند منتخب ہوئے۔
- ۱۴۰۹ھ = ۱۹۸۹ء میں المجمع العلمی العراقی کے رکن منتخب ہوئے۔
- ۱۹۹۰ء وزارت فروغ انسانی وسائل کی طرف سے قدیم زبانوں کے اداروں کی دی جانے والی امداد کی تحقیقاتی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔

مشہور تلامذہ:

حضرت مولانا عبدالجبار مئویؒ شیخ الحدیث مظہر العلوم بنارس ومرقاۃ العلوم مئو، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ایڈیٹر الفرقان لکھنؤ، حضرت الاستاذ مولانا محمد حسین بہاریؒ استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ مفتی ومرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، مولانا محفوظ الرحمن نامی بانی

مدرسہ نورالعلوم بہرائچ، مولانا ضیاء الحسن اعظمیؒ شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا عبدالستار معروفی شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا سعید الرحمن اعظمیؒ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا عبدالرشید صدر مفتاح العلوم مئو، مولانا قاری ریاست علی بحرآبادی مئوی، مولانا محمد یحییٰ اعظمی وغیرہ۔

اسفار:

- ۱۳۶۹ھ = ۱۹۵۰ء میں پہلا سفر حج۔
- ۱۳۷۱ھ = ۱۹۵۲ء میں دوسرا سفر حج۔
- ۱۳۸۰ھ = ۱۹۶۱ء میں تیسرا سفر حج۔
- ۱۳۸۴ھ = ۱۹۶۵ء میں چوتھا سفر حج۔
- ۱۳۹۰ھ = ۱۹۷۰ء میں مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے سلسلے میں بیروت کا سفر اور وہاں طویل قیام۔
- ۱۳۹۰ھ = ۱۹۷۰ء میں رمضان المبارک میں بیروت سے عمرہ کا سفر۔
- ۱۳۹۰ھ = ۱۹۷۱ء میں بیروت ہی سے پانچواں سفر حج۔
- ۱۹۷۱ء میں ۶ر مہینے کے طویل قیام کے بعد بیروت سے وطن واپسی۔
- ۱۳۹۱ھ = ۱۹۷۱ء میں بیروت کا دوسرا سفر۔
- ۱۳۹۳ھ = ۱۹۷۳ء میں چھٹا سفر حج۔
- ۱۳۹۸ھ = ۱۹۷۸ء میں شام کا سفر۔
- ۱۳۹۸ھ = ۱۹۷۸ء میں شام سے واپسی میں ساتواں حج۔
- ۱۳۹۹ھ = ۱۹۷۹ء میں آٹھواں اور آخری حج۔
- ۱۹۸۵ء میں سنت وسیرت کانفرنس میں شرکت کے لیے مصر کا سفر۔
- ۱۴۰۷ھ = ۱۹۸۷ء میں حجاز کا آخری سفر اور عمرہ۔
- ۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ = ۱۶ر مارچ ۱۹۹۲ء کو عین افطار کے وقت علم وعمل کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ تدفین ۱۱ر رمضان کو بعد نماز ظہر۔

تصانیف وتالیفات:

۱:- ابطال عزاداری (مطبوعہ)، ۲:- احکام النذر لاولیاء اللہ (مطبوعہ)، ۳:- ارشاد الثقلین (مطبوعہ)، ۴:- الازہار المربوعہ (مطبوعہ)، ۵:- الاعلام المرفوعہ (مطبوعہ)، ۶:- اعیان الحجاج (مطبوعہ) ۷:- انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت (مطبوعہ)، ۸:- اہل دل کی دل آویز باتیں (مطبوعہ)، ۹:- بناء عائشہ صدیقہؓ (مطبوعہ)، ۱۰:- تبصرہ بر شہید کربلا ویزید (مطبوعہ)، ۱۱:- تحقیق اہل حدیث (مطبوعہ)، ۱۲:- تذکرۂ علما، ۱۳:- ترجمہ کتاب الترغیب والترہیب، ۱۴:- ترجمہ موطا امام مالک، ۱۵:- تعدیل رجال بخاری (مطبوعہ)، ۱۶:- تعزیہ داری ودیگر مراسم عزا داری سنی نقطۂ نظر سے (مطبوعہ)، ۱۷:- التنقید السدید علی التفسیر الجدید (مطبوعہ)، ۱۸:- تنبیہ الکاذبین بجواب تنبیہ الناصبین، ۱۹:- انجح القویہ علی حرمۃ سجدۃ التحیہ، ۲۰:- دارالاسلام اور دارالحرب (مطبوعہ)، ۲۱:- دست کا راہل شرف (مطبوعہ)، ۲۲:- دفع المجادلہ (مطبوعہ)، ۲۳:- دنیا میں پارچہ بافی کے مرکز (مطبوعہ)، ۲۴:- دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب (مطبوعہ)، ۲۵:- رکعات تراویح (مطبوعہ)، ۲۶:- رکعات تراویح مزیّل بردانوار مصابیح (مطبوعہ)، ۲۷:- الروض المجود فی تقدیم الرکبتین عند السجود (مطبوعہ)، ۲۸:- رہبر حجاج (مطبوعہ)، ۲۹:- السیر الحثیث الی تنقید تاریخ اہل الحدیث، ۳۰:- سیرۃ طحاوی، ۳۱:- شارع حقیقی (مطبوعہ)، ۳۲:- عظمت صحابہ (مطبوعہ)، ۳۳:- قاضی نامہ بجواب جولاہہ نامہ، ۳۴:- کشف المعضلات (مطبوعہ)، ۳۵:- لغات حدیث، ۳۶:- مسئلۂ تقلید، ۳۷:- مفتاح النحو، ۳۸:- مقدمۂ معارف الحدیث (مطبوعہ)، ۳۹:- مولوی ثناء اللہ اور بحث تقلید (مطبوعہ)، ۴۰:- نصرۃ الحدیث (مطبوعہ)۔

نوٹ:

اس فہرست میں صرف وہ تصانیف درج کی گئی ہیں، جو کتابوں اور رسائل کی شکل میں ہیں، ان کے علاوہ ۱۰۰ سے زائد مقالات ومضامین ہیں، جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے تھے، اور اب وہ ''مقالات ابو المآثر'' میں ۳ جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں۔

تحقیقات وتعلیقات:

مصنف عبدالرزاق (۱۱/جلد)، مصنف ابن ابی شیبہ (تقریباً ۱۲/جلد)، مسند حمیدی (۲/جلد)، کتاب الزہد والرقائق (۱/جلد)، کشف الاستار للبزار (۲/جلد)، الحاوی لرجال الطحاوی (۱/جلد)، مختصر الترغیب والترہیب (۱/جلد)، سنن سعید بن منصور (۲/جلد)، مسند اسحٰق ابن راہویہ (۲/جلد)، المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیۃ (۴/جلد)، تلخیص خواتم جامع الاصول فی بیان الاسما والکنی والابناء والالقاب والانساب الواردۃ فی الکتب الستۃ (۱/جلد)، فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث (۱/جلد)، اسماء الثقات (۱/جلد)، مجمع بحار الانوار (۵/جلد)۔

استدراکات وتعقیبات:

حضرت محدث الاعظمیؒ کے خامۂ گہر بار نے بے شمار مصنفین ومحققین کے تسامحات اور ان کی فروگذاشتوں پر گرفت کی ہے، جن کو اگر مرتب کر کے شائع کیا جائے، تو خاصی ضخیم اور بیش بہا کتاب تیار ہو جائے گی۔ احمد محمد شاکر کی شرح مسند احمد تو خود کتاب کے سات چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ تحفۃ الاحوذی، سنن کبریٰ للبیہقی اور تہذیب التہذیب وغیرہ پر آپ کے استدراکات مجلہ ''المآثر'' (سہ ماہی) میں شائع ہو چکے ہیں۔ □□

حضرت محدث اعظمیؒ اور علم حدیث

حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی★

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمیؒ آسمان علم ومعرفت کے ایک نیر تاباں اورمہر درخشاں تھے،انھوں نے ہندستان کی ایک دورافتادہ اورغیر معروف بستی میں رہ کر جوعلمی مقام حاصل کیا اورعلم وفن کی جو عظیم الشان اور بیش بہاخدمات انجام دیں اوران کو اپنے علمی کارناموں کی بدولت نہ صرف ہندوستان کے طول وعرض میں، بلکہ ہندوستان سے باہر عالم عرب اور پوری علمی دنیامیں جوشہرت حاصل ہوئی ، وہ انتہائی حیرت انگیزاور باعث تعجب ہے۔ مولانا مرحوم نے جس زمانے میں تعلیم وتربیت اورنشو ونما پائی، اور پھر درس وتدریس اورتصنیف وتالیف کا کام کیا، اس وقت مئو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جہاں نہ درس وتدریس اورتعلیم وتربیت کا کوئی مرکزی ادارہ تھا، نہ کوئی بڑا کتب خانہ، اورنہ آمد ورفت اورحمل ونقل کے مناسب ذرائع تھے۔ ان تمام وسائل کے فقدان یا قلت کے باوجود مولانا اعظمی کا علم ومعرفت اور فضل وکمال کے آسمان تک پہنچنا، ان کی غیر معمولی عظمت اورعبقریت کی دلیل ہے، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس دور میں وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اورآیۃ من آیات اللہ تھے۔

حضرت مولاناؒ کی تقریباً پوری زندگی عسرت وتنگ دستی میں گذری، درس وتدریس کا کام پوری عمرانجام دیا،مگراس کا مقصد صرف دین کی خدمت،علم کی اشاعت اورطلبہ کی تعلیم وتربیت تھا، تدریسی مصروفیت آپ نے معاشی ضرورت کے لیے نہیں اختیار کی، یہی وجہ ہے کہ تدریسی خدمت آپ نے زیادہ تر بغیر مشاہرہ وتنخواہ کے حسبۃً للہ اورخالصۃً لوجہ اللہ انجام دی۔عسرت وتنگ دستی کے باوجود آپ کے استغنا، دنیا سے بے رغبتی اور علمی کاموں میں خلوص وللّٰہیت کا یہ حال تھا، کہ آپ نے جو کتابیں تصنیف کیں، یا جن کتابوں کو اپنی تحقیق وتعلیق سے آراستہ کر کے شائع کیا، ان میں ایک دو کو چھوڑ کر کسی کتاب کی کوئی رائلٹی یا مالی معاوضہ نہیں لیا، اوران کو صرف علم دین کی اشاعت اورخدا کی رضا کے واسطے طبع کرا کر شائع کیا۔حق تعالی نے مولانا کے سینے اورقلب کو قناعت واستغنا اورورع وتقوی کی نعمت سے ایسا بھر دیا تھا کہ اس کے اندر مال وزر کی حرص، دولت وثروت کی آرزو اورحب دنیا یا حب جاہ ومنصب کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

دنیا کی ضرورتیں سب کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں کسی کو اس سے مفر نہیں ہے، اور دنیا کے اندر رہتے ہوئے کسی کے لیے ممکن نہیں کہ اس کے علائق سے بے نیاز رہ سکے، معاشی طور پر مطمئن ہونے کے بعد ہی یکسوئی کے ساتھ علمی کام کرنا ممکن ہوتا ہے، اس کے بغیر دل ودماغ اضطراب وانتشار کا شکار رہتا ہے۔مولانا مرحوم کے پاس کوئی مضبوط ذریعۂ معاش نہیں تھا، اوراللہ نے علم ودانش کی جس دولت سے ان کو نوازا تھا، اس کو حصول دنیا کا ذریعہ بنانا ان کو کسی طرح گوارا نہیں تھا۔اس کے علاوہ پورب کے اہل ثروت کا مزاج بھی پچھّم کے اہل ثروت کی طرح نہیں ہے، پچھّم کے اہل ثروت کا مزاج یہ ہے کہ اگرکوئی شخص علمی کاموں منہمک ہے، اوراسی کو شب وروز کا مشغلہ بنا رکھا ہے، اورکسب معاش سے بے فکر ہوکر وہ علم کی خدمت میں مشغول ہے، تواس کو دنیا کی فکر سے مستغنی کر دیا جاتا ہے، لیکن پورب کے لوگوں کا یہ مزاج نہیں ہے کہ وہ اپنے علما وفضلا کو کسب معاش کی فکر سے آزاد کردیں، اوران کے ساتھ ایسے حسن سلوک کا مظاہرہ کریں کہ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ علم وفن کی خدمت میں مشغول رہ سکے۔میری ان معروضات کے بعد حضرت مولانا کے علم وفضل اوران کی علمی وتحقیقی خدمات کو دیکھا جائے تو ان کی عظمت اورقدر وقیمت جو ویسے بھی بہت بڑھی ہوئی ہے، مگراس کے بعد اس میں اوراضافہ ہوجاتا ہے۔

میرے اس مضمون کا اصل مقصد توفن حدیث میں حضرت مولانا اعظمی کی امامت وعبقریت کا ذکر کرنا ہے، لیکن چونکہ مولانا کو قریب سے دیکھنے والے اب بہت کم لوگ رہ گئے ہیں، اورجن لوگوں نے ان کو دیکھا ہے ان میں سے زیادہ تر لوگ یا تو دنیا سے جاچکے ہیں یا رخصت پذیر ہیں، اورالحمدللہ راقم کو انھیں بہت قریب سے دیکھنے، ان کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان سے استفادہ کی سعادت حاصل رہی ہے، اورراقم اوراس کے بڑے بھائی حضرت مولانا امانت اللہ صاحب مرحوم پر حضرت مولانا کی خصوصی توجہ اورعنایت رہی ہے؛ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مولانا کی ہمہ جہت شخصیت سے متعلق اختصار کے ساتھ کچھ باتیں عرض کردوں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت مولانا اعظمی قدس سرہ کو ہرعلم وفن میں رسوخ اورکمال حاصل تھا، خواہ وہ زبان وادب ہو، علوم عربیت ہوں، یا علوم شریعت اوران کی مختلف فروع اور شاخیں۔ ان علوم وفنون میں مولانا کی حذاقت ومہارت کو دیکھ کر عقل حیران ہے کہ انھوں نے علم کی اتنی اقسام میں کس طرح یہ مقام حاصل کیا، کہ جس فن پر وہ قلم اٹھاتے ہیں یا بحث وگفتگو کرتے ہیں، اس میں بلندی کی انتہا پر نظر آتے ہیں۔ حدیث کے علاوہ فقہ وتفسیر، تاریخ وتذکرہ، شعر وشاعری، بلاغت وبیان اور علم عروض وغیرہ پر ان کی تحریروں کو

★ استاذ حدیث وصدر شعبۂ تخصص فی الحدیث دارالعلوم، دیوبند

پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اندر ان کو انتہائی کمال وتفوُّق حاصل تھا۔ عربی وار دو دونوں زبانوں میں اللہ نے ان کو تحریر وتقریر کی عجیب وغریب اور حیرت انگیز قدرت وصلاحیت عطا فرمائی تھی، ان کی کتابوں کو پڑھیے تو علمی گہرائی وگیرائی کے ساتھ زبان وادب کی لذت وحلاوت سے لبریز ہوتی ہیں۔ ایجاز واختصار کے ساتھ سہل اور دل نشیں انداز اور عام فہم اسلوب میں اپنے افکار وخیالات، تحقیقات اور نتائج فکر کو سپرد قلم کرنا مولانا کا امتیازی وصف تھا۔ ان کو زبان وقلم پر ایسی قدرت اور دسترس تھی کہ جب کسی مسئلے کو اختصار کے ساتھ لکھتے تو کوزہ میں دریا بند کر دیتے، اور ضرورت پڑنے پر اسی مسئلے کو پھیلا کر اور شرح وبسط کے ساتھ لکھتے ہیں، تو آپ کا اشہب قلم کہیں رکتا نہیں ہے۔ تراویح اور طلاق وغیرہ کے مسئلے پر ان کی تحریریں پڑھیے تو کوئی انتہائی جامع اور مختصر ومحقَّق، مگر جب ان پر فریق مخالف کا نقد واعتراض سامنے آتا ہے، تو ان کے قلم کی جولانی قابل دید ہو جاتی ہے؛ اس لیے یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کی کتابیں اور تحریریں علمی مباحث اور گہرائی وگیرائی کے ساتھ ادب وانشا، سلاست وروانی، زبان کی حلاوت وشیرینی اور شستگی وشگفتگی کا بھی بہترین نمونہ ہیں۔

مولانا کو اپنے قلم پر بڑا قابو تھا، وہ جو لکھتے تھے ضرورت کے وقت اور اس کے بقدر لکھتے تھے، ضرورت پوری ہو جانے کے بعد ایک لفظ کیا ایک حرف زائد نہیں لکھتے تھے۔ جہاں اشارے سے کام چل جاتا وہاں بس اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے، جہاں اختصار کے ساتھ کسی بحث کو بیان کرنے کی ضرورت ہوتی، تو اس سے آگے نہ بڑھتے، اور جب پھیلا کر لکھنے کا موقع ہوتا تو شرح وبسط کے ساتھ لکھ کر مسئلے کو منقح اور بے غبار کر دیتے۔ مثلاً ایک مجلس کی تین طلاق کے مسئلے پر مولانا کی متعدد تحریریں موجود ہیں، ان میں سے کچھ آپ کے مجموعۂ مقالات کی جلد اول میں شامل ہیں، اس میں مختصر تحریر کو دیکھیے تو صرف مغز ہی مغز ہے، اور جب اس مسئلے کو قدرے وضاحت سے سپرد قلم کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو ''الأعلام المرفوعة'' کے نام سے ایک متوسط رسالہ منصۂ شہود پر آیا، جس میں ائمۂ اربعہ کے مسلک کو کسی قدر واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے، اور جب ''اعلام'' کا جواب ایک اہل حدیث عالم مولانا عبداللہ شائق کا لکھا ہوا شائع ہوا، تو آپ نے ''الأزهار المربوعة في رد الآثار المتبوعة'' لکھ کر اس میں فریق مخالف کے اعتراضات کا قلع قمع کر کے اور ان کے دلائل کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔ ''ازہار مربوعہ'' مولانا کی ایسی تصنیف ہے، جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ علوم ومعارف کا ابلتا ہوا چشمہ اور آپ کے علم وفضل، وسعت مطالعہ اور زور قلم کا شاہکار ہے، اور ہندوستان کے موجودہ سیاسی وسماجی حالات میں اس کتاب کی اہمیت اور قدر وقیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح تراویح کے مسئلے پر کئی ایک مختصر تحریریں آپ کے مقالات میں شامل ہیں، اس کے بعد ضرورت کے وقت ''رکعات تراویح'' تصنیف فرمائی، جو ایک متوسط حجم کی کتاب ہے، اور جب فریق مخالف کی طرف سے اس کا جواب سامنے آیا تو ''رکعات تراویح مدلل برد انوار مصابیح'' تصنیف کی گئی، جو اگرچہ مئو کے ایک دوسرے عالم کے نام سے شائع ہوئی تھی؛ لیکن یہ کتاب پوری کی پوری مولانا ہی کی تصنیف کردہ ہے۔

اس ضمن میں ایک اور مثال دے دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جب مولانا کی تحقیق سے ''مصنف عبدالرزاق'' گیارہ جلدوں میں چھپ کر مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے شائع ہوئی تو کئی سال کے بعد ایک رسالے میں مشہور عالم ومحقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا یہ اعتراض شائع ہوا کہ مصنف کی تقریباً ڈیڑھ جلدیں یعنی دسویں جلد کا کچھ حصہ اور پوری گیارہویں جلد مصنف عبد الرزاق کا حصہ نہیں ہے، بلکہ یہ ''جامع معمر'' ہے، لیکن کتاب کے محقق کو اس پر تنبہ نہیں ہو سکا اور انھوں نے مصنف عبدالرزاق کا حصہ سمجھ کر اس میں شامل کر کے اس کے ساتھ ہی شائع کر دیا۔ یہ اعتراض کوئی معمولی اعتراض نہیں تھا، مولانا کے پورے کام کو مشکوک بنا دینے والا تھا، ڈاکٹر حمید اللہ کا مضمون شائع ہونے کے بعد مولانا نے ایک مختصر سا مضمون چند دلائل سے مبرہن کر کے شائع کیا؛ لیکن اس کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کو اپنے موقف پر اصرار رہا اور انھوں نے اس کے ثبوت میں ایک دوسرا مضمون شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس دوسری تحریر کے بعد مولانا نے عربی میں ایک مفصل مضمون لکھا جو ''البعث الاسلامی''، لکھنؤ کے رجب ۱۴۰۵ھ = مارچ واپریل ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوا، اس مضمون میں مولانا نے اپنے دعوی کے ثبوت میں دلائل وشواہد کا انبار لگا دیا۔ مولانا کی اس مفصل تحریر کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا کوئی اور جواب سامنے نہیں آیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی اب مولانا کے موقف سے اتفاق ہو گیا تھا۔

واقعۂ کربلا اور یزید کی شخصیت سے متعلق اہل علم اور اصحاب تصنیف وتالیف کے مابین نقطۂ نظر کا جو اختلاف ہے، اس میں عموماً بہت افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے، اس موضوع پر جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں ان میں افراط وتفریط کے ساتھ اتنا الجھاؤ اور ژولیدگی ہے جس سے اسلامی تاریخ کے اس اہم واقعے کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا اور کسی نتیجے تک پہنچنا سخت مشکل ہوتا ہے؛ مگر مولانا نے اس موضوع پر ''تبصرہ بر کربلا و یزید'' لکھ کر اس کو ایسا منقح اور واضح کر دیا ہے، جس سے اس واقعے کے تمام پہلو اور اس کی نوعیت صاف اور بے غبار ہو جاتی ہے؛ خصوصاً اس کے آخر میں انھوں نے جو ''خلاصۂ مباحث'' سپرد قلم فرما دیا ہے، وہ انتہائی جامع، معتدل، متوازن بلکہ درحقیقت اس بحث میں قول فیصل ہے، اور نہ صرف عقائد واحکام ومسائل

بلکہ فکر ونظر میں بھی غلو اور افراط وتفریط کی راہ سے بچ کر اعتدال وتوازن کی راہ اختیار کرنا، یہ اہل سنت والجماعت کی خاص پہچان اور ان کی اہم ترین شناخت ہے اور یہ حضرت مولانا مرحوم کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف تھا۔

مولانا کے تبحر علمی، وسعت مطالعہ، فکر ونظر کی گہرائی، نگاہ کی جامعیت اور باریک بینی ودقیقہ رسی ہی کا اثر تھا کہ بڑے بڑے اہل علم اور اصحاب تصنیف وتالیف حضرات اپنی تصانیف وتالیفات پر آپ سے نظر ثانی کرانے کے خواہش مند رہا کرتے تھے، اور جو کتاب آپ کی نگاہ سے گزر جاتی تھی وہ مستند سمجھ لی جاتی تھی۔ ہندوستان کے اہل علم میں حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسے عظیم المرتبت علماء جو عمر میں مولانا سے بیسوں سال بڑے تھے، اپنی تصانیف آپ کے پاس نظر ثانی کے لیے بھیجتے اور جب مولانا ان کو دیکھ کر اپنی رائے ظاہر کر دیتے تو ان کو اطمینان ہو جاتا۔ اسی طرح آپ کے معاصر علماء ہند میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور شیخ عبدالفتاح ابو غدہ شامی جیسے حضرات کو اپنی تحقیقات پر اسی وقت اطمینان حاصل ہوتا جب وہ مولانا کی نگاہ سے گزر جاتیں، اور وہ اس کی توثیق کر دیتے۔

فکر ونظر کی جامعیت مولانا کی تحریر اور طرز نگارش ہی کا صرف وصف اور خاصہ نہیں تھی، بلکہ یہ چیز مجموعی طور پر ان کی ذات اور شخصیت پر نمایاں تھی۔ وہ فطرتاً نہایت کم گو، خاموش طبع، گفتگو اور بات چیت میں محتاط اور یکسوئی پسند تھے۔ نہ صرف قرب وجوار بلکہ دور دراز سے لوگ ان کے پاس اپنے علمی اشکالات اور مسائل لے کر آتے، آپ مشکل سے مشکل سوالات کا ایسا مختصر سا جواب دیتے کہ تمام اشکال اور الجھن دور ہو جاتی، اور مسئلہ بالکل منقح اور صاف وبے غبار اور سائل پوری طرح مطمئن ہو جاتا۔ یہ خصوصیت خطوط کے جوابات اور درس میں بھی پائی جاتی، درس میں عبارت پڑھنے اور ترجمہ کرانے کا کام طالب علموں سے کراتے اور خود چند لفظوں میں زیر درس مسئلے کا ایسا مطلب بتلا دیتے کہ بات طالب علم کے ذہن نشیں ہو جاتی، وہ درس میں لمبی تقریر کے سخت خلاف تھے، اور اس کو طلبہ کی استعداد وصلاحیت کے لیے قطعاً مفید نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اصل اور اہم کام یہ تھا کہ طلبہ کے اندر عبارت فہمی کا ملکہ، کتاب سمجھنے کا سلیقہ، اس سے مطلب اخذ کرنے کا شعور اور مطالعہ کرنے کی عادت پیدا کر دی جائے۔

حضرت مولانا کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کی حامل تھی، اگر ایک طرف وہ علمی وعملی لحاظ سے انتہائی بلند مقام پر تھے، تو اسی کے ساتھ وہ انتہائی معاملہ فہم، دور اندیش، صاحب بصیرت وفراست اور صائب الرائے تھے؛ چونکہ کم گو تھے، اس لیے کسی معاملے میں اپنی رائے اور اپنے خیال کا اظہار فوراً یا عجلت کے ساتھ نہیں کرتے تھے؛ بلکہ غور وفکر کے بعد بولتے تھے، لیکن جو بات بولتے یا رائے دیتے وہ بہت نپی تلی اور متوازن ہوتی۔ اسی خصوصیت کی بنا پر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ اور جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کی نشستوں میں۔ جس کے وہ عرصۂ دراز تک رکن رکین رہے۔ آپ کی رائے اور مشورے کا بڑا وزن ہوتا اور اس کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا، اور اکثر آپ کی رائے کے مطابق ہی فیصلہ کیا جاتا۔

مولانا کی زندگی آں حضرت ﷺ کی سنت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، شاید احادیث نبویہ کے ساتھ شب وروز کے اشتغال کا یہ اثر تھا کہ سنت نبویہ ان کا مزاج بلکہ کہنا چاہئے کہ ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ احادیث میں آں حضرت ﷺ کے جو اوصاف ملتے ہیں، مولانا کی زندگی میں بھی ان کی پوری پوری جھلک نظر آتی تھی، وہ زیادہ تر خاموش رہتے اور بہت کم بولتے، اکثر کسی گہری فکر اور سوچ میں غوطہ زن رہتے، خوش ہوتے تو آپ کے لبوں پر صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل جاتی، زور سے ہنستے ہوئے بہت کم کسی نے ان کو دیکھا ہوگا، اور جب کوئی بات یا کام خلاف شریعت دیکھتے تو آپ کی دینی غیرت وحمیت کے لیے ان کو گوارا کرنا مشکل ہو جاتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام حد درجہ تھا۔ علم کا پہاڑ ہوتے ہوئے بھی اس کا پندار بالکل نہیں تھا، نام ونمود سے کوسوں دور تھے، مزاج میں ایسا تواضع وانکسار اور ایسی سادگی وبے لوثی جس کا اس دور میں تصور میں بھی محال ہے۔ لباس وپوشاک، رہن سہن، رفتار وگفتار، نشست وبرخاست ہر چیز میں سادگی نمایاں تھی۔ ایک خس پوش مکان کے گوشے میں معمولی سی چٹائی پر بیٹھے ہوئے اس درویش صفت انسان کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہ شخصیت ہے جس کے علم ومعرفت اور فضل وکمال کا سکہ پوری علمی دنیا میں چلتا ہے، اور جس سے تمام عالم اسلام کے علماء نہ صرف متاثر بلکہ مرعوب رہتے ہیں۔

حق تعالیٰ کو حضرت مولانا سے احیاء حدیث وسنت اور علم دین کی اشاعت کا عظیم کام لینا تھا، اس لیے ان کو بیش بہا فطری استعداد وصلاحیت بھی ودیعت کی تھی۔ چنانچہ ان کی قوت حافظہ، بداہت واستحضار، فہم وبصیرت، دقت نظر، تبحر علمی، وسعت مطالعہ، قوت استدلال، باریک بینی اور فکر ونظر کی رسائی اور ان جیسے گوناگوں اوصاف وکمالات کو دیکھ کر متقدمین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

مولانا کا مزاج خالص علمی اور تحقیقی تھا، یکسوئی کے ساتھ گھر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر مطالعہ وکتب بینی اور تصنیف وتالیف سے محبوب ان کو کوئی مشغلہ نہیں تھا؛ لیکن ضرورت پڑنے پر انھوں نے دین کے نام پر اٹھنے والے فتنوں اور باطل فرقوں کا بھرپور تعاقب کیا اور ان کے سدّ باب کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

یوں تو مولانا کو جملہ علوم وفنون پر حیرت انگیز قدرت ومہارت حاصل تھی، لیکن ان کا اصلی میدان علم حدیث تھا، اور اس مبارک ومقدّس فن کے

ساتھ ان کا شغف والہانہ تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی خدمت اور نشر واشاعت کے لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ اس علم کے ساتھ غایت درجہ لگاؤ اور تعلق کی ابتدا شاید اس سے ہوئی ہو کہ انھوں نے جب ہوش سنبھالا، تو ان کا علاقہ غیر مقلدیت کی زد میں تھا، اور پورے علاقے میں حدیث کے نام پر زور وشور سے غیر مقلدیت کی تبلیغ وتشہیر ہو رہی تھی، کئی ایسے علماء جنھوں نے دہلی میں سید نذیر حسین صاحب وغیرہ سے حدیث کا درس اور عدم تقلید کا نظریہ حاصل کیا تھا، وہ وہاں سے آکر علاقے میں اس کی ترویج واشاعت میں مصروف تھے۔ مولانا نے عنفوان شباب سے ہی اس کا بھر پور مقابلہ کیا، بلکہ ان کے جواب میں کئی رسائل انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں تصنیف کیے۔ اہل حدیث کی حقیقت اور عمل بالحدیث کے ان کے دعوے کو واشگاف کرنے، اور حنفیہ پر حدیث کی مخالفت کے ان کی طرف سے لگائے جانے والے الزام کو رد کرنے اور اس کا مُسکت جواب دینے کے لیے حدیث کے جملہ فنون میں درک اور تبحُّر وتعمُّق ضروری تھا، چنانچہ مولانا نے علم حدیث اور اس سے متعلق تمام فنون کا نہایت گہرائی وگیرائی اور خوب باریک بینی سے مطالعہ کیا، اور اس کے ہر شعبے میں غیر معمولی براعت ومہارت بہم پہنچائی۔ ان کی یہ مہارت آگے چل کر کتب احادیث کی تحقیق واشاعت میں بہت معاون بنی، اور انھوں نے حدیث کی بہت سی امہات الکتب کو دریافت کر کے ان کو تعلیق وتحشیہ کے بعد شائع کیا۔ علم حدیث سے متعلق مولانا کے عہد شباب کے قابل ذکر کارناموں میں ان کی تصنیف کردہ کتاب ''الحاوي في رجال الطحاوي''ہے، جس میں انھوں نے امام طحاوی کی دو مایۂ ناز کتابوں ''شرح معاني الآثار'' اور ''شرح مشكل الآثار'' کے رجال ورواۃ کو جمع کر کے ان کے حالات لکھے ہیں، جو ایک بہت بڑا اور اہم علمی کام ہے، اور انھوں نے اس کام کو اس وقت انجام دیا تھا، جب آپ کی عمر ابھی تیس سال بھی نہیں ہوئی تھی؛ مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب اب تک چھپ نہیں سکی ہے، اور اس کا قلمی نسخہ حضرت مولانا کے علمی ذخیروں میں محفوظ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کے عزیز نواسے ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی اب اس کے مقارنہ ومقابلہ اور تحقیق وترتیب کا کام کر رہے ہیں، خدا کرے کہ یہ کام جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے، اور کتاب چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچ جائے، تاکہ جہاں ایک طرف علمی دنیا اس سے فائدہ اٹھا سکے، وہیں ہندوستانی علماء کے قابل فخر علمی کارناموں کی فہرست میں ایک نیا اضافہ سامنے آسکے۔

علم حدیث کی بہت سی انواع اور سند ومتن کے اعتبار سے اس کی بہت سی قسمیں ہیں، اور کسی ایک قسم میں بھی حذاقت ومہارت یا بصیرت حاصل کرنا نہایت مشکل اور دشوار کام ہے، جس کے لیے سالہا سال کی محنت، عرق ریزی، شب بیداری اور فن کی کتابوں کے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو خداوند قدوس کے خصوصی فضل وکرم کے بغیر کسی کے لیے ممکن نہیں ہے؛ مگر مولانا اعظمی کا امتیاز یہ ہے کہ ان کو اس مبارک فن کی تقریباً تمام انواع پر ایسا عبور اور کمال حاصل تھا، جس کی وجہ سے عصر حاضر کے اندر پوری دنیا میں ان کو علم حدیث کا مرجع اور امام تسلیم کیا گیا۔ اصول حدیث ہو، فن اسماء الرجال ہو، راویان حدیث کی ولادت ووفات اور ان کی زندگی کے احوال وواقعات ہوں، جرح وتعدیل کے لحاظ سے ان کا مرتبہ ومقام ہو، عِلَل کا علم ہو، غریب الحدیث ہو، مختلف روایات کے درمیان تطبیق یا دفع تعارض ہو، حدیث کے مظانّ ہوں، یا اس فن کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں ونسخوں کا علم ہو، ان تمام جہات کے لحاظ سے اِس دور میں مولانا مرحوم کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔

مولانا نے کتب احادیث ورجال پر جو استدراکات وتعقبات تحریر فرمائے ہیں، جن کے بہت سے نمونے ان کی یادگار میں شائع ہونے والے مجلہ ''المآثر'' اور بنارس کے مجلہ ''ترجمان الاسلام'' کی خصوصی اشاعت ''مولانا اعظمی نمبر''میں شائع ہو چکے ہیں، ان کو دیکھ کر مولانا کے فضل وکمال کا اعتراف اور ان کے تبحر علمی اور عبقریت کو تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ خاص طور سے ''مسند امام احمدؒ'' کی تحقیق احمد محمد شاکر کی فروگذاشتوں پر جو تعقبات واستدراکات انھوں نے لکھے اور جن کو شیخ احمد شاکر نہایت کشادہ دلی اور وسیع الظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسند کی سولھویں جلد میں بعینہ شائع کر دیا، ان استدراکات نے ہمارے مخدوم گرامی مولانا اعظمیؒ کی عظمت کا سکہ پورے عالم عرب اہل علم وفضل کے قلوب پر بٹھا دیا، جس کے بعد مولانا کی ذات علم حدیث سے وابستہ افراد اور اس کے خدمت گذاروں کا قبلہ بن گئی، اور عالم عرب کے اکثر علماء حدیث واہل تحقیق اپنی علمی وتحقیقی مشکلات میں ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کی تحقیق کو حرف آخر سمجھ کر قبول کرتے۔ یہ استدراکات اتنے محققانہ، بیش قیمت اور علم وحکمت کے آبدار موتیوں سے مرصَّع ومزیَّن ہیں کہ ان کو پڑھ کر دل عش عش کرنے لگتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود شیخ احمد محمد شاکر جن کے تسامحات پر ان استدراکات میں گرفت ہے، ان کو دیکھ کر دم بخود ہیں، اور فرط مسرت وانبساط سے جگہ جگہ مولانا کی تحقیق کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہتے۔

حضرت مولانا اس دور میں علم حدیث کے امام اور نقد وتحقیق کے عظیم شہ سوار تھے، ان کی تحقیقات ہم نیاز مندوں اور ان کے علم وتحقیق کے خوشہ چینوں کے لیے مایۂ افتخار رہیں۔ اس فن میں ان کے تحقیقی جواہر پاروں کو دیکھ کر پوری علمی دنیا ان کی دقیقہ رسی، باریک بینی اور ژرف نگاہی کی معترف ہے، اس کی صرف ایک مثال میں ناظرین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ امام بخاری اپنی کتاب ''التاريخ الكبير''میں بعض بعض راویوں کے حالات میں ایک اصطلاح فيه نظر استعمال کرتے ہیں، امام بخاری نے اپنی اس

اصطلاح کا مطلب خود کچھ نہیں بتایا ہے، بعد کے مصنفین جرح وتعدیل قیاس واستقرا سے کام لے کر اس کا محمل متعین کرتے ہیں، اور علامہ شمس الدین ذہبی -متوفی ۷۴۸ھ- اور امام زین الدین عراقی -متوفی ۸۰۶ھ- جیسے ائمہ حدیث اور ماہرین فن رجال اس اصطلاح کو راوی کے متہم ہونے پر محمول کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی اپنی کتاب الرفع والتکمیل (ص: ۲۵۴) میں لکھتے ہیں: قال الذهبي في ميزانه في ترجمة (عبد الله بن داود الواسطي): قال البخاري: فيه نظر، ولايقول هذا إلا فيمن يتهمه غالباً (ذہبی نے میزان الاعتدال میں عبداللہ بن داؤد واسطی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ امام بخاری نے ان کی نسبت فیہ نظر فرمایا ہے، اور امام بخاری اس لفظ کو اکثر وبیشتر اسی کے لیے استعمال کرتے ہیں جو متہم ہو)۔ اور اسی جیسی بات حافظ عراقی نے بھی کہی ہے، مولانا عبدالحی صاحب اس کے بعد لکھتے ہیں: وقال العراقي في شرح ألفيته: فلان فيه نظر، وفلان سكتوا عنه، هاتان العبارتان يقولهما البخاري فيمن تركوا حديثه (عراقی نے الفیہ کی شرح میں لکھا ہے کہ امام بخاری فیہ نظر اور سکتوا عنہ اس راوی کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کی حدیثیں محدثین نے چھوڑ دی ہوں)۔

مگر مولانا اعظمی نہایت دقت نظر اور دیدہ وری کے ساتھ راویوں کے حالات کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امام بخاری کی اس اصطلاح کو راوی کے متہم یا متروک ہونے پر علی الاطلاق محمول کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اس میں غور وفکر سے کام لے کر کوئی نتیجہ نکالنے کی ضرورت ہے، اور اپنی اس تحقیق کے ثبوت کے لیے بارہ راویوں کو نام بنام اور اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کے احوال پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے: لاينقضي عجبي حين أقرأ كلام العراقي هذا وكلام الذهبي أن البخاري لايقول: (فيه نظر)، إلا فيمن يتهمه غالباً، ثم أرى أئمة هذا الشأن لايعبأون بهذا، فيوثقون من قال فيه البخاري: (فيه نظر)، أويدخلونه في الصحيح. میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں عراقی اور ذہبی کی یہ بات پڑھتا ہوں کہ بخاری فیہ نظر کا لفظ اکثر وبیشتر اس شخص کے بارے میں استعمال کرتے ہیں، جو ان کے نزدیک متہم ہوتا ہے۔ پھر میں اس فن کے ائمہ کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس جرح کی پروا کیے بغیر ایسے راویوں کی توثیق کرتے ہیں جن کے بارے میں امام بخاری نے فیہ نظر کہا ہے، یا اس کی روایت کو وہ صحیح میں جگہ دیتے ہیں۔

اس کے بعد بطور ثبوت کے بریدہ بن سفیان اسلمی، تمام بن نجیح، ثعلبہ بن یزید حمانی، جعدہ مخزومی، جمیع بن عمیر تیمی، حبیب بن سالم انصاری، حریش بن خریت، راشد بن داود صنعانی، سلیمان بن داود خولانی، صعصعہ بن ناجیہ، طالب بن حبیب مدنی اور عبدالرحمن بن سلیمان رُعَینی کے اسماء اور ان کے احوال کتب رجال سے نقل کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں:

والصواب عندي أن ما قاله العراقي ليس بمطرد ولا صحيح على إطلاقه، بل كثيرا ما يقوله البخاري ولايوافقه عليه الجهابذة، وكثيرا ما يقوله ويريد به إسنادا خاصا، وكثيرا ما يقوله ولا يعني الراوي، بل حديث الراوي، فعليك بالتثبت والتأني۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ عراقی نے جو بات کہی ہے، وہ نہ تو قاعدہ کلیہ ہے اور نہ علی الاطلاق درست ہے، بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بخاری یہ بات کہتے ہیں اور ان سے دوسرے ماہرین فن اتفاق نہیں کرتے، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ امام بخاری فیہ نظر بول کر کوئی خاص سند مراد لیتے ہیں، اور بار ہا یہ ہوتا ہے کہ اس عبارت سے ان کی مراد راوی نہیں ہوتا، بلکہ اس راوی کی حدیث ہوتی ہے، لہذا اس مسئلے میں بہت غور وفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

مولانا نے اپنے اس نتیجۂ فکر اور محققانہ کلام کو قلم بند کر کے مشہور شامی عالم شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کے پاس بھیجا تھا، اور انھوں نے اس کو نہایت اہتمام سے ''قواعد في علوم الحديث'' اور ''الرفع والتكميل'' پر اپنی تعلیقات وحواشی کے ساتھ شامل کر کے شائع کیا، اور پھر بعض دوسرے فضلاء اور محققین نے بھی اس کو اپنی کتابوں میں نقل کر کے اس کی تحسین وآفرین کی۔ لیکن شیخ ابوغدہ کے پاس اس کو ارسال کرنے سے بہت پہلے سے ان کی یہ تحقیق تھی، چنانچہ اس کو انھوں نے مذکورہ بالا کتابوں کے شائع ہونے سے بہت پہلے اپنی کتاب ''رکعات تراویح'' میں بھی تحریر فرمایا تھا، لیکن یہاں کے لوگ اس کو پڑھ کر سرسری طور سے گذر گئے، مگر جب یہی بات عرب دنیا میں پہنچی، تو وہاں کے اہل علم وتحقیق نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

یہ مولانا کی باریک بینی دقت نظری اور ژرف نگاہی کا بس ایک نمونہ ہے، ورنہ کتب احادیث پر ان کے تعلیقات وحواشی اور ان کی دیگر نگارشات مفید اور نادر تحقیقی نکات وفوائد سے معمور ہیں۔ حضرت مولانا کے وہ علمی وتحقیقی کارنامے جنھوں نے ان کی شخصیت کو نابغۂ عصر اور نادرۂ روزگار بنایا، اور جن کی وجہ سے ان کا طائر شہرت پوری علمی دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا ہے، حدیث پاک کے وہ مخطوطات اور قلمی نسخے ہیں، جن کو انھوں نے نہ جانے کہاں کہاں سے حاصل کر کے ان کی تحقیق وتعلیق پر شب وروز محنت صرف کی، اور ان کو ایڈٹ کر کے اشاعت کے قابل بنایا، اور ان کی جد وجہد اور مساعی جمیلہ سے حدیث کی ایسی ایسی نادر ونایاب کتابیں منظر عام پر آ کر اہل علم کے لیے استفادہ کا سبب بنیں، جن کا لوگ صرف نام سنا کرتے تھے، اور جن کے بارے میں دنیا کو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ کہیں موجود بھی ہیں یا نہیں۔ ذہن ودماغ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہے کہ مولانا کو ان کی طرف توجہ آخر کیسے ہوئی، جب کہ ہندوستان کے اہل علم کا یہ ذوق نہیں تھا، اور نہ ہی علماء عرب کی اس کی طرف توجہ ہوئی تھی۔ اس دور میں حدیث کی شرحیں، احادیث کی روشنی میں

فقہی بحثیں اور ان کی تشریح و توضیح، ان ہی موضوعات اور ان پر تصنیف وتالیف کی طرف پوری توجہ تھی؛ لیکن انھوں نے ایک نئے میدان کا انتخاب کر کے پوری علمی دنیا کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی، اور انتہائی بے سروسامانی کے باوجود حدیث شریف کے قلمی نسخوں کو بہم پہنچا کر ان کو طباعت و اشاعت کے قابل بنایا۔ یہ شاید ان کے اخلاص وللّٰہیت، حُبّ حدیث اور عشق رسول کی برکت تھی کہ ظاہری اسباب ووسائل کے بغیر تن تنہا، خستہ و بوسیدہ مکان کے ایک گوشے میں معمولی سی چٹائی اور بوریے پر بیٹھ کر اتنے بڑے پیمانے پر حدیث کی خدمت انجام دی، جس کو تمام وسائل کے ہوتے ہوئے ایک پوری جماعت نہیں انجام دے سکتی۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ خداوند قدوس کی خصوصی مدد اور اس کا خاص فضل وکرم آپ کے شامل حال تھا۔

کسی کتاب کے صدیوں پرانے قلمی نسخے کو ایڈٹ کر کے اشاعت کے قابل بنانا سخت مشکل اور دشوار کام ہے، اس کو دریافت کر کے اس کو پڑھنا، اس کی قدر وقیمت کو متعین کرنا، اس کی اصلیت اور جس مصنف کی طرف وہ نسخہ منسوب ہے اس کی صحت کا پتہ لگانا، اس کا مبیضہ اور نقل تیار کرانا، کئی نسخے ہوں تو ان کا باہم اور پھر دیگر مراجع سے مقابلہ کرنا، اغلاط کی تصحیح وتصویب کرنا، ان پر حواشی اور نوٹ لکھنا، راویوں کے حالات کی تحقیق اور ایک ہی جیسے متعدد نام کے راویوں میں فرق کرنا، یہ سب آسان کام نہیں ہے، اور ان جیسے نہ جانے کتنے مشکل مراحل سے کسی محقق کو گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ مولانا نے حدیث کے مخطوطات پر جس وقت یہ کام کیے تھے، اس وقت تک کتب اطراف وفہارس ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھیں، اور تحقیق کے لیے وہ آسانی نہیں تھی، جو آج ہے۔ آج بہت سی فہرستیں اور اطراف کی کتابیں چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی ہیں، کمپیوٹر ایجاد ہو چکا ہے، جس کی ایک بٹن دبانے سے کسی حدیث کے تمام مراجع نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں، لیکن مولانا نے جس وقت یہ کارنامے انجام دیے اس وقت دنیا ان وسائل اور سہولیات سے نا آشنا تھی، اور جو کچھ انحصار تھا وہ صرف اپنے علم ومعرفت اور جد وجہد وعرق ریزی پر تھا۔ اسی لیے علمی دنیا میں مولانا کے ان کاموں کی جو پذیرائی اور قدر ہوئی وہ دوسروں کے کاموں کی نہیں ہوئی۔ ان سے پہلے عرب دنیا کا بھی یہ تحقیقی ذوق نہیں تھا، مولانا کا کام ہی وہاں کے محققین کے لیے نمونہ اور مشعل راہ بنا، اور لوگوں نے ان کے اختیار کیے ہوئے اور دکھائے ہوئے طریقے کے مطابق مخطوطات کو دریافت کر کے ان کی پر کام کرنا شروع کیا، ان محققین کی کاوشوں کے نتیجے میں اب حدیث کی بہت سی کتابیں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں، لیکن اس میدان میں ہمارے حضرت مولانا کو جو مقام اور ان کے تحقیقی کاموں کہ جو اہمیت اور فضیلت حاصل ہے، اس کو کوئی نہیں پہنچ سکتا، اور ان کے اس بلند مقام اور فضیلت کا اعتراف کرنے پر دنیائے علم وتحقیق مجبور ہے۔

اس وقت حدیث پر کام کرنے والوں کا ایک جم غفیر ہے، اور بے شبہہ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں روزانہ نئی نئی کتابیں تحقیق وتعلیق کے بعد سامنے آ رہی ہیں؛ لیکن مولانا کے کاموں کی جو قدر وقیمت ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہے۔ مولانا کے تعلیقات وحواشی کا ایک جملہ اور ایک لفظ دوسروں کے کئی کئی صفحات پر بھاری ہوتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں جو علم کی پختگی، فن کی باریکی، گہرائی وگیرائی، فراست کا نور اور اخلاص کی لذت وحلاوت ہوتی ہے، وہ ان کی امتیازی وانفرادی شان ہے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ فن حدیث کے بہت سے انواع واقسام ہیں، اور حضرت مولانا ان تمام اقسام میں کسی ماہر فن امام سے کم نہیں تھے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ان کی تحریروں، محققانہ کتابوں، تعلیقات وحواشی اور علمی وتحقیقی استدراکات کو پڑھنے کے بعد دل ودماغ اس کے اعتراف پر خود بخود مجبور ہو جاتا ہے، اور ان کی جلالت قدر ومنزلت کے آگے سر تسلیم خم ہو جاتا ہے۔

''مسند حمیدی'' (۲ جلدیں)، ''سنن سعید بن منصور'' (۲ جلدیں)، ''کتاب الزہد والرقائق'' (ایک جلد)، ''مصنف عبد الرزاق'' (گیارہ جلدیں)، ''المطالب العالیہ'' (۴ جلدیں)، ''کشف الاستار'' (۴ جلدیں)، ''مجمع بحار الانوار'' (۵ جلدیں)، ''تلخیص خواتم جامع الاصول'' (ایک جلد)، ''فتح المغیث'' (ایک جلد مطبوعہ، دو غیر مطبوعہ)، ''مصنف ابن ابی شیبہ'' (مولانا کی تحقیق سے ۴؍جلدیں طبع ہوئی تھیں اور اب شیخ عوامہ کی تحقیق سے پوری چھپ چکی ہے)، ابن شاہین'' کی کتاب الثقات'' (غیر مطبوعہ) وغیرہ حدیث شریف کے وہ دواوین اور مجموعے ہیں، جو کبھی نادر ونایاب تھے؛ مگر مولانا کی تلاش وجستجو اور ان کی مخلصانہ جد وجہد اور کاوشوں کی بدولت گوشۂ گمنامی سے باہر آ کر آج مطبوعہ شکلوں میں اہل علم کے سامنے ہیں، اور ہندوستان کے ایک دور افتادہ مقام کے ایک خس پوش مکان کے ایک بوریہ نشین شخص اور اس دور کے سب سے بڑے درویش صفت عالم کا فیض ہے کہ پوری علمی دنیا آج ان کتابوں سے فائدہ اٹھا رہی ہے، اور پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کا یہ وارث سرکار رسالت مآب ﷺ کی تعلیمات کا سچا نمونہ پیش کرتے ہوئے ایک ٹوٹی پھوٹی اور معمولی سی چٹائی پر بیٹھ کر پوری علمی دنیا کے اہل علم اور ارباب فضل وکمال کے دلوں پر حکومت کرتا رہا۔

مولانا نے تصانیف وتالیفات اور تحقیقات کی شکل میں جو عظیم الشان ذخیرہ چھوڑا ہے، اور اہل علم پر جو احسان کیا ہے، اس کو دنیائے علم وتحقیق فراموش نہیں کر سکتی، اور جب تک یہ کتابیں صفحۂ ہستی پر باقی رہیں گی، ان کا نام زندہ وتابندہ اور روشن رہے گا، اور ان کی روح اقدس کو ان کا اجر وثواب ملتا رہے گا، ان شاء اللہ۔ ☐☐

حضرت والد صاحبؒ اور چند نمایاں خصوصیات

از: جگر گوشۂ محدث کبیرؒ **حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی** دامت برکاتہم

الحمد للّٰہ وکفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، وبعد!

ہم نے جس گھر میں آنکھیں کھولی ہیں اور نشو ونما پائی ہے، اس کا ماحول الحمدللہ خالص علمی اور دینی تھا۔ دادا مرحوم حضرت مولانا محمد صابر صاحب ایک عالم وفاضل اور صاحب نسبت بزرگ تھے، خالص علمی ودینی مزاج رکھتے تھے، دینی امور میں بہت سخت تھے، نہ صرف عبادات بلکہ معاملات میں بھی شرعی احکام سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اپنی دینداری اور تقوی وپرہیزگاری کے ساتھ صاف ستھرا علمی وادبی ذوق بھی رکھتے تھے، چنانچہ ہمارے ہوش کی بات ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کے مشہور اور صاحب طرز شاعر علامہ انور صابری مئو آئے، تو دادا مرحوم نے ان کے اعزاز میں ایک شعری نشست رکھی، جو ہمارے مکان سے تھوڑے فاصلے پر جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے صحن میں منعقد ہوئی، اور دیر رات تک لوگ صابری صاحب کے کلام سے محظوظ ہوتے رہے۔ دادا مرحوم نے حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کی جو تعلیم وتربیت کی تھی، اس میں دینداری وپرہیزگاری، تقویٰ وطہارت، قناعت واستغنا، علم دوستی اور ادب نوازی جیسے تمام عناصر کی آمیزش تھی۔

والد صاحب کی تقریباً تمام عمر عسرت اور تنگ دستی میں گذری، جس کی وجہ سے اکثر وبیشتر سخت آزمائشوں سے دوچار رہے، جب کہ ان کی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آئے کہ بس ایک قدم بڑھانے؛ بلکہ ایک ”ہاں“ کردینے سے آپ کی حالت کچھ سے کچھ ہوجاتی، لیکن کبھی آپ نے علم کی دوکان کے ذریعے قناعت واستغنا کا سودا کرنا گوارا نہیں کیا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ ذکر کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ندوۃ المصنّفین کی طرف سے ’ترجمان السنۃ‘ کی تصنیف وتالیف کا کام کررہے تھے؛ مگر اس کام کی رفتار اتنی سست تھی کہ ارباب ندوۃ المصنّفین کو اس کی تکمیل کے سلسلے میں برابر فکر لاحق تھی، اس صورتحال کے پیش نظر ندوۃ المصنّفین کے اس وقت کے ناظم حضرت مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم نے حضرت والد صاحب سے درخواست کی کہ آپ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں، اور اس کے لیے انھوں نے اس زمانے کے لحاظ سے ایک معقول حق الخدمت کی پیشکش کی، لیکن والد صاحب اپنے مشاغل اور خاص مزاج کی وجہ سے اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اسی اثنا میں والد مرحوم کے رفیق اور دوست حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ کسی کام کے لیے دہلی گئے، وہاں مولانا عثمانی صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی، تو مولانا عثمانی کہنے لگے کہ مولانا -یعنی حضرت والد مرحوم- کے پاس کھیت اور زمین جائداد وغیرہ بہت زیادہ ہے کیا؟! مولانا ایوب صاحب یہ سن کر مسکرائے اور دریافت کیا کہ بات کیا ہے؟ تو مولانا عثمانی نے ’ترجمان السنۃ‘ کے سلسلے کی پیشکش اور والد صاحب کی عدم آمادگی اور بے نیازی کا قصہ سنایا۔ اس پر مولانا محمد ایوب صاحبؒ نے فرمایا کہ رہائشی مکان کے علاوہ مولانا کے پاس کھیت اور جائداد کے نام پر ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر مولانا عثمانی ورطۂ حیرت میں پڑ گئے کہ اس کے باوجود اتنی بڑی پیشکش کو رد کردیا!۔ مولانا ایوب صاحب نے فرمایا کہ مولانا کا بس یہی خاص مزاج ہے۔

قناعت واستغنا حضرت والد صاحبؒ کی خاص صفت تھی، اور آپ نے زندگی بھر کسی قیمتی شے کی طرح اس کی حفاظت کی، مشکل سے مشکل حالات سے گذرے، لیکن اس پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ ہم لوگ تین بھائی اور ہماری سات بہنیں تھیں، ایک بھائی کا انتقال تو کم عمری ہی میں ہوگیا تھا، مگر باقی بھائی بہن بعد تک زندہ رہے، اتنے افراد کا خرچ چلانا آسان کام نہیں تھا، کوئی کاروبار اور مستحکم ذریعۂ معاش نہیں تھا، ہماری جو یافت تھی اس سے بہ مشکل نان شبینہ کا انتظام ہوجاتا تھا، اس کے باوجود آپ نے علم کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا، درس وتدریس کا کام آپ نے محض علم کی اشاعت، مردم سازی اور طلبہ کی تعلیم وتربیت کے لئے حسبۃً للّٰہ کیا، اور اکثر وبیشتر یا تو اس کا مشاہرہ نہیں لیا، یا اگر لیا -جیسا کہ تدریسی زندگی کے آغاز میں کیا- تو وہ تنخواہ اتنی قلیل تھی کہ اس سے گھر کا خرچ چلنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ شاذ ونادر ایسا ہوا ہے کہ آپ نے اپنی تصانیف وتالیفات پر رائلٹی یا حقوق لئے ہوں۔

ایک طرف عسرت وتنگ دستی کا یہ سماں تھا، دوسری طرف ملک وبیرون سے بڑے بڑے تعلیمی اداروں کی طرف سے ملازمت کی پیشکش ہوئی، لیکن آپ نے ان کو منظور کرنا تو درکنار نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے تعلیمی اداروں کے علاوہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، وزارت اوقاف کویت، جامعہ ازہر مصر، قطر اور جنوبی افریقہ وغیرہ سے

بڑے بڑے عہدوں اور مناصب کی پیشکش ہوئی، لیکن آپ نے نظرِ التفات بھی نہیں کی، سب سے معذرت کرتے رہے، اور فقیر بے نوا کی طرح ایک بوسیدہ چٹائی اور بوریے پر بیٹھ کر علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کی خدمت انجام دیتے رہے۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے جس پر قارئین کو شاید یقین نہ ہو کہ اکثر ایسا ہوا کہ کسی بڑے ادارے یا جامعہ کی طرف سے پیشکش کا خط آیا، تو آپ نے اس کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی کہ کسی سے اس کا تذکرہ کریں، کسی بہت خاص شخص کو اس کا پتہ چل جاتا تو چل جاتا، ورنہ گھر کے افراد کو شاید ہی کبھی اس کا علم ہوتا۔

علم ودین کی دولت ہی آپ کی نگاہ میں اصلی دولت اور قدر ومنزلت کی چیز تھی، مال وزر کی آپ کے دل میں کوئی حیثیت نہیں تھی، یہ آپ کا مزاج تھا، اور یہی توکل آپ اپنی اولاد کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ علم کی ترغیب دیتے، اس کی فضیلت واہمیت بتلاتے، اور قناعت وتوکل کی تلقین کرتے، اگر یہ کہا جائے کہ آپ کا مزاج قرونِ اولیٰ کے ائمہ ومحدثین کی طرح تھا، تو اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔

آپ اسلاف کی زندہ یادگار تھے، دنیا کی محبت والفت سے نفور، راحت وآسائش سے دور، جاہ ومنصب سے گریزاں اور نام ونمود سے بے پرواہوکر، علم ودین کی خدمت آپ کا محبوب شغلہ تھا۔ مطالعہ وکتب بینی، بحرِ علم کی غواصی، کتابوں کی ورق گردانی، تصنیف وتالیف، تحقیق وتعلیق، نسخہ نویسی، غرض آپ کی دلچسپیوں کا محور بس علم ودانش تھا۔ اس سے جو وقت بچتا اس میں طلبہ کو تعلیم دینا، عالم اسلام کے اطراف وجوانب سے آنے والے اہلِ علم کے خطوط اور ان کے اشکالات کا جواب دینا، آپ کے روزمرہ کے مشاغل ومصروفیات کا حصہ تھا۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود گھریلو مسائل اور خانگی ضروریات سے کنارہ کش اور بے فکر نہیں تھے، وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ گھر کی نگہداشت اور دیکھ ریکھ کرتے اور ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ اللہ جل شانہ نے ان کے وقت میں بڑی برکت دی تھی، اور وہ غیر معمولی علمی ودینی وتحقیقی مشاغل کے باوجود سب کے حقوق کا خیال رکھتے تھے۔ بچوں کی پرورش وپرداخت، ان کی رعایت ونگہداشت، تعلیم وتربیت، دوا علاج، شادی بیاہ، اور اس کے علاوہ دیگر ضروریاتِ زندگی سے انھوں نے کبھی بے اعتنائی اور چشم پوشی نہیں کی۔

عموماً تصنیف وتالیف اور تحقیق کی دنیا کا آدمی گردوپیش کے مسائل، دنیا کے واقعات اور زندگی کے جھمیلوں سے دور رہنا پسند کرتا ہے۔ لیکن والد صاحب علیہ الرحمہ خالص علمی مزاج کے باوجود ان سے دور یا الگ تھلگ نہیں تھے۔ وہ سماج کے مسائل، شہر اور اس کے اطراف ومضافات بلکہ دور دراز کے متعلقین کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ تلامذہ اور شاگردوں کی مصروفیات پر نظر رکھتے تھے۔ درس وتدریس کا شوق رکھنے والوں کے لئے بوقتِ ضرورت جگہ کا انتخاب کرتے اور ضرورت پڑنے پر ان کی سفارش بھی کرتے۔ دنیا خصوصاً عالم اسلام کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات پر آپ گہری نظر، اور اس میں پیش آنے والے واقعات سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔

ہم نے ان کو جب سے دیکھا ہے، اخبار بینی کا پابند پایا ہے، کئی کئی اخبار روزانہ دیکھتے تھے، صبح وشام ریڈیو سے خبریں بھی سنتے تھے۔ غیر منقسم ہندوستان کے تمام مشہور اخبارات آپ کے پاس آتے تھے۔ روزنامہ زمیندار (لاہور)، مدینہ (بجنور)، الجمعیۃ (دہلی) جمہوریت (بمبئی)، روزنامہ سیاست (کانپور)، قومی آواز (لکھنؤ)، قومی مورچہ (بنارس)، آواز ملک (بنارس) جیسے سیاسی اخبارات کے علاوہ العدل (گوجرانوالہ)، الفقیہ (امرتسر)، ضیاء الاسلام (امرتسر)، اہل حدیث (امرتسر)، النجم (لکھنؤ)، معارف (اعظم گڈھ)، برہان (دہلی)، الفرقان (لکھنؤ)، صدق، صدق جدید (لکھنؤ) یا دار العلوم دیوبند، ندوہ اور دوسرے اداروں سے شائع ہونے والے علمی ودینی رسائل کے علاوہ، ''شاعر'' بمبئی جیسے ادبی رسائل بھی والد صاحب کے پاس آتے تھے، اور آپ سب کے مطالعہ یا ورق گردانی کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے، یہ اخبارات اور رسائل وجرائد آج بھی حضرتؒ کے باقیات میں موجود ہوں گے، اگرچہ بہت خستہ اور بوسیدہ ہوگئے ہوں گے۔

یہاں مقصد ان رسائل وجرائد کو شمار کرنا نہیں ہے، عرض کرنے کا منشا صرف یہ ہے کہ خلوت گزینی، عزلت پسندی اور گوشہ نشینی کے باوجود وہ نہ صرف گردوپیش بلکہ پوری دنیا کے حالات پر گہری اور بصیرت مندانہ نظر رکھتے تھے۔ شہر اور بیرون شہر کے بہت سے لوگ اپنے اپنے مسائل اور قضیے لے کر والد صاحب کے پاس آتے، اور آپ ان کے حل کی کوشش کرتے، یا ان کو مناسب مشورہ دیتے اور رہنمائی فرماتے۔

عوامی اور سیاسی وسماجی مسائل سے دلچسپی ہی کا نتیجہ تھا کہ جمعیۃ علماء ہند سے آپ کا دیرینہ تعلق تھا، جمعیۃ علماء سے آپ کا تعلق زمانۂ طالب علمی سے تھا، اور آپ اس وقت سے اس جماعت سے وابستہ تھے، جب اس کا قیام عمل میں آیا تھا، اور یہ تعلق کبھی کمزور نہیں ہوا، بلکہ زندگی کی آخری سانس تک باقی رہا۔ والد صاحب اگرچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز سے بیعت اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، اور حضرت تھانوی کو فکری اور نظریاتی اعتبار سے جمعیۃ علماء کے بہت سے موقف اور نقطۂ نظر سے جو اختلاف تھا، وہ اظہر من الشمس ہے، اس کے باوجود والد صاحب جمعیۃ علماء ہند

کے فکر اور نظریے کے کٹر حامی تھے، اور عرصۂ دراز تک جمعیۃ علماء کی صوبائی اور مرکزی مجلس عاملہ کے رکن رکین رہے اور آخر تک اس پر برقرار رہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے معتمد ومقرب اور فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی علیہ الرحمہ کے اپنے معاصر علماء ہند میں سب سے بڑے خیر خواہ تھے۔

حضرت والد صاحبؒ طبیعت کے بہت نرم، لیکن دینی وشرعی معاملات میں بہت سخت تھے۔ وہ دینی امور اور شرعی مسائل میں کسی قسم کی مداہنت کے روادار نہیں تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام بدرجۂ اتم تھا۔ اس معاملے میں ان کا عمل اس حدیث کے موافق تھا کہ من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه الحديث۔ چنانچہ اگر اپنے دائرۂ اختیار میں اگر کوئی کام خلاف شریعت دیکھتے تو ہاتھ سے روکتے، اور جہاں اس کا موقع نہ ہوتا تو زبان سے اس پر نکیر فرماتے، لیکن اس سے چشم پوشی کرلیں یہ ناممکن تھا، چنانچہ شہر کے اندر اور بیرون شہر جہاں کہیں آپ کا وعظ ہوتا تو اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حد درجہ اہتمام ہوتا۔

معاشرے کی خرابیوں، عوام الناس خصوصاً نوجوانوں کی بے راہ رویوں، دنیا کے اندر لوگوں کے انہماک اور دین سے دن بدن دوری اور غفلت پہ وہ ہمیشہ متفکر اور بے چین رہا کرتے تھے۔ دینداری کے اندر کمی کے ساتھ ساتھ علمی انحطاط اور علماء کے اندر صلاحیت واستعداد کے زوال وانحطاط سے وہ سخت دل گیر اور آزردہ خاطر رہا کرتے تھے۔ ان کو اس بات کا سخت افسوس اور قلق رہتا تھا کہ مدارس میں مردم سازی اور تعلیم وتربیت کا روز بروز فقدان ہوتا جارہا ہے، اور بالعموم علماء کا مزاج دینداری کے بجائے دنیا داری کا ہوتا جارہا ہے۔ مدرسین اور طلبہ دونوں کے اندر سے محنت اور درس ومطالعہ کا شوق کم ہوتا جارہا ہے، علمی کاموں میں اشتغال اور کتب بینی کا مشغلہ ختم ہوتا جارہا ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں علم دین کی طرف سے دن بدن بیزاری ہوتی جارہی ہے، اور ان کے دلوں سے اہل علم کی قدر نکلتی جارہی ہے اور ان کی ناقدری بڑھتی جارہی ہے، مدارس کی تعداد اگرچہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ لیکن علم اٹھتا جارہا ہے، والد صاحب ان حالات سے سخت غمگین اور متفکر رہا کرتے تھے، اور موقع بموقع اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کا اظہار کرتے، علماء کو -بالخصوص اپنے تلامذہ اور شاگردوں کو- اس کی طرف توجہ بھی دلاتے۔

والد صاحب معمولات کے سخت پابند تھے، وہ اپنے وقت کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کرتے تھے، ان کے درس وتدریس، تصنیف وتالیف، مطالعہ وکتب بینی، خطوط نویسی، راحت وآرام ودیگر ضروریات اور لوگوں سے ملاقات، سب وقت مقرر تھا، اور ہر کام کو الگ الگ وقت میں بانٹ رکھا تھا، اور جس کام کے لیے جو وقت مقرر تھا، اس وقت وہی کام انجام دیتے تھے۔ پابندیٔ اوقات کا حال یہ تھا کہ کھانے کا جو وقت مقرر تھا، بالکل ٹھیک اس وقت کھانا تیار رہتا تھا، چند منٹوں کی بھی تاخیر گوارا نہیں تھی، کسی کو ملاقات کے لیے کوئی مقرر ہے تو ٹھیک اس وقت اس کو حاضر ہونا چاہئے، کہیں اگر جانا ہے اور اس کے لیے مثلاً ۱۰ ربجے کا وقت دیا ہے، تو دس بجے ٹھیک وہ تیار ہوتے، غرض انھوں نے وقت کی جو قدر کی ہے، کسی چیز کی اتنی قدر نہیں کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان سے دین اور علم دین کا جو ہمہ جہت کام لیا ہے، اس کی مثال بھی تاریخ میں خال خال ملے گی۔

مطالعہ وکتب بینی والد صاحب کا سب سے محبوب مشغلہ تھا، اور زندگی کے آخری لمحے تک یہ شوق باقی رہا، کتابوں سے زیادہ قیمتی ان کا کوئی سرمایہ نہیں تھا، کتابوں کی تلاش وجستجو- خواہ وہ مطبوعہ ہوں یا مخطوطہ- کا جذبہ ناقابل بیان حد تک تھا۔ آخر عمر میں تو عشا کی نماز کے بعد جلدی استراحت کا معمول ہوگیا تھا، لیکن جوانی میں یا جب تک طاقت اور قوت رہی، اس وقت تک آپ کا حال یہ تھا کہ رات میں بہت کم سوتے، زیادہ وقت مطالعہ وکتب بینی میں گزارتے، شب کے پچھلے پہر تھوڑی دیر استراحت کے بعد صبح کی نماز کے لیے اٹھ جاتے۔

والد صاحب کا اصلی میدان تو علم حدیث تھا، لیکن شوق ان کو ہر علم وفن کی کتابوں کے مطالعے کا تھا، یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف کے علاوہ جملہ علوم وفنون اسلامیہ میں ان کی مہارت مسلّم تھی، اور پوری علمی دنیا اس کا اعتراف کرتی تھی۔ فقہ، تفسیر، ادب، منطق وفلسفہ، علم ہیئت کوئی ایسا فن نہیں تھا، جس پر ان کا وسیع وعمیق مطالعہ اور باریک نظر ومہارت حاصل نہ رہی ہو۔

اللہ رب العزت نے ان کو ایسی بہت سی نمایاں خصوصیات سے نوازا تھا، جو کم کسی کے اندر جمع ہوتی ہیں۔ ان کا حافظہ ضرب المثل تھا، اردو، فارسی اور عربی کے نہ جانے کتنے اشعار، خدا جانے کتنی حدیثیں، اللہ جانے کتابوں کی کتنی عبارتیں، راویوں کے حالات، کتابوں اور ان کے مصنّفین کے نام، مطبوعہ ہیں تو کہاں سے چھپی ہیں، اور قلمی ہیں تو کہاں کہاں ان کے نسخے ہیں، ان کے ذہن ودماغ میں محفوظ رہتی تھیں، اور وہ ان سے بوقت ضرورت کام لیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ علمی اشکالات کے سلسلے میں اہل علم کے خطوط والد صاحب کے پاس آتے، اور وہ ان کے جواب لکھواتے، بعد میں جب کتابوں کی طرف مراجعت کی جاتی تو بالکل وہی الفاظ یا عبارت کتاب میں مذکور ملتی۔ زمانۂ طالب علمی یا جوانی کے دور میں پڑھی ہوئی چیزیں ان کو عموماً بقید جلد وصفحہ یاد رہا کرتی تھیں۔ ان کے حافظہ کی خاص بات یہ ہے کہ مرور

زمانہ سے چاہے آخر عمر میں پہلے جیسی بات نہ رہی ہو،لیکن اس میں خرابی نہیں آئی تھی،اور ۹۳ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی آخر تک ان کا حافظہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔

یہی حال ان کے استحضار کا بھی تھا،قرآن وحدیث کے نصوص،فقہی احکام،ادبی نکات،تاریخ وتراجم،وغیرہ ہمہ وقت مستحضر رہا کرتے تھے۔بارہا ایسا ہوتا کہ اہل علم اپنے اشکالات حضرت والد صاحب کے پاس یہ سوچ کر لے آتے کہ ان کے سامنے عرض کردیں گے،کہ تلاش وتتبع کے بعد ان کا تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں گے،اور ان کے سوال کرتے ہی والد صاحب بلا تاخیر جواب عنایت فرماتے،اور وہ علماء ان کے اس استحضار پر متحیر رہ جاتے۔

حضرت والد صاحب سے ملاقات یا علمی تحقیق کے لیے ہندوستان کے بڑے بڑے باکمال اہل علم وفضل کی آمد ورفت رہا کرتی تھی،اور والد صاحب بقدر استطاعت ان کی خاطر مدارات کیا کرتے تھے۔امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی علیہ الرحمہ اور علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ سے تو دیرینہ تعلقات تھے،ان میں سے موخر الذکر بزرگ تو بہ کثرت تشریف لایا کرتے تھے،ان کے علاوہ ہندوستان کے اور بھی بہت سے دیگر علما اور بزرگان دین خاص خاص موقعوں پر یا علمی اشکالات کو حل کرنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے،کبھی کبھی علماء عرب بھی اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے اس دور افتادہ مقام کا سفر کرتے،جن میں قابل ذکر شخصیت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ کی ہے،جنھوں نے تین مرتبہ مئو کی سرزمین کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا ہے۔

ہندوستانی اہل علم میں ایک حضرت مولانا محمد تقی امینی مرحوم تھے،پہلے ندوۃ العلما لکھنؤ کی مجلس تحقیقات شرعیہ میں تھے،جہاں وہ فقہی مسائل کی تحقیق کے لیے رکھے گئے تھے،بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے اہم عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔انھوں نے ندوہ میں قیام کے زمانے میں بیمہ پر اپنا مقالہ لکھا تھا،اس پر والد صاحب سے نظر ثانی کرانے کے لیے مئو آئے،اور رات کو یہیں قیام کیا۔اس وقت حضرت والد صاحب نے تھوڑا سا قطعۂ اراضی خرید کر چند کمروں کا ایک مکان تعمیر کروالیا تھا-جس میں اب میرے چھوٹے بھائی حاجی سعید احمد سلمہ رہتے ہیں- والد صاحب اس وقت اسی مکان میں منتقل ہو چکے تھے۔جب رات ہوئی تو مجھ سے فرمایا کہ لے جاؤ مولانا تقی امینی کو کھانا کھلا کر ان کے سونے کا انتظام کردو۔میں ان کو لے کر پرانے مکان پر چلا آیا،مولانا امینی جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو مجھ سے فرمایا کہ یہ بتلاؤ کہ مولانا کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟ یہ تو جانتا ہوں کہ شیخ الحدیث ہیں اور حدیث میں مہارت حاصل ہے،مگر خاص امتیاز کیا ہے؟ یہ میں جاننا چاہتا ہوں۔ان کا یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ مجھے کوئی جواب نہیں سمجھ میں آرہا تھا،اتفاق کی بات کہ اس وقت میرے پاس مشہور محدث علی ابن المدینی کی کتاب 'العلل' رکھی ہوئی تھی،جو ہمارے شہر کے معروف عالم ومحقق ڈاکٹر محمد مصطفی الاعظمی کی تحقیق سے شائع ہوئی تھی،اس پر والد صاحب کے بہت سے استدراکات وحواشی ہیں۔میں نے مولانا امینی سے عرض کیا کہ اگر آپ والد صاحب کی خصوصیات معلوم کرنا چاہتے ہیں،تو یہ ایک پتلی سی کتاب ہے،پہلے آپ اس کو والد صاحب کے استدراکات پر نگاہ ڈالے بغیر پڑھ جائیے،پھر والد صاحب کے استدراکات پڑھئے،خصوصیات خود ہی سمجھ جائیں گے،چنانچہ اس کو مولانا نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا،اور پڑھنے کے بعد دم بخود رہ گئے،جب اگلی صبح والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو عرض کیا کہ حضرت! مولوی رشید احمد نے رات مجھے ایسی چیز دکھلائی کہ میں رات بھر تعجب کرتا رہا۔

فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی علیہ الرحمہ کا جب بھی مئو کے قرب وجوار سے گذر ہوتا،تو تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی حضرت والد صاحب کی خدمت میں مئو ضرور حاضری دیتے۔ایک دفعہ کسی ٹرین سے مئو اسٹیشن پر تن تنہا اترے،اور رکشہ کرکے بالکل تنہا والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے،کچھ دیر تک بعض اہم مسائل پر ضروری گفتگو کی،اس کے بعد والد صاحب نے مجھے ان کو ناشتہ وغیرہ کرانے کا حکم دیا،مولانا جب ملاقات سے فارغ ہوکر واپس جانے لگے،تو میں نے کہا کہ ساتھ چل کر اسٹیشن چھوڑ دوں،مگر وہ اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوئے اور کہا کہ میں تنہا جاؤں گا تو یہاں کے عام لوگ پہچان نہ سکیں گے،اور جب آپ ساتھ ہوں گے تو لوگوں کی نگاہ پڑے گی۔پھر مولانا رکشے سے تنہا اسٹیشن گئے،اور میری طبیعت نہیں مانی تو دوسرے رکشے سے پیچھے سے اسٹیشن پہنچا اور ان کو گاڑی پر سوار کرکے واپس آیا۔

کتابیں حضرت والد صاحب کی سب سے قیمتی اور متاع تھیں،آپ نے اپنی پوری زندگی مطالعہ اور کتب بینی میں صرف کردی،اس کے باوجود آپ کی علمی تشنگی دور نہیں ہوئی،کئی کئی جلدوں پر مشتمل ضخیم کتابیں بالاستیعاب پڑھ جاتے تھے،بلکہ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک کتاب جو متعدد جلدوں میں ہوتی کئی کئی بار پڑھ جاتے تھے،حدیث وفقہ اور تذکرہ وتراجم کے ساتھ اگرچہ آپ کو خاص اشتغال تھا،لیکن مناسبت جملہ اسلامی علوم وفنون سے تھی،اور ہر فن کی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہا کرتی تھیں،مگر آپ کا یہ شوق کبھی پورا ہوتا نہیں

دکھائی دیتا تھا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مطالعہ کی کثرت کے ساتھ اس کی تڑپ بڑھتی جاتی تھی، اور عمر کے آخری حصے تک مطالعہ کی یہ لگن برقرار رہی۔ شوق مطالعہ اور ذوق تحقیق وجستجو ہی نے آپ کے مزاج کو یکسو اور عزلت نشین وخلوت پسند بنادیا تھا۔آپ دوزانو بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کی کہنیوں کو زمین پر رکھ لیتے، اور دونوں ہتھیلیوں پر کتاب کو رکھ کر دیر دیر تک کتاب میں غرق رہتے، کتاب میں اس طرح گم اور کھوئے رہتے کہ معلوم ہوتا کہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوں۔ اس انداز سے بیٹھ کر مطالعہ کرنے کی وجہ سے دونوں کہنیاں دور تک ایک دم سیاہ اور کہنیوں کی کھال موٹی ہوگئی تھیں۔

مسند حمیدی کی تحقیق کے دوران مجھے جب تعلیقات کا املا کراتے، تو حدیث پڑھتے ہی فرماتے کہ فلاں کتاب کا فلاں باب کھول کر نکالو، یعنی ایسا کم ہوتا کہ مراجع کی کتابوں کو کھول کر پھر ان کے ابواب میں وہ حدیث تلاش کرنی پڑتی، اس سے اندازہ لگانا چاہئے کہ اس کی تحقیق والد صاحب نے زیادہ تر اپنی یادداشت کے بھروسے پر کیا ہے، اس وقت تک ابھی اطراف اور احادیث کی فہرست کی کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں۔

مخطوطات اور قلمی نسخوں کے مقابلہ اور تصحیح نصوص کا کام بہت مشکل ہوتا ہے، بسا اوقات ان نسخوں میں بہت سنگین قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں، کہ اس میں صحیح لفظ تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے، کبھی ایسا ہوتا کہ جب مخطوطے میں کوئی ایسی غلطی ہوتی کہ صحیح لفظ تک رسائی نہ ہوتی اور مراجع سے بھی اس کی طرف رہنمائی نہ ہوتی، تو والد صاحب لیٹ جاتے، اور ذہن پر زور دیتے، چند لمحے گزرتے کہ اٹھ کر بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ یہاں صحیح لفظ یہ ہونا چاہئے۔

والد صاحب نے الحمدللہ بہت بڑا علمی وتحقیقی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے، آپ کی تصانیف وتالیفات میں بہت سی ایسی ہیں جو طبع ہوکر علمی حلقوں سے داد تحسین وصول کرچکی ہیں، لیکن جتنی طبع ہوچکی ہیں ان سے زیادہ آپ کی تحقیقات وہ ہیں، جو زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوسکی ہیں، نیز کچھ ایسی تحریریں بھی تھیں جو حوادث زمانہ کا شکار ہوگئی ہیں۔خواہرزادۂ عزیز ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ نے اس جلد میں آپ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں میں سے جو محفوظ ہیں، ان کا تعارف اور تلخیص کرنے کی ایک سعی بلیغ اور مسعود ومبارک کوشش کی ہے، یہ کام نہایت محنت طلب اور ہفت خوان طے کرنے کی طرح تھا، جو محض خدا کی توفیق اور اس کے فضل وکرم سے پورا ہوا ہے۔خداوند کریم عزیز موصوف کو ان کی اس غیر معمولی محنت وکاوش اور عرق ریزی کا اجر جزیل عطا فرمائے، اور کتاب کو مقبول خاص وعام بنائے، آمین۔ □□

ہدیۂ تبریک وتہنیت

از:- حضرت مولانا سید محمد یحییٰ صاحب ندوی، سانہہ، بیگوسرائے، بہار

درج ذیل تحریر ''حیات ابوالمآثر'' جلد ثانی کے لیے سپرد قلم کی گئی تھی اور نہایت بیش قیمت معلومات اور یادگار واقعات پر مشتمل ہے، جو حضرت اعظمیؒ کی عظمت شان کو اجاگر کرتی ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے اس مجموعے میں اس کو شامل کیا جارہا ہے۔

تازہ خواہی داشتن گرداغہائے سینہ را
گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

عزیزم مولانا ڈاکٹر مسعود سلمہ الودود 'حیات ابوالمآثر' کی دوسری جلد کی تیاری میں ہیں، کتاب تقریباً تیار ہے، اور طباعت کا مرحلہ باقی ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ حضرت مولانا الاعظمی پر تم اپنے تاثرات قلم بند کرو، میں انکار کرتا رہا کہ میری یہ بساط اور اوقات نہیں، مگر ان کا اصرار بڑھتا رہا، بالآخر ان کے شدید اصرار نے اس ناکارہ کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ سطور ذیل میں حضرت مولانا اعظمیؒ کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں، جو میرے مشاہدے میں آئے ہیں، اور اس وقت ذہن میں حاضر ہیں، ورنہ حضرت کے واسطے سے اتنی یادیں میرے حافظے میں موجود ومحفوظ ہیں، کہ ان سب کو قلم بند کرنا میرے لیے مشکل بھی ہے، اور طوالت کا باعث بھی۔

حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے میری نیازمندی کی ابتدا تقریباً ۵۵ ؍برس پیشتر ۱۹۵۵ء میں ہوئی، حضرت محدث الاعظمی کے عزیز اور وفادار شاگرد مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی فراغت کے بعد میرے گاؤں -سانہہ- میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، مفتی صاحب حضرت محدث اعظمی کے گرویدہ اور شیفتہ ووارفتہ تھے، اور غایت عقیدت واحترام کے ساتھ اپنے مشفق اور عظیم استاذ حضرت اعظمی اور ان کے فضائل وکمالات کا اکثر وبیشتر ذکر کیا کرتے تھے، ان کی زبان سے حضرت اعظمی کے والہانہ تذکرے نے میرے دل میں غائبانہ عقیدت واحترام کا جذبہ پیدا کردیا تھا۔

دریں اثنا ۱۹۵۵ء میں کلکتہ میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس عام منعقد ہوا، حضرت اعظمیؒ اس کی عاملہ کے رکن رکین اور میں مجلس منتظمہ کا ممبر تھا، اجلاس میں شرکت کے لیے مفتی صاحب کے ہمراہ میں بھی کلکتہ پہنچا، اس وقت تک مجھے حضرت اعظمی سے ملاقات وزیارت کا شرف نہیں حاصل ہوا تھا، حضرت اعظمی اجلاس میں شرکت کے لیے مئو سے اپنے دیرینہ رفیق مولانا عبد اللطیف نعمانی مرحوم کے ہمراہ تشریف لے گئے تھے، وہیں پہلی دفعہ آپ کی زیارت سے بہرہ مند ہوا، مفتی ظفیر الدین صاحب نے میرا تعارف کرایا کہ حضرت مولانا گیلانی کے قریبی رشتہ دار اور ہمارے مدرسہ کے سکریٹری کے صاحبزادے ہیں۔

اسی دوران ایک روز حضرت کے ساتھ مولانا عبد اللطیف، مفتی ظفیر الدین اور یہ خاکسار مولانا سعید احمد اکبرآبادی سے ملنے گئے، مولانا اکبرآبادی حضرت کے بے حد قدرداں تھے، اور حضرت اعظمی بھی ان سے بہت بے تکلف تھے، مولانا اکبرآبادی نے آپ سے عرض کیا کہ مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقیؒ مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس کے عہدے سے سبکدوش ہورہے ہیں، آپ اس منصب کو قبول فرمالیں، یہاں آپ کے ذوق کے مطابق ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ ہے، جس میں بہت سے مخطوطات ونوادرات کا ذخیرہ ہے۔ حضرت اعظمیؒ نے فرمایا کہ مولوی سعید! میں ملازمت نہ کرنے کا عہد کرچکا ہوں۔

مدرسہ عالیہ کی صدر مدرسی کوئی معمولی عہدہ نہیں تھا، منصب وجاہ اور دنیا سے حضرت مولانا اعظمی کی بے رغبتی وبے نیازی کا یہ پہلا نقش تھا، جو میرے لوح قلب پر مرتسم ہوگیا، اس کے بعد کا ہر نقش گہرا اور انمٹ ہوتا گیا، وہیں سے آپ کے ساتھ میرا ربط وتعلق قوی اور مضبوط ہوتا گیا، میری عقیدت اور ان کی شفقت ومحبت روز افزوں رہی، میں علمی مسائل ومشکلات میں ان کی طرف رجوع کرتا، وہ نہایت شفقت ومہربانی کے ساتھ جواب دیتے، میں ان کے فضیلت کدے پر حاضر ہوتا تو وہ اپنا مہمان بناتے اور باصرار ہفتوں روک لیتے، اور میں آپ کی مہمان نوازی، فیاضی اور منبع علمی وچشمہ صافی سے خوب فیض یاب ہوتا، حتی کہ آپ نے میرے غریب خانے پر تشریف آوری سے بھی مجھے عزت بخشی، اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شفقت ومحبت ہی نے مجھے قدرے جری اور بے باک بنادیا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت کی شخصیت میں بے پناہ رعب ودبدبہ تھا، یہاں تک کہ آپ کے محبوب تلامذہ اور مقربین کے لیے بھی آپ سے کھل کر بات کرنا مشکل تھا، لیکن میرے لیے ان کی شخصیت میں بلا کی محبوبیت اور دلآویزی تھی۔

میں نے آپ کے بہت سے حالات وواقعات کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا ہے، بہت سی مجلسوں میں شریک رہا ہوں، آپ کے حضور میں اہل علم اور اصحاب تقویٰ کی نیازمندانہ حاضری دیکھی ہے، اور ان سب کو قلم بند کرنا چاہوں تو گفتگو بہت طویل ہوجائے گی۔

• ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنا پچاسی سالہ جشن منعقد کیا، جس میں ہندوستانی اہل علم کے علاوہ عالمِ عرب کی بڑی بڑی باکمال اور مقتدر شخصیتیں بھی رونق افروز تھیں، اور ندوے کے وسیع وعریض کیمپس میں آسمانِ علم وفضل کے ایک سے بڑھ کر ایک درخشاں ستاروں کی موجودگی کہکشاں کا منظر پیش کررہی تھی، نمایاں علماء عرب میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود تھے، اپنے عہدے اور منصب کے لحاظ سے شیخ الازہر تمام مندوبین کے سالار تھے، ایک نشست میں شیخ ازہر کو دیکھا کہ انھوں نے حضرت اعظمی کی تحقیق سے شائع ہونے والی کتاب 'المطالب العالیۃ' کی بڑی تعریف کی، اور فرمایا کہ آپ نے بڑا علمی کام کیا ہے، اس نشست میں ڈاکٹر مصطفی صاحب علوی بھی تھے، مگر شیخ ازہر شیخ اعظمی ہی سے محوگفتگو رہے، اور 'المطالب العالیۃ -مسندہ-' کے شائع کرنے کا مشورہ دیا، شیخ اعظمی نے پیر جھنڈا - پاکستان - کے کتب خانے کا نام لیا کہ وہاں اس کا ایک صحیح نسخہ باریک خط میں موجود ہے، لیکن میرے لیے اس کا حصول بہت دشوار ہے۔ شیخ ازہر نے حضرت عبد اللہ ابن مبارک کی سیرت وشخصیت پر ایک کتاب تصنیف کی تھی، انھوں نے فرمایا کہ میں نے اس میں کتاب الزہد والرقائق سے بہت مدد لی ہے۔

• پٹنہ کی خدابخش لائبریری حضرت اعظمی کی علمی چراگاہوں میں سے ایک تھی، مجھے بیگوسرائے میں پتہ چلتا کہ حضرت پٹنہ آئے ہیں، تو آپ سے استفادے کے لیے پٹنہ آجاتا، ایک دفعہ میں پٹنے میں مقیم تھا کہ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اطلاع دی کہ کل مولانا اعظمی تشریف لارہے ہیں، مجھے اسی دن گھر جانا تھا، لیکن حضرت اعظمیؒ کی تشریف آوری کی اطلاع پاکر رک گیا، آپ نے پٹنہ لوجنگ (Lodjing) میں قیام فرمایا، وہاں سے ہم آپ کے ساتھ لائبریری پہنچے، جمعہ کا دن تھا اور اس دن لائبریری قانوناً بند رہتی ہے، بیدار صاحب نے حضرت کی وجہ سے چند گھنٹوں کے لیے کھلوادی، میں نے حضرت سے تشریف آوری کی وجہ دریافت کی؟ تو فرمانے لگے کہ مکہ مکرمہ میں شیخ ازہر سے ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ مصر چلیں، سفر کی جو بھی دقتیں اور قانونی اڑچنیں ہوں گی، وہ دور ہوجائیں گی، ازہر سے الجامع الکبیر (جمع الجوامع) للسیوطی شائع ہورہی ہے، جن جن شخصیتوں نے کام کیا ہے، میں ان کے کام سے مطمئن نہیں ہوں، میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب آپ کی نگرانی میں شائع ہوجائے۔ شیخ ازہر کی اس پیشکش پر حضرت نے ان کو جواب دیا کہ میں حج کی نیت سے آیا ہوں، ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، وطن پہنچنے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ شیخ ازہر نے کہا کہ الجامع الکبیر کا ایک نسخہ پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، کم از کم اس نسخے ہی کے بارے میں تحریر فرمادیں۔ اسی کو دیکھنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ نے چند گھنٹوں میں کتاب پر نظر ڈال کر فرمایا کہ بیدار صاحب اس کے اوراق بے ترتیب ہیں، یحییٰ اس کو ٹھیک کردے گا۔

• حضرت مولانا اعظمی کی عبقریت کا سب سے اہم اور قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ آپ نے تمام تر علمی وتحقیقی خدمات نہایت نامساعد حالات میں انجام دیے ہیں، جس کا بہت اچھا خاصا علم راقم الحروف کو ہے۔ آپ کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ عسرت اور تنگ دستی میں گزرا، محب مخلص وصادق ہونے کی وجہ سے اس صورت حال پر مجھے فطری طور پر فکر رہا کرتی تھی، بلکہ ایک دفعہ مشکلات نے اس طرح چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا کہ صرف آپ کے مقربین ومخصوصین ہی کو اس کا علم تھا، اس وقت مفتی ظفیر الدین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ مولوی یحییٰ یہ میرے استاذ ہی کا دل وجگر ہے کہ صبر وشکر اور استغنا کے ساتھ اس کا تحمل کررہے ہیں۔ ان ہی حالات اور شیخ الازہر کی پیشکش ہی کے زمانے میں کویت کی طرف سے موسوعہ فقہیہ کی ترتیب کے لیے وہاں سے آپ کے پاس نہایت اونچی تنخواہ اور رہائشی سہولیات کے ساتھ کویت میں قیام کے لیے دعوت آئی، تو ملاقات ہونے پر احقر نے عرض کیا کہ حضرت آپ کویت والی دعوت قبول کیوں نہیں فرمالیتے؟! تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمھاری ہی طرح دو اور دنیاداروں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا، پھر فرمایا کہ مولوی یحییٰ! یہ صحیح ہے کہ اگر میں وہاں چلا جاؤں تو تمھاری خانقاہ کے احاطے سے بڑا میرا احاطہ ہوجائے گا۔ مصر کے لیے شیخ الازہر کی پیشکش پر بھی میں نے وہاں جانے کی ترغیب دینا چاہی، تو اس وقت بھی اسی طرح کا بے نیازانہ جواب دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت اعظمی نہ صرف قناعت واستغنا بلکہ غیرت وخودداری کے بھی نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔

• ۱۹۸۷ء میں جب آپ کا آخری سفرِ حجاز ہوا، تو اس حقیر نے بھی ساتھ جانے کی تمنا ظاہر کی، آپ کا یہ سفر ایک شامی فاضل شیخ ایمن رشدی سوید کی دعوت پر ہوا تھا، حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے ساتھ آپ کے خلف الرشید حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ مجاز حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی بھی تھے۔ اس سفر کے دوران عرب فضلا کے ہاں حضرت محدث اعظمی کی پذیرائی اور ان کی عقیدت ومحبت کے خوب نمونے دیکھنے میں آئے، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علیہ الرحمہ ریاض ایرپورٹ پر ملنے آئے اور ان کی وجہ سے بہت سہولت رہی۔ شیخ ایمن جدہ میں ابوبکر بن لادن کی موسسہ میں تھے، حضرت کے اس سفر سے پہلے وہ دو مرتبہ مئو حضرت کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے، اور آپ سے سبقاً سبقاً صحیح بخاری پڑھی تھی، اس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا، تو اسی کی تکمیل کے لیے حضرت کو حجاز کی دعوت دی تھی، اس سفر کا پروگرام کئی مرتبہ مرتب ہونے اور پھر ملتوی ہونے کے بعد پیش آیا تھا، جدہ میں آپ کے قیام کے دوران ریاض سے شیخ ابوغدہ اور مدینہ منورہ سے شیخ محمد

عوامہ وقتاً فوقتاً ملاقات وزیارت اور استفادہ کے لیے تشریف لایا کرتے۔ ایک دن شیخ عوامہ بعض مخطوطات کے زیروکس لے کر حاضر خدمت ہوئے، جس کے کچھ الفاظ پڑھنے میں ان کو دقت پیش آرہی تھی، حضرت سے ان کے بارے میں استفسار کیا، آپ نے جب ان کو صحیح پڑھ کر بتایا، تو شیخ عوامہ نے بے ساختہ آپ کی پیشانی چوم لی۔ چند دنوں کے بعد حضرت اعظمیؒ نے عمرہ کا ارادہ کیا، تو فرمایا کہ ہم جعرانہ سے احرام باندھیں گے، چنانچہ ہم لوگوں نے جعرانہ جا کر وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ کیا۔

• حجاز کے اس سفر میں اپنے میزبان، خاندان بنی عباس کے چشم و چراغ شیخ ایمن کو دیکھا کہ حضرت کی بے حد اور انتھک خدمت کر رہے ہیں، وھیل چیئر Wheel chair پر آپ کو طواف اور سعی کراتے ہیں، محنت ومشقت کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہوجاتے ہیں، لیکن مجھ کو یا مخدوم زادے مولانا رشید احمد صاحب کو خدمت کا موقع نہیں دیتے ہیں، علم ومعرفت کی ایسی قدردانی کم دیکھنے میں آتی ہے، شیخ ایمن حضرت اعظمی سے صحیح بخاری پڑھتے، اور جدہ یا حرمین محترمین میں قیام کے دوران حجاز کے بہت سے علما وفضلا آ آ کر حدیث پاک کی سند واجازت لیتے، مکہ مکرمہ میں شیخ یاسین فادانی کی آمد ورفت زیادہ رہتی، ایک دن وہ اپنے شاگردوں کی بڑی جماعت کو جو تقریباً بیس پچیس کی تعداد میں تھے، حضرت اعظمی کے پاس مسلسل بالاولیت کی سند دلانے کے لیے لے آئے، اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ اے فادانی! آپ دن میں کئی مرتبہ لایئے، مگر چار پانچ کی تعداد میں طلبہ کو لایئے، مجھے بھیڑ سے وحشت ہوتی ہے۔ یہ حضرت کا مزاج تھا کہ آپ تنہائی اور یکسوئی کو پسند فرماتے تھے، اور بھیڑ بھاڑ سے متوحش رہتے تھے۔

• مکہ مکرمہ میں ایک بزرگ شخص شیخ عبدالشکور فدا تھے، حرم شریف کے قریب ہی ان کا ایک تجارتی مکتبہ تھا، عبدالشکور صاحب کو مخطوطہ اور مطبوعہ کتابوں کا بڑا وسیع علم تھا، جس کی وجہ سے ہمارے حضرت محدث اعظمی کو ان سے یک گونہ مناسبت تھی، اور ان سے خوب علمی مذاکرے ہوتے رہتے۔

• میں ابن بحشل کی 'تاریخ واسط' خریدنے جا رہا تھا، حضرت نے پوچھا مولوی یحییٰ کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کتاب کا نام لیا، فرمایا کہ جس مقصد سے خریدنا چاہتے ہو وہ اس میں نہیں ہے، 'تاریخ واسط' میں محدثین وعلما کے حالات ہیں، تمھارے آبا واجداد واسطی ہیں، ان کے حالات اس کتاب میں نہیں ملیں گے۔ یہ حضرت کی غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت وفطانت تھی کہ محض کتاب کا نام لینے پر تاڑ گئے، کہ اس کو خریدنے کا اصل مقصد کیا ہے۔

• اسی سفر میں کتابوں کے ساتھ حضرت کا شغف اور شوق مطالعہ کا ایک نمونہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا، اور آج تک میری حیرت کم نہیں ہو رہی ہے، واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ حافظ عراقی نے علامہ ذہبی کی 'میزان الاعتدال' کا ایک ذیل لکھا ہے، جدہ میں حضرت اعظمی کو یہ کتاب دستیاب ہوگئی، صبح کو فجر کی نماز کے بعد آپ نے کتاب دی کو اس کو رکھ دو، دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں نے اس کو رات بھر میں دیکھ لیا ہے۔ یہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس عمر اور ضعیفی میں آپ نے رات بھر میں اس ضخیم کتاب کی ورق گردانی کر لی، نہ معلوم کتنی دیر سوئے اور سوئے بھی یا نہیں۔

• مکہ مکرمہ میں کئی بار پروفیسر احمد محمد نور سیف صاحب ملنے کو آئے اور اپنی تالیفات خدمت اقدس میں پیش کیں، ایک دفعہ انھوں نے کچھ علمی سوالات کیے، حضرت کے جواب سے بے حد متاثر اور مسرور ہوئے، اور فرط مسرت کے عالم میں کہا أنت العلم الکبیر۔

• مدینہ منورہ میں حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری اور شیخ عوامہ کی آمد ورفت کثرت سے رہتی تھی، شام کو شیخ عوامہ اپنی گاڑی سے اطراف کی سیر کراتے۔ حضرت، شیخ ایمن اور مولانا رشید صاحب کے سہارے روضۂ اطہر پر سلام پڑھنے جاتے، میں نے دیکھا کہ روضۂ اقدس کی حاضری کے وقت آپ کے پورے وجود پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے، تھر تھر کانپ رہے ہیں، اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی فریادی یا کوئی قصوروار کسی بڑے بادشاہ کے دربار میں کھڑا ہے۔

احقر نے الحمد للہ آپ کی تالیفات وتصنیفات اور تعلیقات کا بہت کثرت کے ساتھ اور بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، اثنائے مطالعہ میں مجھ کو اگر کہیں کوئی اشکال ہوتا، تو آپ اس کی تشریح فرماتے، اور کبھی کتابوں کی نشان دہی فرمادیتے کہ فلاں کتاب دیکھ لو تشریح وتوضیح مل جائے گی۔

• حضرت اعظمی کو جملہ علوم وفنون میں جو کمال حاصل تھا، اس کی مثال کم ملے گی، حدیث وفقہ وتفسیر میں منصب امامت پر فائز ہونے کے علاوہ نحو وصرف، لغت وبلاغت، منطق وفلسفہ اور علم عروض وہیئت بھی آپ کے کمال علمی کے شعبے تھے، ایک دفعہ میں نے آپ سے علم ہیئت کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے اس فن کو اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔

• حضرت نے ایک دفعہ میرے غریب خانے کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا، جس کمرے میں آپ مقیم تھے، اس میں فجر کی نماز کے بعد تنہا بیٹھے تھے، میں جب دروازے کے قریب پہنچا تو محسوس ہوا کہ آپ قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے ہیں، نہایت خوش الحانی کے ساتھ اور تجوید کی رعایت کرتے ہوئے آپ تلاوت کر رہے تھے، آپ کی تلاوت بڑی پُرسوز اور پُرکیف تھی، ہم وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے سننے لگے کہ ہمارے قریب جانے پر کہیں تلاوت بند نہ کردیں۔

• ایک مرتبہ اپنے زمانۂ طالب علمی کا واقعہ بیان کیا کہ وہ اپنے استاذ

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے ایک کتاب پڑھنا چاہتے تھے، مولانا عبدالغفار صاحب نے فرمایا کہ تم میرے لڑکے کو 'ضریری' - علم بلاغت کی ایک منظوم اور بہت اہم کتاب - پڑھا دو، میرا اس کو 'ضریری' پڑھانے کا جو وقت ہے، اس میں تم کو میں پڑھا دیا کروں گا۔ احقر نے حضرت اعظمی سے جھٹ سوال کر دیا کہ حضرت آپ نے اس سے پہلے 'ضریری' پڑھی تھی، فرمایا نہیں پڑھی تھی۔ پھر حضرت نے مولانا کے صاحبزادے کو 'ضریری' پڑھائی اور مولانا ان کے پڑھانے سے مطمئن بھی تھے۔

• ایک مرتبہ میں نے 'الافق المبین' کے بارے میں سوال کیا؟ تو آپ نے فرمایا کہ مولوی یحییٰ! میں نے ہر فن کی کتاب پڑھائی ہے۔

• الفاظ غریبہ کی تشریح وتوضیح میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا، جو آپ کی تعلیقات میں عیاں ہیں، دفع تعارض میں کمال تھا، اور ایجاز واختصار کے ساتھ اپنے مدعا و مافی الضمیر کی ادائیگی کا ملکۂ تامہ حاصل تھا، شد رحال پر حضرت مولانا ابوالوفا افغانی نے بہت بسط کے ساتھ لکھا ہے، لیکن اسی بحث کو حضرت اعظمی نے الألبانی میں بہت کم الفاظ میں سمیٹ کر پیش کر دیا ہے، جس سے زبان وبیان پر آپ کی قدرت کاملہ کا پتہ چلتا ہے۔

• ایک حدیث کے بارے میں علامہ ابن القیم نے لکھا ہے کہ اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے، علامہ احمد محمد شاکر نے اس کی نسبت مسند احمد کے حاشیے میں لکھا کہ یہ روایت مجھے سنن کبریٰ میں نہیں ملی۔ حضرت اعظمی نے مسند حمیدی کی تعلیق میں لکھا کہ بیہقی نے اس کو 'معرفۃ السنن والآثار' میں روایت کیا ہے، اور اس کے لیے آپ نے 'معرفۃ السنن' کے قلمی نسخے کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے ایک موقع پر عرض کیا کہ حضرت! آپ نے اس کا - معرفۃ السنن کا - نسخہ دیکھا ہے؟ فرمایا کہ جی ہاں میں نے اس کے مخطوطے کا مطالعہ کیا ہے۔

• میں نے ایک دفعہ عرض کیا کہ حمیدی کی بعض احادیث 'فتح الباری' اور 'اخبار القضاۃ' للوکیع میں ہیں، جو مسند حمیدی میں نہیں ہیں؟۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے مسند حمیدی پر جو کام کیا ہے، وہ نسخہ بشر بن موسیٰ کا روایت کردہ ہے، اس کے علاوہ بہت ساری روایتیں ہماری نظر سے گزر چکی ہیں، جن کا تعلق ہمارے کام سے نہیں ہے۔

باوجودیکہ بہت سارے راویوں کے حالات آپ کے ذہن ودماغ میں حاضر اور محفوظ ہوتے، لیکن تعلیقات لکھتے وقت ان کے حالات کی اگر ضرورت پڑتی، تو کتب رجال یا حوالے کی دوسری کتابوں سے مراجعت کے بعد لکھتے۔ ایک دفعہ دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں جب تک اطمینان نہیں کر لیتا، لکھتا نہیں ہوں۔

• علامہ ابراہیم بلیاویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری میں شرکت کے لیے دیوبند تشریف لے جارہے تھے، راستے میں لکھنؤ میں قیام فرمایا، میں اُس وقت ندوے میں بحیثیت مہمان مقیم تھا، حضرت اعظمی کا قیام اپنے عزیز شاگرد مولانا محمد منظور نعمانی کے یہاں تھا، میں اور مولانا سعید الرحمٰن حضرت اعظمی سے ملنے کے لیے رکشے سے کچہری روڈ گئے، آپ کا یہ سفر تنہا تھا، کوئی رفیق نہیں تھا، حضرت اعظمی ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے، اس وقت آپ کے پاس مولانا نسیم احمد فریدی بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کچھ کتابوں اور تحریروں کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اس مسئلے پر شاہ صاحب سے پہلے فلاں عالم نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس وقت میں نے یہ منظر دیکھا کہ مولانا منظور صاحب نعمانیؒ اپنے استاذ گرامی حضرت اعظمیؒ کا بستر لگا رہے ہیں۔

اس واقعے کے کچھ دنوں بعد حضرت پٹنہ تشریف لائے، تو میں نے پوچھا کہ حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ کے بعد صدر مدرسی کا عہدہ کن کے سپرد ہوا، فرمانے لگے کہ مولانا عبدالصمد اور مولانا منت اللہ میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ صدر مدرسی کا عہدہ قبول کر لیں، آپ کے علاوہ کوئی اور اس کا حق دار نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ یہ عہدہ میرے سپرد کر رہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری اہلیت اور صلاحیت کے معترف ہیں، تو آپ لوگوں کے اس اعتماد کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ اس کے مجھ سے زیادہ حق دار مولانا فخر الدین ہیں، اس لیے ان ہی کے سپرد کر دیا جائے، اور پھر اسی پر مجلس شوری نے فیصلہ کر دیا۔

اس طرح ایک بار پھر حضرت اعظمیؒ نے دارالعلوم دیوبند کے ایک اہم منصب کو خوش اسلوبی سے ٹال دیا اور اس اہم معاملے میں آپ کی تجویز پر مجلس شوری کا فیصلہ ہوا۔

• حضرت اعظمی اپنے اساتذہ میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب اور حضرت مولانا شاہ انور صاحب سے بہت متاثر تھے، بالخصوص حضرت شاہ صاحب کا ثانی نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے معاصرین اور دیگر اہل علم میں علامہ سید سلیمان ندوی کے بہت معترف، مداح اور قدرداں تھے، سید صاحب ہی کی وجہ سے حضرت اعظمی کا اعظم گڈھ میں کئی کئی دن قیام ہوجاتا، دوسری طرف سید صاحب بھی بغیر کسی اطلاع کے آپ کے پاس مفتاح العلوم آجاتے، اور شام کو واپس دارالمصنفین چلے جاتے، اسی طرح سید صاحب کے اعتراف وقدردانی کا یہ حال تھا کہ 'سیرۃ النبی' کی جلدوں پر آپ سے باقاعدہ نظر ثانی کراتے۔

• مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا سید شاہ فضل اللہ جیلانی کو میں نے آپ کے فضل وکمال کا بے حد مداح پایا، مولانا اکبرآبادی نے 'صدیق اکبرؓ' اور 'عثمان ذوالنورینؓ' کے مقدمے میں اور اپنے خطوط میں حضرت اعظمی کے

علم وفضل کا بھرپور اعتراف اور تعریف وتوصیف کی ہے، ورنہ مولانا اکبر آبادی کا یہ حال تھا کہ کم کسی کی تعریف کرتے تھے۔ مولانا فضل اللہ صاحب نے صرف 'الحاوی لرجال الطحاوی' کی زیارت کے لیے مئو کا سفر کیا، اور خود مجھ سے فرمایا کہ میرے علم کے مطابق اسماء الرجال میں آپ کے رتبے کا کوئی دوسرا عالم نہیں ہے۔

حضرت مولانا یکتائے زمانہ اور نادرۂ روزگار تھے، آپ تاریخ اسلام کی ان بے نظیر ہستیوں میں تھے، جن کی مثالیں خال خال ملتی ہیں، مگر باوجود اپنی عبقریت، جلالت قدر ومنزلت، عظمت وبلندی، وسعت مطالعہ، اور تبحر علمی کے نہایت خاموش طبع اور کم گو تھے، جس کی وجہ سے آپ کے علم ومعرفت اور فضل وکمال کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا، اِخفاء حال کا حد درجہ اہتمام تھا، اپنی شخصیت اور کمالات کے اظہار کے جذبے سے قلب وجگر پاک تھا، حالانکہ آپ کے علم کی گہرائی وگیرائی کو دیکھنا ہوتو کوئی حدیث کی کتابوں پر آپ کی تعلیقات کو دیکھے کہ امام بیہقی، دارقطنی، حافظ ابن حجر اور ہیثمی جیسے اجلہ محدثین وحفاظ حدیث سے کتنی باتوں کی تحقیق میں اختلاف کیا ہے، اور اپنے دعووں کو بدلائل ثابت کیا ہے، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مبارک فن میں ہمارے حضرت کا قد متقدمین کے برابر تھا۔

ان کے اندر خود اعتمادی غضب کی تھی، وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ مولوی یحییٰ! میں عزت سب کی کرتا ہوں متاثر کسی سے نہیں ہوتا۔ اور یہ بات بالکل صحیح ہے، ان کی تصانیف وتالیفات نیز استدراکات وتعقبات کو پڑھنے کے بعد اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت اعظمی کی سیرت وشخصیت اور علم وفضل کے شعبوں کو منظر عام پر لانے کے لیے مفتی محمد ظفیر الدین صاحب اور ان جیسے دیگر شاگردوں اور وابستگان دامن ابوالمآثر پر ایک قرض بلکہ فرض تھا، جس کا کچھ حصہ ان کے قریب عزیز اور دور آخر کے شاگرد عزیزم ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ نے "حیات ابوالمآثر" جلد اول لکھ کر ادا کیا، اور اب انھوں نے حضرت کے علمی کارناموں پر مشتمل دوسری جلد لکھ کر تیار کر دی ہے، عزیز موصوف نے حضرت کی تحریروں، آپ کی نگارشات اور تعلیقات کا جس خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ تجزیہ اور تعارف کیا ہے، وہ بہت قدر و قیمت کا حامل ہے، ان کے تجزیہ وتعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کا بھرپور اور بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، اور جس طرح تعارف کیا ہے، اس میں کوئی تشنگی نہیں رہ گئی ہے، اللہ ان کی عمر کو دراز فرمائے اور وہ اسی طرح حضرت کی تحریروں کو اہل علم کے حلقوں میں پیش کرتے رہیں، عزیز موصوف کے قلم میں جو پختگی اور درستگی ہے، اس کا اعتراف علمی حلقوں میں بھی ہے، اور اِس کی شہادت ان کی دوسری تحریریں اور خود یہ کتاب دے گی۔

میری ان سے عزیزانہ گزارش ہے کہ وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ان مکتوبات ورسائل کو بھی جمع کر کے قابلِ اشاعت بنا دیں، جو آپ نے اہل علم کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے ہیں، تو علمی دنیا کے لیے ایک بیش قیمت علمی تحفہ اور قابل قدر چیز ہوگی، اسی طرح ان کے عربی مقالات کا مجموعہ بھی شائع ہونا چاہئے۔ حضرت نے مصنف عبدالرزاق وغیرہ کے حواشی میں جہاں رواۃ حدیث کا ذکر بہت اختصار کے ساتھ کیا ہے، ان کے پھیلاؤ کی بھی ضرورت ہے۔

محب مکرم اور میرے مخلص کرم فرما حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی مجددی نقشبندی مدظلہ العالی بہت زیادہ تبریک وتہنئت کے مستحق ہیں کہ اپنے عظیم والد علیہ الرحمہ کے علمی کاموں کو نہایت کامیابی کے ساتھ ایک ایک کر کے اہل علم ودانش کے سامنے لا رہے ہیں، اور جو گمنام ہیں ان کو گمنامی سے نکال کر عیاں فرما رہے ہیں، ایک موقع پر حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے یہ بات بالکل برملا اور بجا فرمائی تھی کہ ہمارے علما میں اور کسی عالم کی اولاد نے اپنے والد کے علمی کاموں کی حفاظت اور ان کو منظر عام پر لانے کا وہ کارنامہ نہیں انجام دیا، جو مولانا رشید احمد صاحب نے کر دکھایا ہے، اور مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مدظلہ کے اس خیال سے میں پوری طرح متفق ہوں۔ اہل علم کو مولانا مدظلہ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کے اہتمام سے ایک سے بڑھ کر ایک گوہر نایاب عمدہ کتابت وطباعت سے آراستہ ہو کر تشنگانِ علم کو شاد کام کر رہے ہیں۔ مولانا مدظلہ خود بھی باذوق اور صاحب نظر ہیں، اپنے والد گرامی حضرت اعظمیؒ علیہ الرحمہ کے مسودات ومخطوطات کی انھوں نے پوری زندگی تبییض کی ہے، اُن کو علامہ محقق ومحدث حضرت شیخ زاہد کوثری سے علم حدیث کی تحریری اجازت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر کو دراز فرمائے اور ہم سب کے مخدوم گرامی حضرت محدث الاعظمی علیہ الرحمہ کے علمی کارناموں کے مزید اشاعت کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔

حضرت محدث الاعظمیؒ کو میں نہ صرف اپنا محسن بلکہ پدر مجازی سمجھتا ہوں، اور اسی نسبت اور تعلق سے میں عزیزم ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ کو اپنے بھانجے کی طرح سمجھتا ہوں، میں ان کی اس کاوش کے حق میں- جو ان کی سالہا سال کی عرق ریزی کا ثمرہ ہے- خداوند قدوس کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ اپنے فضل وکرم سے اس کو قبول عام عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔ □□

حضرت محدث الاعظمیؒ
ایک آفتابِ علم و آگہی

مولانا حکیم عزیز الرحمن صاحبؒ

درج ذیل تحریر ''حیات ابوالمآثر'' جلد اول کے لیے لکھی گئی تھی اور ایک مخصوص انداز رکھتی ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے اس مجموعے میں اس کو شامل کیا جارہا ہے۔

یہ ہمیشہ سے دستور چلا آ رہا ہے کہ سلاطین نے جس جگہ کو اپنا مرکز بنایا وہاں ہر علم وفن کے لوگ بھی دھیرے دھیرے جمع ہوتے چلے گئے، اور ملک کے چیدہ پسندیدہ دل ودماغ کا مستقر یہ راجدھانیاں بنتی گئیں، لیکن سلاطین کی ایک دوسرے سے آویزش جنگ ومحاربہ بھی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہے، ایسی صورت میں راجدھانی کا سکون ختم ہوجانا، اہل علم ونظر کا انتشار کا شکار ہو جانا بھی: إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ. کی روشنی میں ایک حقیقت ہے۔

اس آیت میں قرآن کریم نے اسی فلسفۂ ملوکیت کا ذکر فرمایا ہے، آویزش وبدامنی میں سب سے زیادہ اضطراب اہل علم کا جو علمی کاموں میں لگے رہتے ہیں، ہوتا ہے، نتیجۃً عالی دماغ اور علمی استحضار کے لوگ راجدھانی کو چھوڑ کر نواحی کی طرف منتقل ہوجاتے، تاکہ اس بے ثباتی سے ان کے کام کو نقصان نہ پہنچے۔

دہلی ہندو پیریڈ سے لے کر انگریزوں کے عہد تک دارالسلطنت رہا کیا اور وہ، خواہ وہ ہستناپور ہو یا شاہجہاں آباد یا کسی اور نام سے اسے یاد کیا گیا ہو، ہر زمانے میں راجدھانی رہا کیا، ظاہر ہے کہ ان تمام ادوار میں بدامنی، قتل وغارت کے واقعات وحادثات پیش آتے رہے، نتیجۃً دہلی کے اطراف میں فکر بلیغ، طبع بلند، راسخ العلم اذکیا وعقلاء کی بڑی تعداد سکونت پذیر ہوتی گئی، خود انگریز جیسے جہاں گرد وجہاں دید قوم نے کلکتہ میں وہ بات نہیں پائی اور دہلی کو اپنا مستقر بنایا، آج بھی ملک کی راجدھانی وہی ہے، اس طرح دہلی اور اس کے قریبی علاقوں میں اہل علم وتدبیر وتدبر کا حلقہ بڑھتا گیا، رامپور کو دیکھئے روہیلہ خاندان کے حکمرانوں سے بریلی واطراف بریلی کو جو منافع نصیب ہوئے وہ آپ کے سامنے ہے۔

اسی طرح جونپور کم وبیش ایک صدی تک مختلف سلاطین کا دارالسلطنت رہا، اگر شیر شاہ سوری نے اسے آباد کیا، اہل کمال کا مجمع اس کے گرد جمع ہو گیا تو ہمایوں کی واپسی سے اس پر منفی اثر پڑا، لوگوں نے جونپور کو خیر باد کہا، مونگیر کے جونپوری شیخان اسی زمانے کی دین ہیں، بہر حال ان سلاطین جونپور کے زمانے میں جونپور کے اطراف میں راجدھانی کے ناسازگار حالات پر لوگوں نے پناہ لی، اعظم گڈھ چونکہ جونپور ہی کا ایک پرگنہ تھا اور زیادہ دور بھی نہیں تھا، اس لئے اہل کمال خود اور ان کے خاندان نے اعظم گڈھ کو اپنا مسکن ومستقر بنایا، چریا کوٹ کا ذکر آپ کو آئین اکبری میں نظر آئیگا، وہاں مولانا فاروق چریا کوٹی، غلام مخدوم چریا کوٹی جیسی شخصیات پیدا ہوئیں، سر شاہ سلیمان انگریزوں کے دور کے پہلے چیف جسٹس پھر دی فیڈرل کورٹ، جو بعد میں سپریم کورٹ کہلانے لگی کے پہلے چیف جسٹس بھی رہے، شبلی نعمانی جیسا ہمہ جہت باکمال اسی اعظم گڈھ نے پیدا کیا، عبدالسلام ندوی جیسا برجستہ نگار جن کے مسودہ کی کبھی تبییض نہیں کرنی پڑی، حافظ حمید الدین فراہی جیسا عالم علوم قرآن جن کے حادثۂ مرگ کی اطلاع سید سلیمان ندوی نے عبدالماجد دریابادی کو ان لفظوں دی کہ: ''آج آفتاب اسلام متھرا کے ظلمت کدہ میں ڈوب گیا'' سہیل اعظمی جیسا ذکی وذہین بدیہہ گو شاعر جس نے کم سے کم ۲۵ ہزار اشعار اردو فارسی میں کہے ہوں گے، گو زمانہ نے صرف دو ہزار اشعار محفوظ رکھے، جنھوں نے اپنے ایک مصرع میں اعظم گڈھ کی علمی تاریخ مرتب کردی ہے، اسی اعظم گڈھ نے پیدا کیا:

جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے۔

اعظم گڈھ نے صرف علوم ظاہری کے ماہرین ہی پیدا نہیں کیے، بلکہ یہاں اہل اللہ اور خدا رسیدہ بزرگوں کا ایک بڑا طبقہ بھی پیدا ہوا، مولانا شاہ عبدالغنی، مولانا شاہ وصی اللہ ان کے سرخیل ہیں، جن کے بارے میں علامہ ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین نے فرمایا کہ یہ دونوں بزرگ اس دور کے حاجی امداد اللہ ہیں، اور موخر الذکر سے خود علامہ نے باوجود شاگرد ہونے کے بیعت کی اور خلعت خلافت سے نوازے گئے، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، حافظ عبداللہ غازیپوری، مصطفیٰ اعظمی جیسے محدثین بھی یہیں پیدا ہوئے۔

وہ آفتاب علم وآگہی بھی اسی زمین سے طلوع ہوا (جس کو دنیا محدث

کبیر علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی کے نام سے جانتی ہے) جس کی تیز کرنوں سے علم حدیث کے مخفی گوشے منور ہوگئے، جس سے رجال حدیث کی دوصدی کی تاریخ آئینہ بن کر سامنے آگئی، نام، زمانہ، ولدیت، لقاء، معاصرت، وطنیت، احتیاط وتورع پر سیر حاصل بحث کرکے ان کا مقام، ان کی حیثیت واضح فرمادی، اس سلسلے میں مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ''الحاوی لرجال الطحاوی'' ہے جو زیورطبع سے آراستہ ہوکر اہل علم کے سامنے آرہی ہے، اس کے مطالعہ سے مولانا کی عبقریت، زیرکی، دانائی، باریک بینی اہل علم کے سامنے مجسم ہوکر آجائے گی۔

اس وقت مولانا کی سوانح حیات کے پروف کا کچھ حصہ میرے سامنے ہے، اس کے مطالعہ سے جو باتیں میرے سامنے آئیں، اسے بے دریغ لکھ رہا ہوں۔

- اگر مولانا علم حدیث کے امیر المؤمنین نہ ہوں ممکن ہے، مگر آپ رجال حدیث کے امیر المؤمنین بلا شک وشبہہ ہیں، اس درجہ کا عالم رجال اخلاف میں کہیں نظر نہیں آتا، اسلاف میں بھی معدودے چند ہیں۔

مولانا اعظمی مخطوطات حدیث نبوی کے سب سے بڑے عالم تھے، آپ اس سلسلہ میں اس بات کی سعی فرماتے کہ قدیم سے قدیم تر مخطوطہ سامنے آجائے، اس لئے کہ دور نبوت سے قرب کی وجہ سے ان میں صیانت ودیانت کا عنصر غالب رہتا ہے، بہ نسبت بعد کے مخطوطات کے کہ اس میں متاخرین نے متقدمین کی طرح احتیاط نہیں برتی، چنانچہ ان کی بالغ نگاہی کا ثبوت جامع عبدالرزاق کے مخطوطہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر حمیداللہ جیسے کثیر المطالعہ، مخطوطات پر نظر رکھنے والے عالم اور حضرت مولانا کے درمیان جو استدراکی مکاتبت ہوئی اور اس کے جامع معمر بن راشد ہونے کی تردید مولانا نے فرمائی، اس سلسلہ میں طویل مکاتبت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی تحقیق کو تسلیم کرلیا یہی نہیں۔ بلکہ ان کو شاہ ولی اللہ ثانی کے لقب سے یاد فرمایا۔

- مولانا کی حدیثی خدمات جو سامنے آئی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ ان پر صدیوں تک لوگ ریسرچ کرکے ڈاکٹریت حاصل کرتے رہیں گے۔

- آپ نے حدیثی خدمات کے علاوہ فرق باطلہ کے سلسلے میں جو سرمایہ چھوڑا ہے اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن کس قدر ثاقب اور طبیعت کس قدر حاضر تھی، چنانچہ نصرۃ الحدیث جو اہل قرآن کے رد میں آپ نے لکھی اس پر مقدمہ لکھنے کی پیش کش مولانا مناظر احسن گیلانی نے فرمائی، اور حضرت تھانوی نے لکھا کہ اگر میں کوشش کرتا تو ایسی پر تحقیق کتاب نہ لکھ پاتا۔

- شیعیت جو یہودیت کی ردیف ہے، اور اموی وعباسی دور کے خلفاء کے آل رسول پر مظالم اور اس طبقہ کی نام نہاد حب آل رسول کے نتیجہ میں فروغ ہوا، بعد کو سلاطین نے بھی سرپرستی کی اور ہندوستان میں تو تیمور کے بعد اکثر سلاطین نے اس کی ہمنوائی کی، پھر نوابین اودھ کا دوران کے لئے فصل بہار ثابت ہوا، ردشیعیت میں مولانا عبدالشکور نے وہ کام کیا کہ سابقین میں سے بھی کسی نے نہیں کیا، مولانا اعظمی جو خود کو نمایاں نہ کرنے کا مزاج رکھتے تھے، اس تحریک ردشیعیت میں برابر کے شریک رہے، آپ کے تین رسالے بھی اس سلسلہ میں مطبوع ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ دارالمبلغین کے قیام کے زمانے میں آپ کی وجہ سے اس تحریک میں جان آگئی۔

داستاں ان کے اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خون تمنا بھی ہے شامل میرا

- غیر مقلدیت جو اعتزال کی ایک شاخ ہے، آپ نے اس کے رد میں بھی وہ نمایاں خدمات انجام دیں کہ ان کے علماء واساطین قبروں میں بھی بے چین نظر آتے ہیں، مولانا کی وہ تقریر جو آپ نے علامہ ثناء اللہ امرتسری کی موجودگی میں ضلع گونڈہ میں رد قراءت خلف الامام پر کی تھی، اگر ٹیپ رکارڈ میں ٹیپ ہوتی تو آج قراءت خلف الامام پر اس بہتر کوئی رسالہ نہ پہلوں کا ہوتا نہ پچھلوں کا، مولانا امرتسری کے تقلید کی تعریف پر جو سوالیہ اخبار میں نکلا، جس کا مسکت جواب مولانا نے دے کر مولانا امرتسری کو ان کے علمی مقام کی سیر کرادی، مولانا نے ''الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعۃ'' میں طلاق کے بارے میں جو تحریر فرمایا اس کے جواب کے لیے بنا سپتی محدثین کی ایک ٹولی مبارکپور میں جمع ہوئی اور ان کی کاوش سے الآثار المتبوعۃ سامنے آئی، جس کا جواب مولانا نے الازھار المربوعۃ میں دیا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے معارف مئی ۱۹۳۷ء میں جو لکھا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے، اس مسئلہ پر عامر عثمانی نے مولانا کی تائید ہی نہیں کی بلکہ تجلی کا مستقل نمبر نکال کر اس بحث کے لئے گفتگو کا دروازہ بند کردیا، اگرچہ غیر مقلدین تنویر الآفاق کے نام پر تسوید الآفاق کرتے رہ گئے۔

مولانا نے رکعات تراویح کا تعین اور حنفیہ کا عمل بیس رکعات کا ثبوت جناب نبی کریم ﷺ سے اور حضرت عمر فاروق اعظم کے زمانے سے آج تک بیس پر اجماع امت کا ثبوت تحریر فرمایا، اس کا جواب انوار المصابیح کے نام سے شائع ہوا، پھر مولانا کے شاگرد مولانا عبدالباری کے قلم سے مذیل رکعات تراویح کے نام سے شائع ہوا جس نے غیر مقلدین کو خاموش کردیا۔

البانی جو عربی دنیا میں اپنی حدیث دانی کی دھاک بٹھائے ہوئے تھے، ہندوستان کے غیر مقلدین بھی اس پر ناز کرتے تھے، حضرت مولانا نے چار جزء میں "الألبانی شذوذہ وأخطاءہ" کے نام سے ایسا تعاقب کیا کہ حدیث کے اس بحر بیکراں کو ذرا سی آب جو ثابت کر دیا، جس میں چند چلو پانی ہو، عربی دنیا میں سب سے زیادہ اشاعت پذیر یہ کتاب ہوئی اور پھر دوسرے علماء عرب کا بھی ہیاؤ کھل گیا، انھوں نے بھی البانی کی تردید وتعاقب کیا۔

ہر مدعی کے واسطے علم سنن کہاں

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

"التنقید السدید علی التفسیر الجدید" کے نام سے خواجہ عبدالحیٔ پروفیسر جامعہ ملیہ کا رد کیا، جس پر مولانا تھانوی نے مبارکباد دی اور دعائے برکت سے نوازا۔

رضا خانیت جو حقیقت میں سلاطین وامراء کی پیداوار ہے، انھوں نے اپنے سجدۂ تعظیمی، آداب وکورنش کے جواز کے لئے علماء سوء کی ایک ٹولی کو قبروں پر کھڑا کر دیا، اور اس طرح کے لوگوں نے اس جماعت کی سرپرستی کی، ان میں کوئی بالغ نگاہ عالم پیدا نہیں ہوا، ابوالفضل فیضی کی طرح دنیادار علماء ہمیشہ اس جماعت سے وابستہ رہے، لے دے کے ان میں مولانا احمد رضا خاں صاحب کی شخصیت نظر آتی ہے، جو پہلے اعلیٰ حضرت تھے، اب امام احمد رضا ہو گئے ہیں، انھوں نے اپنے طریقہ کی تائید میں بہت کچھ لکھا، مگر مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ان کی خوبیاں گنانے کے بعد کثیر الشتم علی معاصریہ وشدید التکفیر لکھ کر ان کی پوری تاریخ لیاقت، علم وہنر سامنے کر دیا، اس لئے مولانا نے ان کے خلاف بہت کم لکھا کہ یہ لوگ مخاطبت کے لائق ہی نہیں تھے، پھر بھی مولانا نے دو رسالے شارع حقیقی اور احکام النذر لاولیاء اللہ تصنیف فرمائے، خود احقر نے اپنی کمسنی کے زمانے میں ادری کے مناظرہ میں علماء رضا خانی مولانا حشمت علی وغیرہ کو دیکھا کہ دونوں ہاتھ میں تسبیح اور منھ میں بدگوئی وسب وشتم کے سوا کچھ نہ تھا۔

- مولانا کا ادب بھی غیر معمولی تھا، اس سلسلہ میں عربی مراثی اور دوسرے کلام سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ صرف نثر ہی نہیں نظم پر بھی یکساں قادر ہیں۔

۷:- مولانا عربی اردو فارسی زبان پر یکساں کمان رکھتے تھے۔

- مولانا کا حافظہ سابقین اولین کی طرح تھا، اس کا ثبوت ان کتابوں کے علاوہ اس بیت بازی سے، جو مولانا عبدالرحیم فاروقی اور مولانا کے مابین جب کبھی وہ مئو آتے، کئی کئی رات صبح تک جاری رہتی، ہوتا ہے۔

- مولانا ذکاوت کے اعتبار سے بھی عبقری تھے، ان کی ذکاوت، اصابت رائے کا اندازہ ان کی تصانیف سے کیا جا سکتا ہے۔

- مولانا نے مفتاح العلوم مئو میں صدر مدرسی کیلئے مولانا ابوالحسن عراقی، جو مولانا کے استاذ بھی ہیں، کی پیشکش کو قبول کیا، پھر اسی مدرسہ کے ہو کر رہ گئے، تا آنکہ سیاست حاضرہ کے بعض افراد کی ناشائستگی، جو علمی ماحول ومزاج کے بالکل خلاف ہے، سامنے آنے سے مولانا کی بددلی کا سبب بنی، اور مولانا نے اپنے ہی ہاتھوں سے سینچے ہوئے اس باغ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

- مرقاۃ العلوم کا قیام آپ کی حیات میں ہو گیا، اس کی عمارت کا بیشتر حصہ آپ کے دور حیات میں تعمیر ہو گیا، آپ کے صاحبزادے مولانا رشید احمد اعظمی اسے پروان چڑھا رہے ہیں۔

مولانا کو دنیاوی وجاہت ومناصب میں سے بھی بے منت غیرے بہت سے مناصب ومراتب نصیب ہوئے، آپ نے دارالعلوم دیوبند کے صدر الافتاء وصدر مدرسی کو قبول نہیں کیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث رہے، اس کی عاملہ کے ممبر اور دارالعلوم کے شوریٰ کے ممبر رہے، یوپی اسمبلی کے ممبر رہے، اس زمانہ میں سمپورنانند جو وزیر اعلیٰ اور پارٹی کے لیڈر تھے مولانا کو کسی بزرگ کے مکتوب پر کسی کام کے انجام نہ دینے کو لکھا، جب سمپورنانند نے اس کا ذکر کیا تو مولانا نے ان سے بے نیازانہ بیباکانہ فرمایا کہ میں نے آپ سے ٹکٹ طلب کیا تھا؟ کوئی وعدہ کیا تھا؟ آپ کی کانگریس کو دو سیٹیں جیتنی تھیں اور وہ کام میرے بغیر نہ ہوتا، اس لئے آپ نے ٹکٹ دیا تھا، وہ کام ہو گیا، میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو مجھ سے اس سوال کی کیسے ہمت ہوئی، اس پر وزیر اعلیٰ خاموش ہو گئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا میں دنیاوی اعزاز واحترام سے بے رغبتی غیر معمولی طور سے تھی، مزید روشنی کیلئے منتخب ہونے کے بعد جو مکتوب مفتی ظفیر الدین کے نام لکھا ہے، معلوم ہوگا، ان سب کے باوجود دوبارہ آپ ہی کو کانگریس نے نامزد کیا، آپ کے انکار پر مولانا (عبد اللطیف) نعمانی کے حصہ میں یہ اعزاز آیا۔

- صدر جمہوریہ نے آپ کو عربیت کی سند افتخار پیش کی۔
- آپ کو امیر الہند کا خطاب دیا گیا، یہ وہ خطاب ہے جو مولانا آزاد کو بھی علماء ہند لاہور میں پیش نہ کر سکے تھے۔
- مولانا مختلف یونیورسٹیوں کے ممتحن رہا کیے، اور بعض کے ایکزیکیٹو کے ممبر بھی رہے۔
- سید سلیمان ندوی آپ سے حدیث اور فقہ کے مسائل میں بلا تکلف رجوع کرتے اور آپ کی اصابت رائے پر عمل کرتے، سید صاحب نے

میرے سامنے والد صاحبؒ سے یہ بات کہی کہ فقہی مسائل میں ان کی نظر دقیق ہے، اس لیے ان سے رجوع کرتا ہوں۔ میرے والد گرامی باوجود معاصر ہونے کے مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ مولانا حبیب الرحمٰن کی نظر حدیث پر شاہ انور کشمیری کی طرح ہے۔

مسند احمد جس کی تحقیق علامہ احمد محمد شاکر نے کی اس پر ان کے ملاحظات دیکھنے کے بعد مولانا کو جو مکتوب انھوں نے بھیجا اس سے اندازہ کیجئے کہ مولانا کا علمی مقام اور احترام ان کے دل میں کس قدر تھا، ان کے خط کے ایک حصہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

آپ کا عمدہ گرامہ نامہ ملا، آپ کی ہر گرفت قابل قدر لائق تسلیم ہے، میں یہ آپ کی دلجوئی اور مدارات کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اعتراف حقیقت کے طور پر کہہ رہا ہوں، اس گراں بہا عنایت پر دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں، امید کہ آپ سنت مطہرہ نبوی کی خدمت کے جذبے میں اپنی رہنمائی اور ملاحظات سے مزید نوازیں گے، آپ کے ان ملاحظات کو دیکھ کر میں نے یہ جان لیا کہ آپ اس دور کے عظیم ترین علماء حدیث میں سے ایک ہیں۔

مولانا کو جو قبول عام حاصل ہوا، وہ مئو کی پوری تاریخ میں سے کسی کو نہ ملا، نہ کسی عالم کو نہ صوفی کو نہ شاعر کو، لوگ مولانا پر پروانہ وار گرتے تھے، آپ کے چند کلمات سننے کو اپنی سعادت جانتے، ان کے ہاں نشست برکت مانتے، چنانچہ ان کی موت کے بعد رمضان کے مہینہ میں مارچ کی کھلی دھوپ میں تقریباً دو لاکھ عوام شریک نماز جنازہ ہوئے، عمل تدفین افطار صوم کے بعد تک جاری رہا، **رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ ومغفرۃ تامۃ۔**

سوانح نگار عزیز گرامی ڈاکٹر مسعود احمد مولانا کے نبیرہ ہیں، ابھی کم عمر ہیں، اور یہ عمر کمتر بعلم برتر کی بہترین مثال ہیں، ماشاء اللہ انھوں نے سوانح کے تمام ہی گوشے کو بہت سلیقے سے جمع کیا، پھر شگفتہ اردو میں منتقل کیا، عربی زبان پر تو وہ قادر تھے ہی، انگریزی عبارتوں کے ترجمہ سے جو نہایت درجہ شگفتہ وشائستہ ہیں، ان کی قدر ومنزلت میرے دل میں اور بڑھ گئی ہے، مولانا کی ''نصرۃ الحدیث'' کا عربی ترجمہ جو زیر طباعت ہے، پھر ''المآثر'' کا استدراک والا حصہ ان کے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی شہادت ہیں، دعا ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، اگر قلم کے بجائے رقم کر دیا جائے تو ذومعنیٰ ہو جائے گا۔

میں یہ مضمون اپنے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں:

باد بہار گلشن علمت چناں وزید
کز وے ہزار باغ بہ ہندوستاں دمید

حضرت امیرِ شریعت ابوالمآثر مولانا اعظمیؒ

امتیازات — علمی خدمات

مولانا برہان الدین سنبھلی★

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، أما بعد: فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، قال اللہ تعالیٰ:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (سورہ المائدۃ، آیت، ۳)

اس آیت کے نزول کی زمانی اور مکانی اہمیت سے قطع نظر اس میں جو تین اہم باتیں یا خوشخبریاں سنائی گئی ہیں، وہ تاریخی لحاظ سے بھی (جیسا کہ مستقبل سے معلوم ہوا) بڑی مہتم بالشان ہیں۔ یہاں پر ماضی کا صیغہ حال و مستقبل کے لئے بھی ہیں۔ (جیسا کہ بعض مفسرین مثلاً زمخشری نے لکھا ہے)

پہلی میں تو دین یعنی عقائد، معاملات، دیانات، فرائض وواجبات، مطلوبات ومنہیات کا ذکر ہے، اور اخیر والی میں ان ہدایات پر عمل کرنے والوں کے لیے کامل رضا مندی کا اعلان ہے۔ ان سب سے اہم درمیانی حصہ میں ایسی خوشخبری ہے جو گویا تاریخی اور واقعاتی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس میں اتمام نعمت کا ذکر ہے جو بڑا وسیع اور ہمہ جہتی میدان ہے۔ اس میں اقتدار، حکومت، دولت، عزت اور وجاہت سب شامل ہیں، چنانچہ پوری دنیا نے دیکھا کہ بہت تھوڑی مدت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی (حضرت عمرؓ کی وفات تک) بہت کچھ ظہور پذیر ہو گیا کہ نہ صرف عرب بلکہ اس کے ملحق تمام خطے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اور وہاں کے سب لوگ اپنے کو عرب کہنے اور سمجھنے لگ گئے اور اپنا سب کچھ بدل لیا، حتی کہ ان کی زبان بھی عربی ہو گئی مثلاً شام ومصر، چنانچہ وہ سب عرب ملک شمار ہونے لگے اور ان میں مصر وشام نے تو قائدانہ حیثیت حاصل کر لی۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس سے متصل اور بہت سے ملک مثلاً مراکش، الجزائر، تیونس بھی اسی رنگ میں رنگ گئے، اور یہ کہنا اور سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں حضرت عثمانؓ کا زمانہ خلافت ختم ہوتے ہوتے تقریباً آدھی دنیا جس میں ہندوستان کا ایک حصہ (سندھ) بھی شامل ہے، اس پیشین گوئی کے زیر اثر آ گیا یعنی اتمامِ نعمت کا مظہر بن گیا۔ (فالحمد للہ علی ذالک)۔

اتمام نعمت کا یہ ایک پہلو ہے، دوسرا اس سے اہم اور مفید تر پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ علوم بھر پور طریقے سے حاصل ہوں اور اس پر عمل کی پوری توفیق ہو۔ پہلے تو عربوں کو اللہ نے ان دونوں پہلوؤں سے خوب خوب نوازا، لیکن بعد میں اس کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ عربوں سے ذرا ہٹ کر رہنے والوں کو اس دوسرے پہلو سے نوازے، (کل یوم ھو فی شأن) چنانچہ علم حدیث جیسی دولت عربوں سے نکل کر رفتہ رفتہ دوسروں میں جانے لگی، اس کی سب سے نمایاں نظیر یہ کہی جا سکتی ہے کہ حدیث نبوی کے اہم مجموعے – جسے صحاح ستہ کہا جاتا ہے – کے مصنّفین میں کوئی بھی عرب نہیں، حتی کہ اس کے سرخیل امام بخاریؒ جن کی کتاب کو (أصح الکتب بعد کتاب اللہ) کہا گیا، وہ بھی عرب نہیں، ان کی پیدائش، نشو ونما مہبط وحی سے کوئی ایک ہزار میل دور بخاری میں ہوئی، جسے روسی ترکستان کہا جاتا تھا، یہی حال دیگر پانچوں مصنّفین کا بھی ہے، ان میں صرف امام مسلم مستثنیٰ ہیں کہ وہ نسلاً تو عرب ہیں (قشیری) لیکن وطناً وہ بھی عجمی ہیں (نیشاپوری)، یہ واقعہ یعنی صحاح ستہ کی ترتیب وتدوین کا تیسری چوتھی صدی ہجری کا ہے۔

یہ معکوس رفتار برابر چلتی رہی اور بُعد بڑھتا رہا، جو تیرہویں چودہویں صدی ہجری (انیسویں بیسویں صدی عیسوی) میں اتنا بڑھ گیا کہ علم حدیث سے شغف اور محبت رکھنے والے خون کے آنسو روئے اور سخت رنجور وملول ہوئے، جس کا اظہار گویا کہ خون کے آنسوؤں سے علامہ رشید رضا مصری (جو خود بہت بڑے عالم، مفسر، صحافی اور دیدۂ بینا رکھنے والے تھے) نے ”مفتاح کنوز السنۃ“ کے مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ داستان اردو میں متعدد علوم کے بحر بیکراں علامہ مناظر احسن گیلانیؒ نے بڑے درد کے ساتھ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ”ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت“ میں بڑے مؤثر اور دل دوز انداز میں سنائی ہے، علامہ رشید رضا مصری نے ایک ایک عرب ملک کا نام لے لے کر لکھا ہے کہ وہاں سے علم حدیث گویا کہ مٹ چکا ہے، بس ہندوستانی علمائے حدیث نے اسے سنبھالا دیا ورنہ مشرقی دنیا سے بھی مٹ چکا

★ رئیس قسم التفسیر واستاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ہوتا، علامہ مصری کے الفاظ یہ ہیں:

"لولا عناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال من أمصار الشرق"۔

مگر اسی کے ساتھ مولانا گیلانیؒ نے یہ خوش آئندبات بھی رقم کی ہے کہ علامہ رشید رضا موصوف اپنی ہندوستان آمد کے موقع پر (بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں) جب ام المدارس دارالعلوم دیوبند گئے، اس وقت وہاں علم بالخصوص حدیث کے علم کی کہکشاں سجی ہوئی تھی، وہاں ان کا استقبال علم حدیث کے نیر اعظم علامہ انورشاہ کشمیریؒ نے عربی میں تقریر کرکے کیا تو علامہ رشید رضا مصری مبہوت رہ گئے، اور بار بار اپنی نشست سے خوش ہوکر اچھل اچھل پڑتے تھے اور ان کی زبان سے نکلتا تھا (ما رأيت مثل هذا الرجل قط)۔

راقم الحروف (محمد برہان الدین سنبھلی قاسمی) کا خیال ہے کہ اگر علامہ رشید رضا مذکور ہمارے مخدوم ابوالمآثر علامہ حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کا وہ نوٹ پڑھ لیتے، جو موصوف نے محدث احمد محمد شاکر صاحب کو بطور استدراک لکھا تھا، تو علامہ رشید رضا مصری شاید اس سے زیادہ خوش ہوتے جتنا کہ علامہ کشمیریؒ کی تقریر سے ہوئے تھے۔

محدث اعظم علامہ اعظمیؒ کا امتیاز:

چونکہ محدث اعظمیؒ زیادہ تر متقدمین محدثین عظام مثلاً محدث عبدالرزاق صنعانیؒ اور ابن ابی شیبہؒ (جو استاذ تھے امام بخاریؒ کے بھی) وغیرھم کی تصنیفات سے اعتناء رکھا، ان کے حواشی لکھے، اور انھیں ایڈٹ کیا، ان کی ہر طرح علمی خدمت کی، اس بنا پر موصوف کا احادیث شریفہ کے نقد ونظر اور جانچ پرکھ کے معاملے میں وہی ذوق بن گیا، جو متقدمین (دوسری صدی ہجری سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک کے محدثین) کا تھا، یعنی ہر روایت کے راوی کا پوری طرح جانچ پڑتال اور تحقیق کے بعد مرتبہ متعین کرنا، پھر روایت میں جتنے راوی آئے ہیں، ان سب کی حیثیات ملحوظ رکھ کر ان کی مرویات کا درجہ طے کرنا، یہ ذوق پانچویں صدی ہجری کے بعد برابر برابر کم ہوتا رہا، یہاں تک بعد میں گویا بالکل ختم ہوگیا، اب شاید ہی برصغیر میں اس ذوق کا کوئی حامل ملے، راقم کی نظر میں موصوف کے علاوہ قریبی زمانہ میں صرف دو شخص اور اس ذوق کے حامل ہوئے ہیں، علامہ شوق نیمویؒ اور مولانا یوسف بنوریؒ ان کے علاوہ اور کوئی نظر میں نہیں۔ محدث اعظمیؒ نے اپنے اس ذوق اور طرز عمل کو اپنی تصنیفات میں بکثرت خاص طور پر ان میں جن میں مناظرانہ بحثیں تھیں، خوب استعمال کیا، مثلاً "الأزهار المربوعة" اور "الأعلام المرفوعة في حكم الطلقات المجموعة" میں اپنے اسی طرز کو استعمال کرکے مدمقابل کو لاجواب کیا، کیونکہ وہ اس ہتھیار سے خالی تھے، گویا ؎

"لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

کے مصداق تھے، اس لیے میدان سر کرنا آسان ہوگیا اور تین طلاق تین رہی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، اس کتاب کے ذریعہ موصوف نے عیسائی طرز استدلال (تین ایک ہیں اور ایک تین ہیں) کو جیسا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ کہتا ہے تین طلاق ایک ہوتی ہے کے نظریہ کو پاش پاش کرکے جمہور مسلمانوں کو آسودہ کیا اور تشویش دور کی، اسی طرح ایک اور کتاب "رکعات تراویح" لکھ کر ہر سال رمضان سے قبل شائع ہونے والے اخباری سائز کے اشتہارات جس میں بیس رکعات کو سنت ثابت کرنے والوں کے لیے بڑے بڑے فرضی انعامات کے اعلانات ہوتے تھے، اس سے ایک حد تک نجات دلائی، اور عام مسلمانوں کو ذہنی سکون بخشا، اور بیس رکعات تراویح کو (العیاذ باللہ) بدعتِ عمری کہنے والوں کے منھ بند کردیے۔ اور علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب میں ثابت کیا بیس رکعات یا اس سے زیادہ تراویح حرمین شریفین سمیت پورے عالم اسلام میں ساڑھے بارہ سو سال یا اس سے زیادہ مدت تک بلا اختلاف پڑھی جاتی رہی، اور اس کے لیے ایسے دلائل دیے کہ کسی مخالف سے اس کا حقیقی رد نہیں ہوسکا (فجزاه الله خير الجزاء)۔

علاوہ ازیں علامہ اعظمیؒ ایسی بہت سی حدیث کی کتابوں مثلاً "مسند حمیدی" اور "سنن سعید بن منصور" کو قیمتی حواشی سے مزین کرکے منظر عام پر لانے کا ذریعہ بنے، جن کے استفادہ سے دنیا محروم چلی آرہی تھی (فغفر الله له وأعلى درجاته)۔

مولانا اعظمیؒ اپنے زمانہ کے بہترین اور کامیاب استاذ حدیث بھی رہے، جن کے بے شمار شاگرد ہوئے، ان میں بعض بہت ممتاز تھے، مثلاً مولانا عبدالجبار اعظمیؒ۔

محدث اعظمی موصوفؒ کے سارے کارناموں کا اس وقت ذکر کرنا نہ مقصود ہے اور نہ ممکن، بس ان کے کمالات کی کچھ جھلکیاں دکھانا سردست پیش نظر ہے۔ تفصیل کے طالب علامہ کی سوانح حیات پر لکھی دو ضخیم جلدوں میں (حیات ابوالمآثر) دیکھیں، جسے ان کے نہایت لائق وفاضل نواسے مولانا ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی مدظلہ نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔

(فجزاه الله عنا وعن جميع المسلمين خير الجزاء)

□□

تعارف

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ★

درج ذیل تحریر ''مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ اور ان کی علمی خدمات'' نامی کتاب کے تعارف کے طور پر لکھی گئی تھی، جس میں حضرت محدث الاعظمیؒ کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کا ایک جامع تعارف پیش کر دیا گیا ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے اس مجموعے میں اس کو شامل کیا جارہا ہے۔

عصر حاضر میں علمی تحقیق کی اختصاصی ڈگری (پی-ایچ-ڈی) کے لیے کسی خاص موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا نہایت مفید طریقہ رائج ہے، اس کے لیے بعض اوقات اہم علمی شخصیات کو موضوع بنایا جاتا ہے اور اگر مقالہ نگار علمی دیانت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عرق ریزی سے کام لے تو متعلقہ شخصیت پر نہایت مفصل، جامع اور مواد سے بھرپور ایسی کتاب وجود میں آجاتی ہے جو اس شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے اور دوسروں کے لیے ایک مفید دستاویز کا کام دیتی ہے۔

اس وقت ایک ایسی ہی کتاب پیش نظر ہے جو محترم مولانا محمد صہیب صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس میں انھوں نے محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہ کی حیات وخدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ حضرت محدث کبیر کا نام، اقلیم علم وفن کے تاجداروں میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے وہ درحقیقت علماء کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جن کا امتیاز علوم وفنون کی جامعیت ہوتی ہے، لیکن ان کا اختصاصی میدان علم حدیث اور اسماء الرجال تھا، اور وہ ہندوستان میں خدمت حدیث کی تابناک روایت کی ایک روشن کڑی تھے۔

ہندوستان میں صہبائے مدینہ کے میخواروں اور خدمت گذاروں کی پاکیزہ روایت شیخ علی متقیؒ، شیخ محمد طاہر پٹنیؒ، اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، سے ہوتی ہوئی مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ذریعہ نہایت جامعیت کے ساتھ آگے بڑھی اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے اولاد واحفاد اور سلسلۂ تلامذہ کے واسطہ سے علماء دیوبند اس کے حاملین وامین قرار پائے، جنھوں نے اس امانت کو قریہ قریہ پہنچا کر گھر گھر کو اس کے نور سے منور کر دیا، خاص طور پر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارن پوریؒ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ حضرات کے ذریعہ حدیث نبوی کی وہ خدمت ہوئی کہ قرون ماضیہ کی یاد تازہ ہوگئی اور شاعر کو کہنا پڑا۔

ساقیٔ دہلی کے مستوں نے بارض دیوبند
جب رکھی بنیاد میخانہ بطور یادگار
دور دورہ ساغر صہبائے طیبہ کا ہوا
جرعہ نوشانِ ازل آئے قطار اندر قطار
قاسمؔ ومحمودؔ وانورؔ نے لنڈھائے خُم کے خُم
اپنی وسعت کے مطابق پی گیا ہر بادہ خوار

اور انہی خدمات کے آثار ومظاہر کو دیکھ کر مصر کے صاحب نظر عالم اور باخبر مبصر علامہ سید رشید رضا مرحوم علماء ہند کی بلند پایہ خدمتِ حدیث کے اعتراف پر مجبور ہوئے اور ان کا قلم اس اعترافِ حقیقت پر مجبور ہوا کہ اگر ان قرون اخیرہ میں علماء ہند نے فنون حدیث کی خدمت کا بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو یہ علوم زوال کا شکار ہوجاتے۔

اس وقت عمومی طور پر علماء دیوبند کی خدمت حدیث کا جائزہ لینا مقصود نہیں بلکہ مختصر طور پر یہ دکھانا تھا کہ حضرت محدث اعظمی اس روشن تاریخ کے تسلسل کا ایک زریں کردار تھے، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں علم وفن کے آسمان پر جو نامور علماء آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور ان کے غروب کے بعد بھی اہل علم ان کے زندہ وجاوید آثار سے استفادہ کرتے ہیں ان شخصیات میں حضرت مولانا کا نام نہایت ممتاز ہے، بیسویں صدی میں عالم اسلام بشمول ہندوستان میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ زاہد کوثریؒ اور شیخ احمد محمد شاکرؒ وغیرہ کے بعد علوم حدیث کے تابناک افق پر جو ستارے نہایت آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوئے ان میں شیخ عبدالفتاح ابوغدۃؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، وغیرہ کے ساتھ ایک نہایت نمایاں نام محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کا بھی ہے۔ اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے نامور خدام حدیث کی کوئی فہرست بھی مولانا کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

حضرت مولانا کا علم حدیث سے لگاؤ فطری تھا، ان کا ذوق خالص محدثانہ ومحققانہ تھا، انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں امام العصر علامہ انور شاہ

★ استاذ حدیث، دارالعلوم دیوبند

کشمیریؒ سے استفادہ کیا تھا، پھر جب آب وہوا کی ناموافقت کے سبب دیوبند سے جانا پڑا تو اپنے وطن میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی اور مشہور محدث حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ سے حدیث کی تکمیل کی تھی، فراغت کے بعد تالیف وتدریس کے ذریعہ مسلسل خدمتِ حدیث میں مصروف رہے۔

علمی دنیا خصوصاً عالم عرب میں ان کی شہرت کا نقطۂ عروج ان کے وہ استدراکات تھے جو انھوں نے مصر کے مشہور ومعروف محقق شیخ احمد محمد شاکر کی تعلیقات علی مسند احمد پر کیے تھے، اور ان کو شیخ کے پاس بھیج دیا تھا، شیخ نے ان کو اپنی کتاب میں شامل کرتے ہوئے مولانا اعظمیؒ کے تبحر علمی اور دقت نظر کی دل کھول کر داد دی اور ان کا شکریہ ادا کیا، یہ چیز بجائے خود شیخ کی علمی دیانت اور وسعت قلبی کے ساتھ ساتھ مولانا اعظمیؒ کے استدراکات کی صحت اور علمی وقعت کی بین دلیل تھی۔

اس کے بعد حضرت محدث اعظمیؒ نے اس فن کی خدمت کے لیے کئی سنگلاخ وادیوں کو منتخب کیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ ان سے عہدہ بر آ ہوئے، ان میں سے بعض نمایاں کام حسب ذیل ہیں:

(۱) مسند حمیدی- تحقیق وتعلیق:

مسند حدیث کی ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں صحابہؓ کی ترتیب سے روایات کو جمع کیا جاتا ہے، ہر صحابی کی تمام مرویات خواہ وہ کسی بھی موضوع سے متعلق ہوں ایک جگہ جمع کردی جاتی ہیں، مسند کے نام سے بہت سے محدثین نے کتابیں لکھی ہیں جن میں امام حمیدیؒ کا نام بھی نہایت ممتاز ہے امام حمیدیؒ امام بخاریؒ کے کبار اساتذہ میں سے ہیں، ان کی مسند غیر مطبوعہ شکل میں چلی آرہی تھی، حضرت محدث اعظمیؒ نے اس کے مختلف نسخوں سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اس پر تعلیقات کے علاوہ ایک جامع مقدمہ لکھا، یہ کتاب مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

(۲) کتاب الزہد والرقائق:

یہ دوسری صدی ہجری کے نامور عالم محدث مجاہد حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کی تصنیف ہے جس میں تذکیر وموعظت کی احادیث جمع کی گئی ہیں، یہ بھی غیر مطبوعہ شکل میں خال خال ہی کتب خانوں میں موجود تھی، محدث کبیر نے اس کے چند مخطوطہ نسخوں کی مدد سے صحیح نسخہ تیار کیا، اس کی احادیث کی تخریج کی، مشکل الفاظ کی توضیح کی، اور فہرست سازی کے علاوہ ایک مقدمہ تحریر فرمایا، یہ کتاب مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں سے شائع ہوئی۔

(۳) مصنف عبدالرزاق:

یہ عظیم کتاب دوسری صدی ہجری کے مشہور امام حدیث، عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کی تصنیف ہے جس کی اکثر روایات ثلاثی ہیں، اکیس ہزار احادیث کا یہ عظیم مجموعہ بھی تشنۂ طباعت چلا آرہا تھا، مولانا اعظمیؒ اس پر دس سال محنت کی، نسخہ کی تصحیح کی، احادیث کی تخریج اور تحقیق وتعلیق سے اس کو مزین کیا، یہ کتاب گیارہ جلدوں میں شائع ہوئی۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ:

یہ کتاب بھی حدیث کی امہات کتب میں سے ہے، اس کے مصنف، امام بخاری کے استاذ اور مشہور محدث ہیں، اس بے مثال کتاب میں احناف کے متدلات بھی بکثرت ملتے ہیں، یہ کتاب اگرچہ پہلے بھی چھپ چکی تھی، لیکن اس کے شایان شان تحقیقی کام اس پر نہیں ہوسکا تھا، حضرت مولانا نے بعض اہل علم کے اصرار پر اس عظیم کتاب کی بھی تصحیح اور تحقیق وتعلیق کا کارنامہ انجام دیا۔

یہ مولانا کے بے شمار علمی کاموں سے چند اہم خدمات کا اجمالی تذکرہ تھا ورنہ ان کی علمی فتوحات کی فہرست اس سے کہیں زیادہ طویل ہے، جن کی تفصیلات آپ زیر نظر کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے، ان عظیم علمی کارناموں کی بدولت ان کا نام حدیث نبوی کے عالی مرتبت خدام میں جلی حروف سے لکھا جا چکا ہے۔

پھر یہ کہ ان کی خدمات صرف علم حدیث تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ دیگر بہت سے علوم وفنون بھی ان کی خدمت کے دائرے میں آتے ہیں، تفسیر، فقہ، تاریخ وتذکرہ، مناظرہ وغیرہ میں ان کی باقاعدہ تصانیف کی ایک وقیع تعداد ہے، اسی کے ساتھ وہ زبان وادب کے بھی شہ سوار ہیں اور اردو فارسی عربی پر ان کو یکساں قدرت ہے، اور ان تینوں زبانوں میں نظم ونثر میں ان کے نقوش زندہ وتابندہ ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی شخصیت کس قدر علوم وفنون کی جامع ہے۔

اس علمی جامعیت خصوصاً حدیث میں اس درجہ وسعت نظر کے ساتھ ان کی جو خصوصیت نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ حنفیت اور اکابر واسلاف کے مسلک پر ان کا ثبات واستحکام ہے، حدیث پاک سے اشتغال رکھنے والے علماء میں بعض اوقات جو غیر ضروری توسع پیدا ہوجاتا ہے اس سے حضرت مولانا کی ذات بری ہے، وہ اکابر دیوبند کی طرح تھے کہ انھیں کسی مسئلے میں اشکال پیدا نہیں ہوا یہ ان کی بالغ نظری کی علامت ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ نے ان کو دین میں تفقہ اور گہری بصیرت کے بلند پایہ وصف سے حظ وافر عطا کیا تھا۔

ان علمی خصوصیات کے علاوہ ان کی عظیم شخصیت اور بھی بے شمار اوصاف کمال سے متصف تھی، تصوف وسلوک میں ان کا مقام بہت بلند تھا، اصابتِ

رائے ان کا خاص جوہر تھا، جس کی بنیاد پر وہ معاملات میں صحیح فیصلہ تک بآسانی پہنچ جاتے تھے، علمی تنقید اور اس میں دیانت پر کاربند رہنے کے عادی تھے، نہایت درجہ مردم شناس تھے مزاج میں اہل کمال کی طرح نزاکت تھی، لیکن تمام اوصاف کمال کے باوجود تواضع اور اکابر کا احترام حد درجہ پایا جاتا تھا، ان کی ذات علم وعمل کی جامع تھی، اور بلا شبہہ ان کا شمار ان اہل کمال میں تھا جن کی مثالیں کم پیدا ہوتی ہیں۔ جو ''در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق'' کی صفت سے متصف ہوتے ہیں، جن کی شخصیت نہ تو علم وفن کے کسی ایک شعبہ تک محدود ہوتی ہے اور نہ صرف علم یا صرف عبارت کو ان کی پہچان قرار دیا جاسکتا ہے، بلکہ ان کی ذات علوم وفنون اور اخلاق وکردار دونوں میں مقام بلند پر فائز ہوتی ہیں۔

ایسی جامع شخصیات کے احوال وسوانح کا سامنے آنا ان کے حق کی ادائیگی بھی ہے اور بعد والوں کے لیے رہنمائی بھی، اس لیے حضرت مولانا قدس سرہ پر مختلف اہل قلم نے خامہ فرسائی کی ہے، جن میں اب تک سب سے نمایاں مقام ان کے نواسے مولانا ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی کی کتاب ''حیات ابوالمآثر'' کا ہے، اور اب یہ دوسرا مفصل تحقیقی کام جناب مولانا محمد صہیب صاحب الہ آبادی کے قلم سے سامنے آرہا ہے۔

اس کتاب کو انھوں نے پانچ ابواب پر مرتب کیا ہے۔

باب اول میں بیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی وثقافتی احوال کا جائزہ لیا گیا ہے، جس کے تحت مختلف سیاسی تحریکات کے علاوہ علمی تحریکات دیوبند، علی گڈھ اور ندوہ جیسے اداروں کا پس منظر اور مختلف فکری رجحانات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اس باب کا مقصد در اصل اس دور کو قارئین کے سامنے واضح کرنا ہے جس میں حضرت محدث اعظمی نے آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی۔

دوسرے باب کا عنوان ہے سوانح حیات، اس میں ولادت سے وفات تک کے حالات کا مختصر بیان ہے، اس میں ولادت، نام ونسب، تعلیم وتربیت، تدریسی سرگرمیاں، بیعت وسلوک، سیاسی وسماجی سرگرمیاں اور وفات سب کا بیان آگیا ہے۔

تیسرا باب مختلف علوم وفنون سے متعلق خدمات کے موضوع پر ہے، یہ باب اس کتاب کا خلاصہ اور سب سے مفصل باب ہے جو محدث اعظمیؒ کی اصل شخصیت کا تعارف کراتا ہے۔

سب سے پہلے تفسیر قرآن سے متعلق ان کی بعض وقیع تحریروں کا تذکرہ اور مفصل جائزہ ہے۔

اس کے بعد حدیث کے عنوان کے تحت مولانا کی خدمات کی تفصیل ہے، اس عنوان کے تحت جن عظیم کتابوں کی تالیف، تحقیق، تعلیق، اور تصحیح وغیرہ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:

(۱) الحاوي لرجال الطحاوي
(۲) منية الألمعي في ما فات من تخريج أحاديث الهداية للزيلعي
(۳) كتاب الثقات لابن شاهين
(۴) انتقاء الترغيب والترهيب
(۵) رسالة الأوائل
(۶) مسند حميدي
(۷) كتاب الزهد والرقائق
(۸) سنن سعيد بن منصور
(۹) مجمع بحار الأنوار
(۱۰) مصنف عبد الرزاق
(۱۱) المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية
(۱۲) فتح المغيث بشرح ألفية الحديث
(۱۳) تلخيص خواتم جامع الأصول
(۱۴) كشف الأستار عن زوائد البزار على الكتب الستة
(۱۶) مصنف ابن أبي شيبة
(۱۶) حياة الصحابة

اس کے بعد استدراکات کا عنوان ہے جس میں سب سے پہلے شیخ احمد محمد شاکر کی تعلیقاتِ مسند احمد پر مولانا کے استدراکات کی تفصیل ہے، اس کے بعد شیخ ناصر الدین البانی پر مولانا کے استدراکات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جو الالبانی شذوذہ وأخطاؤہ کے نام سے طبع ہو چکے ہیں، پھر الرفع والتکمیل جو مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی تصنیف ہے اور اس پر شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تعلیقات ہیں اس پر مولانا کے استدراکات کی تفصیل بیان کی گئی ہے پھر مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کی تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی پر مولانا کے استدراکات کا تذکرہ ہے۔

ان تحقیقات وتعلیقات کے بعد اسماء الرجال میں مولانا کے مقام بلند کا تذکرہ اور اس کے شواہد پیش کیے گئے ہیں پھر حدیث کی حجیت وصداقت پر مولانا کی محققانہ تالیف نصرۃ الحدیث کا تذکرہ ہے، اس کے علاوہ پانچ چھ مزید کتب کا ذکر ہے جن پر مولانا کی تعلیق ہے، آخر میں محدث اعظمیؒ سے حدیث کی اجازت حاصل کرنے والے مشہور علماء کی فہرست ہے جس میں اس

دور کے تقریباً سبھی بڑے بڑے عرب علماء نظر آتے ہیں۔ اور اسی پر حدیث کا عنوان مکمل ہوتا ہے۔

اس کے بعد فقہ کا عنوان ہے جس میں مولانا اعظمی کی فقہی تالیفات کا جائزہ ہے اس میں الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ، الازہار المربوعہ فی رد الآثار المتبوعہ، رکعات تراویح، رہبر حجاج، وغیرہ تقریباً سات آٹھ تالیفات کا مفصل تذکرہ اور بیس پچیس فقہی مقالات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔

فقہ کے بعد مناظرہ کے عنوان کے تحت رد شیعیت، رد غیر مقلدیت، رد بریلویت، وغیرہ کے تحت دس بارہ تالیفات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

اس کے بعد تاریخ وتذکرہ کا عنوان ہے جس میں پانچ چھ تالیفات کا تعارف اور پندرہ سولہ مضامین کی فہرست دی گئی ہے، اس باب کا آخری عنوان ادب ہے جس کے تحت عربی اور اردو نظم ونثر پر محدث اعظمی کی قدرت اور اس میدان میں ان کی مہارت کا تذکرہ، ان کی اردو عربی نثر کے نمونے، اسی طرح عربی نظم اور اردو میں غزل، نعت اور تاریخ گوئی وغیرہ کے نمونے پیش کیے گئے ہیں اور اس طرح اس عنوان سے محدث اعظمی کی حیات اور صلاحیت کا ایک نیا گوشہ سامنے آتا ہے، جو غالباً اسی کتاب کی خصوصیت ہے۔

چوتھا باب متفرقات کے عنوان سے ہے جس میں مولانا کی چند متفرق کتابوں کے تعارف کے علاوہ تقریباً ساٹھ مضامین کی ایک فہرست دی گئی ہے۔

باب پنجم میں مولانا رحمہ اللہ کے متعلق اہل علم ونظر کی آراء پیش کی گئی ہیں جن سے مولانا کی ہشت پہلو شخصیت کے مقام بلند کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

آخر میں اختتامیہ کے عنوان کے تحت حضرت مولانا اعظمی کی حیات وخدمات پر ایک اجمالی تبصرہ ہے جو بیک نظر مولانا کی شخصیت کو سامنے لے آتا ہے۔

سب سے آخر میں کتابیات کا عنوان ہے جس کے تحت مؤلف نے ان مراجع کی فہرست دی ہے جن سے انھوں نے اپنے اس مفصل تحقیقی مقالہ میں استفادہ کیا ہے، اس فہرست میں ۱۶۷ عربی و اردو کتب، چار انگریزی و ہندی کتابیں اور ۳۲ رسائل ومجلّات شامل ہیں، یہ فہرست بجائے خود مؤلف کی عرق ریزی وجانفشانی کی بہترین گواہ ہے۔

مجموعی اعتبار سے کتاب اپنے موضوع پر نہایت کامیاب ہے جس کا مطالعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ جناب مولوی محمد صہیب صاحب نے اپنے مآخذ سے براہ راست اور بھرپور استفادہ کیا ہے اور اس طرح وہ تحقیقی مقالہ کی حیثیت سے اس نام کی آبرو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

دعاء ہے کہ باری تعالیٰ اس محنت کو قبول عام عطا کرے اور اس کو محدث اعظمی کی شخصیت اور خدمات سے استفادہ کا ذریعہ بنائے، آمین۔ ◻◻

فقیہِ وقت و محدّثِ عصر

پروفیسر شمس تبریز خان★

درج ذیل تحریر ''مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ اور ان کی علمی خدمات'' نامی کتاب کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ افادۂ عام کی غرض سے اس مجموعے میں اس کو شامل کیا جارہا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین وعلی آلہ وصحبہ وعلی من اتبعہم الی یوم الدین۔

بلادِ عربیہ کے بعد اسلام، علوم اسلامیہ اور اسلامی تہذیب وثقافت سے ہندوستان کا جو دیرینہ، گہرا اور ہمہ گیر تعلق رہا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے، جس کی شروعات حضرت آدمؑ کے ورودِ ہند سے ہوتی ہے، پھر رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث شریف سے اس تعلق کی تجدید ہوتی ہے کہ مجھے مشرق کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آتی محسوس ہوتی ہے، اور وہ متعدد احادیث اور آثار بھی اس تعلق کو مضبوط بناتے ہیں جنھیں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ) نے سبحۃ المرجان کے شروع میں درج کیا ہے۔

ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد گو یا وطنِ ثانی میں اقامت کی طرح تھی جہاں کی مہمان نوازیوں اور دل داریوں نے وطن اول کو بھی بڑی حد تک فراموش کرادیا، اسلام کے شجرِ طیب نے اس زرخیز زمین میں بہت جلد اپنی جڑیں جمالیں اور برگ وبار لانے لگا اور یہ ملک اسلامی تہذیب وتمدن، ادب وثقافت اور علوم وفنون کا دلکش گہوارہ بن گیا اور یہاں اسلامی تہذیب وثقافت کی کوئی ایسی شاخ باقی نہیں رہی جو نودمیدہ ونورسیدہ غنچہ وگل سے محروم رہ گئی ہو ؎

بہار آئے اور اس طرح سے بہار آئے
کہ گل تو گل ہی ہیں خاروں پر بھی نکھار آئے

ویسے تو علوم اسلامیہ کی ہر شاخ میں ہندوستانی علماء نے اپنی ذہانت وفطانت، دانائی وطباعی اور جدت وعبقریت کے نمونے پیش کیے ہیں خصوصاً حدیث وفقہ اور تفسیر وکلام کے میدانوں میں بڑے کارنامے انجام دیے ہیں لیکن حدیث نبوی سے ان کا تعلق عشق کی حد تک پہنچ گیا ہے اور انھوں نے شروع سے آج تک حدیث نبوی سے اپنے قلبی وذہنی، طبعی وجذباتی تعلق کے جس طرح مظاہرے کیے ہیں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے حدیث شریف کی خدمت کے اُنھیں ایسے مواقع ملے جو عالم اسلام میں کسی اور کو نہیں ملے اور انھیں اس سلسلے میں اولیت وافضلیت کی سعادت حاصل ہوئی، مثلاً حضرت ربیع بن صبیح تبع تابعی اور سندھی الاصل تھے، بصرہ میں قیام تھا، انھوں نے حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ، اور ثابت بنانی وغیرہ جیسے اکابر سے روایت کی اور ان سے وکیعؒ، اور ابوداؤد طیالسیؒ وغیرہ نے روایت کی نیز ان کے اساتذہ میں مجاہدؒ، یزید رقاشیؒ، حمید الطویل اور ان کے تلامذہ میں ابن المبارکؒ اور سفیان ثوریؒ کے نام بھی آتے ہیں ان کا شمار حدیث کے اولین مصنّفین میں بھی ہے، انھوں نے ۱۶۰ھ میں بھاڑ بھوت (گجرات) خلیفہ مہدی کی فرستادہ فوج کے ساتھ شرکت کی اور وہیں ایک بیماری میں انتقال کیا۔

ایسی ہی اولیت دوسرے ہندوستانی الاصل محدث ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی (م ۱۷۰ھ) کو حاصل ہے جو تابعی بھی ہیں اور سیر ومغازی کے اولین مصنّفین میں بھی ہیں ان کے اساتذہ میں سعید بن المسیبؒ، محمد بن کعب القرظیؒ، حضرت نافعؒ، ابن المنکدرؒ ہشام بن عروہؒ اور موسی بن عقبہ جیسے شیوخ تھے، اور تلامذہ میں سفیان ثوریؒ، عبدالرزاق صاحب المصنف، وکیع بن الجراحؒ، لیث بن سعدؒ، اور واقدیؒ، جیسے مشاہیر تھے۔

عہد سلطنت میں حدیث شریف کی نمایاں خدمت کی سعادت علامہ رضی الدین حسن بن محمد الصغانیؒ (م ۶۵۰ھ) کو بھی حاصل ہوئی جو لاہور سے جاکر بغداد میں مقیم ہوگئے تھے، ان کی لغت العباب الزاخر اور ابن سیدہ کی المحکم کو جمع کرکے مجدالدین فیروزآبادی نے مشہور عربی لغت القاموس تیار کی تھی۔

انھیں صحیح بخاری کے موجودہ متن کی تحقیق وتدوین کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور اپنے رسالہ الموضوعات میں تحقیق روایت اور درایت کے عملی نمونے بھی پیش کیے اور صحیح احادیث کی ترویج واشاعت کے لیے ''مشارق الانوار'' کے نام سے صحیحین کا انتخاب عوامل نحویہ کی ترتیب کے مطابق کیا اور یہ مجموعۂ احادیث ایسا مقبول ومروج ہوا جس کی بہت کم مثال ملتی ہے، ان کے شاگردوں میں عرب کے ساتھ افریقہ اور اندلس کے لوگوں کے نام بھی ملتے ہیں اور اس کے سیکڑوں حاشیے اور شرحیں لکھی گئیں اور ہندوستان میں تو وہ صدیوں تک حدیث کے نصاب درس میں شامل رہی ہے۔

علامہ سیوطی نے جمع الجوامع میں صحاح ستہ اور چند اور حدیثی مجموعوں کو جمع کرکے احادیث صحیحہ کا ایک دائرۃ المعارف مرتب کردیا تھا، شیخ علی متقی برہان پوریؒ (م ۹۷۵ھ) نے اسے نئی ترتیب دے کر اس سے استفادہ کو

★ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

آسان بنادیا جو کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال کے نام سے حدیث کے حلقوں میں مقبول ہوا، اس کی اہمیت کے اعتراف میں علامہ شوکانیؒ نے بجاطور پر یہ کہا تھا کہ:

للسیوطی منۃ علی العالمین وللمتقی منۃ علیہ (سیوطی کا احسان دنیا پر ہے اور علی متقی کا احسان خود ان پر ہے)

اسی طرح ان کے شاگرد شیخ محمد طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) اپنی کتابوں المغنی فی ضبط الرجال اور تذکرۃ الموضوعات کے لیے مشہور ہیں لیکن ان کا بڑا کارنامہ حدیث وقرآن مجید کی مشہور ومقبول لغت مجمع بحار الانوار ہے جو ابن الاثیر کی النہایۃ سے زیادہ جامع ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) حدیث کی عظیم درسی وتحریری خدمات کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، ہندوستان میں صحیحین اور مشکوۃ کے درس کے رواج میں ان کا بڑا ہاتھ ہے، الاکمال کے علاوہ شرح سفر السعادۃ اور لمعات واشعۃ اللمعات حدیث کی بہترین شرحیں ہیں۔حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) نے حجۃ اللہ البالغۃ کے ذریعے حدیث کے اسرار وحکم کے بیان اور اس کے فہم ودرایت کا ایک نیا باب کھولا جس نے پورے عالم اسلام کو متاثر کیا ہے اسی کے ساتھ مسوی ومصفی کے ذریعے فقہی مذاہب میں تطبیق کا اچھا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے نامور تلمیذ علامہ سید محمد مرتضی زبیدی بلگرامی (م ۱۲۰۵ھ) نے قاہرہ میں اپنا حلقۂ درس قائم کرکے علامہ صغانی وشیخ علی متقی کی طرح ایک بار پھر ہندوستانی علماء ومحدثین کے امتیاز واعزاز کو دوبالا کردیا ان کی عقود الجواہر المنیفۃ، اتحاف السادۃ المتقین اور تاج العروس کی افادیت کا سلسلہ آج بھی قائم ہے۔

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ (م ۱۲۹۷ھ) اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۵ھ) اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (م ۱۳۳۹ھ) نے تصنیف سے زیادہ تدریس اور تعلیم وتربیت اور مردم سازی پر توجہ کی اور دارالعلوم دیوبند کی شکل میں فقہ وحدیث کا ایک عالمی مرکز قائم کردیا، جس نے علوم اسلامیہ کے ایسے ماہرین پیدا کیے، جن کی وجہ سے عالم اسلام میں ہندوستان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔چنانچہ دارالعلوم کے ممتاز محدثین میں علامہ انورشاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ) کی فیض الباری شرح صحیح بخاری اور العرف الشذی، شرح سنن الترمذی۔مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی فتح الملہم شرح صحیح مسلم، مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی اعلاء السنن، مولانا یوسف بنوریؒ کی معارف السنن، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی التعلیق الصبیح، مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کی بذل المجہود، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی لامع الدراری اور اوجز المسالک شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے درسی افادات 'معارف مدنیہ' مرتبہ مولانا سید طاہر حسن صاحب امروہوی اور حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کے درسی افادات 'ایضاح البخاری' مرتبہ مولانا ریاست علی بجنوری اور علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے درسی افادات 'انوار الباری' مرتبہ مولانا احمد رضا بجنوری حدیث کے حلقوں میں بڑی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔

فقیہ وقت ومحدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ (م ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء) علماء ومحدثین ہند کے اسی چودہ سو برسوں کے سلسلۃ الذہب کی مضبوط وقیمتی کڑی تھے، جنھوں نے علمائے راسخین وفضلائے محققین کے علم وفضل اور تحقیق وتدقیق کی شاندار دیرینہ روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے آگے بڑھایا اور حدیث وسنت کے مدفون ومجہول ذخائر کو حیاتِ نو بخشی اور اس کے فیض سے خود بھی بقائے دوام کے مستحق ہوگئے۔

مولانا اعظمیؒ کی تحقیقات ودراسات کی افادیت کے گوناگوں پہلو ہیں ان کا سب سے بڑا فائدہ تو فقہ وشریعت کے لیے سنت وسیرت کی تائید حاصل کرنا ہے، اور مختلف نزاعی مسائل میں سیرت وسنتِ نبویہ کی تحقیق ودریافت ہے، اس کے علاوہ حدیث کے ان اولیں صحیفوں سے مسلک حنفی کی تائید وتوثیق بھی حاصل ہوتی ہے۔ان کی اشاعت مستشرقین کے اس اعتراض کا جواب بھی ہے کہ حدیث کے مجموعے بہت بعد میں مرتب ہوئے، ان کا طرز تحقیق وتدوین مشرق ومغرب کے محققین کے لیے تلاش حقیقت وحق پسندی، خلوص وبے غرضی، اور انتہائی محنت ومحویت اور مقصد سے عشق کا بے مثال اور قابل تقلید اسوہ ونمونہ ہے۔

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے برقدمِ راہ روان است مرا

مولانا الاعظمیؒ کی علمی فتوحات میں ''رکعات تراویح'' کو بہت اہمیت حاصل ہے، جو اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے ان استدراکات وتصحیحات کی بہت اہمیت تسلیم کی گئی اور عالم عربی کے اعلی درجے کے محققین نے اپنی غلطیاں تسلیم کیں اور حضرت مولاناؒ کے اعتراضات وتنبیہات کو صحیح قرار دیا ایسے استدراکات میں مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کی تحفۃ الاحوذی، تاج العروس للزبیدی، مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی الرفع والتکمیل اور الأجوبۃ الفاضلۃ بتحقیق الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ، احمد محمد شاکر (م ۱۳۷۷ھ) کی تحقیق مسند احمد، اور الألبانی شذوذہ وأخطاؤہ، سے متعلق ان کے استدراکات علمی تنقید وتحقیق کا اعلی نمونہ ہیں۔

الاعلام المرفوعہ اور حدر الملثام عن وجہ تحقیق الکلام کے ذریعہ طلاق ثلاثہ

اور قرأت خلف الامام کے حنفی مسلک کو احادیث نبویہ سے بخوبی مدلل کیا ہے۔

مولانا الاعظمیؒ کی رجال وتاریخ، فقہ وحدیث، لغت وادب عربی میں مہارت وبصیرت اور دقت نظر کا ثبوت ان کی تحقیق وتدوین اور تحشیہ وتعلیق کے ذریعہ شائع شدہ گراں قدر کتابیں ہیں جن کو انھوں نے ایک طرح سے نئی زندگی بخشی اور علمی دنیا میں ان کا کماحقہ تعارف کرایا ایسی کتابوں میں ان کا نام لیا جاتا ہے، الحاوی، الثقات لابن شاهين (م ۳۸۵ھ)، مسند الحميدي (م ۲۱۹ھ) السنن لسعيد بن منصور الخراساني (م ۲۲۷ھ) مجمع بحار الانوار للفتني (م ۹۸۶ھ) المصنف لعبد الرزاق (م ۲۱۱ھ) المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية لابن حجر (م ۸۵۲ھ) كشف الأستار عن زوائد البزار للهيثمي (م ۸۰۷ھ) مصنف ابي بكر بن ابي شيبة (م ۲۳۵ھ)

ان کتابوں کے علاوہ مولانا اعظمیؒ نے شیعہ، اہل بدعت اور اہل حدیث کے مسلک وموقف پر بہت سے تنقیدی مضامین لکھے جو حقیقت پسندی، غیر جانبداری، اور علمی طرز تنقید وتحقیق کا مثالی نمونہ ہیں اور رسالہ ''المآثر'' مئو کے ذریعے برابر شائع ہورہے ہیں۔

حضرت مولانا اعظمیؒ کے علمی وتحقیقی مقام ومرتبہ کا عرب وعجم میں جس طرح اعتراف کیا گیا وہ ان کے لیے بھی باعث شرف وسعادت ہے اور جماعت دیوبند کے لیے بھی، حضرت مولاناؒ کی علمی خدمات وفتوحات اب ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ہیں اور ہم سب کے لیے درس عبرت وبصیرت اور لائق تقلید اسوہ ونمونہ ہیں۔

حضرت مولانا اعظمیؒ کی ناقابل فراموش وگراں قدر علمی وتحقیقی خدمات کا یہ تقاضا تھا کہ ان کا تفصیلی وتحقیقی جائزہ لیا جائے ان کے موضوعات کی اہمیت اجاگر کی جائے اور ان کے غیر جانبدارانہ اور معروضی اسلوب نقد وتحقیق کے محاسن کی نشاں دہی کی جائے اور ان کی تمام کتابوں اور مضامین کے تذکرے کے ساتھ ان پر حقیقت پسندانہ اور بصیرت افروز تبصرہ بھی کیا جائے۔

اس سلسلے میں عزیزی ڈاکٹر محمد صہیب الہ آبادی سلمہٗ ہم سب کے شکریے اور قدر دانی کے پوری طرح مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی حد تک حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی حیات وخدمات پر علمی وتحقیقی تبصرے کا حق ادا کر دیا، اور مولاناؒ کی علمی فتوحات وتحقیقات کا اس طرح تحلیل وتجزیہ کیا جس سے ان کی قدر وقیمت اور افادیت اجاگر ہوگئی، مولانا کی ہر کتاب ومضمون پر تبصرہ ان کے مقالے کی خصوصیت ہے جس میں انھوں نے بڑے اعتدال وتوازن، حقیقت پسندی اور علمی طرز استدلال سے کام لیا ہے۔ اپنے موضوع سے انھوں نے بڑی محنت اور سنجیدگی وشائستگی کے ساتھ انصاف کیا ہے، ان کے طرز بیان میں بھی ایجاز واختصار، بے تکلفی وبرجستگی اور سادگی کے ساتھ شگفتگی موجود ہے۔

اپنی کتاب کی تیاری کے سلسلے میں وہ بار بار حضرت مولاناؒ کے ادارہ ''مرقاۃ العلوم'' مئو گئے اور صاحبزادۂ محترم جناب مولانا رشید احمد صاحب مد ظلہ اور جناب ڈاکٹر مسعود احمد صاحب مدیر مجلہ ''المآثر'' کے تعاون وسرپرستی میں اپنی تحقیق مکمل کی، اس طرح کتاب کو مولاناؒ کے جانشینوں کا استناد واعتماد بھی حاصل ہے چنانچہ وہ اس کی اشاعت کا اہتمام بھی کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ عزیز محترم مولانا ڈاکٹر محمد صہیب سلمہ کو دین وعلم کی خدمت کی مزید توفیق عطا کرے اور ترقیات سے نوازے اور کتاب کو مقبولیت بخشے۔ □□

حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا بیان

حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی فاضل دیوبند ایم۔ اے نے جب اپنی مشہور کتاب ''صدیق اکبر'' لکھی تو نظر ثانی کے لیے حضرت الاستاذ کی خدمت میں بھیجی اور دوسرے اڈیشن میں تحریر فرمایا: ''پھر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی جن سے بڑھ کر فن حدیث اور اسماء الرجال کا محقق اور مبصر میرے نزدیک آج انڈو پاک میں کوئی عالم نہیں ہے، دیرینہ نیازمندی کی بنا پر خط لکھا کہ اگر آپ 'صدیق اکبر' کو ایک مرتبہ ملاحظہ فرمالیں تو مجھے اطمینان ہوجائے گا، مولانا نے از راہِ شفقت بزرگانہ میری درخواست کو قبول فرمایا، اور کتاب کا ایک ایک ورق پڑھ کر غلطیوں سے آگاہ فرمایا، میں نے نظر ثانی میں اصلاح فرمائی۔'' (مقدمہ صدیق اکبر طبع دوم)

حضرت الاستاذ نے ایک بار لکھا کہ بہت سارے علماء کے خطوط آتے رہتے ہیں کہ میں ان کی کتاب پر نظر ثانی کروں، جوابات میں الجھا رہتا ہوں، تحریر فرماتے ہیں: ''مصنف عبدالرزاق کے کام کے علاوہ روزانہ متعدد خطوط کے جوابات وغیرہ میں ایسا الجھا ہوا رہتا ہوں کہ کسی نئے کام کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں ہوتی، مولانا محمد میاں صاحب کا اصرار ہے کہ ان کے 'عہد زریں' پر نظر ڈال کر تقریظ لکھوں اور مشورہ دوں، ایک صاحب مصر سے ابن عبدالبر کی الاستذکار شائع کرنا چاہتے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اس کام میں، میں ان کی مدد کروں، اور برابر ان کے سوالات کے جوابات بھیجا کروں، اس طرح خطوط آتے رہتے ہیں۔''

کفاءت کے متعلق ابو المآثر علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی کا موقف اور اس کی عصری معنویت واہمیت

پروفیسر عبدالرحمن مومن★

ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نور اللہ مرقدہ جیسی جامع الکمالات شخصیتیں صدیوں میں پردۂ ہستی پر نمودار ہوتی ہیں، آپ کے علم وفضل کی گہرائی وگیرائی، بے مثل قوت حافظہ واستحضار، دقت نظر، ژرف نگاہی ونکتہ رسی اور قوت استنباط واستدلال علمائے سلف کی یاد دلاتی تھی، حضرت ابو المآثر کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف آپ کی عدیم النظیر جامعیت تھا۔

علوم الحدیث میں آپ کی بلند پایہ خدمات علمی حلقوں میں مشہور ومعروف ہیں، اس کے علاوہ تفسیر و اصول تفسیر، فقہ واصول فقہ، سیرت، عربی زبان و ادب، فلسفہ وکلام اور تاریخ وتذکرہ نگاری میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ کی تحریریں اصابت رائے، فکری توازن و اعتدال، حق پسندی وحق گوئی اور جرأت ایمانی کی آئینہ دار ہیں۔ حضرت ابو المآثر بیسویں صدی کے ان معدودے چند علمائے راسخین میں سے تھے، جن کی تحریروں میں اجتہادی بصیرت کے جواہر پارے نظر آتے ہیں۔ آپ کی اجتہادی بصیرت کے واضح نقوش دار الاسلام اور دار الحرب کی بحث میں آپ کے نقطۂ نظر اور مسئلہ کفاء ت پر آپ کے موقف میں نظر آتے ہیں۔

مسئلہ کفاءت اور اس کا معاشرتی وتاریخی پہلو

کفاءت کے لفظی معنی ہمسری اور مماثلت کے ہیں، کفاءت کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ زوجین ایک ہی طبقہ یا برادری سے تعلق رکھتے ہوں اور حسب ونسب اور پیشہ کے لحاظ سے ہم پایہ ہوں۔ نکاح میں کفاءت کا لحاظ رکھنے کی بنیادی غرض و غایت یہ ہے کہ زوجین کے معاشرتی اور خاندانی ماحول میں موافقت وہم آہنگی ہو، تاکہ رشتۂ نکاح میں استواری اور استحکام پیدا ہو، اس کے پس پردہ معاشرتی اور نفسیاتی مصالح کارفرما ہیں۔ مسلم معاشرے میں نکاح صرف زوجین ہی تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے بھی مربوط ہے۔ نکاح کی بدولت نہ صرف زوجین میں بلکہ دو خاندانوں کے درمیان قرابت وانسیت کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔

کفاءت کے مسئلہ میں مذاہب اربعہ کے فقہا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

حنفی فقہا کہتے ہیں کہ چھ امور میں عورت کو مرد کا ہم پایہ ہونا چاہیے: (۱) اسلام (۲) نسب یا خاندان (۳) پیشہ (۴) حریت (۵) دین داری (۶) مال۔

حنفی فقہا کے نزدیک غلام یا آزاد شدہ غلام آزاد عورت کا کفو نہیں ہوسکتا، اسی طرح عجمی شخص عربی عورت کا کفو نہیں ہوسکتا اور غیر قریشی مرد قریشیہ عورت کا کفو نہیں ہوسکتا۔

کفاءت میں پیشے کا لحاظ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ رواج اور عرفِ عام کے لحاظ سے زوجین کا خاندانی پیشہ ہم پلہ ہو؛ لہٰذا جلاہا، درزی، رنگریز اور دباغ؛ تاجروں کے کفو نہیں ہوسکتے۔

شافعی فقہا کہتے ہیں کہ کفاءت کا لحاظ چار امور میں ہے: (۱) نسب یا خاندان (۲) دین داری (۳) حریت (۴) پیشہ۔

شافعی فقہا کے نزدیک بھی اہل عجم اہل عرب کے کفو نہیں ہوسکتے۔

حنبلی فقہا کہتے ہیں کہ کفاءت کا اعتبار پانچ امور میں ہے: (۱) نسب یا خاندان (۲) حریت (۳) پیشہ (۴) دین داری (۵) مالی خوش حالی۔

حنابلہ کے نزدیک بھی عجمی شخص عربی عورت کا کفو نہیں ہوسکتا۔

مالکی فقہا کے نزدیک کفاءت کا اعتبار صرف دو امور میں ہے: ایک تو یہ کہ مرد مسلمان ہو اور بدکار نہ ہو، اور دوسرے یہ کہ اس میں ایسا کوئی عیب نہ ہو جس سے عورت کو فسخ عقد کا اختیار ہوتا ہے، جیسے برص یا جذام۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نسب، خاندان، حریت، پیشہ اور مال غیر اعتباری چیزیں ہیں؛ لہٰذا آزاد کردہ غلام کا نکاح آزاد عورت سے اور عجمی شخص کا نکاح عربی عورت سے ہوسکتا ہے۔

فقہا کہتے ہیں کہ مرد کا عورت کے لیے کفو ہونا معتبر ہے، عورت کا مرد کے لیے کفو ہونا ضروری نہیں ہے، اگر عورت مرد کی کفو نہ بھی ہو، تو بیوی ہونے کے سبب سے اپنے شوہر کی کفو سمجھی جائے گی۔[1]

برصغیر کا مسلم معاشرہ اور کفاءت کا مروجہ تصور

ازمنہ وسطیٰ سے لے کر آج تک برصغیر بالخصوص شمالی ہندوستان کے

★ سابق صدر شعبۂ سماجیات، بمبئی یونیورسٹی

مسلمان دو طبقات میں بٹے ہوئے ہیں: ایک طبقہ اشراف کہلاتا ہے اور دوسرا اجلاف یا ارذال۔

طبقۂ اشراف میں دو قومیں اور برادریاں شامل ہیں، جن کے آبا واجداد عربستان، ایران، ترکستان، وسط ایشیا اور افغانستان سے مختلف ادوار میں وارد ہوئے تھے۔

اشراف میں چار قومیں شامل ہیں: سید، شیخ، مغل اور پٹھان۔

اجلاف یا ارذال طبقے میں وہ قومیں اور برادریاں شامل ہیں، جن کے آبا واجداد پہلے ہندو تھے اور پھر انھوں نے اسلام قبول کیا۔

اجلاف برادریاں زیادہ تر ایسے پیشوں سے وابستہ ہیں جن کا تعلق محنت سے ہے اور جو اشراف کی نظروں میں پست سمجھے جاتے ہیں، مثلاً کپڑے بننا یا رنگنا، دوسروں کے کپڑے سینا، جانور ذبح کرنا اور ان کا گوشت فروخت کرنا، سبزی بیچنا، حجامت، روئی دھننا، تیل بیچنا، مویشی چرانا، جوتے گانٹھنا وغیرہ۔ نائی، قصائی، جلاہا، موچی، درزی، تیلی، دُھنیا، کنجڑا اور دھوبی اجلاف برداریوں میں شامل ہیں۔

اشراف قومیں اور برادریاں اپنے کو حسب ونسب، خاندان، پیشہ، عادات واطوار اور رہن سہن کے اعتبار سے اجلاف برادریوں سے برتر اور افضل سمجھتی ہیں۔ اشراف برادریوں میں یہ خیال عام ہے کہ شرافت عالی نسب افراد کے خون میں رچی بسی ہوئی ہوتی ہے اور یہ ایک نسل سے دوسری نسل کو وراثتاً منتقل ہوتی ہے۔ اشراف قومیں اجلاف برادریوں کو پست درجہ اور حقیر سمجھتی ہیں۔ اشراف برادریوں میں یہ خیال عام ہے کہ غیر اشراف یا ''رذیل'' قوموں کا شرافت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے کوئی واسطہ نہیں ہے، شرفا کی گفتگو میں محنت کش برادریوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے لیے یہ الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں: چھوٹی قوم، چھوٹی امت، چھوٹی ذات، نیچ قوم، کمین ذات، ذلیل قوم، ذلیل ذات، کم اصل، ذلیل پیشہ ور، بدذات، نیچ ذات وغیرہ۔

اس نوع کے الفاظ بعض متاخرین علماء کی تحریروں اور فتاویٰ میں بھی نظر آتے ہیں۔

موجودہ حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو حسب ونسب، فرق مراتب اور خاندانی پیشے کے لحاظ سے چار طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلے طبقے میں وہ قومیں اور برادریاں شامل ہیں جو اشراف میں شمار کی جاتی ہیں، یعنی سادات، شیوخ، مغل اور پٹھان۔ اشراف قوموں میں حسب و نسب کے لحاظ سے فرق مراتب اور درجہ بندی پائی جاتی ہے۔

سادات سب سے زیادہ مکرم اور معزز سمجھے جاتے ہیں۔ شیخ برادریوں، پٹھانوں اور مغلوں میں فرق مراتب اور درجہ بندی پائی جاتی ہے۔

دوسرے طبقے میں وہ برادریاں شامل ہیں، جن کے آبا واجداد ہندوؤں کی اونچی ذاتوں (بالخصوص راجپوتوں) سے تعلق رکھتے تھے، اس طبقے میں مسلمان راجپوت، خانزادہ مسلمان اتر پردیش، پنجاب اور بہار کی ملک برادری، دلّی کی پنجابی سوداگر برادری اور اتر پردیش کے کنبوہ شامل ہیں۔ ان برادریوں کے بہت سے افراد نے علم وہنر، تجارت، قابلیت، جد وجہد، دین داری اور قومی وملی خدمات کی بدولت معاشی استحکام حاصل کیا اور ان کو معاشرے میں عزّت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ان برادریوں کا شمار اشراف میں نہیں ہے؛ لیکن ان کی عرفی حیثیت اور معاشرتی رتبہ اشراف برادریوں سے فروتر بھی نہیں ہے۔

ممبئی کی میمن برادری اور چلیا مومن برادری جو تجارت پیشہ ہیں، اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔

تیسرے طبقے میں معمولی پیشوں سے تعلق رکھنے والی برادریاں شامل ہیں، جیسے قصائی، جلاہا، دھوبی، کنجڑا، دُھنیا، تیلی اور بہشتی وغیرہ۔

چوتھے طبقے میں وہ برادریاں شامل ہیں، جو سب سے پست اور کمتر سمجھی جاتی ہیں، جیسے چمار اور حلال خور۔

برصغیر کے مسلمانوں میں نکاح کا رشتہ طے کرتے وقت حسب ونسب، خاندان، پیشہ اور عرفی حیثیت کو مدنظر رکھا جاتا ہے، شادیاں عموماً برادری کے اندر کی جاتی ہیں، سادات عموماً اپنی برادری میں شادی کرتے ہیں؛ لیکن سادات اور شیوخ کے مابین شادی روا سمجھی جاتی ہے؛ لیکن سیدوں اور مغلوں یا پٹھانوں کے بیچ شادی معیوب سمجھی جاتی ہے، اشراف برادریوں اور غیر اشراف برادریوں میں شادیاں نہیں ہوتیں۔ لیکن اشراف اور نو مسلم برادریوں کے درمیان شادی کی بعض مثالیں ملتی ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ اعظم گڈھ اور دیگر اضلاع میں راجپوت نو مسلموں کی ایک قوم ہے، جو عرف عام میں روتارہ کہلاتی ہے، (جو ہندی لفظ راوَت کی بگڑی ہوئی شکل ہے)۔

انیسویں صدی میں ان میں سے بعض افراد نے شیوخ، پٹھان اور مغل خانوادوں میں شادیاں کیں۔

مولانا شبلی نعمانی کے والد شیخ حبیب اللہ (جن کے اجداد راجپوت تھے) کی شادی انصاری شیوخ کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ ؎

برصغیر کے مسلم معاشرے میں ایک بدیہی تضاد نظر آتا ہے، چنانچہ ایک طرف اسلام کا آفاقی تصور مساوات و مواخات ہے اور دوسری طرف مسلم معاشرے میں حسب ونسب، خاندان اور پیشے کے امتیازات پر مبنی طبقات پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض اعلیٰ و ارفع اور بعض پست اور کمتر سمجھے جاتے ہیں، کفاءت کا مروجہ تصور اور نظام اس تضاد کا آئینہ دار ہے۔

راقم السطور کی رائے میں اس تضاد کے پس پردہ چار عناصر کارفرما ہیں:

اولاً: عموماً یہ ہوتا ہے کہ جس طبقے کے پاس اقتدار، مال و دولت اور دیگر مادّی وسائل ہوتے ہیں، معاشرے پر اسی کا غلبہ ہوتا ہے، اور اس طبقے کے نظریات، طور طریق اور عادات و اطوار دوسرے طبقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

برصغیر میں جن مسلمان بادشاہوں نے صدیوں تک حکومت کی وہ ترک، افغان اور مغل نسل کے تھے۔ ان بادشاہوں اور ان کے امراء میں نسبی تفوق اور تفاخر کا قوی جذبہ موجود تھا۔ التمش، بلبن اور مملوک خاندان کے دیگر حکمراں مقامی مسلمانوں کو (جن کے آبا و اجداد پہلے ہندو تھے) حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پست طبقات کے مسلمانوں اور نومسلموں کا اعلیٰ سرکاری عہدوں مثلاً خواجگی، مشرفی یا مدبری پر تقرر نہیں کیا جاتا تھا۔

ثانیاً: کفاءت کے مروجہ تصور کا جواز فراہم کرنے اور اس کو تقویت پہنچانے میں اور معاشرتی اونچ نیچ کے غیر اسلامی خیالات کو ہوا دینے میں برصغیر کے بعض علماء و فقہا کی تحریروں اور فتاویٰ کا خاصا حصہ ہے۔ ان علماء و فقہاء کی تحریروں اور فتاویٰ میں نسبی تفوق کے غیر اسلامی تصور کا جواز فراہم کیا گیا ہے اور محنت کش اور پیشہ ور برادریوں کے لیے حقارت آمیز الفاظ اور فقرے استعمال کیے گئے ہیں۔

ثالثاً: ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کے آبا و اجداد نومسلم تھے، اسلام لانے والوں میں ہندوؤں کی اونچی ذاتوں کے لوگ بھی تھے اور پست ذاتوں کے بھی۔ ان نومسلموں میں اسلام لانے کے بعد بھی ہندوانہ عقائد، روایات اور رسم و رواج کی خو بو باقی رہی۔

رابعاً: ہندوستان کے مسلمانوں میں ذات پات اور معاشرتی اونچ نیچ کے تصور کو زمیں دارانہ نظام نے بھی تقویت پہنچائی۔ برطانوی دور حکومت میں مسلمانوں کا زمیندار طبقہ اشراف قوموں پر مشتمل تھا اور ان کے اہلکار، کارندے اور ملازمین زیادہ تر پست طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔[۳]

مسئلہ کفاءت کے متعلق علامہ اعظمی کا نقطۂ نظر

مسئلہ کفاءت کے متعلق حضرت ابوالمآثر کے افکار آپ کی کتاب ''انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت'' میں تفصیل کے ساتھ اور دوسری کتاب ''دست کار اہل شرف'' میں اجمالی طور پر موجود ہیں۔

مؤخر الذکر کتاب میں آپ نے اس موضوع پر اجمالی طور پر جو کچھ لکھا ہے اسے جامعیت اور بلاغت کا کمال کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے:

''اس (کفاءت کی) بحث میں فقہی کتابوں سے جو نقل کیا جاتا ہے، وہ سب غلط فہمی پر مبنی ہے''۔[۴]

اس چشم کشا فقرے میں تبحر علمی اور معنویت کا ایک جہان پوشیدہ ہے اور یہ فقہ کی ضخیم مجلدات پر بھاری ہے۔

کفاءت کے متعلق حضرت ابوالمآثر کے موقف کا خلاصہ پانچ نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) قرآن وسنت، اسوۂ نبوی اور تعامل صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے یہ واضح ہے کہ رشتۂ نکاح میں صرف دین و اخلاق کا اعتبار ہے، لہٰذا کفاءت کا مروجہ تصور اسلامی اصولوں اور روایات کے منافی ہے۔

(۲) نسبی برتری اور تفاضل کا تصور (جو کفاءت کے مروجہ نظام کا ایک بنیادی جزو ہے) اسلامی نقطۂ نظر سے ایک لایعنی اور بے اعتباری چیز ہے اور تاریخی لحاظ سے ایک موہوم اور ناقابل اعتبار مفروضہ ہے۔

(۳) شرف علم نسبی شرافت سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

(۴) سنت نبوی اور صحابہ و تابعین کے طرز عمل سے یہ واضح ہے کہ کوئی جائز پیشہ فی نفسہ معیوب یا لائق تحقیر نہیں ہے؛ بلکہ تمام جائز پیشے اباحت کے لحاظ سے یکساں ہیں؛ لہٰذا پیشے کو امور کفاءت میں شمار کرنا اسلامی اصولوں کے منافی اور معقولیت سے بعید ہے۔

(۵) حنفی فقہ میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ کفاءت کے مروجہ تصور سے پیدا ہونے والے ناخوشگوار نتائج کا سدّ باب کیا جا سکے۔

زیر نظر مضمون میں حضرت ابوالمآثر کے افکار کو مزید وسعت دے کر ایک مبسوط انداز اور عصری اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، مزید برآں آپ کے موقف کی عصری معنویت و اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

رشتۂ نکاح میں صرف دین و اخلاق کا اعتبار ہے

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی نظر میں رشتۂ نکاح میں حسب ونسب، خاندان، عورت کے حسن و جمال اور مال و دولت کو حد درجہ اہمیت حاصل تھی، اسلام نے ان چیزوں کو بے اعتباری اور غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ رشتۂ نکاح میں صرف دین و اخلاق کا لحاظ کیا جائے۔

(صحیح بخاری (کتاب النکاح) اور صحیح مسلم (کتاب النکاح) میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تنکح المرأۃ لأربع: لمالها

"ولحسبها ولجمالها ولدينها، فاظفر بذات الدين، تربت يداك"

(عورت سے چار باتوں کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے: اس کے مال کی خاطر، اس کے حسب ونسب کی بنا پر، اس کے حسن اور خوبصورتی کے پیش نظر اور اس کی دین داری کے سبب سے)، تم دین دار عورت سے نکاح کرو، تو کامیاب و کامران رہوگے)

ابن ماجہ (کتاب النکاح) میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لا تزوجوا النساء لحسنهن، فعسى حسنهن أن يرديهن، ولا تزوجوا لأموالهن، فعسى أموالهن أن تطغيهن، ولكن تزوجوهن على الدين، ولأمة سوداء ذات دين أفضل۔"

(عورتوں سے ان کے حسن و جمال کی بنا پر نکاح نہ کرو، ہوسکتا ہے کہ ان کا حسن و جمال ان کو خرابی اور بربادی کی راہ پر ڈال دے۔ اور نہ ان کے مال و دولت کی وجہ سے ان سے شادی کرو، ہوسکتا ہے کہ ان کا مال ان کو سرکشی اور فخر وغرور میں مبتلا کردے؛ بلکہ دین واخلاق کی بنیاد پر شادی کرو، کالی کلوٹی لونڈی جو دین داری کا پیکر ہو، وہ بہت بہتر ہے)۔

ترمذی (ابواب النکاح) اور مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إذا جاءكم من ترضون دينه وخلقه فانكحوه، إلا تفعلوا تكن فتنة في الأرض وفساد، قالوا: يا رسول الله! وإن كان فيه (أي شيء من قلة المال وعدم الكفاءة)، قال: إذا جاءكم من ترضون دينه وخلقه فانكحوه، ثلاث مرات"

(جب تمہیں ایسا شخص مل جائے، جس کا دین اور اخلاق پسندیدہ ہوں، تو تم اسے اپنی لڑکیوں کا نکاح کردو، اگر تم ایسا نہیں کروگے، تو زمین پر فتنہ و فساد پھیل جائے گا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگرچہ اس میں غریبی یا کفو نہ ہونے کا نقص ہو، تب بھی؟ اس کے جواب میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر تین مرتبہ یہی فرمایا کہ جب تمہیں کوئی ایسا شخص مل جائے، جس کی دین داری اور اخلاق پسندیدہ ہوں، تو اس کے ساتھ اپنی لڑکیوں کا نکاح کردو)[۵]

صاحب مجمع البحار اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ''اگر تم اپنی لڑکیوں کا نکاح ایسے شخص سے نہ کروگے جس کی دین داری اور اخلاق پسندیدہ ہیں اور محض حسب ونسب اور حسن وجمال کو ترجیح دوگے، تو اس سے فتنہ برپا ہوجائے گا؛ کیوں کہ یہ باتیں باعثِ فتنہ ہیں۔

بعض نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ اگر تم مال و دولت اور حسب ونسب والے کی تلاش میں رہوگے، تو بہت سی عورتیں اور بہت سے مرد بغیر شادی کے پڑے رہ جائیں گے، جس سے زنا اور حرام کاری کی کثرت ہوگی، اس کے نتیجے میں اعزاء واقرباء کو بھی ننگ و عار اور غیرت وحمیت لاحق ہوگی اور قتل وخونریزی اور فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اٹھے گی۔

یہ حدیث امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں دیگر ائمہ کے مقابلے میں حجت ہے؛ کیوں کہ اس میں دین اور اخلاق ہی کو سب سے زیادہ قابل لحاظ قرار دیا گیا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ دین داری ہی کو کفاءت میں معتبر مانتے ہیں''۔[۶]

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے یہ صریح طور پر ظاہر ہے کہ رشتہ نکاح کے لیے حسب ونسب، خاندانی عز وجاہ اور پیشہ بے اعتباری چیزیں ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اشعث بن قیس کی بہن قُتیلہ کو اپنی زوجیت میں قبول فرمالیا تھا، اشعث کپڑا بننے کا کام کرتے تھے، قُتیلہ یمن میں تھیں؛ اس لیے اشعث نے ان کے ولی کی حیثیت سے ان کا نکاح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ میں ۱۰ھ کے اواخر میں کردیا تھا۔

قُتیلہ یمن سے رخصت ہوکر ابھی نہیں آئی تھیں کہ نصف صفر ۱۱ھ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شروع ہوئی اور ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوگئے۔

ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی اس واقعہ کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ یہ اس بات کی نہایت مستحکم دلیل ہے کہ کپڑا بننے والے کی بیٹی ایک عربی بلکہ قریشی وہاشمی بلکہ سب سے اشرف واکرم ہاشمی کی کفو ہوسکتی ہے۔[۷]

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ سے کیا، جو عہد جاہلیت کے معیار سے پست درجہ کے تھے، اس شادی کے سلسلہ میں اس آیت کا نزول ہوا: [وما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمرا أن تكون لهم الخيرة من أمرهم، ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا] (ایک مسلمان مرد اور ایک مسلمان عورت کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ جب کسی معاملے میں اللہ اور اس کے رسول نے فیصلہ کردیا ہو، تو اس کے متعلق کوئی دوسری رائے یا راستہ اختیار کرے، اگر کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے، تو وہ صریحاً غلط راستے پر ہے)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''في هذه الآية دليل بل نص في الكفاءة، لا تعتبر في الأحساب، وإنما تعتبر في الأديان''(اس آیت میں دلیل بلکہ محکم صراحت ہے کہ کفاءت کا اعتبار نسب

میں نہیں؛ بلکہ صرف دین میں ہے)۔[۸]

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چچازاد بہن ضباعہ کا نکاح مقداد بن اسود سے کیا جو غیر قریشی اور ایک روایت کی بنا پر حبشی غلام تھے۔

زید اور ضباعہ کے نکاحوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”زوجت مقداداً و زيداً ليكون أشرفكم عند الله أحسنكم خلقاً“ (میں نے مقداد اور زید کا اس لیے نکاح کردیا تاکہ یہ ثابت ہوجائے کہ اللہ کے نزدیک وہی زیادہ عزت والا ہے جس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں)۔[۹]

حضرت فاطمہ ایک قریشی خاتون تھیں، حضرت معاویہ جیسے معزز قریشی حضرات ان کو نکاح کا پیغام دے چکے تھے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہ سے کیا جو کنیز زادے تھے۔

اصبغ بن عمرو دومۃ الجندل کے حکمراں اور مذہباً عیسائی تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے حضرت عبد الرحمن بن عوف کو بھیجا، وہ مشرف بہ اسلام ہوئے، حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوش خبری سنائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اصبغ بن عمرو کے قبیلے میں شادی کرلیں، چنانچہ انھوں نے اصبغ کی صاحبزادی تماضر سے نکاح کرلیا، حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ قریشی تھے اور قریش اپنے کو تمام عربی قبائل سے افضل و برتر اور دوسرے قبائل کو کمتر اور حقیر سمجھتے تھے، اصبغ بن عمرو کا تعلق بنو کلب قبیلے سے تھا اور عہد جاہلیت میں قریش اور بنو کلب میں شادیاں نہیں ہوا کرتی تھیں، حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اصبغ بن عمرو کی صاحب زادی سے شادی اسلامی مساوات کی ایک روشن مثال تھی۔

ایک صحابی حضرت ابو ہند پچھنا لگانے کا کام کرتے تھے، انھوں نے بنو بیاضہ کے ہاں اپنے لیے نکاح کا پیغام بھیجا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے میں پتہ چلا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو بیاضہ سے کہا: ”أنكحوا أبا هند و أنكحوا إليه“ (ابو ہند سے اپنی لڑکی کا نکاح کردو اور ان کے خاندان میں رشتہ کرو)۔

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ بعض انصار گھرانوں میں اپنے لیے نکاح کا پیغام بھیجا؛ لیکن انھوں نے غلام ہونے کے سبب سے قبول نہ کیا، جب انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ”قل لهم: ان رسول الله يأمركم أن تزوجوني“ (انصار سے جاکر کہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں حکم دیا ہے کہ تم میری شادی (اپنے گھرانوں) میں کراؤ)۔[۱۰]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں عوالی میں سے ایک صاحب حیثیت شخص نے ایک قریشی کی بہن کو نکاح کا پیغام بھیجا، قریشی نے شادی سے انکار کردیا، جب اس کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس قریشی کو بلاکر دریافت کیا کہ تم نے کس بنا پر شادی سے انکار کیا، وہ تو نیک آدمی ہے اور مال دار بھی ہے، قریشی نے کہا کہ اے امیر المومنین! ہمارا عمدہ حسب ونسب ہے مگر لڑکا ہماری بہن کا کفو نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ درحقیقت تیرے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا حسب موجود ہے، دنیا کا حسب تو مال ہے اور آخرت کا حسب تقویٰ ہے، اگر تیری بہن راضی ہے تو اس شخص سے اس کی شادی کرادے، قریشی نے جاکر جب اپنی بہن سے دریافت کیا، تو وہ راضی ہوگئی اور دونوں کا نکاح کردیا گیا۔[۱۱]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے خاندان کی ایک خاتون سے فرمایا کہ میں تمھیں اللہ تعالی کی قسم دیتا ہوں کہ کسی مسلمان سے نکاح کرلو، چاہے وہ سرخ رومی ہو، یا سیاہ حبشی۔[۱۲]

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے پانچ شادیاں کی تھیں، ان میں سے ایک اشعث بن قیس کی بیٹی جعدہ بھی تھی، حضرت اشعث کپڑا بننے کا کام کرتے تھے۔

فتح ایران کے بعد ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد ثالث کی بیٹیاں مدینے آئیں، ان میں سے ایک کو جس کا نام شہر بانو تھا امام حسین رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں دیا گیا اور دوسری محمد بن ابی بکر سے منسوب ہوئیں۔ شہر بانو کے بطن سے امام زین العابدین پیدا ہوئے۔

حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ قریشی بدری اور صحابی تھے، انھوں نے اپنے غلام سالم کو متبنیٰ بنایا اور اس کی شادی اپنی بھتیجی ہند بنت ولید بن عتبہ سے کردی، قریش کو یہ بات اچھی نہیں لگی اور لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں کہ ابو حذیفہ نے اپنی بھتیجی کی شادی ایک غلام سے کردی، ابو حذیفہ کو جب اس کی خبر ہوئی، تو انھوں نے فرمایا کہ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ سالم ہند سے بہتر ہے، حضرت حذیفہ کی اس بات پر لوگوں کو ان کے فعل سے زیادہ تعجب ہوا۔[۱۳]

تعامل صحابہ وتابعین

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کے طرز عمل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ نکاح میں صرف تقویٰ وصلاح کو پیش نظر رکھتے تھے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی صاحبزادیوں کے لیے ان کے گھر نکاح کا پیغام بھیجا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبول فرمایا اور ان کی بیٹی سے حضرت سلمان کا نکاح ہو گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو ٹال دیا، مگر بعد میں خواہش ظاہر کی کہ سلمان ان کی صاحبزادی سے نکاح کرلیں؛ لیکن آپ نے قبول نہ کیا۔ [14]

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے قبیلہ کندہ کے ابوقرہ نامی ایک شخص کی بیٹی سے بھی نکاح کیا تھا۔ [15]

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سے بیاہی تھیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی ہمشیرہ ام فروہ کا نکاح اشعث بن قیس سے کیا، جو غیر قریشی اور کپڑا بننے والے تھے۔ [16]

آپ رضی اللہ عنہ کی دوسری بہن قریبہ کا نکاح قیس بن سعد بن عبادہ انصاری سے ہوا تھا جو غیر قریشی تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں قریش کی کئی معزز خواتین کے نکاح غیر قریشیوں سے ہوئے۔

ہند بنت الحارث قریشیہ کی شادی معید بن المقداد کندی سے ہوئی تھی جو غیر قریشی تھے۔

میمونہ بنت ابی سفیان قریشیہ کا نکاح عروہ بن مسعود ثقفی سے اور ان کے بعد مغیرہ بن شعبہ ثقفی سے ہوا تھا، یہ دونوں حضرات غیر قریشی تھے۔

اسی طرح صخرہ بنت ابی سفیان کا نکاح سعد بن الاخنس سلمی سے۔

ہند بنت مقوم بن عبدالمطلب کا نکاح ابوعمرہ انصاری سے۔

یعلی بن امیہ قریشی کی بہن نفیسہ کا نکاح سعد بن الربیع انصاری سے۔

ام کلثوم بنت عقبہ قریشیہ کا نکاح زید بن حارثہ سے۔

اور ام الحکم قریشیہ بنت ابی سفیان کا نکاح عبداللہ بن عثمان ثقفی سے ہوا تھا۔

یہ سارے مرد غیر قریشی تھے۔ [17]

امام زین العابدین نے جو شہر بانو نام کی ایک ایرانی شہزادی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، اپنے غلام کو آزاد کیا اور اپنی بیٹی سے اس کا نکاح کردیا۔ پھر آپ نے اپنی ایک باندی کو آزاد کیا اور خود اس سے نکاح کیا۔

بنوامیہ کے حکمراں عبدالملک بن مروان کو خبر ہوئی، تو وہ بہت ناراض ہوا اور آپ کے خاندان کی شرافت ونجابت کا ذکر کرتے ہوئے آپ کے اس طرز عمل پر طعنہ دیا، آپ نے اس کے جواب میں لکھا کہ قرآن کریم میں ہے: {لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ}۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ بنت حی کو آزاد کیا اور ان سے نکاح فرمایا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو آزاد کیا اور ان سے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب کا نکاح فرمایا۔ [18]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ایک ممتاز شاگرد زفر بن ہذیل کے والد بصرے کے ایک معزز عربی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے ایک غیر عرب خاتون سے شادی کی تھی، جن کے بطن سے زفر پیدا ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک مشہور ومعروف محدثین میں سے ہیں، ان کے والد مرو کے قاضی کے غلام تھے، قاضی نے ان کے کردار واخلاق سے متاثر ہوکر ان کو آزاد کردیا اور اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی، اسی لڑکی کے بطن سے حضرت عبداللہ ابن مبارک پیدا ہوئے۔ [19]

حضرت ابوالمآثر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عمر، تابعین میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور محمد بن سیرین اور ائمہ فقہ میں امام مالک رحمہم اللہ کفاءت میں صرف دین داری کا اعتبار کرتے ہیں، یہی مذہب حضرت حسن بصری اور سفیان ثوری کا ہے۔ ائمہ حنفیہ میں امام کرخی اور امام ابوبکر جصاص کا یہی قول ہے۔

علامہ نوح آفندی نے لکھا ہے کہ اگر اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کی کوئی روایت نہ ہوتی، تو امام کرخی اور امام جصاص ہرگز کفاءت کے باب میں یہ موقف اختیار نہ کرتے؛ لہٰذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی کوئی روایت امام مالک کے موقف کے مطابق اس باب میں ہے۔ [20]

کفاءت کے متعلق روایات کا تنقیدی جائزہ

حضرت ابوالمآثر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کفاءت کے مروجہ تصور کے جواز اور تائید میں جن حدیثوں سے استدلال کیا جاتا ہے، وہ تمام بے اصل، ضعیف یا موضوع ہیں۔ [21]

(۱) ابن ماجہ (ابواب النکاح، باب الاکفاء)، مستدرک حاکم (۲/ ۱۶۳) اور دارقطنی (کتاب النکاح ۳/ ۲۹۹) میں یہ روایت ہے: "تخیروا لنطفکم، وأنکحوا الأکفاء، وأنکحوا إلیهم" (اپنے نطفوں کے لیے عورتیں پسند کرو، کفو میں نکاح کرو، اور بیواؤں کے نکاح کرو)۔

اس روایت کے تمام طریق کمزور اور نامعتبر ہیں اور اس کے تمام رواۃ ضعیف ہیں۔ اس کے راوی حارث بن عمران کو امام دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ابن حبان نے کہا ہے کہ وہ گڑھتا تھا۔ حافظ ابن حجر نے "تہذیب التہذیب (۲/ ۱۵۲)" میں اسے متروک قرار دیا ہے اور محدث ابو

زرعہ کا قول نقل کیا ہے کہ حارث بن عمران واہی تباہی حدیثیں بیان کیا کرتا تھا۔ حافظ ابن طاہر مقدسی نے اس روایت کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے کتاب العلل میں اس کو باطل، منکر اور بے اصل کہا ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس روایت کو بے اصل اور نا قابل استدلال قرار دیا ہے۔ [۲۲]

(۲) دارقطنی اور بیہقی میں ایک روایت پائی جاتی ہے: ''لا یزوج النساء إلا الأولیاء، ولا یزوجن إلا من الأکفاء'' (عورتوں کا نکاح صرف ان کے اولیاء کریں اور ان کا نکاح صرف ان کے کفو میں کیا جائے)۔

امام دارقطنی نے اس روایت کے راوی مبشر بن عبید کو متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ امام بیہقی نے امام احمد بن حنبل کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ مبشر بن عبید کی بیان کردہ روایتیں موضوع اور من گھڑت ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ''الدرایہ'' (ص: ۲۲۲) میں، حافظ ابن ہمام نے فتح القدیر (۳/ ۱۸۵-۱۸۶) میں اور امام جمال الدین زیلعی نے نصب الرایہ (۲/ ۱۷) میں مبشر بن عبید کو حدیثیں وضع کرنے والا اور متروک الحدیث لکھا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے اس روایت کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔ [۲۳]

(۳) حاکم نے مستدرک (جلد دوم کتاب النکاح) میں یہ روایت نقل کی ہے کہ قریش ایک دوسرے کے کفو ہیں، ایک عرب دوسرے عرب کے لیے اور اہل عرب ایک دوسرے کے کفو ہیں، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے لیے اور عجمی دوسرے عجمیوں کے لیے کفو ہیں، ایک آدمی دوسرے آدمیوں کے لیے سوائے پارچہ بافوں اور حجاموں کے۔

حافظ ابن عبد البر کی رائے میں یہ روایت منکر اور من گھڑت ہے۔ (هذا منكر وموضوع)۔

محدث ابن ابی حاتم نے کتاب العلل (۲/ ۳۱۲) میں اس روایت کے بارہ میں لکھا ہے کہ بالکل جھوٹی اور بے بنیاد ہے۔ اس کے راوی عمران کے بارہ میں امام ابن حبان نے لکھا ہے کہ وہ روایتیں گڑھتا تھا؛ لہٰذا اس کی روایتیں لکھنا جائز نہیں ہے۔

(۴) ترمذی (ماجاء فی تعجیل الجنازہ) اور مستدرک حاکم میں روایت ہے: ''یا علي! ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا أتت، والجنازة إذا حضرت، والأيم إذا وجدت لها كفوا'' (اے علی! تین باتوں میں دیر نہ کرنا: نماز جب اس کا وقت آجائے۔ جنازہ جب تیار ہوجائے اور بے شوہر والی عورت کے لیے جب تم اس کے لیے کفو پالو)۔

ترمذی نے اس روایت کو غریب لکھا ہے اور کہا ہے کہ میں اس کی سند متصل نہیں سمجھتا۔

اس روایت میں متاخرین فقہاء کا اصطلاحی کفو مراد نہیں ہے؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ بے شوہر والی عورت کو جب کوئی جوڑ مل جائے، یعنی کوئی مناسب رشتہ مل جائے، تو پھر اس کے نکاح میں تاخیر نہ کی جائے۔

(۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کنواری لڑکی کے لیے جب کفو میں رشتہ مل جائے تو شادی میں تاخیر نہ کرو۔

ترمذی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کی سند متصل نہیں ہے۔ امام بخاری اور زیلعی کے نزدیک بھی یہ روایت ضعیف ہے۔

(۶) مصنف عبدالرزاق (کتاب النکاح، باب الاکفاء)، امام محمد کی کتاب الآثار (باب النکاح)، دارقطنی کی معرفۃ السنن والآثار (کتاب النکاح)، بیہقی کی السنن الکبریٰ (کتاب النکاح) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

''لأمنعن النساء عن أن ينكحن إلا من أكفائهن'' (میں عورتوں کو منع کروں گا کہ وہ اپنے کفو کے علاوہ دوسروں سے نکاح نہ کریں)۔

حافظ مزنی کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ابراہیم بن طلحہ ہیں، جن کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے لقاء ثابت نہیں ہے۔ یہی بات حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب (۲/ ۶۵) میں کہی ہے، اس روایت میں دوسرا راوی عبداللہ بن روّاد ہے، جو مجہول ہے؛ لہٰذا سند منقطع ہونے کے سبب سے یہ روایت مرسل اور ضعیف ہوئی۔ [۲۴]

(۷) المغنی میں ایک روایت پائی جاتی ہے: ''العرب أكفاء بعضهم أكفاء، والموالي بعضهم أكفاء بعض، إلا حائك أو حجام'' (تمام عرب ایک دوسرے کے کفو ہیں، اور موالی آپس میں ایک دوسرے کے کفو ہیں، سوائے کپڑا بننے والے اور پچھنا لگانے والے کے)۔

یہ روایت حاکم اور بیہقی میں بھی ہے، اس روایت کی تمام اسناد ضعیف اور نا قابل اعتبار ہیں۔ ابن عبدالبر نے اس روایت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ موضوع اور منکر ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس روایت کو منکر اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ دارقطنی، ابوحاتم، ابن عبدالبر اور ابن حبان نے اس روایت کو منکر اور موضوع قرار دیا ہے۔ [۲۵]

(۸) دارقطنی، مستدرک حاکم اور بیہقی میں ایک روایت پائی جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پارچہ باف، پچھنا لگانے والا اور رنگریز تاجروں کے کفو نہیں ہو سکتے۔

یہ روایت انتہائی ضعیف اور بہت سے محدثین کے نزدیک منقطع، مجہول، منکر اور موضوع ہے۔

(۹) مسند فردوس دیلمی اور شیخ علی متقی کی کنز العمال میں کچھ روایتیں پائی جاتی ہیں جن میں بعض پیشوں اور ان سے وابستہ افراد اور برادریوں کی مذمت اور تنقیص ہے، مثلاً کنز العمال میں ایک روایت ہے: "أكذب الناس الصباغ" (سب سے زیادہ جھوٹے لوگ رنگریز ہیں)۔

دوسری روایت ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی آواز دے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنھوں نے زمین پر رہتے ہوئے اللہ تعالی کے ساتھ خیانت کی تھی؟ اس پر ٹھٹھیرے، گھوڑا بیچنے والے، صراف اور جلاہے حاضر کیے جائیں گے۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سب سے برتر لوگ دستکاری کرنے والے اور سنار ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: "لم يثبت في اعتبار الكفاءة حديث" (کفاءت (فی النسب) کے جواز میں کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے)۔[۲۶]

علامہ ابن القیم نے اپنی کتاب "المنار المنيف في الصحيح والضعيف" (ص: ۱۰۵) میں یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ ہر وہ حدیث جو بنکروں، موچیوں، رنگریزوں اور دیگر مباح پیشہ وروں کی مذمت کرتی ہو، وہ حدیث نہیں ہے؛ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان ہے۔

ملا علی قاری نے بھی یہی لکھا ہے۔[۲۷]

نیل الاوطار میں ہے کہ نکاح میں کفاءت کا اعتبار کرنے کے جواز میں کوئی مستند حدیث موجود نہیں ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے بعض پیشوں کی رذالت کے مروجہ تصور کو غیر اسلامی اور غلط قرار دیا ہے۔ اور ان پیشوں کی مذمت میں جو روایتیں نقل کی گئی ہیں، ان سب کو ضعیف اور موضوع قرار دیا ہے۔[۲۸]

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ان روایات کو جو بعض پیشوں اور ان سے وابستہ برادریوں کی مذمت میں نقل کی جاتی ہیں موضوع اور باطل قرار دیا ہے۔[۲۹]

بعض لوگوں نے کفاءت کے متعلق روایات میں ضعف کے باوجود انھیں تعدد طرق اور تلقی بالقبول کی بنا پر قابل استناد بتلایا ہے۔ یہ استدلال تین وجوہ کی بنا پر نا قابل قبول ہے:

اول تو یہ کہ کفاءت کے جواز میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ سب کی سب مجہول، منکر، ضعیف اور موضوع ہیں ورتلقی بالقبول کے درجہ کو نہیں پہنچتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس نوع کی روایات نصوص قرآنی، احادیث، اسوۂ نبوی اور تعامل صحابہ سے متعارض ہیں۔

اور تیسرے یہ کہ یہ روایتیں درایت کے اصول کے اعتبار سے یعنی عقل وفہم، مشاہدہ اور تجربے کی روشنی میں معقولیت سے بعید نظر آتی ہیں۔

اسلامی مساوات ومواخات اور نسبی تفاضل کا بے بنیاد مفروضہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عربوں میں یہ خیال عام تھا کہ وہ غیر عربوں یا عجمیوں سے ہر لحاظ سے افضل و برتر ہیں۔ جاہلی معاشرے میں حسب ونسب، خاندان اور مال و دولت کو حد درجہ اہمیت دی جاتی تھی اور عالی نسبی کو شرافت ونجابت کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے رنگ ونسل، حسب ونسب، خاندان اور مال و دولت پر مبنی نابرابری کے تمام تصورات کو یکسر رد کر دیا اور ان کی جگہ انسانی وحدت اور مساوات ومواخات کا انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا۔

علامہ اعظمی فرماتے ہیں کہ اسلام میں نسبی تفاضل یعنی کسی ایک نسب کا دوسرے نسب سے بہتر و برتر ہونا کوئی چیز نہیں ہے۔[۳۰]

حضرت ابو المآثر کے اس بصیرت افروز بیان کی تائید وتوثیق قرآن کریم کی متعدد آیات اور سنت نبوی سے ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ (سورہ حجرات: ۱)

اسی سورہ میں ہے: [يا أيها الناس إنا خلقناكم من ذكر وأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أكرمكم عند الله أتقاكم]۔

اس آیت کریمہ کا شان نزول قابل غور ہے، حضرت ابو ہند عرب کے ایک معزز قبیلہ بنو بیاضہ کے غلام اور پیشہ کے اعتبار سے نائی تھے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلی عصبیت اور نسبی تفاخر کا خاتمہ کرنے کی غرض سے بنو بیاضہ کو حکم دیا کہ وہ اپنی لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی شادی ابو ہند سے کر دیں۔

یہ بات بنو بیاضہ کے لوگوں کو ناگوار گزری، انھوں نے کہا کہ کیا ہم اپنی بیٹیوں کی شادی اپنے غلاموں سے کر دیں، اس پر مذکورۃ الصدر آیت کا نزول ہوا۔

اس آیت کی تفسیر میں امام بغوی رحمہ اللہ نے معالم التنزیل میں اور علامہ علاء الدین بغدادی نے تفسیر خازن میں لکھا ہے: "والمعنى أنكم متساوون في النسب" (اس کے معنی یہ ہیں کہ تم سب لوگ نسب کے لحاظ سے یکساں اور برابر ہو)۔

بیضاوی لکھتے ہیں: "فالكل في ذلك سواء، فلا وجه للتفاخر بالنسب" (تمام لوگ اس بات میں برابر ہیں؛ لہذا حسب ونسب پر فخر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے)۔ امام نسفی اور علامہ زمخشری لکھتے ہیں: "فما

منكم أحد إلا وهو يدلي بمثل ما يدلي به الآخر، سواء سواء، فلا وجه للتفاخر والتفاضل في النسب" (تم میں سے ہر ایک وہی انتساب رکھتا ہے جو دوسرا رکھتا ہے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے؛ لہٰذا حسب ونسب کی بنا پر ایک دوسرے پر فخر اور بڑائی کی کوئی وجہ نہیں ہے)۔

یہی بات علامہ عینی نے شرح بخاری (۷ / ۸۷ ۴) میں لکھی ہے۔

علامہ مہلب شارح بخاری فرماتے ہیں: "قد نسخ الله سبحانه ما كانت تحكم به العرب في الجاهلية من شرف الأنساب بشرف الصلاح في الدين، فقال: إن أكرمكم عند الله أتقاكم" (دور جاہلیت میں عرب شرافت نسبی کو بہت اہمیت دیتے تھے، اللہ تعالی نے اس کو دین داری وصلاح سے منسوخ و باطل کر دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالی کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا تعالی کا خوف رکھتا ہے)۔[۳۱]

سورۂ بقرہ میں ہے: [وإذ ابتلى إبراهيم ربه بكلمات فأتمهن قال إني جاعلك للناس إماما قال ومن ذريتي قال لا ينال عهدي الظالمين] اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے علامہ اعظمی لکھتے ہیں کہ شرافت اور نسب میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے اور یہ کہ کمال اخلاق کا ایک شخص سے دوسرے شخص تک یا ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہونا ضروری نہیں ہے، ہابیل وقابیل کے واقعہ سے بھی اس دلیل کی تائید وتوثیق ہوتی ہے۔

سورۂ حدید میں ہے: [ولقد أرسلنا نوحا وإبراهيم وجعلنا في ذريتهما النبوة والكتاب فمنهم مهتد وكثير منهم فاسقون]۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے نے حکم الٰہی سے سرتابی کی اور کشتی میں سوار ہونے سے انکار کر دیا اور بالآخر ڈوبنے لگا، تو حضرت نوح علیہ السلام کی شفقت پدری جوش میں آئی اور آپ نے بارگاہ الٰہی میں اس کو غرقابی سے بچانے کے لیے التجا کی، تب ارشاد باری ہوا: [إنه ليس من أهلك إنه عمل غير صالح]۔ اس آیت کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ عمل صالح کے بغیر نسبی رشتہ بے معنی اور بے سود ہے۔ شیخ سعدیؔ نے اس واقعے کے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

پسر نوح با بداں بہ نشست — خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند — پئے نیکاں گرفت مردم شد

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا:

"أيها الناس! ألا إن ربكم واحد، وإن أباكم واحد، ألا! لا فضل لعربي على عجمي، ولا لأحمر على الأسود، ولا لأسود على لأحمر إلا بالتقوى"۔[۳۲]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قد أذهب عنكم عبية الجاهلية وفخرها بالآباء، إنما هو مؤمن تقي أو فاجر شقي"۔[۳۳]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "من أبطأ به عمله لم يسرع به نسبه"۔[۳۴]

ابن کثیر نے "البدایہ والنہایۃ" میں اور علامہ طاہر پٹنی نے "مجمع بحار الانوار" میں اس حدیث کے معنی یہ لکھے ہیں کہ جو بدکار ہو، یا اعمال صالحہ میں اس نے کوتاہی کی ہو، اس کو آخرت میں نسبی شرافت ونجابت کچھ کام نہ دے گی۔

ملا علی قاری مرقاۃ میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جو اپنے اعمال کی کوتاہی کی وجہ سے درجہ سعادت پانے کے قابل نہ ہو، اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا؛ اس لیے کہ خدا تعالی کا تقرب نسب سے نہیں؛ بلکہ اعمال صالحہ سے حاصل ہوتا ہے۔[۳۵]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"كرم المؤمن تقواه، ودينه حسبه"۔[۳۶]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"الفخر في الأحساب من أمر الجاهلية"۔[۳۷]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے اولیاء متقی لوگ ہوں گے، اگر کسی کا نسب دوسرے کی نسبت زیادہ قریب ہوگا، تو کچھ فائدہ نہ دے گا۔[۳۸]

بیہقی اور درمنثور میں ہے:

"كلكم لآدم وحواء طف الصاع بالصاع، وإن أكرمكم عند الله أتقاكم، فمن أتاكم ممن ترضون دينه وأمانته فزوجوه"۔[۳۹]

طبرانی میں ہے: "يقول الله يوم القيامة: أيها الناس! إني جعلت نسبا، وجعلتم نسبا، فجعلت أكرمكم عند الله أتقاكم، فأبيتم إلا أن تقولوا فلان أكرم من فلان، وفلان أكرم من فلان، وإني اليوم أرفع نسبي وأضع نسبكم، ألا إن أوليائي المتقون" (۴۰)۔[۴۰]

ترمذی میں روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی حضرت صفیہ اور صاحب زادی حضرت فاطمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم قیامت کے دن میرے سامنے اپنے اعمال لانا، اپنے انساب نہ پیش کرنا۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ابن اثیر اور سیوطی نے لکھا ہے کہ جو شخص بداعمال ہو، یا اعمال صالحہ میں اس نے کوتاہی کی ہو، اس کو آخرت میں نسب کی شرافت کچھ کام نہ دے۔[۴۱]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أربع من أمتي من أمر

الجاهلية لا يتركونهن: الفخر بالأحساب، والطعن في الأنساب، والاستسقاء بالنجوم، والنياحة'' (چار خصلتیں میری امت میں زمانہ جاہلیت کی ہیں جن کو لوگ نہ چھوڑیں گے: ایک تو اپنے خاندان پر بڑائی مارنا، دوسرے اوروں کے نسب میں عیب لگانا، تیسرے ستاروں کے ذریعہ بارش چاہنا اور چوتھے نوحہ کرنا)۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اثنتان في الناس هما بهم كفر: الطعن في النسب، والنياحة على الميت'' (دو باتیں ایسی ہیں کہ وہ لوگوں کو کفر کے درجے تک پہنچا دیتی ہیں: ایک تو کسی کو نسب کے بارے میں طعنہ دینا اور دوسرے میت پر نوحہ کرنا)۔

جنگ خندق کے موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ مدینہ کے اطراف ایک طویل وعریض خندق کھودی جائے، تاکہ دشمن کے حملے سے شہر کا دفاع ہوسکے، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ قوی ہیکل شخص تھے، اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تنہا پانچ ہاتھ لمبا اور پانچ ہاتھ گہرا گڑھا کھودنے کا کام سپرد کیا، رضا کاروں کی ہر جماعت حضرت سلمان کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتی تھی؛ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان کسی اور کے ساتھ نہیں، بلکہ خاص میرے ساتھ ہوں گے، پھر آپؐ نے فرمایا: ''سلمان منا أهل البيت'' (سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں)

ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اپنے انساب پر فخر ومباہات کا اظہار کر رہی تھی، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بھی ان کے درمیان موجود تھے، صحابہ نے ان کے خاندان کے بارے میں پوچھا، تو انھوں نے فرمایا: ''أنا ابن الإسلام'' (میں اسلام کا بیٹا ہوں)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کی خبر ہوئی، تو رونے لگے اور فرمایا: ''وعمر ابن الإسلام'' (اور عمر بھی اسلام کا بیٹا ہے)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا:

''إن كرم الرجل دينه، وحسبه خلقه، وإن كان فارسيا أو نبطيا'' (آدمی کی عظمت اور بزرگی اس کا دین ہے اور اس کا حسب ونسب اس کے اخلاق ہیں، خواہ وہ ایرانی ہو، یا نبطی)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ فرمایا کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کی تین آیتوں پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے، ان میں سے ایک آیت یہ ہے: [إن أكرمكم عند الله أتقاكم] (خدا کے نزدیک متقی اور پرہیزگار انسان سب سے زیادہ باعزت اور مکرم ہے)؛ لیکن مسلمان کہتے ہیں: ''أعظم بيتا'' (جس کے پاس اچھا اور بڑا مکان ہو، وہ بہتر ہے)۔

اس واقعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد آپ کی تربیت کا اثر رفتہ رفتہ کم ہونے لگا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات ومواخات کا درس دیا تھا، اور اخلاق اور دین داری کو فضیلت وعزت کا معیار قرار دیا تھا، لیکن آپ کے بعد لوگوں نے دنیوی مال ومتاع کو عزت اور معاشرتی حیثیت کی علامت سمجھ لیا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس جاہلیت کی شرافت کا ذکر ہوا، تو آپ نے فرمایا: ''دعوا هذا، فإن الإسلام عمر بيوتا كانت خاملة وأخمل بيوتا كانت عامرة'' (اس بات کو چھوڑ دو، اسلام نے ان خاندانوں کو جو گم نام تھے، ان کو نامور بنادیا اور جو بڑے نامی تھے ان کو گم نام بنادیا)۔[۴۲]

نسب اور شرف علم

بعض متاخرین فقہا نے لکھا ہے کہ عجمی شخص اگر پڑھ لکھ کر عالم بھی ہوجائے، تو عربی عورت کا کفو نہیں ہوسکتا، اسی طرح پست طبقات سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص علوم دینیہ میں فضیلت حاصل کرلے، تب بھی وہ شرفا کا کفو نہیں ہوسکتا۔

یہ فتویٰ قرآن وسنت، تعامل صحابہ وتابعین اور تاریخی، سماجیاتی اور شواہد اور عقل وفہم کی روشنی میں معقولیت سے بعید ہے۔

امام ابو یوسف کا قول ہے کہ اگر موالی میں سے کوئی شخص علم وفضل یا دوسرے فضائل میں ایسا مرتبہ حاصل کرلے کہ وہ لوگوں کی نگاہ میں ذی حیثیت شمار ہونے لگے، تو وہ قریشیہ بلکہ ہاشمیہ عورت کا کفو ہوسکتا ہے، کیوں کہ علم کا شرف نسبی شرف سے بالاتر ہے۔ ابن ہمام نے بھی یہی لکھا ہے کہ شرفِ علم نسبی شرافت سے بالاتر ہے۔

علامہ اعظمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بخاری رحمہ اللہ نے ذخیرہ سے نقل کیا ہے: ''إن العالم كفو للعلوي، إن شرف العلم فوق النسب''۔

آپ امام ابو یوسف کا فتویٰ نقل کرتے ہیں: ''الذي أسلم بنفسه أو عتق إذا أحرز الفضائل بنسب الآخر كان كفوا له''۔

علامہ عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں: ''الوضيع العالم خير من الشريف الجاهل، والعلم يرفع كل من لم يرفع''۔[۴۳]

جامع قاضی خان، بزازیہ، فتح القدیر اور نہر فائق میں ہے: ''فالعالم العجمي كفو للجاهل العربي والعلوية، لأن شرف العلم فوق شرف النسب'' (عجمی عالم عربی جاہل؛ بلکہ علویوں کا بھی کفو ہے؛ اس لیے کہ علم کا مرتبہ نسب کے مرتبہ سے بڑھا ہوا ہے)۔

علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وكيف يصح لأحد أن يقول: إن مثل أبي حنيفة والحسن البصري وغيرهما ممن ليس بعربي أنه لا يكون كفؤا لبنت قرشي جاهل أو لبنت عربي بوال على عقبيه'' (یہ کہنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور حسن بصری جیسے ائمہ جو عربی النسل نہیں ہیں، وہ کسی جاہل قریشی یا کسی ایسے عربی بدوی کی لڑکی کے کفو نہیں ہوسکتے جس کو پیشاب کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے)۔

علامہ عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں: ''الوضيع العالم خير من الشريف الجاهل، والعلم يرفع كل من لم يرفع'' (پست نسب عالم شریف جاہل سے بہتر ہے، علم ہر پست کو بلند کردیتا ہے)۔[۴۴]

قاضی ثناء اللہ حنفی پانی پتی نے تفسیر مظہری میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ایک عالم جو غیر اشراف برادری سے تعلق رکھتا ہے، وہ اپنے شرف علم کے سبب سے علوی اور دیگر عالی نسب لوگوں کا کفو ہے۔

علامہ اعظمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اسی طرح یہ جو مشہور ہے کہ عجمی اگر عالم بھی ہو تو عربیہ کا کفو نہیں ہوگا، یہی ظاہر الروایۃ ہے''۔

تو یہ بالکل غلط ہے اور ظاہر الروایۃ ہونے کا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔ اور محیط و بزازیہ وفیض و جامع الفتاویٰ وغیرہ میں جزم ویقین کے ساتھ مذکور ہے کہ شرف علم شرف نسب سے بڑھ کر ہے۔ ایسا ہی صاحب نہر فائق نے بھی لکھا ہے۔ اور اس کو کمال بن الہمام نے پسند کیا ہے؛ لہٰذا کوئی عجمی عالم خواہ وہ خیاط ہو، یا بزاز ہو، یا تاجر، یا بافندہ ہو، ایک سیدانی کا بلاشبہہ کفو ہوسکتا ہے اور سید اولاد آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس کی دلیل ہے۔[۴۵]

تاریخی نقطۂ نظر سے نسب ایک موہوم اور تغیر پذیر چیز ہے

عرب قبائل اور دیگر قوموں میں نسلی ونسبی اختلاط کا عمل صدیوں سے جاری وساری ہے، عرب قبائل کو عموماً تین طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے:

ایک عرب عاربہ جو خالص عربی نسل کے ہیں اور جن کا سلسلہ نسب ارم بن سام بن نوح سے ملتا ہے، عرب عاربہ میں عاد، ثمود، امیم، طسم، جدیس اور جرہم وغیرہ قبائل شامل ہیں، یہ قبائل معدوم ہوچکے ہیں۔

دوسرا طبقہ متعربہ کہلاتا ہے، جو خالص عرب نہیں سمجھے جاتے۔

تیسرا طبقہ مستعربہ کہلاتا ہے، مستعربہ کا نام ان قبیلوں کو دیا گیا ہے جو اصلاً عرب نہ تھے، شمالی عرب کے تمام قبیلے مستعربہ میں شامل ہیں۔ صحرائے عرب کے چند خانہ بدوش قبیلے مثلاً صلبہ، حطیم اور شرارات اصلاً غیر عربی ہیں۔

عرب قبائل میں نسبی اختلاط اور آمیزش عرصۂ دراز سے ہوتی آئی ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوا کہ کچھ افراد یا خاندان اپنے قبیلے سے الگ ہوکر دوسرے قبیلے میں مل گئے، یا ایک قبیلے نے اپنی حیثیت تبدیل کر کے نئی گروہ بندیاں قائم کرلیں، کئی عرب قبیلے مختلف نسلی عناصر سے مل کر بنے ہیں، عربوں کے انساب میں عجمی خون کی آمیزش بھی ہوئی ہے۔[۴۶]

عرب میں زیادہ تر غلام اور لونڈیاں وسطی افریقہ کی تھیں، کئی علاقوں میں عربوں نے حبشی عورتوں سے نکاح کیا تھا۔

محمد بن حبیب البغدادی نے ساٹھ عربوں کے نام گنائے ہیں، جن کی مائیں حبشیہ تھیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی والدہ حبشیہ تھیں، بعض عربوں نے ایرانی، کردی اور بربری خواتین سے شادیاں کی تھیں۔[۴۷]

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ نسب اکثر آپس میں گڑبڑ ہوجاتے ہیں، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم یا قبیلہ کا آدمی رشتہ کی قرابت کی وجہ سے یا کسی کا حلیف اور مددگار ہونے کے باعث، یا کسی جرم کا مرتکب ہوکر اپنا قبیلہ چھوڑ دیتا ہے اور کسی دوسرے قبیلہ میں جاملتا ہے اور پھر اس نئے قبیلہ کے نسب میں اپنے کو شمار کرنے لگتا ہے، مثلاً بنی عبدالقوی بن العباس بن توجین کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت عباس بن عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہیں۔

یہ دعویٰ علم انساب کے لحاظ سے غلط ہے اور محض اس لالچ میں کیا گیا تھا کہ اس نسب شریف کی عزت وشرف ان کے حصے میں بھی آجائے۔ اسی طرح بنوسعد شیوخ بنی یزید میں سے ہیں اور قبیلہ زغبہ سے جڑے ہوئے ہیں، وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں، جو بے اصل دعویٰ ہے۔[۴۸]

ابن حزم نے جمہرۃ انساب العرب اور القلقشندی نے صبح الاعشی میں لکھا ہے کہ موالی میں دو قسم کے لوگ شامل تھے:

ایک تو وہ تھے جن کا نسبی تعلق کسی قبیلہ سے نہ ہوتا؛ لیکن کسی عرب قبیلہ کے ساتھ باہمی امداد ومعاونت کا معاہدہ کرنے کی بنا پر ان کو اس قبیلہ کی طرف منسوب کردیا جاتا تھا، انھیں حلیف بنی فلان، یا مولیٰ بنی فلان کہا جاتا تھا۔

دوسری طرف مسلمانوں کے آزاد کردہ عجمی غلام، یا ان کی اولاد کو بھی موالی کہا جاتا تھا، انھیں بھی عرب قبائل کی طرف منسوب کردیا جاتا تھا۔

ایک زمانہ میں کردوں، قبطیوں اور بربر قبائل نے عربوں کے ساتھ نسبی تعلق کا دعویٰ کیا۔ جب مسلمانوں نے آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہسپانیہ کو فتح کیا، تو عربوں کی تعداد چند ہزار سے زائد نہ تھی، لیکن مروانی خلافت کے احیا کے بعد ایشیا کے مختلف خطوں سے مختلف النسل مہاجرین کی بڑی تعداد یہاں آکر آباد ہوگئی، عربوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کیں، ایسے لوگوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوگیا، جو غلط یا صحیح طور سے اپنے کو عربی

النسل کہتے تھے۔ بربر قوم جب اندلس میں آباد ہوئی، تو انھوں نے بڑی تیزی سے عربی زبان، تہذیب اور رسم و رواج اپنا لیے، انھوں نے اپنی زبان ترک کرکے عربی زبان اختیار کرلی اور عربی خانوادوں کے ساتھ اپنا سلسلۂ نسب ملانا شروع کیا۔[۴۹]

جعلی نسب نامے اور شجرے

معاشرے میں عزت و وقار حاصل کرنے کی غرض سے اونچے خاندانوں اور معروف شخصیات کے ساتھ نسبی تعلق جوڑنے اور جعلی نسب نامے وضع کرنے کا سلسلہ عرصۂ دراز سے جاری ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بعض لوگوں نے اعلیٰ اور معزز خاندانوں سے نسبی تعلق کا دعویٰ کیا، تو اہل علم نے ان کے دعویٰ کی تردید کی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگردوں میں تقی الدین قلقشندی بلند پایہ عالم ہیں، انھوں نے قریشی ہونے کا دعویٰ کیا، تو ان کے معاصر امام بقاعی نے ان پر سخت قدح کی۔

محمد بن احمد جروانی نے سید ہونے کا دعویٰ کیا، تو لوگوں نے ان پر طعن کیا اور کہا کہ یہ پہلے اپنے کو انصاری لکھتے تھے اور اب سید بن گئے۔

شمس الدین ابو المجد خراسانی اپنے کو سید کہتے تھے، ان کے متعلق علامہ سخاوی نے لکھا ہے کہ مکہ کے لوگ ان کے دعویٰ سیادت کے بارے میں شک کرتے ہیں۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادی پہلے شیخ ابو اسحاق شافعی کی اولاد میں سے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، اس کے بعد جب وہ یمن میں قاضی مقرر ہوئے، تو اپنے کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے بتلانے لگے، ان کے معاصر علماء نے ان کے دعویٰ کو قبول نہیں کیا۔ امام ذہبی نے یہاں تک لکھا کہ شیخ ابو اسحاق شافعی نے شادی بھی نہیں کی، تو پھر ان کی اولاد کہاں سے آئی؟

مشہور بزرگ شیخ ابو الحسن شاذلی نے اپنے نسب نامے میں اپنے کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے بتلایا ہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ یہ نسب نامہ مجہول ہے اور ثابت نہیں ہے۔

محمد بن احمد حمید الدین نعمانی بڑے عالم تھے، ان کے باپ حضرت امام ابو حنیفہ کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، حافظ ابن حجر اور سخاوی جیسے مشاہیر علماء نے ان کے دعویٰ کو غلط بتلایا ہے۔[۵۰]

کبھی ایسا ہوا کہ کسی علاقہ میں رہائش کی نسبت سے بعض لوگ حسنی، عباسی اور جعفری کہلانے لگے۔ عبد الرحمن بن محمد کے والد زبیریہ نامی مقام کے رہنے والے تھے اور اس نسبت سے زبیری کہلاتے تھے، لیکن عبد الرحمن کے لڑکے نے حضرت زبیر بن العوام سے اپنا نسب جوڑ لیا۔

ابراہیم بن احمد قاہرہ کے حسینیہ نامی علاقہ میں سکونت رکھتے تھے، وہ اس نسبت سے حسینی مشہور ہو گئے۔

ابراہیم بن ابی بکر مصر کے مضافات میں حسن نام کے ایک محلہ میں رہتے تھے، اس نسبت سے وہ حسنی مشہور ہو گئے۔

عبد الرحمن بن عبید شافعی زبید (یمن) کے ایک محلہ قریشیہ میں سکونت رکھنے کی بنا پر قریشی کہلانے لگے۔

شیخ محمد جعفری اور ان کے اہل خاندان جعفریہ محلہ میں سکونت رکھنے کی بنا پر جعفری مشہور ہو گئے۔

بعض علماء بغداد کے عباسیہ محلہ میں رہنے کی وجہ سے عباسی کہلاتے تھے۔

اگلے وقتوں میں طائف کو "وادیٔ عباس" بھی کہا جاتا تھا، اس اعتبار سے طائف میں پیدا ہونے والے بعض اصحاب عباسی کہلاتے تھے۔

بعض اصحاب کے اجداد اور مشہور انساب میں مماثلت مغالطہ کا سبب بن گئی۔ شرف الدین ابو الطیب عباسی حضرت عباسؓ کی اولاد میں سے نہیں تھے؛ بلکہ ایک مشہور بزرگ شیخ ابو العباس نابینا سے نسبی تعلق کی بنا پر عباسی کہلاتے تھے۔ یمن کے مشہور محدث نفیس الدین سلیمان کو علوی کہا جاتا تھا، حالاں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے نہیں تھے؛ بلکہ ان کے اجداد میں ایک شخص علی بن راشد بن بولان تھے، اس نسب سے وہ علوی مشہور ہو گئے۔ شیخ ابو البرکات عراقی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ہم عصر عالم ہیں، وہ اپنی نسبت خود لکھتے ہیں کہ ہم لوگوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ مشہور و معروف بزرگ شیخ رسلان کی اولاد میں سے ہیں، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم نے اس کی کوئی سند نہیں پائی۔[۵۱]

حاجی سالار قنوجی کا سلسلۂ نسب خواجہ عثمان ہارونی سے ملتا ہے، اسی وجہ سے ان کے خاندان والوں کو عثمانی کہتے ہیں۔[۵۲]

ہندوستان میں بعض خاندانوں نے اپنا سلسلۂ نسب خلفائے راشدین کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین کے ساتھ نسبی تعلق کے قابل اعتبار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سلسلۂ نسب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین تک بلا انقطاع چلا جائے۔

گوپامئو میں فاروقیوں کا ایک خاندان ہے جو اپنا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم بن ادہم کے واسطہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچاتا ہے۔ مولانا حکیم سید عبد الحی نے نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے کہ یہ دعویٰ بے اصل ہے؛ اس لیے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم نہ قریشی تھے، نہ فاروقی۔

مولانا عبدالحی نے دو اور خاندانوں کی نسبت لکھا ہے کہ یہ لوگ حضرت ابراہیم بن ادہم کے واسطہ سے اپنے کو عمری کہتے ہیں؛ مگر علمائے انساب کے نزدیک یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔[۵۳]

بعض عثمانی حضرات اپنے نسب نامہ میں حضرت سری سقطی کا ذکر کرتے ہیں، حالاں کہ حضرت سری سقطی عثمانی نہیں تھے اور نہ ہی کسی عربی قبیلہ سے ان کا تعلق تھا۔

دہلی کی صدیقی برادری کا جو شجرہ ہے اس میں بتلایا گیا ہے کہ اس برادری کے افراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے اور حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر کے بیٹے قاسم کی اولاد میں سے ہیں۔ انساب کی کتابوں کی روشنی میں یہ دعویٰ باطل ہے؛ کیوں کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر کی اولاد میں قاسم نام کا کوئی شخص نہیں ہوا ہے۔

اسی شجرہ میں حضرت سفیان ثوری کا نسب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملایا گیا ہے جو غلط ہے، حضرت سفیان ثوری نہ قریشی ہیں نہ صدیقی۔

کاندھلہ کے صدیقی حضرات اپنا نسبی تعلق امام فخر الدین رازی سے جوڑتے ہیں، خود امام رازی کا صدیقی ہونا مشتبہ ہے، مزید برآں امام رازی کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔[۵۴]

بعض عثمانی حضرات اپنے کو عبداللہ اکبر بن عثمان کی اولاد میں سے بتاتے ہیں، حالاں کہ عبداللہ اکبر لاولد فوت ہو گئے اور ان کی نسل ہی نہیں چلی۔

امروہہ کے سادات عقیلی اپنا سلسلہ نسب حضرت عبد اللہ بن مسلم بن عقیل سے جوڑتے ہیں، حالاں کہ ان کی نسل باقی نہیں رہی۔

امروہہ کے عباسی خاندان کے لوگ اپنے کو موسیٰ بن امین کے خاندان سے بتاتے ہیں، حالاں کہ ان کی نسل نہیں چلی۔

مولانا لطف اللہ علی گڑھی اپنا شجرۂ نسب حضرت ابوعبیدہ بن الجراح سے ملایا کرتے تھے، حالاں کہ حضرت ابوعبیدہ لاولد تھے۔[۵۵]

کفاءت اور پیشہ

کفاءت کے مروّجہ تصور میں پیشہ بالخصوص خاندانی و آبائی پیشہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرے میں مختلف پیشوں کے درجات یا مراتب مقرر کیے گئے ہیں، جن کی رو سے بعض پیشے اعلیٰ اور معزز سمجھے جاتے ہیں اور بعض پست اور حقیر۔

جو پیشے طبقۂ اشراف کے ساتھ مخصوص ہیں انھیں برتر اور ارفع سمجھا جاتا ہے اور جو پیشے کسب اور محنت پر مبنی ہیں اور جو محنت کش اور پیشہ ور برادریوں سے منسوب ہیں، انھیں کمتر اور حقیر سمجھا جاتا ہے، پیشوں کو عموماً جامد سمجھا جاتا ہے، جو خاندان درخاندان اور نسل درنسل چلتے رہتے ہیں۔

طبقۂ اشراف میں پیشوں کے بارے میں جو تصور پایا جاتا ہے، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے اور عقل وفہم کی روشنی میں صریحاً غلط ہے، اسلام کے نزدیک کوئی جائز پیشہ حقیر یا باعث عار نہیں ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کافر قوم نے ان سے کہا: [قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ] (کیا ہم آپ پر ایمان لائیں دریں حالے کہ رذیل اور گھٹیا لوگ آپ کے پیرو ہیں)۔

امام نسفی تفسیر مدارک التنزیل میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: حضرت نوح علیہ السلام کے پیروؤں کو ان کی کافر قوم نے اس لیے رذیل قرار دیا کہ ان کی نگاہ میں ان کا نسب پست تھا اور ان کے پاس مال و دولت کی کمی تھی۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ گھٹیا درجے کے پیشے کرتے تھے، حالاں کہ پیشے سے دین داری پر کوئی حرف نہیں آتا، اصلی دولت دین کی دولت اور حقیقی نسب تقویٰ کا نسب ہے، اور مومن چاہے کتنا ہی فقیر ومحتاج اور عرفاً کتنا ہی پست نسب ہو، اس کو رذیل کہنا جائز نہیں ہے، انبیاء کے پیرو ہمیشہ ایسے ہی لوگ رہے ہیں۔[۵۶]

اکثر انبیاء کرام کسی نہ کسی پیشے سے منسلک رہے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام بڑھئی کا کام کیا کرتے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام بزاز تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ پلائی ایک لوہار کی بیوی ام سیف تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بنایا کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرایا کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کپڑے سیتے تھے۔ قرآن کریم میں حضرت لقمان علیہ السلام کا ذکر آیا ہے اور ایک سورہ بھی آپ کے نام سے منسوب ہے، ابن کثیر نے حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے: "كان لقمان عبداً حبشياً نجاراً" (حضرت لقمان حبشی غلام تھے اور بڑھئی کا کام کرتے تھے)۔[۵۷]

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "أفضل الكسب بيع مبرور، وكسب الرجل بيده" (مسند أحمد وطبراني) (سب سے بہتر کمائی وہ ہے جو عمدہ تجارت اور آدمی کی اپنی محنت سے حاصل ہو)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: "ما أكل طعاماً قط خيراً من أن يأكل من عمل يديه، وإن نبي الله داود كان يأكل من عمل يديه.[۵۸]"

(سب سے بہتر رزق وہ ہے، جو محنت سے حاصل ہو اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنی محنت کی کمائی سے کھاتے تھے)۔

بیہقی کی شعب الایمان میں ہے: "أزكى الأعمال كسب المرء

بیدہ'' (سب کاموں میں پاک اور ستھرا کام آدمی کا اپنے ہاتھ سے کمانا ہے)

اگر کوئی شخص غریبوں پر اپنی تعلّی ظاہر کرتا، تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوتے اور فرماتے کہ تمہیں جو کچھ بھی میسر ہے انہی محنت کشوں کی وجہ سے ہے۔

صحیح بخاری اور ابن ماجہ میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں، صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، میں اہل مکہ کی بکریاں معمولی اجرت پر چراتا تھا۔

صحیح بخاری کی جلد اول میں متعدد صحابۂ کرام کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بنائی اور بڑھئی کا کام کرتے تھے۔

میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا پیشہ بافندگی تھا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بھی بنائی کا کام کرتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کچھ دنوں تیر بنانے کا کام کیا اور اس کے بعد باغبانی کا کام کیا۔

حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ بڑھئی کا کام کرتے تھے۔

حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ سلائی کا کام کرتے تھے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے والد بھی کپڑے سیتے تھے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جانور ذبح کرتے تھے اور چمڑے اور عطریات کی تجارت کرتے تھے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اپنی محنت کی روزی کھاتے تھے۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ زیتون کے تیل اور چمڑے کی تجارت کرتے تھے۔

حضرت ابوہند رضی اللہ عنہ فصد کھولنے کا کام کرتے تھے۔

حضرت عامر بن کریز رضی اللہ عنہ خزاز تھے، ''خز'' اون اور ریشم کے تانے بانے سے بنے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں۔

مدینہ منورہ کے انصار کا پیشہ پارچہ بافی تھا، بونجار اس پیشے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے بونجار کے یہاں سلاتے تھے۔ انصار خواتین بھی کپڑے سیتی تھیں۔

ایک مرتبہ ایک انصاریہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چادر لے کر آئیں اور آپ سے کہا کہ یارسول اللہ! اس چادر کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنا ہے، تاکہ آپ کو پہناؤں، آپ نے اس چادر کو اپنے جسم مبارک پر اوڑھا۔

صحیح مسلم (کتاب النکاح) میں ہے کہ ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا چمڑے کی دباغت کا کام کرتی تھیں۔ حافظ ابن حجر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ چمڑے کی دباغت اور جوتا گانٹھنے کا کام کرتی تھیں اور اس سے جو یافت ہوتی تھی اس کو راہِ خدا میں صدقہ کرتی تھیں۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی دباغت کا کام کرتی تھیں۔

بعض صحابیات مثلاً حضرت خولہ عطارہ، اسماء بنت مخرمہ ثقفی اور ملیکہ ثقفی رضی اللہ عنہن پھیری لگا کر عطر فروخت کرتی تھیں۔ اسی طرح بعض صحابیات کپڑے، دوپٹے اور قالین وغیرہ پھیری لگا کر فروخت کرتی تھیں۔ بعض صحابیات بازار میں غلہ فروخت کرتی تھیں۔ حضرت ہالہ رضی اللہ عنہا گوشت فروخت کرتی تھیں۔ بعض صحابیات کپڑوں کی بُنائی، رنگائی اور سلائی کا کام کرتی تھیں۔ بعض صحابیات مویشی چراتی تھیں۔[۵۹]

امام محمد بن حسن شیبانی نے پیشوں کے متعلق کتاب الکسب لکھی ہے اور امام سرخسی نے المبسوط میں اس کی شرح کی ہے، اس کتاب میں نقل ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کسب کا درجہ جہاد سے اونچا قرار دیا ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسب کوئی بھی ہو، وہ عبادت وتقرب کے قائم کرنے اور بجالانے میں معین و مددگار رہے، تا آں کہ کپڑا سینا، رسی بٹنا اور پیالے اور گھڑے بنانا اطاعت وقربت کی اعانت ہے۔

المبسوط میں بصراحت مذکور ہے: ''المذهب عند جمهور الفقهاء أن المكاسب كلها في الإباحة سواء'' (جمہور فقہا کا مذہب یہ ہے کہ پیشے اور معاش کے تمام جائز ذرائع اباحت کے لحاظ سے یکساں ہیں)۔

امام سرخسی رحمہ اللہ نے اس خیال کی پر زور تردید کی ہے کہ جو پیشے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل سمجھے جاتے ہیں، ان کو بلاضرورت شدیدہ اختیار نہ کرنا چاہیے۔[۶۰]

بعض کتب فقہ میں پیشوں کو شریف اور رذیل کے خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

بعض متاخرین فقہا نے لکھا ہے کہ اگر مرد کا پیشہ حقیر اور ذلیل ہو اور عورت کے لیے باعث عار ہو، تو وہ مرد اس عورت کا کفو نہ ہوگا۔

پیشوں کو اعلی اور ادنیٰ کے خانوں میں تقسیم کرنا اور پیشہ کو امور کفاءت میں شمار کرنا قرآن وسنت کی تصریحات اور تعامل صحابہ وتابعین کے منافی ہے۔

یہ نقطۂ نظر تاریخی، سماجیاتی اور عقلی پیمانوں کی روشنی میں بھی معقولیت سے بعید ہے۔

پیشے کے بارے میں پانچ نکات لائق توجہ ہیں:

اول یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اور عقل وفہم اور مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں کوئی پیشہ پست، معیوب یا حقیر نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں بے شمار علماء فقہاء، محدثین اور صالحین و اولیاء کی گزر اوقات ایسے پیشوں پر تھی جو عرف عام میں پست اور معمولی سمجھے جاتے ہیں۔[61]

تیسری بات یہ ہے کہ پیشے ہمیشہ جامد نہیں رہتے؛ بلکہ امتداد زمانہ اور سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی عوامل کے زیر اثر ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ بعض پیشے مرور ایام اور زمانے کے انقلابات کے ساتھ معدوم ہو جاتے ہیں اور ان پیشوں سے جڑے ہوئے لوگ دیگر ذرائع معاش اختیار کر لیتے ہیں، اسی لیے امام مالک رحمہ اللہ نکاح میں پیشے کا مطلق اعتبار نہیں کرتے۔

امام سرخسی المبسوط میں لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کفاءت میں پیشے اعتبار نہیں کرتے۔

فقہائے حنفیہ میں امام کرخی اور امام ابوبکر جصاص کا یہی قول ہے۔

علامہ نوح آفندی نے لکھا ہے کہ اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی روایت اس باب میں نہ ہوتی، تو امام کرخی اور امام جصاص کفاءت کے باب میں پیشے کو نا قابل اعتبار نہ قرار دیتے۔[62]

جن فقہاء نے کفاءت میں پیشے کا اعتبار کیا ہے، انھوں نے اپنے زمانے کے عرف اور رسم ورواج کو پیش نظر رکھا ہے، مثلاً فقہاء لکھتے ہیں کہ ایک شخص کوئی پیشہ یا ذریعۂ معاش رکھتا ہو اور پھر وہ اپنا ذریعہ معاش بدل دے، مثلاً اگر کوئی شخص کپڑا بننے والا ہو اور پھر اس نے یہ پیشہ چھوڑ کر تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنالیا ہو، تو اب وہ تاجر کا کفو سمجھا جائے گا۔[63]

فقہی اصطلاح میں دُھنیا وہ ہے جو خود یہ پیشہ کرتا ہو، جس شخص کا خاندانی پیشہ روئی دُھننا ہو؛ لیکن اس کے خاندان میں عرصے سے یہ پیشہ ترک ہو چکا ہو اور اس خاندان کے کسی فرد نے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر لیا ہو جو عرف عام میں حقیر نہ سمجھا جاتا ہو، (مثلاً تجارت، صنعت وحرفت، ملازمت وغیرہ) تو وہ فقہاء کے نزدیک دُھنیا نہیں سمجھا جائے گا اور وہ دیگر غیر عرب قوموں مثلاً مغل، پٹھان یا کنبوہ کا کفو ہو سکتا ہے۔[64]

چوتھی بات یہ ہے کہ یہ مشاہدے اور تجربے سے ثابت ہے کہ پیشے کا شرافت وعظمت سے کوئی لازمی تعلق نہیں ہے، اچھے برے لوگ معاشرے کے ہر طبقے اور ہر پیشے میں ہوتے ہیں، محنت کشوں اور معمولی پیشہ وروں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی سیرت و کردار میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی آب و تاب نظر آتی ہے۔

ایک جلیل القدر حنفی فقیہ علامہ خیر الدین رملی نے فتاویٰ خیریہ میں یہ بصیرت افروز بات لکھی ہے کہ بہت سے معمولی پیشہ وروں میں ہم وہ دین داری اور تقویٰ پاتے ہیں جو عزت وجاہ والوں میں نہیں پایا جاتا۔[65]

حضرت ذو النون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جس کو مروت و شرافت سیکھنی ہو وہ بغداد کے بھشتیوں سے سیکھے۔[66]

پانچویں بات یہ ہے کہ پیشے کی بنیاد پر کسی مسلمان کو حقیر سمجھنا نہ صرف ایک غیر اسلامی فعل ہے؛ بلکہ گناہ ہے۔

ترمذی اور مسند احمد میں روایت ہے: ”حسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم“ (کسی آدمی کے برے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے اور اسے حقیر سمجھے)۔

ترمذی میں ہے: ”لا تؤذوا المسلمين ولا تعيروهم“. (مسلمانوں کو ایذا نہ پہنچاؤ اور نہ ان کو شرم وعار دلاؤ)۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”لا يحل لمسلم أن يحقر أخاه المسلم، كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه“۔

مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی نے اپنے ملفوظات میں یہ بصیرت افروز بات تحریر فرمائی ہے کہ ہندوستان میں پیشہ کرنا بدترین خصلت سمجھا جاتا ہے، اسی وجہ سے لوگ محتاجی اور فقیری میں مبتلا ہو گئے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ اکثر انبیاء علیہم السلام کسی نہ کسی پیشے کی طرف منسوب ہیں؛ اس لیے پیشے کی توہین کرنا ایک قسم کا کفر ہے۔[67]

مسئلہ کفاءت کے متعلق حنفی فقہ میں کشادگی

اس سے پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح قول کے مطابق کفاءت میں پیشے کا اعتبار نہیں ہے۔ یہی مسلک حنفی فقہا میں امام ابوبکر جصاص، امام کرخی اور امام کاسانی کا ہے۔

ائمہ اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر عورت اور اس کے اولیاء کفاءت کا لحاظ نہ کریں، تو کوئی مواخذہ نہیں ہو سکتا۔

علامہ اعظمی فرماتے ہیں کہ کبار مشائخ حنفیہ کی تصریح کے مطابق متعدد احادیث کی بنا پر نسبی کفاءت کا لحاظ نہ کرنا اور اس حق سے دست بردار ہونا ہی افضل ہے۔

امام سرخسی اور ملک العلماء کاسانی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو بیاضہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے قبیلے کی کسی لڑکی سے اپنے غلام ابوطیبہ کا نکاح کر دیں۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ عرب کی قوم کے پاس جا کر کہو کہ تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ اپنے قبیلے میں میرا نکاح کر دو۔

یہ روایتیں نقل کرنے کے بعد سرخسی اور کاسانی نے لکھا ہے: ’’تأویل الحدیث الآخر الندب إلی التواضع وترک طلب الکفاءۃ‘‘۔

اس کے بعد کاسانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ’’وعندنا الأفضل اعتبار الدین والاقتصار علیہ‘‘۔[68]

علامہ اعظمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کفاءت کا شمار حقوق اللہ میں نہیں؛ بلکہ حقوق العباد میں ہے، اور یہ حق جوازی ہے نہ کہ وجوبی، چنانچہ اگر باپ یا دادا نے اپنی نابالغ لڑکی یا پوتی کا نکاح غیر کفو سے کر دیا، تو یہ نکاح صحیح ہے، فسخ نہیں ہوسکتا۔

اگر منکوحہ بالغہ ہے اور اس کا کوئی ولی نہیں ہے اور اس نے اپنا نکاح غیر کفو میں کرلیا، تو یہ نکاح بھی صحیح و لازم ہے، فسخ نہیں ہوسکتا۔

اگر ولی موجود ہو اور لڑکی اور اس کا ولی غیر کفو میں شادی کرنے پر رضا مند ہوجائیں، تو یہ نکاح بھی صحیح و لازم ہے، فسخ نہیں ہوسکتا۔

لڑکی بالغ ہو اور وہ اور اس کا باپ غیر کفو میں شادی کرنے کے لیے رضا مند ہوں اور چچا اور بھائی ناراض ہوں، تب بھی نکاح صحیح اور لازم ہوگا۔

اگر لڑکی بالغہ ہے اور اس کا ولی موجود ہو اور لڑکی ولی کی رضا مندی کے بغیر غیر کفو سے اپنا نکاح کرلے، تو حسن بن زیاد کی شاذ روایت کی بنا پر یہ نکاح صحیح نہیں ہوگا؛ لیکن ظاہر الروایۃ کی بنا پر نکاح صحیح ہوگا، اگرچہ ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فقہا نے دونوں روایتوں پر فتوے دیے ہیں؛ لہٰذا دونوں مفتیٰ بہ ہیں۔

علامہ شامی ظاہر الروایۃ کے بارے میں علامہ ابن نجیم کا قول نقل کرتے ہیں: ’’وبہ أفتی کثیر من المشایخ فقد اختلف الإفتاء‘‘۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عابد سندی نے نہر فائق سے اور صاحب نہر نے بزازیہ سے اور صاحب بزازیہ نے برہان الائمہ سے نقل کیا ہے کہ ظاہر الروایۃ پر مبنی فتویٰ حضرت امام اعظم کے قول پر ہے۔

پھر علامہ فرماتے ہیں کہ ظاہر الروایۃ ہر لحاظ سے قابل ترجیح ہے۔ اس رائے کی تائید و تصویب میں آپ علامہ ابن نجیم کی تحریر نقل کرتے ہیں (جسے شامی نے بیان کیا ہے) کہ ’’الفتوی إذا اختلفت کان الترجیح لظاہر الروایۃ‘‘۔ مزید برآں امام ابو یوسف اور امام شیبانی کا قول ظاہر الروایۃ کے موافق ہے، (جیسا کہ کفایہ، فتح القدیر اور عالمگیری میں مذکور ہے)۔ یہ رائے امام شافعی کی تصریح کے موافق ہے۔ پھر علامہ اعظمی فرماتے ہیں کہ ظاہر الروایۃ دلیل کے لحاظ سے بھی قوی ہے۔[69]

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر بالغ لڑکی اپنی مرضی سے غیر کفو سے نکاح کرنا چاہے؛ لیکن اس کے ولی اس نکاح کے خلاف ہوں، تب بھی یہ نکاح جلیل القدر حنفی فقہا کے نزدیک صحیح ہوگا۔

اس مسئلے کے بارے میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

’’موجودہ زمانے میں اس رائے (یعنی حسن بن زیاد کی شاذ روایت) پر فتویٰ دینے میں بڑی دقتیں پیدا ہوجائیں گی اور شہروں کے سماج میں رہنے والے بہت سے ایسے نکاح جو ولی کی اجازت کے بغیر ہوجاتے ہیں اور اپنی ناراضگی کے باوجود انجام کار ولی اس پر خاموشی اختیار کرلیتا ہے، حرام قرار پائیں گے؛ اس لیے موجودہ حالات میں ظاہر الروایۃ والا قول ہی زیادہ صحیح اور قابل عمل ہے۔‘‘[70]

مسئلہ کفاءت کا عصری تناظر

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی اقدار اور اسلامی شریعت کے اصولوں کا بڑی حد تک رچاؤ ہے؛ لیکن ان کی معاشرتی زندگی کے کئی پہلو ایسے ہیں جو اسلامی اصولوں اور اسلامی شریعت کی روح سے متعارض ہیں، ایک طرف اسلام کا انقلاب آفریں پیام وحدت و مساوات و مواخات ہے، جس نے چھوٹے بڑے، غریب امیر، حاکم و محکوم اور رذیل و شریف کے سارے جاہلی امتیازات کو یکسر ختم کر دیا۔ دوسری طرف یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ ہماری معاشرتی زندگی اس زریں اور بے مثال اصول کے برعکس ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں بالخصوص شمالی ہندوستان میں اونچ نیچ، شریف و رذیل اور ادنیٰ و اعلیٰ کا تصور عام ہے، ہم بظاہر اسلامی مساوات و مواخات کا دم بھرتے ہیں؛ لیکن غریبوں، محنت کشوں اور معمولی پیشہ وروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ شادی بیاہ کے نظام میں معاشرتی نابرابری اور اونچ نیچ کا تصور نمایاں نظر آتا ہے، بدقسمتی سے کفاءت کے مروجہ تصور کے ڈانڈے ذات پات کے غیر اسلامی نظام سے مل گئے ہیں۔

امت مسلمہ میں طبقاتی، علاقائی اور مسلکی اختلافات بڑے پیمانے پر موجود ہیں، کفاءت کے مروجہ تصور نے ان اختلافات کو مزید تقویت پہنچائی ہے۔ کفاءت کا مروجہ تصور امت مسلمہ کے اختلافات وافتراق کا آئینہ دار بھی ہے اور اس کے سبب سے اختلاف وافتراق میں اضافہ بھی ہوا ہے۔ اس تصور نے ناروا داری، تنگ نظری اور طبقاتی عصبیت کو ہوا دی ہے، اس کے سبب سے شرفا اور پیشہ ور برادریوں کے درمیان بے گانگی اور منافرت کی خلیج اور بھی

وسیع ہوگئی ہے۔

ہمارے معاشرے میں بچوں کی شادی عموماً والدین طے کرتے ہیں اورنسبت طے کرتے وقت حسب ونسب، برادری اور خاندان کو اولیت دی جاتی ہے،بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خاندان یا برادری میں موزوں رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے بہت سی لڑکیاں کنواری رہ جاتی ہیں اور عمر رسیدہ ہوجاتی ہیں، بہت سے والدین شادی کی عمر گزر جانے کے بعد بھی اپنی لڑکیوں کی شادی برادری سے باہر کرنا پسند نہیں کرتے، ایسی صورت میں لڑکیاں سسک سسک کر اپنی زندگی گزار دیتی ہیں،بعض لڑکیاں اپنے والدین کی مرضی کے خلاف اپنی پسند کے لڑکوں سے شادی کرلیتی ہیں،بعض صورتوں میں مسلمان لڑکیاں غیر مسلموں سے شادی کرلیتی ہیں۔

ادھر بیس پچیس برسوں میں ہندوستان کے مسلمانوں میں عصری تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا ہوا ہے اور وہ اپنے بچوں کو اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج رہے ہیں، کئی شہروں میں مسلمان لڑکیاں تعلیم کے میدان میں لڑکوں سے آگے ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عموماً لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھتے ہیں، اس کے نتیجے میں انھیں ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔آج کل بہت سی مسلمان لڑکیاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسکولوں، کالجوں اور دفتر میں ملازمت کرتی ہیں، دفتر میں مختلف برادریوں اور قوموں کے لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ساتھ کام کرتی ہیں، ایک ہی جگہ کام کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان شناسائی اور قربت کا پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے۔آج کل لڑکوں اور لڑکیوں میں اپنا شریک حیات خود منتخب کرنے کا رجحان تیزی سے بڑھتا جارہا ہے، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں چاہتی ہیں کہ ان کی شادی ان کی پسند کے مطابق اور ان کے والدین کی رضامندی کے ساتھ ہو، ہماری نوجوان نسل میں اور ان کے والدین اور دادا دادی اور نانا نانی کی پیڑھی کے انداز فکر میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ آج کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں صدیوں سے چلی آئی رسم ورواج کو آنکھ بند کرکے قبول کرنا پسند نہیں کرتے، وہ ہر معاملے کو عقل وفہم اور تجربے کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں، جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ان کا مذہب مساوات ومواخات کے اصولوں کا علم بردار ہے اور دوسری طرف وہ مسلمانوں میں طبقاتی، مسلکی اور گروہی اختلافات اور نارواداری پاتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے والدین نکاح میں حسب ونسب اور خاندان کو اولیت دیتے ہیں، تو یہ بات ان کو کھٹکتی ہے۔اسلامی اصولوں اور مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے درمیان پایا جانے والا یہ تضاد ان میں اپنے مذہب اور معاشرے کے تئیں بدگمانی پیدا کرتا ہے۔

خاتمۂ کلام

اس مضمون میں مسئلہ کفاءت کے متعلق ابوالمآثر علامہ حبیب الرحمن الاعظمی کے افکار ونظریات ایک وسیع تر تناظر میں اور موجودہ حالات کے پس منظر میں پیش کیے گئے ہیں، کفاءت کے متعلق علامہ اعظمی کے موقف کا لب لباب یہ ہے کہ کفاءت کا مروجہ تصور قرآن وحدیث کی تصریحات، اسوۂ نبوی اور صحابہ وتابعین کے تعامل کے خلاف ہے۔

آپ نے متعدد دلائل وشواہد سے یہ واضح کیا ہے کہ رشتۂ نکاح میں حسب ونسب، خاندان اور پیشے کا اعتبار کرنا اسلامی اور تاریخی نقطہ نظر سے موہوم اور ناقابل اعتبار ہے، رشتہ نکاح میں صرف دین واخلاق کا اعتبار کرنا چاہیے۔یہ موقف تنہا علامہ اعظمی کا نہیں ہے؛ بلکہ اسے صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عمر، تابعین میں حضرت عمر بن عبد العزیز، محمد سیرین اور حسن بصری، ائمہ فقہ میں امام مالک، سفیان ثوری اور ابن حزم اور حنفی فقہا میں امام کرخی، امام ابوبکر جصاص اور امام کاسانی رحمہم اللہ کی تائید وتصویب حاصل ہے۔متاخرین حنفی فقہا میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور مفتی کفایت اللہ اسی موقف کے حامی ہیں۔مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید مجیب اللہ ندوی اور مولانا اخلاق حسین قاسمی رحمہم اللہ نے اسی موقف کو راجح قرار دیا ہے۔[۱]

کفاءت کے مروجہ تصور کے سبب سے مسلمانوں کے معاشرے میں کئی سنگین مسائل پیدا ہوگئے ہیں، جن کا سد باب کرنا ضروری ہے۔

راقم السطور عرض کرتا ہے کہ مذاہب اربعہ کے فقہا کا اس بات پر اجماع ہے کہ ضرورت شدیدہ، یا ابتلائے عام، یا عوام الناس کی سہولت کے پیش نظر دوسرے امام کے مسلک پر فتویٰ دینا جائز ہے۔

علامہ شامی نے ''عقود رسم المفتی'' میں لکھا ہے: '''لو أفتى بقول مالك في موضع الضرورة ينبغي أن لا بأس به'''۔امام شاطبی نے ''الموافقات'' میں متعدد مثالوں کے ذریعہ یہ واضح کیا ہے کہ عامۃ المسلمین کی سہولیت اور دفع ضرر کی غرض سے مالکی فقہا نے امام ابوحنیفہ کے مسلک پر فتویٰ دیا ہے۔زوجۂ مفقود الخبر کے مسئلہ میں برصغیر کے حنفی فقہا نے امام مالک کے مذہب پر فتویٰ دیا ہے۔[۲]

ہمارے زمانے کے ایک جلیل القدر حنفی عالم شیخ مصطفی زرقا (متوفی: ۱۹۹۹ء) نے لکھا ہے کہ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلامی فقہ کی تشریح و تعبیر موجودہ حالات اور عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی جائے،

تاکہ معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی مسائل میں امت مسلمہ کی رہنمائی ہوسکے، وہ فرماتے ہیں کہ اس مقصد کی برآری کے لیے اہل سنت کے فقہی مذاہب میں جو اصول اور فتاویٰ موجودہ حالات میں موزوں ہوں ان سے خاطر خواہ استفادہ کرنا چاہیے۔

لہذا علماء وفقہا، اصحاب افتا اور دینی وفقہی تنظیموں اور انجمنوں سے میری دست بستہ گزارش ہے کہ تمام مسلکی، گروہی اور طبقاتی اختلافات اور مصلحت کوشی کو پس پشت ڈال کر اس مسئلے پر موجودہ حالات کی روشنی میں غور و خوض کریں، کفاءت کے مروجہ تصور سے پیدا ہونے والے مفسدات کا سد باب کریں اور امت مسلمہ کی رہنمائی فرمائیں۔

اس ضمن میں علامہ ابن القیم اور علامہ عبدالوہاب شعرانی کے ارشادات جو ذیل میں نقل کیے گئے ہیں ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوسکتے ہیں۔

علامہ ابن القیم لکھتے ہیں: جس مسئلہ میں انصاف کے بجائے ظلم ہو، رحمت کے بجائے زحمت ہو، فائدے کے بجائے نقصان ہو اور عقل کے بجائے بے عقلی ہو، وہ شریعت کا مسئلہ نہیں، اگر چہ اسے بذریعہ تاویل شرع میں داخل کرلیا گیا ہو۔[3]

علامہ شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فکل مسئلة حدثت في الإسلام فاختلف الناس فيها، ولم يورث ذلك الاختلاف بينهم العداوة ولا بغضاء ولا فرقة، علمنا أنها من مسائل الإسلام، وكل مسئلة طرت فأوجبت العداوة والتنافر والتنابز والقطيعة علمنا أنها ليست من أمر الدين في شيء'' (ہر نیا مسئلہ جو اسلام میں پیدا ہوا اور لوگ اس میں مختلف ہوجائیں، تو اگر اس اختلاف کی وجہ سے نہ عداوت پیدا ہو، نہ بغض وکینہ اور نہ لوگ ایک دوسرے سے جدا ہوں، تو ہم جان لیتے ہیں کہ وہ اسلام ہی کے مسئلوں میں سے ایک مسئلہ ہے، مگر جو مسئلہ ایسا چھڑے کہ اس کی وجہ سے دلوں میں دشمنی اور باہمی منافرت پیدا ہوتی ہو، لوگ ایک دوسرے کو برے القاب اور برے ناموں سے پکارنے لگیں اور اسلامی اخوت کا رشتہ اس اختلاف کی وجہ سے کٹ جائے، تو ہم جان لیں گے کہ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے)۔[4]

جمعیۃ علماء ہند نے اپنے گیارہوں اجلاس منعقدہ جون پور ۷/تا ۹/جون ۱۹۴۰ء میں جو قرار دادیں منظور کیں، ان میں سے ایک قرار داد ذات پات کے رد میں تھی۔

''جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اس حقیقت کا اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اسلامی تعلیم کی رو سے مسلمان شریف اور رذیل طبقات میں منقسم نہیں ہیں اور صنعت وحرفت کے لحاظ سے رذیل اور شریف قرار دینا ہندوستان کے ہندوؤں کا طریقہ تھا، جو مذہبی تعلیم سے ناواقفیت اور عصبیت و جہالت کی وجہ سے بعض مسلمانوں میں بھی پیدا ہوگیا، اسلام نے شرافت کا مدار تقویٰ وصلاحیت پر رکھا ہے۔ اور سید المرسلین رحمۃ للعالمین کا ارشاد ہے: ''لا فضل لعربي على عجمي، الناس كلهم بنو آدم، وآدم من تراب'' اس کی صاف اور صریح دلیل ہے۔

یہ اجلاس ان لوگوں کے رویے کہ پرزور مذمت کرتا ہے جو مسلم پیشہ ور برادریوں کو رذیل قرار دے کر اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی سعی کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں اسلام کو نقصان پہنچاتے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرتے ہیں''۔

جمعیۃ العلماء سے میری یہ گزارش ہے کہ کفاءت کے مروجہ تصور اور نظام سے پیدا ہونے والے پریشان کن مسائل پر غور وخوض کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی غرض سے ملک کے ممتاز علماء وفقہا کا ایک محضر طلب کرے اور اس میں بحث وتمحیص کے بعد کفاءت کے متعلق علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی کے موقف کی تائید وتصویب میں ۱۹۴۰ء کے اجلاس کی قرارداد کی نہج پر ایک قرارداد منظور کی جائے، اجتماعی اجتہاد اور اجماع کے ذریعہ اس مسئلے کے حل کی یہ سبیل ان شاء اللہ نافع ثابت ہوگی۔

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ دے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

حواشی ومراجع

1. الفقہ علی المذاہب الاربعۃ/ از: عبد الرحمن الجزیری (طبع بیروت ۲۰۰۰ء) ۴/ ۵۴، ۵۸، ۵۹، اصول الفقہ الاسلامی/ از: وہبۃ الزحیلی (الکفاءۃ فی الزواج) ص: ۶۷۳۵ - ۶۷۴۰، الاحکام الشریعۃ فی الاحوال الشخصیۃ/ از: محمد ابو زہرہ (طبع قاہرہ) ص: ۱۳۶ - ۱۴۵، مجموعۂ قوانین اسلام/ از: ڈاکٹر تنزیل الرحمن (ط: اسلام آباد ۱۹۶۵ء) ۱/ ۲۶۴۔ حنفی فقہا کے موقف کی تفصیل ''المبسوط'' (جلد پنجم)، فتح القدیر (جلد سوم)، ہدایہ (جلد اول) اور ردالمحتار میں دیکھی جاسکتی ہے۔ امام مالک کے موقف کی وضاحت کے لیے ابن رشد کی ''بدایۃ المجتہد'' (۲/ ۱۵) ملاحظہ کریں۔
2. حیات شبلی/ از: مولانا سید سلیمان ندوی، ص: ۵۱، ۶۱
3. تفصیلات کے لیے راقم السطور کی کتاب ''رشتۂ نکاح، کفاءت اور برادری اسلامی، تاریخی اور سماجیاتی تناظر میں'' (طبع سوم مع اضافات) ملاحظہ کریں۔
4. دستکار اہل شرف/ از: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی (طبع مئو ۱۹۸۵ء) ص: ۱۱۸
5. انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت/ از: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی (طبع مئو ۱۹۹۹ء) ص: ۶۷
6. مسئلہ کفاءت کی اہمیت اور اس کی شرعی حیثیت/ از: مولوی محمد یوسف قاسمی، ''برہان'' (۱۹۷۳ء) (بحوالہ مجمع البحار ۲/ ۱۵۸)

۷ دستکار اہل شرف ص:۱۱۸
۸ الجامع لاحکام القرآن / از: ابوعبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر فرح الانصاری القرطبی (بیروت) ۱۷/۷/۱۸۷
۹ انساب وکفاءت، ص:۴۴-۴۵
۱۰ جدید فقہی مسائل/ از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ص:۹۶-۹۷ (بحوالہ: الجامع لاحکام القرآن ۱۶/۷/۳۴۷)
۱۱ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء/ از: شاہ ولی اللہ دہلوی (طبع کراچی) ۳/۷/۲۸۷-۲۸۸
۱۲ سنن سعید بن منصور (ماجاء فی المناکحۃ) ص:۱۴۶
۱۳ صحیح بخاری (کتاب النکاح/ باب الاکفاء فی الدین)
۱۴ جدید فقہی مسائل ص:۹۹ (بحوالہ: الجامع لاحکام القرآن ۱۶/۷/۳۴۷)
۱۵ سنن سعید بن منصور (ماجاء فی المناکحۃ) ص:۱۴۶
۱۶ دستکار اہل شرف ص:۱۱۸
۱۷ انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت ص:۷۰-۷۱
۱۸ الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۵/۱۶۵
۱۹ انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت، ص:۵۰
۲۰ انساب وکفاءت، ص:۷۴
۲۱ انساب وکفاءت، ص:۷۲
۲۲ جدید فقہی مسائل ص:۶۴، مسئلہ کفو اور اشاعت اسلام/ از: مولانا عبدالحمید نعمانی، ص:۳۰
۲۳ حقوق نسواں/ از: مولانا سید سلیمان ندوی (در ''معارف'' جون ۱۹۲۸ء)
۲۴ جدید فقہی مسائل ص:۶۴، مصنف عبدالرزاق ۶/۱۵۲
۲۵ انساب وکفاءت، ص:۵۶-۵۷
۲۶ فتح الباری/ از: ابن حجر عسقلانی، ۹/۱۳۳
۲۷ الموضوعات الکبیر/ از: ملا علی القاری، ص:۵۴۴، کفایت المفتی/ مرتبہ: مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی، ۷/۷۷-۳۸۶
۲۸ رفع النقب عن النسب والکسب ص:۶۹-۷۲ (بحوالہ شرح سفر السعادۃ)
۲۹ انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت ص:۵۹
۳۰ انساب وکفاءت، ص:۱۵
۳۱ انساب وکفاءت، ص:۱۵-۱۸
۳۲ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ/ از: ڈاکٹر محمد حمید اللہ (طبع چہارم، بیروت ۱۹۸۳ء) ص:۳۶۲
۳۳ مشکوۃ (باب المفاخرۃ)
۳۴ انساب وکفاءت، ص:۲۸ (بحوالہ ترمذی)
۳۵ انساب وکفاءت، ص:۲۸
۳۶ ترمذی (ابواب التفسیر)
۳۷ مسلم وابوداؤد
۳۸ الادب المفرد/ از: محمد بن اسماعیل البخاری (باب الحسب)
۳۹ انساب وکفاءت، ص:۴۳
۴۰ انساب وکفاءت، ص:۴۳
۴۱ انساب وکفاءت، ص:۲۸
۴۲ انساب وکفاءت، ص:۲۶ (بحوالہ: مجمع الزوائد ۸/۸۶)
۴۳ انساب وکفاءت، ص:۵۵
۴۴ انساب وکفاءت، ص:۴۸-۴۹
۴۵ اسلامی پرسنل لاء میں باب کفو/ از: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی (مجلہ المآثر: مئی تا اگست ۱۹۹۹ء)
۴۶ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (طبع لاہور) ۱۶/۱/ص:۲۱۳
۴۷ المحبر لابن الحبیب البغدادی، ص:۲۱۸-۲۲۰، اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۱۳/۸۰
۴۸ مقدمہ ابن خلدون ص:۱۲۹-۱۳۱ (طبع بیروت)
۴۹ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۳/۳۳۳
۵۰ انساب وکفاءت، ص:۷۹-۹۱
۵۱ انساب وکفاءت، ص:۹۰-۹۱
۵۲ مآثر الکرام/ از: مولانا آزاد بلگرامی (اردو ترجمہ) (طبع کراچی ۱۹۸۳ء) ص:۱۵۱
۵۳ نزہۃ الخواطر/ از: مولانا حکیم سید عبدالحی (طبع حیدرآباد) ۳/۶۸
۵۴ اسلامی پرسنل لاء میں باب کفو (مجلہ المآثر مئی تا اگست ۱۹۹۹ء)
۵۵ انساب وکفاءت، ص:۹۰-۹۱، ۱۱۶-۱۲۲
۵۶ انساب وکفاءت، ص:۱۱۰-۱۱۱
۵۷ تفسیر ابن کثیر ۳/۴۸۵
۵۸ صحیح بخاری (کتاب البیوع)
۵۹ عہد رسالت میں خواتین کی آزادی/ از: یٰسین مظہر صدیقی (در ''مطالعات'' اپریل تا جون ۲۰۱۳ء)
۶۰ انساب وکفاءت، ص:۱۱۶-۱۱۷
۶۱ دستکار اہل شرف/ از: مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، ہر طبقے اور پیشے میں علم وعلماء/ از: قاضی اطہر مبارک پوری (دیوبند ۱۴۳۱ھ)
۶۲ انساب وکفاءت، ص:۷۴ (بحوالہ شامی ص:۳۲۶)
۶۳ جدید فقہی مسائل ص:۷۹ (بحوالہ رد المحتار ۳/۳۲۱-۳۲۲)
۶۴ انساب وکفاءت، ص:۵۴ (بحوالہ شامی ص:۳۳۰)
۶۵ انساب وکفاءت، ص:۴۶
۶۶ ہر طبقے اور پیشے میں علم وعلماء ص:۱۱۴
۶۷ لطائف اشرفی/ از: مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی (دہلی ۱۲۹۸ھ) ۲/۴۳
۶۸ انساب وکفاءت، ص:۶۱
۶۹ انساب وکفاءت، ص:۶۳-۶۶
۷۰ جدید فقہی مسائل ص:۶۳
۷۱ تفصیل کے لیے ''رشتۂ نکاح، کفاءت اور برادری'' ملاحظہ کریں۔
۷۲ الحیلۃ الناجزۃ/ از: مولانا اشرف علی تھانوی (طبع کراچی)
۷۳ إعلام الموقعین/ از: ابن القیم (طبع بیروت) ۴/۱
۷۴ الموافقات/ از: امام عبدالوہاب شعرانی (طبع بیروت) ۴/۹۴

☐☐

جامعۃ الاصلاح نور الاسلام

تحت اشرف متحدہ انجمن اصلاح المسلمین

رجسٹریشن نمبر S-12665

قائم شدہ: ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء

الیف-۶، سلطانپوری، دہلی

تعارف

جامعہ ہٰذا مغربی دہلی میں ہریانہ- دہلی بارڈر کے قریب روہتک روڈ ریلوے پھاٹک سے متصل سلطانپوری میں واقع ہے، جو وقف بورڈ رجسٹریشن سوسائٹی، ہوم منسٹری اور انکم ٹیکس سے رجسٹرڈ ہے اور دارالعلوم دیوبند سے بھی ملحق ہے۔ الحمدللہ جامعہ ہٰذا میں شرح وقایہ تک کی تعلیم ہوچکی ہے۔

اغراض ومقاصد

(۱) ہریانہ ودہلی کے اطراف ومضافات اور مرتدین وبرگشتگانِ دین کے علاقوں میں تعلیم و اصلاحِ عقائد (۲) دعوت وتبلیغ اور اسلامی تربیت (۳) اسلامی علوم اور عصری تعلیم کی نشر واشاعت (۴) مقبوضہ مساجد ومدارس کی بازیابی (۵) باہمی اختلافی مسائل میں فقہ وفتاویٰ اور اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے کرنا (۶) حفاظ وقراء، مؤذنین، ائمہ مساجد ومدرسین کی ٹریننگ وتربیت کا انتظام (۷) مختلف علاقوں میں دینی مکاتب ومدارس کا قیام۔

اہم شعبہ جات

(۱) شعبۂ عربی وفارسی (۲) شعبۂ تجوید وقرأت (۳) تحفیظ القرآن (۴) درجہ ناظرہ (۵) ابتدائی دینیات (۶) شعبۂ کمپیوٹر، انگلش ہندی، حساب وعصری تعلیم کا انتظام (۷) شعبۂ دارالافتا والقضا (۸) شعبۂ تحقیق وتصنیف (۹) شعبۂ دعوت واصلاح المرتدین (۱۰) شعبۂ تعلیم نسواں و بنات (۱۱) شعبۂ تعلیم بالغان (۱۲) شعبۂ مطبخ (۱۳) لائبریری (۱۴) شعبۂ تعمیرات (۱۵) شعبۂ تنظیم وترقی (۱۶) شعبۂ ختم نبوت وردِ قادیانیت۔

جامعۃ الاصلاح نور الاسلام ایک نظر میں

بانی:

حضرت مفتی خان محمد قاسمی

(سابق شیخ الحدیث آسام، گجرات، میرٹھ)

مقامی وبیرونی طلبا کی تعداد:	۳۷۵
اساتذہ وملازمین واعزازی کارکن:	۱۵
سال گزشتہ کا خرچ:	۴۹،۰۰،۰۰۰
اہم شعبہ جات:	۱۶
شاخہائے مدرسہ وانجمن:	۲۵

(جو دہلی واطراف ہریانہ ودیگر علاقوں میں قائم ہیں)

ضروریات وتقاضے

جامعہ ہٰذا میں دورۂ تفسیر اور دورۂ حدیث کا ان شاء اللہ عنقریب جلد از جلد انتظام کیا جائے گا۔ چونکہ ابھی تک دارالحدیث، دارالتفسیر، دارالافتاء و القضاء، کمپیوٹر سینٹر اور دارالتجوید والقرأت، پانچ درسگاہوں کی تعمیر باقی ہے۔

مستقبل کے عزائم

تعمیری وترقیاتی منصوبہ کا تخمینہ:

ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے

- دورۂ حدیث وتفسیر تک تعلیم کا انتظام
- مدرسۃ البنات کا قیام
- ہائی اسکول تک کی تعلیم کا پروگرام

ترسیلِ زر برائے بیرونِ ہند:

(1) JAMIATUL ISLAH NOORUL ISLAM (A/c No. 10651008551 (SBI)
Branch: SULTANPURI, DELHI-86, IFS Code: N0004846

(2) MUFTI KHAN MUHAMMAD (Muhtamim) A/c No. 30132031093. S.B.I. IFS Code: N0004846

FCRA No. 231650902

ترسیل زر ورابطہ برائے ہند

(مفتی) خان محمد قاسمی مہتمم **جامعۃ الاصلاح نور الاسلام**، سلطانپوری، دہلی-۸۶

JAMIATUL ISLAH NOORUL ISLAM

(Under Guidence of Muttahidah Anjuman Islahul Muslimeen)

F-6, Sultanpuri, Delhi-110086 (India), Mob. 09312553508

کچھ گذشتہ یادیں

امیر الہند، محدث جلیل، علامۂ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ

شہر کی اصطلاح میں 'بڑے مولانا'

(ولادت ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء　وفات ۱۰ رمضان ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء)

مولانا فضل الرحمن صاحب (آزادول، افریقہ)

سانولے رنگ کے، سیدھے سادے آدمی تھے، دو پلی ٹوپی پہنتے، بڑے بال رکھتے، اکثر لنگی پہنتے، بہت خاموش بارعب شخصیت کے مالک تھے، سادگی کے باوجود علم کا ایسا رعب تھا کہ بڑے بڑے علما ان کے سامنے خاموش باادب بیٹھتے، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو فرماتے سنا: میں مولاناؒ کو اپنا استاذ مانتا ہوں، مولانا منظور نعمانیؒ تو باقاعدہ شاگرد تھے، دوسرے بہت سے علما کو دیکھا بڑا احترام کرتے ہوئے۔

مولانا اعظمیؒ ہر فن میں ماہر تھے، عربی ادب، منطق وفلسفہ میں بھی، فقہ، تفسیر، حدیث تو اصل موضوع تھا، فقہ پر بھی بہت گہری نگاہ تھی، جمعیۃ علماء ہند کے ایسے مفتی تھے کہ مختلف فیہ مسائل میں ان کی رائے فیصلہ تھی، تفسیر پر بھی وسیع نظر تھی، حدیث میں بھی خاص طور پر فن اسماء الرجال میں بے مثال اور بے نظیر عالم تھے۔

میں نے بڑے مولاناؒ سے بخاری شریف کا کچھ حصہ پڑھا، ہمارے زمانہ سے بہت پہلے وہ پڑھانا چھوڑ چکے تھے، حدیث کی کتابوں پر تعلیق و تحقیق کا کام کرتے تھے، کبھی کبھی بخاری شریف کا کچھ حصہ تبرعاً پڑھا دیا کرتے، ہم نے اسی طرح ان سے پڑھا، ان کے محلہ کی مسجد میں ہم لوگ چلے جاتے، مسجد میں آکر پڑھاتے، تقریر جامع مختصر ہوا کرتی تھی۔

رسالۃ الاوائل پڑھ کر حدیث کی ۴۳ کتابوں کی اجازت لی۔

(صورۃ اجازۃ المحدث الکبیر العلامہ حبیب الرحمن الأعظمی)

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد:

فقد قرأ علي هذہ الرسالة الولد العزيز الفاضل الذكي فضل الرحمن بن حفيظ الرحمن المئوي، وأجزت له رواية ما تحويه بشرطها المعتبرة عند أهل العلم، وأوصيه بتقوى الله في السر والعلانية، واتباع السنة، واجتناب البدعة، واقتفاء آثار السلف الصالح، وإحسان الظن بهم، وإكرامهم وإكرام من بعدهم من العلماء، والذب عنهم، وأن لا ينساني في دعواته، وفقنا الله وإياه لما يحبه ويرضاه.

قاله بفمه وسطره ببنانه: حبيب الرحمن الأعظمي

في رابع شوال ۱۳۹۳ھ

مولاناؒ میرے ساتھ بڑی شفقت کا معاملہ فرماتے، عصر کے بعد پٹھان ٹولہ میں مفتی عبد الباری صاحبؒ (مفتی جامعہ مفتاح العلوم) کے گھر کے سامنے چارپائی پر بیٹھتے تھے، کچھ لوگ آتے، ملتے اور بیٹھتے، مئوناتھ بھنجن کی بولی میں" بات چیت" ہوتی، کبھی خبریں ہوتیں، کبھی دینی باتیں ہوتیں۔

میں نے مولاناؒ کی نگرانی میں دورہ سے فارغ ہونے کے بعد حدیث و فقہ میں تخصص کیا، امام ابو یوسفؒ کی سیرت لکھی، طلاق ثلاث پر ایک کتاب لکھی، شامی کی ۵ جلدوں کا (جہاں تک یاد ہے) بالاستیعاب مطالعہ کیا، کچھ کتابیں مفتاح العلوم میں پڑھاتا بھی تھا، ڈھائی سال اس طرح گزرے کہ کتب خانہ کا ناظم کتب خانہ سے زیادہ واقف کار ہو گیا تھا، شامی کا کچھ مطالعہ ہو جاتا تو مولانا کچھ سوالات دیتے کہ اس کا جواب عبارت کے حوالے کے ساتھ لکھ کر لاؤ، مدرسہ کے مفتی صاحبؒ سے بھی فرمایا تھا کہ اس کو سوالات جو آتے ہیں ان کے جواب لکھنے کیلئے دے دیا کریں۔

اس کے بعد مجھے بنارس مظہر العلوم بھیج دیا، وہاں مجھے بہت عزت ملی، اس لیے کہ مولانا کا بھیجا ہوا تھا، چار سال رہا، اتنی مدت میں ترمذی تک پڑھایا، پھر جب ڈابھیل سے استاذ کا مطالبہ آیا تو اشارہ کر دیا کہ وہاں چلے جاؤ، صاف نہیں فرمایا؛ اس لیے کہ دونوں جگہیں مولانا کے عقیدت مندوں کی تھی، بنارس کے مہتمم صاحب (مولانا اسحاقؒ) نے میری مدد کی اور رائے دی کہ تم ایک سال چھٹی لے کر چلے جاؤ، میں چھٹی منظور کروا دوں گا، ورنہ یوں تو لوگ تم کو نہیں چھوڑیں گے، ایسا ہی کیا، اس طرح ڈابھیل پہونچا، مولاناؒ سے تعلق اور اعتماد کی وجہ سے ڈابھیل میں بھی مجھے بہت عزت ملی، تقریباً ۱۲ سال

وہاں رہا۔

جب وہاں سے افریقہ آنے کی بات چلی تو والد صاحبؒ کے ذریعہ حضرت کا منشا میں نے معلوم کیا، رضا مندی معلوم ہونے کے بعد افریقہ کی دعوت قبول کی اور استخارہ کے بعد بہت ڈرتے ہوئے یہاں آیا، اس لیے کہ یہاں دنیا بہت ہے، کہیں دنیا مقصد نہ بن جائے، اور نیت کی کہ ان شاء اللہ مرتے دم تک تبلیغی کام سے اپنا تعلق قائم رکھوں گا، کیونکہ یہاں سے جو دعوت ملی تھی اس میں تبلیغی کام سے تعلق کو خاص دخل تھا (فیما اُعلم)۔

ڈابھیل میں میں نے قرآن کریم کا حفظ کیا، پہلے سے چند پارے آخر کے یاد تھے جن کا ترجمہ پڑھا تھا، یہاں مکمل کیا، تو پہلے سال اکیلے اپنی مسجد میں تراویح سنائی، روزانہ دو پارے کی تراویح ہوتی تھی، ۱۵ میں ختم، اس لیے کہ ہماری مسجد میں حنفیوں اور غیر مقلدین کے درمیان اسی طرح صلح ہوئی تھی، ابتدائی ۱۵ دن ہم تراویح پڑھیں گے اور بعد کے ۱۵ میں وہ لوگ تراویح پڑھیں گے، وہ اکثر الم تو کیف پڑھتے تھے، ان کو حافظ مشکل سے ملتے تھے۔

آخری دنوں میں حضرت مولاناؒ کو ان کے گھر میں تراویح سناتا تھا، بیماری کی وجہ سے مسجد نہیں جاسکتے تھے، پیچھے وہاں کوئی سننے اور لقمہ دینے والا نہیں تھا، میں کہتا کہ حضرت کسی سننے والے کو بلا لیجئے تو فرماتے: بوڑھا اور بیمار ہو گیا ہوں، ورنہ دن میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتا تھا تو لقمہ دیتا تھا، اب حافظہ ایسا نہیں۔

مولانا حافظ قرآن نہیں تھے، لیکن قوت حافظہ ضرب المثل تھی، سوانح حیات (حیات ابوالمآثر) میں اس کے واقعات لکھے ہیں۔

عیدین کی نماز میں بھی مجھے جامع مسجد مئو میں امام بناتے تھے، ان کے محلہ کی مسجد میں بھی مغرب کی نماز پڑھنی ہوتی تھی تو وہاں بھی نماز پڑھانے کا حکم ہوتا تھا۔

ہمارے والد صاحبؒ نے حضرت مولاناؒ سے شروع سے اخیر تک پڑھا تھا، والد صاحبؒ پر بہت اعتماد فرماتے تھے، مرقاۃ العلوم میں والد صاحبؒ نے حضرتؒ کی موجودگی میں بخاری شریف پڑھائی، مدرسہ کے مفتی تھے، اسی تعلق کی وجہ سے ہماری طرف بھی نظر توجہ تھی۔

مجھ سے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ تم میرے فتاوی جمع کردو، لیکن پھر دینے کی نوبت نہیں آئی اور میں شہر سے باہر چلا گیا، اب تک مولاناؒ کے فتاوی جمع نہیں ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند کے شوری کے رکن تھے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ نہیں تھے، نصف سال تقریباً رہے ہوں گے، علامہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہم سے پڑھا تھا، فراغت دارالعلوم مئو سے ہوئی تھی، لیکن دارالعلوم کے فضلا میں اور تاریخ دارالعلوم میں ان کا نام لکھا گیا ہے، بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ادارے ان کو اپنی طرف منسوب کرتے ہے، مولانا ایسے ہی شخصیت کے مالک تھے، شوری میں مولانا علی میاںؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن دیوبندیؒ، حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا منظور نعمانیؒ سب موجود تھے، لیکن شوریٰ کے امیر حضرت مولانا اعظمیؒ تھے۔

ایک سال مجھے حضرت مولاناؒ اپنے خادم کی حیثیت سے مئو سے دیوبند لے گئے تھے، میں نے یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا، مشورہ میں تو نہیں جاتا تھا لیکن کھانے پینے، سونے میں ساتھ رہتا تھا، ان اکابر کے ساتھ دسترخوان پر ہوتا، ان کی باتیں سنتا، بڑے بڑے اساتذہ مولانا بہاریؒ وغیرہ خدمت کے لیے آتے اور کہتے: مولانا میرے لئے یہ طے کرادیجئے، میرے لئے یہ منظور کرادیجئے، کبھی مذاق ہوتا۔

مزاج بہت نازک تھا، سفر میں ریل میں لوٹا جہاں سے اٹھایا اگر دوسری جگہ رکھ دیا تو ناراض ہوگئے، بڑے بڑے مالدار خدمت میں حاضر ہوتے، استغنا بہت تھا، اگر غلطی کی تو سخت ڈانٹ سنتے اور بعض تو پھر آتے بھی نہیں۔ خودداری بہت تھی، خوشامد پسندی بالکل نہیں تھی، علم کی شان اور علم کا رعب قابل دید تھا، رمضان المبارک میں جمعہ کے بعد وعظ ہوتا تھا، بڑا مؤثر اور روح افزا، خالص قرآن وحدیث کا بیان، مجمع بہت ہوتا تھا اور خوب فائدہ ہوتا۔

شہر میں چاند کی رؤیت کا فیصلہ کرتے، نصف رمضان کے بعد بازار سے تین قسم کا گیہوں منگواتے، اوسط کے لحاظ سے نصف صاع گیہوں کی جتنی قیمت ہوتی اس کا اعلان کرواتے، سب لوگ اس پر عمل کرتے۔

اخیر زمانہ میں اپنوں سے بہت اذیت اٹھائی، اقتدار کی ہوس والوں نے آپ کو بہت صدمہ پہنچایا، نبیوں کی سنت پر عمل کیا، لڑائی جھگڑے میں نہیں پڑے، بڑی خوبیوں کے مالک تھے، أعلی اللہ درجاتہ وتقبل اللہ حسناتہ۔

حیات ابوالمآثر پڑھیے تفصیل معلوم ہوگی، میں نے اپنے سے تعلق چند چیزیں ذکر کردیں:

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

علمائے کاملین اور اولیاء صالحین کے ذکر کے وقت رحمت نازل ہوتی ہے، تنزل الرحمۃ عند ذکر الصالحین، اور ان کی زندگیوں سے سبق حاصل کرکے علم وعمل کے میدان میں قدم آگے بڑھانے کی توفیق ملتی ہے، ہم سب کو اللہ تعالیٰ یہ توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔

□□

حضرت محدث اعظمیؒ اور تصوف

ڈاکٹر عبدالمعید صاحب (کھیری باغ روڈ، مئو)

دین کی تکمیل حجۃ الوداع میں عرفہ اور جمعہ کے دن ہوئی جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا﴾ (پ:۶، سورہ المائدہ)۔ ترجمہ: آج کے دن تمھارے لئے تمھارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کردیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کردیا اور میں نے تمھارے لئے اسلام کا دین ہونا (ہمیشہ کے لئے) پسند کرلیا۔

اس آیت کے بعد احکام سے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریمؐ اکیاسی روز دنیا میں باحیات رہے اس دوران یہ واقعہ پیش آیا:

ایک دن نبی کریمؐ لوگوں میں سامنے بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک آدمی آیا اور پوچھنے لگا: ما الایمان؟ (ایمان کسے کہتے ہیں؟) آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اس کے فرشتوں کا اور اس سے ملنے کا اور اس کے رسولوں کا یقین کرلے اور دوبارہ زندہ ہونے کا یقین کرلے۔ اس نے پوچھا: ما الاسلام؟ (اسلام کیا ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو ان کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور نماز قائم کرو اور فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔ اس نے پوچھا ما الاحسان؟ آپؐ نے فرمایا (احسان یہ ہے) کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ ان کو دیکھ رہے ہو پس اگر چہ تم ان کو نہیں دیکھ رہے ہو لیکن وہ تم کو دیکھ رہے ہیں...... الخ۔[1]

مندرجہ بالا حدیث حدیث جبرئیل کے نام سے مشہور ہے حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں فرماتے ہیں: انما جاء بعد انزال جمیع الاحکام لتقریر امور الدین التی بلغھا متفرقۃ فی مجلس واحد لتنضبط (فتح الباری)۔ (یعنی جبرئیل علیہ السلام تمام احکام کے نزول کے بعد تشریف لائے تاکہ جو احکام متفرق اوقات میں پہنچائے تھے ان سب کا نچوڑ اور خلاصہ ایک ہی مجلس میں بیان کردیں تاکہ وہ ذہنوں میں ضبط اور محفوظ ہوجائیں)

حضرت ابویحییٰ زکریا انصاریؒ کا مقولہ ہے: ''تصوف کی اصل حدیث جبرئیل ہے''۔[2]

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے اپنی فقہ کی کتاب 'مالا بد منہ' میں آخری عنوان ''کتاب الاحسان'' قائم کیا ہے اس کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''بداں۔ اسعدک اللہ تعالیٰ۔ ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورت ایمان و اسلام وشریعت است و مغز وحقیقت او در خدمت درویشاں باید جست و خیال نباید کرد کہ حقیقت خلاف شریعت است کہ ایں سخن جہل وکفر است''۔[3]

جان لو! اللہ تعالیٰ تم کو سعادت مند بنائے یہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایمان واسلام اور شریعت کی فقط صورت ہے رہی اس کی حقیقت اور مغز تو اس کو درویشوں کی خدمت میں ڈھونڈنا چاہئے اور یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ حقیقت خلاف شریعت ہے اس لئے کہ یہ بات جہالت اور کفر ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ اوپر کی تحریر میں حدیث جبرئیل میں وارد ایمان اور اسلام کو شریعت کی ظاہری صورت بتارہے ہیں اور ''احسان'' کو مغز اور حقیقت سے تعبیر فرمارہے ہیں پھر اس کے حاصل کرنے کا طریقہ تحریر فرمارہے ہیں:

''نورِ باطن پیغمبرؐ را از سینۂ درویشاں باید جست و بداں نور سینۂ خود را روشن باید کرد''۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو درویشوں کے سینے سے حاصل کرنا چاہئے اور اس نور سے اپنے سینے کو روشن کرنا چاہئے۔[4]

صحابہ کرام نے اس نور باطن کو رسول پاک ﷺ کے سینۂ مبارک سے اخذ کیا اور صحابہ سے تابعین نے اور تابعین سے تبع تابعینؒ نے حاصل کیا اور یہ مبارک سلسلہ سلاسل اربعہ کی صورت میں آج تک جاری ہے۔

امام اعظمؒ نے بھی اپنی عمر کے اخیر دو سال میں اسی مقصد اعلیٰ کی تکمیل کی اور ان کا مشہور مقولہ ہے ''لولا السنتان لھلک النعمان'' (اگر تکمیل مقصد کے یہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہوجاتا)۔

امام احمد بن حنبلؒ علم واجتہاد کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوتے ہوئے مشہور بزرگ حضرت بشر حافیؒ کی رکاب کے ساتھ خادمانہ طریقے پر چلتے تھے لوگوں نے اس ادب واحترام کا سبب دریافت کیا تو امام احمدؒ نے فرمایا کہ ''بشر کو خدا کی معرفت مجھ سے زیادہ حاصل ہے''۔[5]

بیعت وخلافت

حضرت محدث اعظمیؒ دیوبند کی طالب علمی کے دوران ہی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون پہنچ گئے خود تحریر فرماتے ہیں:

''وہ میری زندگی کے نہایت مسعود ومبارک لمحات ہیں جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گذرے مجھے حاضری کی سعادت پہلی بار اس وقت حاصل

ہوئی جب دارالعلوم دیو بند میں طالب علمانہ زندگی بسر کر رہا تھا ۱۳۴۳ھ غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی زیارت کے مقصد سے حاضری ہوئی تھی مگر خوش قسمتی سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہو گیا پہلے سے جانے پہچانے متوسلین میں اس وقت حضرت مولانا (وصی اللہ صاحب) فتحپوری اور خواجہ صاحب (مجذوب تخلص) خانقاہ میں موجود تھے......جس شب میں بعد مغرب میں شرف بیعت سے مشرف ہوا تھا اس کے بعد والے دن میں غالباً بعد نماز عصر حضرت مولانا فتحپوری نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے مٹھائی وصول کرنی چاہئے ان کو حضرت نے زمانہ طالب علمی میں بیعت کر لیا حالانکہ حضرت ایسا نہیں کرتے یہ ان کی خصوصیت ہے''۔[٦]

حضرت محدث اعظمیؒ کے والد محترم مولانا صابر صاحبؒ بھی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے بیعت تھے حضرت محدث اعظمی تحریر فرماتے ہیں:

وتلقن الذکر من العارف باللہ الشیخ اشرف علی التھانوی الفقیہ المحدث المفسر۔[٧]

اور انھوں نے عارف باللہ فقیہ و محدث مفسر شیخ اشرف علی تھانویؒ سے ذکر سیکھا۔

ڈاکٹر مسعود صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ان کے اخلاق فاضلہ اور صفات حمیدہ نے ان کو خاص و عام میں صغیر و کبیر یہاں تک کہ بزرگوں کی نگاہ میں بھی بڑا اور معزز اور مکرم بنا دیا تھا، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے بیعت تھے، مگر خود شیخ کے نزدیک مرید کی قدر کس قدر تھی اس کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری (استاذ دارالعلوم دیو بند) کے درج ذیل الفاظ پڑھئے:

ان کے شیخ و مرشد حضرت تھانویؒ انھیں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے ساتھ بڑا احسن ظن رکھتے تھے جس کا اندازہ محدث اعظمیؒ کی اس روایت سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا (صابر صاحبؒ) نے ان کے ذریعے ایک رومال حضرت تھانویؒ کی خدمت میں بھیجا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن دامت برکاتہم نے حضرت تھانویؒ سے عرض کیا والد صاحب نے یہ ہدیہ پیش کیا ہے تو حضرت تھانویؒ نے اس کو سر پر رکھ کر فرمایا یہ آپ کے والد صاحب کا ہدیہ نہیں تبرک ہے۔[٨]

۱۳۲۲ھ میں جب حضرت تھانویؒ مئو تشریف لائے تو والد محترم نے محدث اعظمی کو صغرسنی میں آپ کی خدمت میں پیش کیا حضرتؒ نے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائے برکت فرمائی خود تحریر فرماتے ہیں:

ودعا لی الشیخ مولانا اشرف علی بالبرکۃ ومسح بیدہ علی راسی وکنت اذ ذاک ابن خمس او ست۔

اور جس وقت میں پانچ چھ سال کا تھا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے میرے سر پر دست شفقت پھیر کر برکت کی دعا فرمائی۔[٩]

اس طرح حضرت تھانویؒ کی محبت آپ کے قلب میں بچپن سے ہی رچ بس گئی تھی حضرت تھانویؒ سے بیعت کے بعد آپ کو اصلاح کی کس قدر فکر دامن گیر تھی مندرجہ ذیل خط سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''حضرت والا میں اپنی بدقسمتی پر جتنا روؤں کم ہے حضور سے اتنا دور ہوں کہ برس دو برس میں چند قلیل ایام صحبت کے نصیب ہوتے ہیں ملازمت کی مشغولی نیز اخراجات کی کثرت اور آمدنی کی قلت سے مجبوری رہتی ہے ورنہ سال میں کئی بار حاضر ہوتا دل بہت چاہتا ہے مگر مجبور ہوں حضور دعا فرمائیں کی صحبت کا زیادہ سے زیادہ موقع نصیب ہونے لگے۔

تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ بغیر صحبت کے کوئی کام بآسانی نہ ہوگا جب تک صحبت میں رہتا ہوں ہر چیز کا اہتمام اور ہر چیز کی طرف توجہ رہتی ہے لیکن جب یہاں پہنچ کر دوسرے مشاغل میں پھنس جاتا ہوں تو غفلت چھا جاتی ہے حضور سے دوام توجہ واہتمام کے لئے دعا اور توجہ اور علاج کا خواستگار رہوں''۔[١٠]

حضرت تھانویؒ کی نگاہ میں علمی حیثیت سے آپ کی بڑی قدر تھی، آپ کی کتاب ''التنقید السدید علی التفسیر الجدید'' پڑھ کر حضرت نے محدث اعظمیؒ کے پاس مندرجہ ذیل خط تحریر فرمایا:

احقر اشرف علی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا: **قال رسول اللہ ﷺ یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاھلین (مشکوۃ عن البیھقی)**

ماشاء اللہ قوت استدلال حسن ادا، دفع شبہات، لین کلام، غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بارک اللہ تعالی فی افادات المصنف و افاضتہ

۲۴ رصفر ۱۳۴۹ھ تھانہ بھون **وقاہ اللہ عن الفتن**

مندرجہ بالا خط میں حضرت تھانویؒ نے محدث اعظمیؒ کی جس طرح توصیف و ستائش فرمائی ہے وہ محدث اعظمیؒ کے لئے طغرائے امتیاز ہے اسی طرح انکار حدیث کے رد میں حضرت محدث اعظمیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ''**نصرۃ الحدیث**'' کو انعام تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

میں اپنے ضعف اور عذر سے خود شرمندہ ہوں اور ہدیہ بسر و چشم قبول کرتا

ہوں اور دعائے نافعیت کرتا ہوں جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہیں لکھ سکتا۔[11]

یہ تھے ہمارے اکابر کہ مرید کے علمی کمال کا کن بلند وبالا الفاظ میں اعتراف فرمارہے ہیں ''کہ میں ایسا جامع اور محقق نہیں لکھ سکتا''، کس قدر بے نفسی اور تواضع ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ کے وصال (۱۹۴۳ء) کے بعد حضرت محدث اعظمیؒ اپنے پیر بھائی مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں برابر جایا کرتے تھے حضرت مصلح الامت حضرت محدث اعظمیؒ سے غایت درجہ محبت وارتباط رکھتے تھے جس کا اظہار اپنے متعدد خطوط میں فرماتے رہے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمدللہ بخیر ہوں آپ کی صحت سے اطمینان ہوا علالت کی خبر ملی تھی مگر یہ کسی سے معلوم نہ ہوسکا کہ علالت طویل ہوگئی اور بخار میعادی ہوگیا تھا اللہ تعالیٰ آپ کو کامل صحت دے اور کامل صحت کے ساتھ رکھے اور آپ سے لوگوں کو مستفیض فرمائے۔

دوسری بات جو آپ نے تحریر فرمائی ہے جواباً عرض ہے:

گر بسر وچشم من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

آپ کی رضا'مرضی'خوشنودی ملحوظ رکھوں گا آپ کو راضی کرکے عندیہ معلوم کرکے کام کرونگا زیادہ کیا عرض کروں میرے لئے دعا فرمائیے کہ آپ لوگوں سے محبت کروں اور نیک لوگوں کے ساتھ رہوں۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

اسی سفر کے دوران قیام بعد مغرب ......علماء حضرات میرے پاس آگئے تو آپ نے فرمایا کہ آپ ......تشریف لے جائیں جب تک میں آپ کی نیابت کروں گا، میں تو آپ سے کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں مگر چونکہ آپ نے خود ہی فرمایا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ آپ میری غیر موجودگی میں میری نیابت کریں۔[12]

مندرجہ بالا خط سے حضرت مصلح الامتؒ کا آپ پر غایت درجہ وثوق واعتماد کا اندازہ ہوتا ہے مصلح الامتؒ کا یہ جملہ ''میں تو آپ سے کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں'' بے پناہ فنائیت اور تواضع سے ناشی ہے اور اس جملے سے حضرت مصلح الامتؒ کے قلب میں محدث اعظمیؒ کی عظمت ورفعت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت مصلح الامتؒ سے آخری ملاقات کا منظر حضرت محدث اعظمیؒ کی قلم سے دیکھئے۔ حضرت محدث اعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

۱۳۸۷ھ میں حرمین کا شوق غالب آیا اور ۱۹رشعبان ۱۳۸۷ھ کو مظفری جہاز سے حجاز کے لئے روانہ ہوئے یہ ناچیز ان کی مشایعت اور رخصت کرنے کی غرض سے جہاز میں ان سے ملاقات کرنے گیا اور دو گھنٹہ وہاں رہا رخصت کے وقت دیر تک معانقہ کیا، حضرت شیخ نے اپنی حد درجہ محبت وشفقت کی وجہ سے ناچیز کے سر اور ہاتھ کا بوسہ دیا اور عطر عود کی ایک شیشی ہدیہ کی ناچیز اسی دن بمبئی سے روانہ ہوا اور جمعہ کے دن مئو وارد ہوا، سنیچر کے دن مغرب بعد ۸ بجے یہ خبر ملی کی مولانا نے جہاز میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی......مت پوچھو اس خبر سے مجھ پر کیا گذری۔[13]

حضرت محدث اعظمیؒ کو اجازت بیعت وخلافت حضرت مصلح الامت کے علاوہ مولانا منیر الدین مہاجر مکی سے بھی حاصل ہے مولانا منیر الدین صاحبؒ شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ تھے حاجی عبدالحمید محلہ اورنگ آباد مئو جب حج کرنے گئے تھے تو ان کے توسط سے آپ نے محدث اعظمیؒ کو اجازت بیعت وخلافت سے نوازا۔

باوجود اجازت وخلافت کے آپ نے بہت کم لوگوں کو مرید کیا یہاں تک کہ بہت سے حضرات کو اس کا علم بھی نہیں تھا کہ محدث اعظمیؒ لوگوں کو بیعت بھی کرتے ہیں اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ آپ نے اپنے حلقۂ ارادت میں بہت ہی کم لوگوں کو داخل فرمایا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حد درجہ اخفائے حال کا اہتمام تھا تیسری وجہ جاننے کے لئے خواجہ عبیداللہ احرارؒ کا یہ قول پڑھ لیجئے:

''فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں (صرف) پیری مریدی کروں تو کسی کو بھی میرے زمانے میں پیری مریدی کرنے کی جرأت وہمت نہ ہوسکے مگر مجھ کو تو ترویج واشاعت دین کیلئے مقرر کیا گیا ہے نہ کہ (فقط) پیری مریدی کے لئے۔[14]

حضرت محدث اعظمیؒ سے اللہ تعالیٰ کو تجدید واشاعت حدیث کا کام لینا تھا، اس لئے آپ کی طبیعت کو منجانب اللہ ادھر متوجہ کیا گیا۔

تجدیدی کارنامے

حضرت محدث اعظمیؒ اپنے زمانے میں حیرت انگیز حافظہ، کثرت مطالعہ، اور وسعت معلومات میں بے نظیر اور حدیث وفقہ میں اعلم اھل الارض تھے۔ مولانا سید محمد یحییٰ صاحب ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت اعظمیؒ کو جملہ علوم وفنون میں جو کمال حاصل تھا، اس کی مثال کم ملے گی، حدیث وفقہ وتفسیر میں منصب امامت پر فائز ہونے کے علاوہ نحو

وصرف، لغت وبلاغت، منطق وفلسفہ اور علم عروض وہیئت بھی آپ کے علمی کمال کے شعبے تھے“۔[15]

محدث اعظمیؒ کی نظر متقدمین کی تصانیف پر بڑی وسیع تھی اور عالم اسلامی کے مخطوطات اور نوادرات کا پوری طرح علم تھا۔ مخطوطات کا پڑھنا آسان کام نہیں ہے، لیکن آپ کو اس فن میں کمال مہارت حاصل تھی۔ ۱۹۸۷ء میں آپ کا آخری سفر حجاز ہوا، جدہ میں آپ کے قیام کے دوران ریاض سے شیخ ابو غدہؒ اور مدینہ منورہ سے شیخ محمد عوامہ وقتاً فوقتاً ملاقات وزیارت اور استفادہ کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن شیخ عوامہ بعض مخطوطات کی زیروکس لے کر حاضر خدمت ہوئے، جن کے کچھ الفاظ پڑھنے میں ان کو دقت پیش آرہی تھی، حضرت سے ان کے بارے میں استفسار کیا، آپ نے جب ان کو صحیح پڑھ کر سنایا، تو شیخ عوامہ نے بے ساختہ آپ کی پیشانی چوم لی۔[16]

مولانا سید محمد یحییٰ صاحب ندوی مزید رقم طراز ہیں:

”اس سفر میں کتابوں کے ساتھ حضرت کے شغف اور شوق مطالعہ کا ایک نمونہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا، اور آج تک میری حیرت کم نہیں ہو رہی ہے۔ واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ حافظ عراقیؒ نے علامہ ذہبی کی ”میزان الاعتدال“ کا ایک ذیل لکھا ہے، جدہ میں حضرت اعظمیؒ کو یہ کتاب دستیاب ہوگئی، صبح کو فجر کی نماز کے بعد آپ نے کتاب دی کہ اس کو رکھ دو، دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں نے اس کو رات بھر میں دیکھ لیا ہے۔ یہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس عمر اور ضعیفی میں آپ نے رات بھر میں اس ضخیم کتاب کی ورق گردانی کر لی، نہ معلوم کتنی دیر سوئے اور سوئے بھی یا نہیں۔[17]

آپ کے تجدیدی کارناموں کو مندرجہ ذیل عناوین کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) احادیث کی امہات کتب کی اشاعت

محدث اعظمیؒ ”مسند حمیدی“ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

برسوں سے میری یہ خواہش تھی کہ کاش اللہ تعالیٰ کسی صاحب علم کو توفیق دیتا کہ کتابوں کے خزانوں میں مسند کے طرز پر مرتب اور دستبرد زمانہ سے محفوظ ان کتابوں کو تلاش کرتا، ان میں سے اگر کوئی کتاب اس کے ہاتھ لگ جاتی تو تصحیح کر کے شائع کر دیتا، تو یہ ایک ناقابل فراموش خدمت اور اہل علم پر ایک بڑا احسان ہوتا، اور اس سے دشمنان حدیث کے اس بہتان تراشی کا دفاع اور جواب ہو جاتا کہ صحاح ستہ میں جو حدیثیں موجود ہیں، ان کو ان کے مصنفین نے اپنی طرف سے وضع کر لیا ہے۔[18]

حدیث کی امہات کتب جو صدیوں سے مخطوطات کی شکل میں دنیا کے مختلف خانوں میں پڑی ہوئی تھیں، آپ نے ان کی اشاعت کی طرف توجہ فرمائی، ان مخطوطات پر کام کرنا بڑی دیدہ وری اور جاں فشانی کا کام تھا، آپ نے ان مخطوطات کو تصحیح، تحقیق اور تعلیق سے مزین کر کے اشاعت کے قابل بنایا۔

قاضی اطہر مبارک پوریؒ ”مسند حمیدی“ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”ان کی اشاعت کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ احادیث کے موجودہ سرمایہ کو تیسری اور چوتھی کی پیداوار بتاتے ہیں، اور مستشرقین کی دسیسہ کاریوں کا شکار ہو کر تشکیک اور تشکک میں مبتلا ہیں، اگر وہ عقل وانصاف سے کام لے کر احادیث کے ان قدیم ترین ماخذوں کو دیکھیں جن سے بعد کی کتابیں مرتب ہوئی ہیں، اور ان کے رواۃ ومتون پر نظر ڈالیں، تو معلوم ہو جائے کہ مسلمان قوم کا یہ فخر ہر قسم کے شک وشبہہ سے بالاتر ہے اور دنیا کی کوئی دوسری قوم اس بارے میں بھی مسلمان قوم کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی، اور احادیث کے ان قدیم ذخیروں اور بعد کی کتابوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

دوسرا فائدہ ان قدیم کتابوں کی اشاعت میں یہ ہے کہ ان میں جگہ جگہ احادیث کے متون والفاظ پر اور رجال ورواۃ کے احوال پر ان کے مصنفین اور شیوخ کی آراء ملتی ہیں، جن سے احادیث کی روایت کے بارے میں سلف صالحین کے نظریات وافکار کا پتہ چلتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ بعد کے کسی محدث نے اپنے سلسلہ سے کوئی حدیث بیان کی ہے اور قدماء کی کتابوں میں وہی حدیث ان کے سلسلۂ سند سے بعض الفاظ وتعبیرات میں مختلف ملتی ہے، تو اس اختلاف سے بعض اوقات اہم مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

چوتھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ عہد رسالت سے قریب تر زمانے کے اسلامی علوم کا معتد بہ سرمایہ بلا کم وکاست ہمارے پاس آجاتا ہے، جس سے دین اور دینی معاملات ومسائل کی صحیح روح نہایت سیدھے سادے انداز میں مل جاتی ہے، اور بعد کے عجمی اثرات یا نقطہائے نظر کے اختلافات کی آمیزش اس میں نہیں ہے“۔[19]

محدث اعظمیؒ نے ان مخطوطات پر کس انداز سے کام کیا ہے، اس کا اندازہ ”مسند حمیدی“ پر مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے تبصرہ سے کیا جا سکتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

”اس کتاب کا پتہ لگانا بجائے خود ایک کارنامہ تھا، چہ جائیکہ اس کی پوری ترتیب وتہذیب، تصحیح ومقابلہ، تحشیہ اور متعدد فہرستوں اور اشاریہ ودیباچہ وغیرہ کا اضافہ، یہ سعادت وکرامت ایک ہندوستانی محقق مولانا حبیب الرحمٰن

اعظمی کے حصہ میں آئی ہے، جس پر انھیں علمی و دینی طبقہ کی طرف سے جتنی بھی مبارک باد دی جائے کم ہے''۔

مزید فرماتے ہیں:

''علمی تحقیق وتدقیق اب تک مستشرقین ہی کا حصہ سمجھی جاتی رہی ہے، مولانا اعظمی سلّمہ اللہ نے عین اسی رنگ میں ڈوب کر ہندوستان کا نام سارے عالم اسلامی میں بلند کر دیا ہے''۔[۲۰]

امام سعید بن منصور کی کتاب ''السنن'' کی تحقیق واشاعت پر حیرت واستعجاب کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''کتاب کی تہذیب وتدوین اور تحشیہ وغیرہ کا کام مولانا اعظمی کا کیا ہوا ہے اور حیرت ہوتی ہے ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہوگئی ہے''۔[۲۱]

مولانا دریابادیؒ کی حیرت واستعجاب بجا ہے، چونکہ مستشرقین یورپ اور منکرین حدیث کو اپنی اعلیٰ علمی تحقیقات پر ناز تھا اور حق تعالیٰ کو محدث اعظمیؒ سے تجدید واحیاء سنت کا کام لینا تھا، اس لیے منجانب اللہ ان سے بہتر ڈھنگ اور اندازِ تحقیق عطا کیا گیا۔ مولانا دریابادیؒ نے چونکہ انگریزی زبان کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور یورپ کے اندازِ تحقیق سے خوب واقف تھے، اس لیے محدث اعظمیؒ کی علمی تحقیقات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ''کتاب الزھد والرقائق'' پر تبصرہ کرتے تحریر فرماتے ہیں:

''کتاب اس قابل ہے کہ یورپ اور امریکہ جائے اور وہاں کے ماہرین اسلامیات دیکھیں کہ ہندوستان کے ایک قصبہ میں بیٹھ کر ایک گوشہ نشین نے وہ کام کر دیا، جو مستشرقین اپنے لامحدود ذرائع کے بعد ہی انجام دے پاتے ہیں''۔[۲۲]

(۲) قدماء محدثین کے علم کا احیاء

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے درس حدیث کی بنیاد درایت اور تفقہ فی الحدیث پر رکھی تھی، جو ان کے متبعین علماء دیوبند کے درس، تصنیف وتالیف کی خصوصیت رہی ہے؛ تاہم رجال، طبقاتِ رواۃ، علل حدیث، طرق حدیث کی تحقیق جو قدماء محدثین کا طریقۂ کار تھا، اس سے اعتنا بہت کم تھا۔ حضرت محدث اعظمیؒ فن روایت ودرایت حدیث میں درجۂ امامت پر فائز تھے۔ علم روایت حدیث کی خدمت جو آپ نے انجام دی ہے اور آپ کی تحقیقات جو ''مسند حمیدی''، ''کتاب الزہد والرقائق''، ''مصنف عبد الرزاق''، ''مصنف ابن ابی شیبہ''، ''المطالب العالیہ''، ''سنن سعید بن منصور'' اور ''کشف الاستار عن زوائد البزار'' جیسی کتابوں کے ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، اس کی مثالیں قدماء محدثین میں حافظ ابن حجرؒ، امام ذہبیؒ، ابن دقیق العیدؒ جیسے امام فن کی تالیفات میں ہی مل سکتی ہیں۔

مولانا سید محمد یحییٰ ندوی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کے علم کی گہرائی وگیرائی کو دیکھنا ہو تو کوئی حدیث کی کتابوں پر آپ کی تعلیقات کو دیکھے کہ امام بیہقی، دارقطنی، حافظ ابن حجر اور ہیثمی جیسے اجلۂ محدثین وحفاظ حدیث سے کتنی باتوں کی تحقیق میں اختلاف کیا ہے، اور اپنے دعویٰ کو بدلائل ثابت کیا ہے، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مبارک فن میں ہمارے حضرتؒ کا قدم متقدمین کے برابر تھا''۔[۲۳]

''ایک حدیث کے بارے میں علامہ ابن القیم نے لکھا ہے کہ اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے، علامہ احمد محمد شاکر نے اس کی نسبت مسند احمد کے حاشیے میں لکھا کہ یہ روایت مجھے سنن کبریٰ میں نہیں ملی، حضرت اعظمیؒ نے ''مسند حُمیدی'' کی تعلیق میں لکھا کہ بیہقی نے اس کو ''معرفۃ السنن والآثار'' میں روایت کیا ہے اور اس کے لیے آپ نے ''معرفۃ السنن'' کے قلمی نسخے کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے ایک موقع پر عرض کیا کہ حضرت! آپ نے اس کا -معرفۃ السنن- کا نسخہ دیکھا ہے؟ فرمایا: جی ہاں! میں نے اس کے مخطوطے کا مطالعہ کیا ہے''۔[۲۴]

علم حدیث کے لیے وسعت معلومات، غیر معمولی حافظہ، ذکاوت، قوت مطالعہ، متون وشروح حدیث کی اطلاع، رجال وتاریخ، جرح وتعدیل، طبقاتِ رواۃ کی واقفیت، تقویٰ، زہد اور ورع درکار ہے، ان میں سے ہر ایک میں قدرت نے آپ کو حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔

حافظے کا یہ عالم تھا کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی تحقیق کے دوران حضرت عمرؓ کا قول لولا علیٌّ لهلك عمر (اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا) آیا، تو محدث اعظمیؒ نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا کہ دارقطنی اٹھاؤ اس کے سرورق پر اس کا حوالہ لکھا ہوگا۔ شاگرد نے راقم سطور سے بتایا کہ میں نے سرسری طور پر دیکھ کر کہا کہ حضرت! نہیں ہے۔ حضرت محدث اعظمیؒ نے فرمایا دوبارہ دیکھو، ضرور لکھا ہوگا۔ شاگرد نے جب دوبارہ دیکھا تو واقعی حوالہ لکھا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا: حضرت! لکھا ہوا ہے۔ حضرت محدث اعظمیؒ نے فرمایا کہ ۵۰ سال کے بعد یہ حوالہ دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد حق تعالیٰ کی اس نعمت (حفظ) کو یاد کر کے آب دیدہ ہو گئے۔

مفتی ظفیر الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''دیوان حماسہ کا سبق پڑھاتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ تم لوگوں ادبی شوق ذوق نہیں ہے، اپنا حال سناتے ہوئے فرمایا کہ مجھے خیال ہوا کہ دیکھوں مجھے کتنے عربی اشعار یاد ہیں، تو اپنی یاد داشت سے صرف الف ردیف کے پانچ سو اشعار لکھ گیا، پھر خیال آیا کہ کبر کہیں پیدا نہ ہو جائے، یاد داشت سے

لکھنا بند کردیا‘‘۔[25]

’’حضرت محدث اعظمیؒ کے آخری حج کے دوران مولانا محمد یحییٰ صاحب ندوی نے سوال کیا کہ تمام محدثین اور اہل علم نے یہاں کوئی نہ کوئی خاص دعا ضرور کی ہے، آپ نے کیا دعا مانگی؟ علامہ اعظمیؒ نے فرمایا: حافظ ابن حجر نے آب زمزم پیتے وقت یہ دعا کی تھی کہ مجھے امام ذہبی کا علم عطا فرمایا، میں نے آب زمزم پیتے وقت، بیر بُضاعہ کا پانی پیتے وقت اور حطیم وملتزم میں ہر جگہ یہی دعا کی کہ خدوندا! مجھے حافظ ابن حجر اور امام ذہبی دونوں کا علم عطا فرما۔ پھر آپ کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں اور تشکُّر وتحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے دیا بھی‘‘۔[26]

(۳) الحاوی لرجال الطحاوی

یہ محدث اعظمیؒ کا تیسرا تجدیدی کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی تحریر فرماتے ہیں:

’’یہ کتاب علامہ اعظمیؒ کے فضل وکمال کا شاہکار ہے، ان کے خامۂ گہر بار کی عظیم الشان یادگار، بحث وتفحص، نقد ونظر اور تلاش وجستجو کا زندہ جاوید نمونہ؛ عرق ریزی، جگر کاوی اور پتہ ماری کی حیرت انگیز مثال ہے۔ یہ کتاب علم ومعرفت کا ایسا زندہ نقش ہے جو اپنے مصنّف کو مِزّی، ذہبی اور ابن حجر جیسے نادرۂ روزگار اور یگانۂ زمانہ تذکرہ نگاروں کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنی اس کتاب میں امام طحاوی کی دو کتابوں کے راویوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دھاگے میں پرونے کا کام کیا ہے۔ امام طحاوی کی تصانیف میں ’’شرح معانی الآثار‘‘ اور ’’شرح مشکل الآثار‘‘ نہایت بلند پایہ اور معرکۃ الآرا کتابیں ہیں‘‘۔[27]

امام طحاویؒ کی ’’شرح معانی الآثار‘‘ کے راویوں کے حالات پر تو متعدد کتابیں معرض وجود میں آئی ہیں، لیکن ’’شرح مشکل الآثار‘‘ کے راویوں کے احوال کی بحث وجستجو ہنوز باقی تھی۔ محدث اعظمیؒ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے ’’شرح معانی الآثار‘‘ اور ’’مشکل الآثار‘‘ دونوں کتابوں کے رجال کو جمع کیا ہے۔

’’شرح مشکل الآثار‘‘ کے رجال کی تحقیق وتنقید کا کام جو صدیوں سے اس امت پر قرض تھا آپ نے اپنے اس تجدیدی کارنامے کے ذریعہ ادا کردیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب کی تصنیف میں کس قدر دماغ سوزی، جگر کاوی اور عرق ریزی کی ہے اور وسائل کی قلت کے باوجود کس طرح اس کے مواد ومراجع تلاش کرکے اور ان کو کھنگال کر یہ کتاب تیار کی ہے، جس پر ان کے استاذ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ بھی اظہار مسرت کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے منتشر اوراق میں ایک جگہ حضرت علامہ کشمیریؒ کے تذکرے میں لکھا ہے:

لقيته واجتمعت به بديوبند في رمضان سنة ١٣٥٢، وكان رحمه الله أنهكه المرض وأدنفه .... الخ۔[28]

ترجمہ:- ’’رمضان ۱۳۵۲ھ میں میں دیوبند میں ان سے ملا ہوں اور میں نے ان سے ملاقات کی ہے۔ مرحوم کو مرض نے لاغر اور قریب المرگ بنا دیا تھا۔ پہلی نظر میں میں آپ کو پہچان نہ سکا، آپ نے مجھ سے لمبی گفتگو فرمائی اور الحاوی لرجال الطحاوی کے بارے میں مجھ سے پوچھا، جس کی تصنیف سے میں تھوڑے ہی دن قبل فارغ ہوا تھا۔ اس کتاب کے مآخذ کے بارے میں مجھ سے پوچھا، جب میں نے آپ سے ذکر کیا تو مسرور ہوئے اور آپ کا چہرہ کھل اٹھا۔ پھر میں نے آپ سے درخواست کہ آپ بنظر اصلاح ’’حاوی‘‘ کا مطالعہ فرمالیں، تو انھوں نے منظور کرلیا اور انھوں نے مجھ کو حکم فرمایا کہ جب وہ ڈابھیل پہنچ جائیں تو وہاں ایک ایک جز کرکے آپ کے پاس بھیجوں، مگر موت نے دیوبند چھوڑنے کی آپ کو مہلت ہی نہیں دی، یہاں تک کہ آپ نے اسی سال ماہ صفر میں دنیا ہی چھوڑ دی۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام صاحب پر جو جرح کی ہے، جس کا جواب علماء نے دیا ہے، اور خطیب کا قدماء نے جو رد کیا ہے، ان کے ماسوا امام اعظم کے دفاع میں میں محنت اور کوشش کروں، اس کا مجھے حکم فرمایا‘‘۔

اس کتاب کو مطبوعہ شکل میں دیکھنے کا اشتیاق آپ کے ایک دوسرے استاد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو اس قدر تھا کہ آپ نے ۱۷ر جمادیٰ الاولی ۱۳۵۱ھ کو اپنے تلمیذ ارشد علامہ اعظمیؒ کو ایک خط میں لکھا:

’’کاش ’الحاوی‘ چھپ جاتی، تو ہم کو بھی اپنے کام میں مدد ملتی، حق تعالیٰ کوئی سامان فرمادیں، انشاء اللہ مناسب موقع پر کوئی کوشش ہوسکی، تو دریغ نہ ہوگا‘‘۔[29]

آپ کے علمی مقام کے معترف ملک اور بیرون ملک کے صدہا علماء کرام ہیں، جن میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے علاوہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ زاہد کوثریؒ، شیخ احمد محمد شاکرؒ، سابق الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود جیسے اساطین علم اور مشاہیر کے نام ملتے ہیں۔

علامہ زاہد کوثریؒ (متوفی ۱۹۵۳ء) سلطنت عثمانیہ کے آخری اسلامی دور میں نائب شیخ الاسلام تھے، آپ ایسے شخص تھے جو انتہائی وسعت علمی، حیران کن مہارت، دقت نظر، خارق عادت حافظہ جیسی خصوصیات کے ساتھ علوم روایت کے تمام انواع واقسام، علم درایت کے تمام مقاصد ومدارک کے جامع تھے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی ''فتح الملہم'' شرح مسلم پر آپ ہی نے بیش قیمت تقریظ رقم فرمائی ہے۔

شیخ زاہد کوثریؒ اپنے خطوط میں محدث اعظمیؒ کو نہایت تعظیم وتکریم کے الفاظ سے خطاب فرمایا کرتے تھے، کبھی لکھتے: حضرۃ العلامۃ الأوحد والنحریر المفرد اور کبھی المجتھد الفرید اور العلامۃ الکبیر اور کبھی العلامۃ النحریر الأستاذ الکبیر کے توقیر آمیز الفاظ سے یاد کرتے تھے۔

منیۃ الألمعي پر اپنے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

مولانا العلامۃ النحریر والجھبذ الخبیر أبو المآثر حبیب الرحمن الأعظمي

ایک مقام پر محدث اعظمیؒ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ھذا وأشکر مولانا العلامۃ النحریر والجھبذ الخبیر أبا المآثر حبیب الرحمن الأعظمي السالف الذکر علی تفضلہ بکتابۃ التعلیقات بخط یدہ المبارکۃ ومبادرتہ بإرسالھا إلی ھذا العاجز مع ما لہ من الأشغال الکثیرۃ فإنہ ھو السبب الأوحد لنشر الاثنین معًا۔

(میں شکر گزار ہوں علامہ نحریر، جہبذ خبیر مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی کا، جن کا اوپر ذکر کیا گیا، ان کی اس کرم فرمائی کے لیے جو انھوں نے کثرتِ اشغال کے باوجود ان تعلیقات کو اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھ کر اور اس عاجز کے پاس ارسال فرما کر کیا ہے، در اصل دونوں کی ایک ساتھ اشاعت کا وہ تنہا ذریعہ بنے ہیں)۔

امام اکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ (سابق شیخ الازہر مصر المتوفی ۱۹۷۸ء) کے بارے میں اتفاق ہے کہ صدیوں میں ایسے بلند پایہ شخص مصر کے امام اکبر ہوتے ہیں۔ آپ نے مکہ مکرمہ کے فندق عرفات میں مولانا مدظلہ کے بارے میں فرمایا، حاضرین میں مولانا منظور نعمانی اور مولانا علی میاں بھی تھے، بلکہ غالباً انھیں کو خاص طور سے مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ ''میں شہادت دیتا ہوں کہ اگر سارے عالم میں کوئی ''محدث اعظم'' کے خطاب کا مستحق ہے تو یہ شخص ہیں''۔[۳۰]

مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارک پوریؒ تحریر فرماتے ہیں:

''احادیث رسول کے ان نادر ونایاب اور قدیم وعظیم ذخیروں کی اشاعت کے بعد ان میں سے کئی ایک فوٹو کے ذریعہ بیروت میں شائع ہوئے اور پورے عالم عرب اور عالم اسلام کے اہل علم کو ان استفادہ کا موقع ملا اور حضرات مولانا کی علم حدیث میں عبقریت سے واقف ہوئے، جس کی وجہ سے مولانا کی شخصیت علم حدیث میں مرجع بن گئی اور ہندوستان وپاکستان کے اہل علم سے زیادہ ان حضرات نے ان کتابوں اور مولانا کی ذات سے علمی ودینی فائدہ اٹھایا۔

ہم نے متعدد بار یہ منظر دیکھا کہ مولانا ایام حج میں حرم شریف کے سامنے مدرسہ فخریہ کے چھوٹے سے دفتر میں تشریف رکھتے تھے اور مصر وشام، حجاز اور افریقہ کے اہل علم مولانا کی خدمت میں نیازمندانہ انداز میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے اور قدماء کے طریقہ پر ان سے حدیث کی روایت کی سند لیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا ہندستان میں علم حدیث کے آخری سالار قافلہ تھے''۔[۳۱]

محدث اعظمیؒ کے تئیں عربوں کی عقیدت، محبت وشیفتگی وگرویدگی پروفیسر محمد اجتباء صاحب ندویؒ سے بھی سن لیجیے۔ تحریر فرماتے ہیں:

''۱۹۷۳ء کے آخر میں سعودی وزارت تعلیم کی دعوت پر ریاض گیا، ۱۹۷۴ء کے حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ریاض سے مکہ مکرمہ حاضر ہوا، تو معلوم ہوا کہ حضرت محدث اعظمیؒ کا قیام مدرسہ فخریہ میں ہے، پہلی فرصت میں حاضر ہوا، کئی برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی، لپٹا لیا، شفقت ومحبت سے حالات پوچھتے رہے، کمرہ کے ایک کونہ میں بڑی سادگی، تواضع اور انکساری سے تشریف فرما تھے اور عرب وعجم کے علماء ومحدثین اور محققین خدمت میں حاضر ہوتے تھے، سند حدیث لیتے تھے اور تاثر وعقیدت کے ساتھ مالا مال لوٹتے تھے''۔[۳۲]

مشہور مصنف مولانا سعید احمد اکبرآبادی تحریر فرماتے ہیں:

''الشیخ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ان محققین علماء میں سے ہیں، جو اگرچہ اپنے وطن میں ''غریب شہر'' ہیں، لیکن عرب ممالک میں ان کے علم وفضل، شہرت وعظمت کا طوطی بولتا ہے''۔[۳۳]

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ شاگرد علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے ایک خط میں محدث اعظمیؒ کو تحریر فرماتے ہیں:

''......آپ شاہ صاحبؒ کے جانشین ہیں، میرے دل میں آپ کے تقویٰ، علم وپرہیزگاری کی وجہ سے بہت زیادہ عزت ہے......''

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''......حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے آپ سے ایک تعلق ہے، کیوں کہ آپ اُن کے علم کے وارث ہیں، اس لیے مجبور ہوں کہ آپ سے اپنا تعلق رکھوں''۔[۳۴]

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ممتاز شاگرد مولانا یوسف بنوریؒ نے ایک بار مکہ میں شیخ سلیمان صنیع کے یہاں ایک دعوت میں شیخ موصوف سے محدث اعظمیؒ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

ھو من أکابر أصحاب شیخنا (وہ ہمارے استاذ کے عظیم ترین

شاگردوں میں سے ہیں)۔

مولانا محمد طاسین صاحبؒ (داماد حضرت بنوریؒ) محدث اعظمی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''غائبانہ آپ کا ذکر جن تعریفی الفاظ کے ساتھ کرتے تھے ہم لوگ سن کر دنگ رہ جاتے تھے، وہ (مولانا بنوریؒ) آپ کو اپنے وقت کا عظیم محدث فرمایا کرتے تھے''۔[۳۵]

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ فن حدیث میں آپ کی مہارت اور آپ کے علمی مقام کا تعین کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے خادمانِ حدیث اور ماہرین علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست ہی تیار کی جائے، تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن (مئو- ضلع اعظم گڈھ) کا ہوگا''۔[۳۶]

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب فرنساویؒ نے محدث اعظمیؒ کو ''شاہ ولی اللہ ثانی'' کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ مصنف عبد الرزاق کی نگرانی کے سلسلے میں جس وقت آپ بیروت میں مقیم تھے، اس وقت ڈاکٹر صاحب نے یہ خط لکھا جس میں تحریر فرمایا:

''شاہ ولی اللہ ثانی کی یہ خدمت حدیث عند اللہ ماجور، عند الناس مشکور ہوگی''۔[۳۷]

شیخ احمد محمد شاکرؒ جلیل القدر محدث، مشہور محقق اور نامور ادیب تھے۔ اہم علمی تعلیمی اور سرکاری مناصب پر فائز رہے، نیز عہدۂ قضا پر بھی مامور رہے، فن حدیث میں زبردست مہارت ودسترس حاصل تھی، علم حدیث کے اندر ان کا پایہ کتنا بلند تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ زرکلی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

لم يخلف بعده مثله (انھوں نے اپنے بعد اپنا مثل نہیں چھوڑا)۔[۳۹]

آپ نے ''مسند امام احمد بن حنبل'' کی تحقیق وتعلیق سولہ جلدوں میں کی ہے۔ مسند احمد کی پندرہویں جلد میں محدث اعظمیؒ کے علم وفضل کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

''اس کتاب کی تیسری جلد (صفحہ ۳۶۵) میں درخواست کی گئی تھی کہ اہل علم وفضل مسند کی شرح اور تعلیق میں جو خامی رہ گئی ہے، اس کی نشان دہی فرمائیں، مگر اس سلسلے میں دس سال بعد سب سے پہلا ''استدراک وتعقیب'' ایک ہندوستانی عالم دین علامہ استاذ حبیب الرحمٰن اعظمیؒ خادم الحدیث جامعہ مفتاح العلوم - مئو- ضلع اعظم گڈھ کی طرف سے موصول ہوا ہے، جن سے میری کوئی جان پہچان نہیں، مگر ان کی اس تحریر سے ان کے عمیق علم وفضل، وسیع مطالعہ اور دقیق بحث وتحقیق کا اندازہ ہوا، چنانچہ میں اس تحریر کو یہاں اس اقرار کے ساتھ شائع کر رہا ہوں کہ جو گرفت کی گئی ہے، وہ درست اور یقیناً مولانا کا فضل وکمال مسلّم ہے''۔[۳۹]

حضرت محدث اعظمیؒ کو شیخ احمد شاکرؒ نے جو مکتوب بطور شکریہ ارسال کیا تھا اس میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

وأنتم كما رأيت من عملكم من أعظم العلماء بها في هذا العصر (اور جہاں تک میں نے آپ کے کام کو دیکھ کر سمجھا ہے، آپ اس زمانہ میں سنت نبویہ کے عظیم تر علماء میں سے ایک ہیں)۔[۴۰]

ایک معاصر مبصر جناب شوکت علی خاں ڈائریکٹر مولانا ابو الکلام آزاد عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ -ٹونک- راجستھان نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

وأخيراً نقدم تحيتنا إلى رجل عظيم جليل لمكانة عظيمة في العلم والفضل في عصرنا الراهن حضرة صاحب الفضيلة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي الذي له خدمات جليلة في مجال الحديث النبوي الشريف الواسع. ولم نجد أحدًا في هذا الحقل على مقربة منه. ومن هنا تستحق أرض الهند أن تفتخر بعبقريته التي ولدت من بطنها وترعرعت على ظهرها. وشبّ في أحضانها. وتخدم علم الحديث فيها حيث لا يوجد مثيل لها.[۴۱]

ترجمہ:- اخیر میں ہمارا اسلام اور نیک تمنائیں ایک جلیل القدر اور عظیم ہستی کی خدمت میں پیش ہے، جن کو ہمارے موجودہ زمانے میں علم وفضل میں بڑا مقام حاصل ہے۔ یعنی محترم فضیلت مآب شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی جن کی فن حدیث کے وسیع میدان میں گراں قدر خدمات ہیں اور ہم نے اس میدان میں کسی کو ایسا نہیں پایا جو آپ کے مرتبہ کے قریب تک پہنچ سکا ہو، بنا بریں سرزمین ہند کو ان کی عبقریت پر بجا طور پر ناز ہے، جو اس کی کوکھ سے پیدا ہوئے، اسی کی گود میں نشو ونما پائی اور اسی کی پشت پر جوان ہوئے، اور اسی سرزمین میں رہ کر علم حدیث کی بے مثال خدمت انجام دے رہے ہیں۔

شیخ عابد الفاسی الفہری فاس (مراکش) کی مشہور لائبریری خزانۃ جامعۃ القرویین کے محافظ ونگراں اور عالم وفاضل شخص تھے، مصنَّف عبد الرزاق علامہ اعظمیؒ کی تحقیق سے شائع ہونے کے بعد جب ان کے پاس پہنچی ہے، تو انھوں نے ۳۰؍ جولائی ۱۹۷۳ء کو مکتوب اسلامی بیروت کے پتہ پر ایک خط لکھا، جو کو بیروت والوں نے علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں روانہ کردیا، اس خط کے آغاز میں شیخ عابد فاسی نے کتاب کی وصولیابی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

فقد تشرفنا بوصول كتاب المصنف للحافظ الكبير أبي بكر عبد الرزاق بن همام الصنعاني الذي عني بتحقيق نصوصه وتخريج

أحاديثه الشيخ الإمام العلامة المحدث السيد حبيب الرحمن الأعظمي.

(ہم حافظ ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کی کتاب المصنف سے شرفیاب ہوئے، جس کی احادیث کی تحقیق وتخریج امام وعلامہ ومحدث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے کی ہے)۔

اسی خط میں چند سطروں کے بعد علامہ اعظمی کے مرتبہ ومقام اور ان کی جلالت علمی کے متعلق فرماتے ہیں:

إنَّ الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي هذا أجدرُ الناس بتحقيق كتب السنة والتعليق عليها، فهو أحد أفراد هذا العصر الذي هيّأ نفسه وهيّأه الله تعالى لتجديد هذا الدين تصديقاً لقول النبي عليه السلام: إنَّ الله يبعث على رأسِ كل مائة سنةٍ من يجدِّد لهذه الأمة أمر دينها.......

(شیخ حبیب الرحمٰن اعظمیؒ موصوف کتب حدیث کی تحقیق وتعلیق کے سب سے زیادہ حق دار ہیں، وہ ایسے یکتائے زمانہ ہیں جنھوں نے خود کو تیار کیا اور اللہ نے ان کو اس دین کی تجدید کے لیے مہیا فرمایا، رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کے مصداق جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر سوسال پر ایک ایسا شخص پیدا کرے گا، جو اس امت کے لیے دین کی تجدید کرے گا)۔

آپ کی اس عظیم الشان خدمت حدیث کی پذیرائی بارگاہ رسالت میں بھی ہوئی، جس سے بڑا کوئی شرف نہیں ہوسکتا۔

بشارت

مولانا حکیم سعداللہ صاحب مرحوم شہر مئو کے مشہور حکیم اور علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے ایک دفعہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہوئے ہیں اور بہت سے لوگ آپ کی دودھ اور بالائی سے ضیافت فرمارہے ہیں لیکن ان کی ضیافت کرنے والوں میں علامہ اعظمیؒ پیش پیش ہیں بلکہ اس مجلس میں وہی آنحضرت ﷺ کے خادم خاص ہیں''۔[۴۲]

خواب ''عیاں راچہ بیاں'' کا مصداق ہے، گذشتہ صدی میں اشاعت حدیث کی خدمت میں آپ سب پر فائق ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں محدث اعظمیؒ کو سلام کہلوانا اور آپ کی خدمت حدیث پر سند قبولیت

حضرت مولانا صوفی نصرت علی صاحبؒ (خلیفہ مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ) جو سلسلۂ تھانوی کے ایک بزرگ تھے ٹانڈہ میں رہتے تھے ایک بار وہ اور حضرت محدث کبیرؒ گورکھپور میں تشریف رکھتے تھے، صوفی صاحب کے داماد کے یہاں دعوت تھی بعد نماز عشاء کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دونوں بزرگ اپنی اپنی قیام گاہ پر چلے گئے، رات میں اچانک مولانا نصرت علی صاحبؒ کی طبیعت خراب ہوگئی، ڈاکٹر آئے دوادی گئی اسی اثناء میں آپ کو نیند آگئی جب بیدار ہوئے تو حاضرین سے فرمایا کہ:

''ابھی میں نے خواب میں آنحضرتؐ کی زیارت کی ہے حضوؐر نے فرمایا کہ ''حبیب الرحمٰن سے میرا اسلام کہہ دیجئے اور کہہ دیجئے کہ وہ جس کام میں لگے ہیں لگے رہیں'' اس کے بعد مولانا نصرت علی صاحبؒ نے فرمایا کہ ''اگر میرا انتقال ہو جائے تو مولانا اعظمیؒ سے کہہ دیجئے گا کہ میری نماز جنازہ پڑھا دیں گے''۔

چنانچہ اسی رات مولانا نصرت علی صاحبؒ کا انتقال ہو گیا صبح لوگ حضرت محدث کبیرؒ کے پاس آئے اور آپ سے رات کا پورا واقعہ بیان کیا۔

صوفی صاحب کی آخری خواہش کے مطابق حضرت محدث کبیرؒ نے ہی آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اس واقعہ کے وقت مئو کے مولوی عبدالرزاق صاحب محلہ علاء الدین پورہ بھی وہاں موجود تھے۔[۴۳]

شیخ علوی بن عباس مالکیؒ کی شہادت

مکہ مکرمہ کے نہایت جید اور بلند پایہ عالم تھے حرم شریف کے اندر حلقۂ درس قائم کیا کرتے تھے حرم پاک میں جب آپ کی مجلس درس وافادہ سجتی تو اس وقت اطراف وآفاق سے آنے والے اہل علم بھی آپ کے چشمہ علم سے سیراب ہوتے، استدلال واحتجاج کی قوت، پرزور بیان، وضاحت وبلاغت، وفور علم اور وسعت مطالعہ آپ کے درس کی نمایاں خصوصیات ہوا کرتی تھیں علم وفن میں مہارت کے ساتھ بڑے صاحب صلاح وتقویٰ بزرگ تھے۔

محدث اعظمیؒ ان سے اپنی دوسری ملاقات کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثم زرته ثانياً في سنة ۱۹۷۱م وزارني في تلك السنة في بيت الشيخ النمنكاني بالمدينة المنورة مع الشيخ حسن المشاط وولده محمد فبالغ في اكرامي وقبل جبيني وحثني على انجاز طبع المصنف لعبد الرزاق وكنت اذ ذاك اشرف على طبعه واصحح ملازمه في بيروت.

پھر میں نے ان سے دوبارہ ملاقات ۱۹۷۱ء میں کی اور اس سال انھوں

نے بھی مجھ سے مدینہ منورہ میں شیخ نمنکانی کے گھر پر حسن مشاط اور اپنے صاحبزادے محمد علوی کے ساتھ ملاقات کی، اس وقت انھوں نے میرا مبالغہ آمیز حد تک اکرام کیا اور میری پیشانی کو بوسہ دیا اور مصنف عبدالرزاق کی طباعت کی تکمیل کے لئے میری حوصلہ افزائی فرمائی، حالانکہ اس وقت میں اس کی طباعت کی نگرانی اور بیروت میں اس کے فرموں کی تصحیح کا کام انجام دے رہا تھا۔

اس ملاقات کی تفصیل مولانا اقبال احمد اعظمی مقیم لندن کی زبانی سے سنئے، جو اس وقت حضرت محدث اعظمی کے ساتھ تھے: اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''شیخ علوی عباس مالکی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے علماء جانتے ہیں، وہ شیخ حسن مشاطؒ اور شیخ ابراہیم کردیؒ کہنا چاہئے کہ حرم پاک کے بلند پایہ علماء ومحدثین کی آخری تین یادگاریں تھیں، ان تینوں کو حضرت مولانا (حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی) مدظلہ کی معیت میں ہی دیکھنے کی اس ناچیز کو بھی سعادت حاصل ہوئی۔ شیخ علوی جو ''سید'' بھی تھے مولانا سے لپٹے ہوئے ہیں اور بلک بلک کر رو رہے ہیں، اور کہتے جاتے ہیں: ''میں یقین دلاتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ آپ سے راضی ہیں''۔[۴۴]

مولانا عبداللہ زمزمی مکّی کی عقیدت

بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ محدث اعظمیؒ سے بڑی والہانہ عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ محدث اعظمی تحریر فرماتے ہیں:

مولانا محمد طیب دیوبندی اور مولانا محمد یوسف بنوری جیسے ہندوستان کے بڑے علماء ان کی پارسائی کے معتقد تھے اور زیارت کے لئے ان کے خلوہ میں جایا کرتے تھے۔ جو شخص ان کو دیکھتا ان سے محبت کرتا، ان سے وابستہ ہو جاتا اور ان کی نیکی کا یقین کرتا۔ مرحوم میرا اکرام مبالغہ حد تک کرتے تھے، وطن سے باہر کے لوگوں میں میں نہیں سمجھتا کہ ان کے جیسی کسی نے مجھ سے محبت کی ہوگی، جس کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جس نے مجھے ان کے ساتھ دیکھا ہوگا۔[۴۵]

مولانا زمزمیؒ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''سیدی! ان ذکراک بلسانی، ومنظرک بعینی، وجلالک بقلبی، اسأله جلت قدرته وتعالت عظمته ان یحفظک ویرعاک ویدیمک ویجمعنا بک''

میرے آقا! آپ کا ذکر میری زبان پر، آپ کا سراپا میری نگاہوں میں اور آپ کی بزرگی میرے دل میں ہے۔ میں خدائے بزرگ وبرتر سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کی حفاظت فرمائے، آپ کی نگہبانی فرمائے، آپ کے سائے کو تا دیر باقی رکھے اور ہماری آپ سے ملاقات کرائے۔[۴۶]

محدث اعظمیؒ نے پہلے حج کے موقع پر ۳۰ رستمبر ۱۹۵۰ء کو حرم شریف - زاد اللہ حرمۃً وشرفاً - میں بیٹھ کر ایک خط گھر والوں کو لکھا، جس میں منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی تحریر فرمایا:

''مولوی عبد اللہ صاحب (زمزمی) رات بھر ہمارے ساتھ رہے، سڑک پر آدھی رات تک ہماری راہ دیکھتے رہے، ہدیوں سے بھی انھوں نے لاد دیا ہے، بار بار ہاتھ چھوتے ہیں، پیر پکڑتے ہیں، سر کا بوسہ دیتے ہیں، الحاصل اللہ کی بڑی عنایات ہیں'' (۴۷)۔

محدث اعظمیؒ فرماتے ہیں:

''کوئی میرے بارے میں ان سے پوچھتا تو فرماتے کہ ''وہ میرے شیخ ہیں''۔

ایک بار محدث اعظمیؒ کی کتاب ''رہبر حجاج'' ایک حاجی کے ہاتھ سے لے کر کھڑے ہو گئے اور سر پر رکھ لیا اور کئی بار فرمایا کہ ''مولانا تو رہبر عالم ہیں، مولانا تو رہبر عالم ہیں''۔[۴۸]

روضۂ اطہر پر حاضری کے وقت محدث اعظمیؒ کی کیفیت

حضرت مولانا سید محمد یحییٰ صاحب ندوی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''مدینہ منورہ میں حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری اور شیخ عوامہ کی آمد ورفت کثرت سے رہتی تھی، شام کو شیخ عوامہ اپنی گاڑی سے اطراف کی سیر کراتے، حضرت، شیخ ایمن، اور مولانا رشید احمد کے سہارے روضہ پر سلام پڑھنے جاتے، میں نے دیکھا کہ روضۂ اقدس کی حاضری کے وقت آپ کے پورے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، تھر تھر کانپ رہے ہیں اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی فریادی یا کوئی قصوروار کسی بڑے بادشاہ کے دربار میں کھڑا ہے۔[۴۹]

سراپا اخلاص

ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی تحریر فرماتے ہیں:

''مصنف عبدالرزاق کی تحقیق وتعلیق کا جب بیڑا اٹھایا، تو بڑی محنت سے اس کتاب کے قلمی نسخوں کو مختلف کتب خانوں سے حاصل کیا، اور شبانہ روز کی محنت کے بعد دس سال کے طویل عرصہ میں نہایت دیدہ وری اور عرق ریزی کے ساتھ اس کی ایک ایک حدیث کی تلاش وتحقیق کے بعد اپنی بیش قیمت تعلیقات سے سجا کر شائع کرنے کے قابل بنایا، جو گیارہ ضخیم جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے بیروت میں چھپ کر شائع ہوئی، یہ علامہ اعظمی کا ایسا اہم اور عظیم الشان کارنامہ تھا کہ اس کا چرچا کتاب کی اشاعت

سے قبل ہی عالم اسلام کے علمی حلقوں میں تحسین وستائش کے ساتھ ہونے لگا تھا، اس عظیم کام کی رائلٹی (Royalty) کی نسبت جب آپ سے بات کی گئی جو اس وقت ۱۹۷۰ء میں ہندوستانی کرنسی سے ۱۶ لاکھ روپئے ہوتی تھی، تو آپ نے بڑی بے نیازی کے ساتھ جواب دیا کہ میں نے اس کام کو شروع کرتے وقت للہ (یا یہ فرمایا کہ بلا معاوضہ) اس کو انجام دینے کی نیت کر لی تھی۔[۵۰]

محدث اعظمیؒ کا یہ شعر آپ کے حال کی ترجمانی کر رہا ہے:

بیروت وکویت اور حلب میں نہ نشش تھی
یہ جاذبہ تھا حبِ حدیث نبوی کا

عالم ربّانی کی شان

محدث اعظمیؒ ۷ ۱۹۶ء رجمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ کو مولانا ابراہیم میاں افریقی کے نام ایک خط لکھا ہے، اس میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''آپ نے اپنے عنایت نامہ میں میری مشکلات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مشکلات کی تفصیل لکھنا علم کے نام کو بٹہ لگانا ہے۔[۵۱]

کرامت وفراست

(۱) مولانا عطاء الرحمٰن بھاگلپوری تحریر فرماتے ہیں:

غالباً ۱۹۸۱ء کا جون، حضرت مخدوم (محدث اعظمی) اپنے اس خاک پا کی حقیر دعوت پر پورینی تشریف لائے، وہی چوہے اور اونٹ والی مثال تھی، مگر اللہ رے شفقت، گرمی کی شدت کے باوجود خندہ جبینی لمحہ بھر کو رخصت نہ ہوئی، ایک موقع پر برف طلب فرمایا، اس غلام نے ۱۲ کلومیٹر دور ایک شخص کو برف کے لئے شہر بھیجا، ۹ بجے کا گیا ہوا فرستادہ ایک بجے تک جب نہ لوٹا تو اس کمترین خادم کا ندامت سے وہ حال ہوا کہ نہ پوچھئے، حضرت فرمارہے تھے کاش بارش ہو جائے، موسم ٹھنڈا ہو جائے، زمین جل رہی تھی، آسمان آگ برسا رہا تھا، بادل کا کوئی ٹکڑا دور دور تک ناپید تھا، واللہ اعلم کہاں سے گھٹا اٹھی اور چند سو گز کے دائرے میں ژالہ باری کر کے دوبارہ آسمان صاحب کر گئی، مصنوعی برف لانے والا ناکام لوٹا، قدرتی برف کے اولے ڈش میں بھرے گئے، تلوؤں پر ملے گئے، موسم یوں معتدل ہو گیا گویا فروری، مارچ کا مہینہ ہو، سارے انگشت بدنداں، عقل توجیہ سے قاصر، کیسے ہو گیا''۔[۵۲]

(۲) صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''دارالعلوم بنگلور کا ایک بڑا دینی وتعلیمی ادارہ ہے، ۱۳۹۵ھ-۱۹۷۵ء کی بات ہے کہ اسکا ختم بخاری اور دستار بندی کا جلسہ ہوا اس کے منتظم سبیل الرشاد کے روحِ رواں، جنوبی ہند کے مشہور عالم اور دارالعلوم دیوبند کے شوریٰ کے رکن مولانا ابوالسعود صاحب علیہ الرحمہ تھے یہ ان کے مدرسے کا بہت بڑا اور تاریخی جلسۂ دستار بندی تھا، جس کے لئے انھوں نے بڑے پیمانے پر انتظامات کئے تھے، اور والد مرحوم کو بطور خاص مدعو کیا تھا اس سفر میں یہ راقم حضرت والد صاحب کے ساتھ تھا، اتفاق یہ ہوا کہ جیسے ہی جلسہ کی کاروائی شروع ہونے کا وقت ہوا، سیاہ گھٹائیں امڈ کر آنے لگیں اور بارش شروع ہو گئی، اس صورت حال سے اربابِ انتظام کے ہوش اڑ گئے، جس قدر کالی گھٹائیں تھیں ان کو دیکھ کر اندیشہ اور خوف تھا کہ جلسہ ناکام ہو کر رہ جائیگا۔ مولانا ابوالسعود صاحب نے حضرت والد صاحب سے لجاجت کے ساتھ اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا کہ حضرت! دعا فرمادیجئے کہ بارش کا سلسلہ رک جائے اور جلسہ کامیاب ہو جائے، والد صاحب نے فرمایا کہ آپ دعا کیجئے میں آمین کہتا ہوں۔ مولانا ابوالسعود صاحب نے اللھم حوالینا ولا علینا والی حدیث پڑھ کر دعا کی، والد صاحب اور ہم لوگوں نے آمین کہی، ہلکی پھلکی جو بارش تھی وہ رک گئی، بادل چھٹ گیا، اور شہریوں کی بڑی تعداد ٹوٹ کر جلسے میں شریک ہوئی، بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے بعد شہر میں اس قدر بارش ہوئی تھی کہ پورا شہر جل تھل ہو گیا تھا۔[۵۳]

(۳) مولانا سید محمد یحییٰ صاحب ندوی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''میں ابن بحشل کی 'تاریخ واسط' خریدنے جارہا تھا۔ حضرت نے پوچھا مولوی یحییٰ کہاں جارہے ہو؟ میں نے کتاب کا نام لیا، فرمایا جس مقصد سے خریدنا چاہتے ہو وہ اس میں نہیں ہے۔ 'تاریخ واسط' میں محدثین وعلماء کے حالات، تمھارے آبا واجداد واسطی ہیں، ان کے حالات اس کتاب میں نہیں ملیں گے، یہ حضرت کی غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت وفطانت تھی کہ محض کتاب کا نام لینے پر تاڑ گئے کہ اس کو خریدنے کا اصل مقصد کیا ہے''۔[۵۴]

زہد واستغناء

امام غزالی تحریر فرماتے ہیں:

جاہ محبوب قلوب ہے، اسے صدیق ہی چھوڑ سکتے ہیں۔[۵۵]

محدث اعظمیؒ کی پوری زندگی امام غزالیؒ کے مندرجہ بالا قول کی عملی تفسیر ہے۔ آپ تقویٰ اور نسبت مع اللہ (ولایت) کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، جس کے نتیجہ میں دنیا اور متاع دنیا سے بے رغبت ہو گئے تھے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّت آشنائی (اقبالؒ)

آپ کے زہد واستغنا کے چند واقعات حسب ذیل ہیں:

(۱) جگر گوشہ محدث اعظمیؒ مولانا رشید احمد صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''والد صاحب کی تقریباً تمام عمر عسرت اور تنگ دستی میں گذری جس کی وجہ سے اکثر بیشتر سخت آزمائشوں سے دو چار رہے، اور زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آئے کہ بس ایک قدم بڑھانے بلکہ ایک ''ہاں'' کر دینے سے آپ کی حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی، لیکن کبھی آپ نے علم کی دکان کے ذریعے قناعت واستغنا کا سودا کرنا گوارا نہیں کیا:

ما آبروے فقر وقناعت نمی بریم

اس سلسلے میں ایک واقعہ ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے مشہور شاگرد حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ندوۃ المصنّفین کی طرف سے ''ترجمان السنۃ'' کی تصنیف وتالیف کا کام کر رہے تھے، لیکن اس کام کی رفتار اتنی سست تھی کہ ارباب ندوۃ المصنّفین کو اس کی تکمیل کے سلسلے میں برابر فکر لاحق تھی، اس صورتحال کے پیش نظر ندوۃ المصنّفین کے اس وقت کے ناظم حضرت مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم نے والد صاحب سے درخواست کی کہ آپ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں، اور اس کے لئے انھوں نے اس زمانے کے لحاظ سے ایک معقول حق الخدمت کی پیش کش کی، لیکن والد صاحب اپنے مشاغل اور خاص مزاج کی وجہ سے اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اسی اثناء میں والد مرحوم کے رفیق اور دوست حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمیؒ کسی کام کے لئے دہلی گئے، وہاں مولانا عثمانی صاحب سے ملاقات ہوئی، تو مولانا عثمانی کہنے لگے کہ مولانا.....یعنی حضرت والد مرحوم کے پاس کھیت اور زمین جائداد بہت زیادہ ہے کیا؟ مولانا ایوب صاحب یہ سن کر مسکرائے اور دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ تو مولانا عثمانی نے 'ترجمان السنۃ' کے سلسلے کی پیش کش اور والد صاحب کی عدم آمادگی اور بے نیازی کا قصہ سنایا۔ اس پر مولانا ایوب صاحبؒ نے فرمایا کہ رہائشی مکان کے علاوہ مولانا کے پاس کھیت اور جائداد کے نام پر ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر مولانا عثمانی ورطۂ حیرت میں پڑ گئے کہ اس کے باوجود اتنی بڑی پیش کش کو رد کر دیا۔ مولانا ایوب صاحب نے فرمایا کہ مولانا کا بس یہی خاص مزاج ہے۔[۵۶]

(۲) مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی (استاد دارالعلوم دیوبند) تحریر فرماتے ہیں:

''۱۳۶۴ھ م ۱۹۴۵ء میں جب کہ محدث عصر مفتاح العلوم مئو میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تدریسی وتعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مئو آکر بیک زبان صدارت افتاء کا اہم ترین منصب پیش کیا مگر اہل مئو بالخصوص جامعہ مفتاح العلوم کے ارباب بست وکشاد کسی طرح سے مفارقت پر راضی نہیں ہوئے۔[۵۷]

(۳) ۱۹۵۲ء میں آزادی کے بعد پہلا عام انتخاب ہوا، حضرت محدث اعظمیؒ کو کانگریس ہائی کمان نے ٹکٹ دیا اور الگو رائے شاستری کو آپ کو راضی کرنے کے لئے مئو بھیجا، بہر حال بجر واکراہ آپ تیار ہو گئے حضرت محدث اعظمیؒ مفتی ظفیر الدین صاحب کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''......دو ماہ سے سخت الجھن میں تھا، حادثہ یہ پیش آیا کہ میرے طلب یا خواہش بلکہ وہم وگمان کے بغیر مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے مجھے کانگریس کی طرف سے اسمبلی کا امیدوار نامزد کر دیا۔ اور میری ہر طرح کی بیزاری وکنارہ کشی کے باوجود امیدوار رہنا پڑا اور ہر چند کہ میں اس کام کے لئے نہ ایک قدم چلا نہ کسی سے اس کے لئے ایک لفظ کہا، پھر بھی زبردستی کانگریس امیدوار کی حیثیت سے نو امیدواروں کے مقابلہ میں کھڑا رکھا گیا......۶ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے میری کامیابی کی خبر مجھ کو سنائی گئی، اس بات کی خوشی تو ضرور ہے کہ ناکامی کی رسوائی سے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا لیکن ممبری کا سودا نہ پہلے تھا نہ اس کی کامیابی کے بعد ہی اس سے کوئی اُنس ہے......''۔[۵۸]

یہی وجہ تھی کہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ سمپور مانند نے جب مولانا (اعظمی) کو کسی بزرگ کے مکتوب پر کسی کام کے انجام نہ دینے کو لکھا، جب سمپور مانند نے اس کا ذکر کیا تو مولانا (اعظمی) نے ان سے بے نیازانہ بے باکانہ فرمایا کہ میں نے آپ سے ٹکٹ طلب کیا تھا؟ کوئی وعدہ کیا تھا؟ آپ کی کانگریس کو دو سیٹیں جیتنی تھیں اور وہ کام میرے بغیر نہ ہوتا، اس لئے آپ نے ٹکٹ دیا تھا، وہ کام ہو گیا، میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو مجھ سے اس سوال کی کیسے ہمت ہوئی۔ اس پر وزیر اعلیٰ خاموش ہو گئے۔[۵۹]

آئین جواں مرداں حق گوئی وبیباکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (اقبالؒ)

مندرجہ بالا واقعہ ذکر کرنے کے بعد مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحبؒ (سابق استاد طبیہ کالج دیوبند) تحریر فرماتے ہیں:

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا میں دنیاوی اعزاز واحترام سے بے رغبتی غیر معمولی طور سے تھی۔[۶۰]

(۴) مندرجہ ذیل واقعات، محدث اعظمیؒ کی علمی تحقیقات کے سب سے بڑے عالم حضرت مولانا سید محمد یحییٰ صاحب ندوی دامت برکاتہم نے

تحریر فرمائے ہیں، جو حضرتؒ کے آخری حج میں ساتھ تھے۔

''ایک روز حضرت (محدث اعظمیؒ) کے ساتھ مولانا عبداللطیف، مفتی ظفیر الدین اور یہ خاکسار مولانا سعید احمد اکبرآبادی سے ملنے گئے، مولانا اکبرآبادی حضرت کے بے حد قدرداں تھے، اور حضرت اعظمی بھی ان سے بہت بے تکلف تھے، مولانا اکبرآبادی نے آپ سے عرض کیا کہ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس کے عہدے سے سبکدوش ہو رہے ہیں، آپ اس منصب کو قبول فرمالیں، یہاں آپ کے ذوق کے مطابق ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ ہے۔ جس میں بہت سے مخطوطات ونوادرات کا ذخیرہ ہے۔ حضرت اعظمیؒ نے فرمایا کہ مولوی سعید! میں ملازمت نہ کرنے کا عہد کر چکا ہوں۔

مدرسہ عالیہ کی صدر مدرسی کوئی معمولی عہدہ نہیں تھا، منصب وجاہ اور دنیا سے حضرت مولانا کی بے رغبتی و بے نیازی کا یہ پہلا نقش تھا، جو میرے لوحِ قلب پر مرتسم ہوگیا، اس کے بعد کا ہر نقش گہرا ہوتا گیا، وہیں سے آپ کے ساتھ میرا ربط وتعلق قوی اور مضبوط ہوتا گیا، میری عقیدت اور ان کی شفقت روز افزوں رہی۔[61]

(۵) حضرت مولانا اعظمی کی عبقریت کا سب سے اہم اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ آپ نے تمام تر علمی وتحقیقی خدمات نہایت نامساعد حالات میں انجام دیے ہیں، جس کا بہت اچھا خاصا علم راقم الحروف کو ہے۔ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ تنگ دستی میں گذرا...... انہی حالات اور شیخ الازہر کی پیشکش ہی کے زمانے میں کویت کی طرف سے موسوعہ فقہیہ کی ترتیب کے لئے وہاں سے آپ کے لئے نہایت اونچی تنخواہ اور رہائشی سہولیات کے ساتھ کویت میں قیام کے لئے دعوت آئی، تو ملاقات ہونے پر احقر نے عرض کیا کہ حضرت آپ کویت والی دعوت قبول کیوں نہیں فرما لیتے؟ تو آپ نے جواب دیا تمھاری ہی طرح دو اور دنیاداروں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا، پھر فرمایا کہ مولوی یحییٰ! یہ صحیح ہے کہ اگر میں وہاں چلا جاؤں تو تمھاری خانقاہ کے احاطے سے بڑا میرا احاطہ ہو جائے گا۔ مصر کے لئے شیخ الازہر کی پیشکش پر بھی میں نے وہاں جانے کی ترغیب دینی چاہی، تو اس وقت بھی اسی طرح بے نیازانہ جواب دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت اعظمی نہ صرف قناعت واستغنا بلکہ غیرت وخودداری کے بھی نہایت بلند مقام پر فائز تھے''۔[62]

(۶) ایک دفعہ میں پٹنہ میں مقیم تھا کہ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار نے اطلاع دی کہ کل مولانا اعظمی تشریف لا رہے ہیں، مجھے اسی دن گھر جانا تھا، لیکن حضرت اعظمیؒ کی تشریف آوری کی اطلاع پاکر رک گیا، آپ نے پٹنہ لوجنگ (Lodging) میں قیام فرمایا، وہاں سے ہم آپ کے ساتھ لائبریری پہنچے، جمعہ کا دن تھا اور اس دن لائبریری قانونًا بند رہتی ہے۔ بیدار صاحب نے حضرت کی وجہ سے چند گھنٹوں کے لئے کھلوادی، میں نے حضرت سے تشریف آوری کی وجہ دریافت کی؟ تو فرمانے لگے کہ مکہ مکرمہ میں شیخ ازہر سے ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ مصر چلیں، سفر کی جو بھی دقتیں اور قانونی اڑچنیں ہوں گی، وہ دور ہو جائیں گی، ازہر سے الجامع الکبیر (جمع الجوامع) للسیوطی شائع ہو رہی ہے، جن جن شخصیتوں نے کام کیا ہے، میں ان کے کام سے مطمئن نہیں ہوں، میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب آپ کی نگرانی میں شائع ہو جائے۔ شیخ ازہر کی اس پیشکش پر حضرت نے ان کو جواب دیا کہ میں حج کی نیت سے آیا ہوں، ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، وطن پہنچنے پر کوئی فیصلہ کروں گا۔ شیخ ازہر نے کہا کہ الجامع الکبیر کا ایک نسخہ پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، کم از کم اس نسخے ہی کے بارے میں تحریر فرمادیں۔ اسی کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ آپ نے چند گھنٹوں میں کتاب پر نظر ڈال کر فرمایا کہ بیدار صاحب اس کے اوراق بے ترتیب ہیں یحییٰ اس کو ٹھیک کر دے گا۔[63]

(۷) مکہ مکرمہ میں شیخ یٰسین فادانی کی آمد ورفت زیادہ رہتی، ایک دن وہ اپنے شاگردوں کی بڑی جماعت جو تقریبًا بیس پچیس کی تعداد میں تھے، حضرت اعظمی کے پاس مسلسل بالاولیت سند دلانے کے لیے لائے، اتنی بڑی تعداد دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ اے فادانی! آپ دن میں کئی مرتبہ لائیے، مگر چار پانچ کی تعداد میں طلبہ کو لائیے، مجھے بھیڑ سے وحشت ہوتی ہے۔ یہ حضرت کا مزاج تھا کہ آپ تنہائی اور یکسوئی پسند فرماتے، اور بھیڑ بھاڑ سے متوحش رہتے تھے (۶۴)۔

(۸) ''...... میں نے پوچھا کہ حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ کے بعد صدر مدرسی کا عہدہ کس کے سپرد ہوا، فرمانے لگے مولانا عبدالصمد اور مولانا منت اللہ میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ صدر مدرسی کا عہدہ قبول کرلیں، آپ کے علاوہ کوئی اور اس کا حقدار نہیں ہے، میں نے کہا کہ آپ یہ عہدہ میرے سپرد کررہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری اہلیت اور صلاحیت کے معترف ہیں، تو آپ لوگوں کے اس اعتماد کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ اس کے مجھ سے زیادہ حقدار مولانا فخرالدین ہیں، اس لئے انھیں کے سپرد کیا جائے، پھر اسی پر مجلس شوریٰ نے فیصلہ کر دیا۔[65]

مندرجہ بالا واقعات بطور نمونہ کے ذکر کر دیے گئے، ورنہ حضرت محدث اعظمیؒ کی پوری زندگی زہد واستغنا سے بھرپور ہے اور ان کو لکھنے کے

لئے ایک دفتر درکار ہے ؎

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

حضرت مولانا سید محمد یحیٰ صاحب ندوی دامت برکاتھم ہی کی مندرجہ ذیل تحریر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں:

''حضرت مولانا یکتائے زمانہ اور نادرہ روزگار تھے، آپ تاریخ اسلام کی ان بے نظیر ہستیوں میں تھے، جن کی مثالیں خال خال ملتی ہیں، مگر باوجود اپنی عبقریت، جلالت قدر و منزلت، عظمت و بلندی، وسعت مطالعہ اور تبحر علمی کے نہایت خاموش طبع اور کم گو تھے، جس کی وجہ سے آپ کے علم و معرفت اور فضل و کمال کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا، اخفاء حال کا حد درجہ اہتمام تھا، اپنی شخصیت اور کمالات کے اظہار کے جذبے سے قلب و جگر پاک تھا۔[٦٦] □□

حواشی

١- بخاری شریف کتاب الایمان
٢- طریق اولیاء، ص: ٨٧-٧٩-٨٠، بحوالہ اکابر کا سلوک و احسان، ص:١٨، تصوف و نسبت صوفیہ، ص:٩
٣- مالابدمنہ
٤- ایضاً
٥- مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ، ص: ٣٥
٦- (٦) مقدمہ تذکرہ مصلح الامۃ
٧- حیات ابوالمآثر، ص:٨٧
٨- ایضاً، ص:٨١-٨٠
٩- ایضاً، ص: ٨٧
١٠- ایضاً، ص:٥١٦-٥١٥
١١- ایضاً، ص:٥٣٦-٥٣٥
١٢- مقدمہ تذکرہ مصلح الامۃ
١٣- حیات ابوالمآثر، ص: ٦٨٩
١٤- مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ، ص: ٩٥
١٥- حیات ابوالمآثر، جلد ثانی، ص: ٣٤-٣٣
١٦- ایضاً، ص: ٣٢
١٧- ایضاً، ص: ٣٣
١٨- ایضاً، ص: ٥٥٨ عربی سے ترجمہ
١٩- مآثر و معارف، ص: ٢٠٧-٢٠٦
٢٠- صدق جدید، ٦/مارچ ١٩٦٤ء
٢١- صدق جدید لکھنؤ، ص: ٤، ٢/اگست ١٩٦٨ء
٢٢- ایضاً، ٢/جون ١٩٦٧ء
٢٣- حیات ابوالمآثر، جلد ثانی، ص: ٣٦
٢٤- ایضاً، ص: ٣٤
٢٥- ترجمان الاسلام، خصوصی اشاعت ١٩٩٢ء، ص: ١٣٩
٢٦- حیات ابوالمآثر، جلد ا، ص: ٤٤٠
٢٧- حیات ابوالمآثر، جلد ثانی، ص: ٤٦١
٢٨- ایضاً، ص: ٤٧٣
٢٩- ایضاً، ص: ٤٧٣
٣٠- حیات ابوالمآثر، جلد ا، ص: ٤٦١
٣١- ترجمان الاسلام، خصوصی اشاعت ١٩٩٢ء، ص: ٤٧
٣٢- حیات ابوالمآثر، جلد ا، ص: ٣٥٠-٣٤٩
٣٣- برہان دہلی، اپریل: ١٩٧٣ء
٣٤- حیات ابوالمآثر، جلد ا، ص: ٥٣
٣٥- ایضاً، ص: ٥٥١-٥٥٠
٣٦- صدق جدید، ٢٥/اگست ١٩٦٨ء
٣٧- حیات ابوالمآثر، جلد ا، ص: ٥٦٥
٣٨- ایضاً، ص: ٥٧٩
٣٩- مسند احمد شرح و تعلیق احمد محمد شاکر: ج ١٥، ص ٢٥١ عربی سے ترجمہ
٤٠- المآثر، جلد ٢، شمارہ: ا، ص: ٣٨-٣٧
٤١- مقدمۃ الدیباجۃ علی ابن ماجہ: ١/١١
٤٢- حیات ابوالمآثر، جلد ا، ص: ٥٢٥-٥٢٤
٤٣- ایضاً، ص: ٥٢٧-٥٢٦
٤٤- ایضاً، ص: ٥٩٦-٥٩٤
٤٥- ایضاً، ص: ٦٧٥
٤٦- ایضاً، ص: ٥٨٣
٤٧- ایضاً، ص: ٢١٤-٢١٣
٤٨- ایضاً، ص: ٥٨٥
٤٩- ایضاً، ج ٢، ص: ٣٣
٥٠- ایضاً، ج ا، ص: ٤٦٦
٥١- ایضاً، ج ا، ص: ٤٦٧
٥٢- ایضاً، ج ا، ص: ٥٣٠
٥٣- ایضاً، ج ٢، ص: ٢٥
٥٤- ایضاً، ج ا، ص: ٣٣
٥٥- المرشد الامین، ص: ١٩٩
٥٦- حیات ابوالمآثر، جلد ا، ص: ٢٥-٢٤
٥٧- ایضاً، ج ا، ص: ٢٠٣-٢٠٢
٥٨- ایضاً، ج ا، ص: ٢٢٢
٥٩- ایضاً، ج ا، ص: ٤٩
٦٠- ایضاً، ج ا، ص: ٤٩
٦١- ایضاً، ج ٢، ص: ٣٠
٦٢- ایضاً، ج ٢، ص: ٣١
٦٣- ایضاً، ج ٢، ص: ٣٢
٦٤- ایضاً، ج ٢، ص: ٣٥
٦٥- ایضاً، ج ٢، ص: ٣٦
٦٦- ایضاً، ج ٢، ص: ٣٦۔

محدثِ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ

بحیثیت محدث و محقق

مولانا خورشید انور اعظمی★

محدث کبیر ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، علم وفن، شعر وسخن، صنعت وحرفت اور دینی وعصری درسگاہوں کے لیے مشہور سرزمین مئو میں پیدا ہوئے، یہ شہر کبھی ضلع اعظم گڑھ کا ایک اہم ترین حصہ ہوا کرتا تھا اور اب بذات خود ضلع بن چکا ہے اور علمی، فکری، سیاسی، سماجی اور ملی سرگرمیوں کے حوالے سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے، یہیں آپ نے شعور کی منزلیں طے کیں اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دار العلوم مئو، مظہر العلوم بنارس اور دار العلوم دیوبند جیسی مشہور ومعروف علمی ودینی درسگاہوں کے یگانہ زمانہ اور ماہر فن اساتذہ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبد الغفار مئوی وغیرہ جیسی نابغہ روزگار شخصیات کے دامن علم وتربیت سے وابستہ ہوکر پورے شوق ونشاط اور ولولہ وحوصلہ کے ساتھ اپنی علمی تشنگی بجھائی، اور فطری ذہانت وفطانت سے کتاب وسنت اور دیگر علوم وفنون میں کامل دستگاہ حاصل کی۔

آپ کی علمی استعداد ایام طالب علمی ہی میں اس درجہ پختہ اور مضبوط ہوگئی کہ بالغ نظر اساتذہ کرام کی دور رس نگاہوں نے بھانپ لیا کہ اگر اللہ نے چاہا تو یہ جوہر قابل مستقبل کا درشہوار ثابت ہوگا اور علم وفن کے میدان میں گراں قدر کارنامے انجام دے گا۔ اکابر کا یہ اندازہ صدفی صد صحیح ثابت ہوا اور دنیا نے دیکھا کہ علمی حلقوں میں آپ کی عبقریت کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا، آپ کی تحقیقات وتعلیقات سے بھرپور استفادہ کیا گیا اور ارباب علم وفضل کے قلوب میں آپ کی جلالت علمی کا رعب ودبدبہ اس درجہ قائم ہوگیا کہ بڑی بڑی صلاحیتیں آپ کے سامنے آکر سہم جایا کرتیں اور کسی بھی علمی مسئلے میں لب کشائی کی ہمت نہ کرپاتیں، آپ کی شخصیت کا یہ نمایاں پہلو ہے جو دوسری جگہ یکسر معدوم نظر آتا ہے، کسی عربی شاعر نے اسی طرح کی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں کہا ہے اور خوب کہا ہے:

[illegible]

آپ نے تعلیم وتعلم کے خوشگوار مراحل سے گذرنے کے بعد تدریس کے میدان میں قدم رکھا اور دیکھتے دیکھتے ایک کامیاب مدرس کی حیثیت سے شہرت کے بام عروج پر پہنچ گئے، اور مدارس کی دنیا میں بطور خاص آپ کے فیضان علم ومعرفت کا چرچا عام ہوگیا، جس کے زیر اثر تشنگان علوم دینیہ آپ کی خدمت میں کشاں کشاں آنے لگے اور حسب صلاحیت واستعداد اکتساب فیض کرنے اور اپنی علمی پیاس بجھانے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے، جس کا اچھا ثمرہ اور بہتر نتیجہ یہ سامنے آیا کہ نہایت قلیل مدت میں مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد حسین بہاری، مولانا عبد الستار معروفی، مولانا ضیاء الحسن اعظمی، مولانا عبد الجبار مئوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی اور مفتی ظفیر الدین مفتاحی جیسے اکابر علما، نامور ادبا، ممتاز محدثین، اور بافیض اصحاب درس وافتا پیدا ہوئے اور اپنے اپنے میدان میں نمایاں علمی ودینی خدمات انجام دے کر ملک وملت کا نام روشن کیا۔

علامہ اعظمی نے تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور حسب ضرورت ومصلحت مختلف موضوعات پر متعدد اہم کتابیں سپرد قلم کیں، چوں کہ ابتدا ہی سے آپ کا مطالعہ عمیق، علم گہرا، ذوق اعلی، اور مزاج تحقیق کا خوگر تھا، اس لیے آپ کی ہر تحریر جامع، پرمغز، پرکشش اور حشو وزوائد سے پاک ہوتی، جس سے ہر باشعور قاری پورے طور پر متاثر ہوتا اور دل کی گہرائی سے اس کی عظمت واہمیت کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ آپ محدث اعظمی کی اردو تصانیف میں صرف رکعات تراویح، نصرۃ الحدیث، اعیان الحجاج اور دست کار اہل شرف کا سرسری مطالعہ کریں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوجائے گی اور اس بات کی صداقت وواقعیت کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ آپ کی جملہ تصانیف میں زبان وبیان کی پختگی، مطالعہ کی وسعت، موضوع کی جامعیت، مضامین کی ندرت، مواد کی فراوانی، اسلوب کی دل کشی ودل پذیری، اور دقت نظری وخوش سلیقگی کے ساتھ ساتھ زیر بحث مسئلے کی مکمل وضاحت پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ فگن ہے، جس کا زبان وادب کے ماہر اصحاب علم وقلم نے اپنے مقالات میں برملا اعتراف کیا ہے، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے سابق مدیر، مشہور ادیب ومورخ مولانا ضیاء الدین اصلاحی آپ کے طرز نگارش کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

★ صدر مدرس جامعہ مظہر العلوم، بنارس

''مولانا سلیس، شگفتہ، پر مغز اور حشو وزوائد سے پاک اردو لکھتے جو ماقل ومادل کا نمونہ ہوتی تھی''۔[1]

اہلِ علم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آپ کے ابتدائی ایام کی تصانیف وکتب بھی بہت ہی جامع، مستند اور غایت درجہ وقیع اور امت مسلمہ کے لئے نہایت مفید ونافع رہی ہیں، لیکن آپ کے عزائم اس سے کہیں بلند اور مقاصد بہت عظیم تھے اور احادیث نبویہ کی خدمت ودفاع کا دینی جذبہ آپ کے نہاں خانہ دل میں اس درجہ موج زن تھا کہ وسائل کی قلت اور اسباب کی کمیابی کے باوجود اس کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہو گئے اور اپنے فطری ذوق اور طبعی مزاج کے زیر اثر کتب حدیث کے مخطوطات کی تلاش وجستجو اور ان کی تحقیق وتعلیق میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور تادم واپسیں اس عظیم خدمت کی انجام دہی میں سر تا پا غرق رہے، آپ کی دلی خواہش اور دیرینہ تمنا تھی کہ احادیث نبویہ کے بیش قیمت ذخائر جو اب تک اہل علم کی نگاہوں سے اوجھل ہیں اور منظر عام پر نہیں آ سکے ہیں انہیں دنیا کے مختلف کتب خانوں سے حاصل کر کے تحقیق وتعلیق کے جدید اسلوب پر زیور طبع سے آراستہ کیا جائے اور علمی دنیا کو اس سے روشناس کرایا جائے تا کہ اس کے ذریعہ جہاں ایک طرف ہمارا علمی سرمایہ دست برد زمانہ سے محفوظ ہو کر لائق استفادہ ہو سکے، وہیں دوسری جانب منکرین حدیث کا مسکت جواب بھی دیا جا سکے جو منصوبہ بند طور پر یہ افواہ پھیلانے میں پوری قوت صرف کئے ہوئے ہیں کہ صحاح ستہ کے مصنّفین نے از خود حدیثیں وضع کر کے اپنی کتابوں میں شامل کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ کو حدیث کا کوئی نادر ونایاب مخطوطہ دستیاب ہوتا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی اور فرط مسرت سے جھوم جاتے اور اس کی تحقیق وتعلیق میں بیحد محنت ودیدہ ریزی کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتے، اسی جذبہ دینی اور مزاجی کیفیت کی کارفرمائی تھی کہ آپ نے وسائل کی قلت اور سہولیات کے فقدان کی پرواہ کیے بغیر پوری خاموشی اور کامل یکسوئی کے ساتھ تن تنہا اتنا عظیم وگراں قدر کارنامہ انجام دیا کہ کوئی بڑی سے بڑی اکیڈمی بھی ہزار تعاون اور مطلوبہ سہولیات کی فراہمی کے باوجود بھی اس جامعیت واستحکام کے ساتھ شاید ہی کر پاتی، علامہ اعظمی نے خود ہی ''مسند حمیدی'' کے مقدمہ میں مخطوطات کے تعلق سے اپنے شغف ودلچسپی اور ان کی تحقیق وتعلیق کی ضرورت واہمیت کے تئیں اپنے دلی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے، لکھتے ہیں:

''وكنت أود منذ أعوام أن لو وفق الله أحدا من أهل العلم أن يفتش عما بقي من هذه المسانيد في خزائن الكتب فإن ظفر بشيء منها قام بتصحيحه ونشره، لكان خدمة لا تنسى ومنة في رقاب أهل العلم وكان أيضا دفاعا مجيدا عما رمى به أعداء الحديث مصنفي الصحاح من أنهم وضعوا الأحاديث التي أودعوها كتبهم. كنت أود هذا وكانت هذه الأمنية دائما نصب عيني حتى عثرت على نسخة من مسند الحميدي في مكتبة دار العلوم (بديوبند، الهند) فطرت فرحا وشكرت الله تعالى''۔[2]

[برسوں سے میری خواہش تھی کہ کاش کہ اللہ کسی اہل علم کو توفیق دیتا کہ جو مسانید کتب خانوں میں پڑی ہوئی ہیں وہ انہیں تلاش کرتا اور دستیاب ہونے پر ان کی تصحیح واشاعت کرتا تو یہ ایک ناقابل فراموش خدمت ہوتی اور اہل علم پر ایک احسان بھی ہوتا، نیز دشمنان حدیث کا بہترین جواب بھی ہوجاتا جو یہ کہتے ہیں کی صحاح کے مصنّفین نے حدیثیں وضع کر کے اپنی کتابوں میں شامل کیا ہے، یہ تمنا ہمہ وقت میرے پیش نظر رہتی، یہاں تک کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں مسند حمیدی کا ایک نسخہ دستیاب ہوا اور میں خوشی سے جھوم اٹھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا]۔

علامہ اعظمی کے ذہن ودماغ پر یہ بات اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ اس کا تذکرہ عام دینی مجالس میں بھی اپنے خطاب کے دوران کیا کرتے اور مخطوطہ پر کام کرنے اور اس کو منظر عام پر لانے کی ضرورت واہمیت پر زور دیتے، ایک تقریر میں ''کتاب الزہد والرقائق'' کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

''میں بتانا چاہتا ہوں کہ صحاح ستہ ہماری بنیادی کتابوں میں ہیں، حدیث کا دارومدار انہیں کے اوپر ہے، مگر وہ حدیثیں کن بنیادی کتابوں سے لی گئی ہیں؟ وہ یہ سب کتابیں ہیں، ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کتابوں کو بر سر عام لایا جاتا، تا کہ بعد کی کتابوں کی تصدیق ہوتی، بخاری نے اگر کہا کہ آنحضرت نے ایسا فرمایا، اور میں نے فلاں سے اور اس نے عبداللہ بن المبارک سے سنا، تو اس کتاب کو دیکھ کر اس کی تصدیق ہوسکتی ہے کہ بخاری نے غلط نہیں کہا، اس کتاب میں یہ حدیث موجود ہے، کسی کو یہ کہنے کی جرات نہ ہوتی کہ بخاری نے ایسے ہی گڑھ لیا ہے، جیسا کہ منکرین حدیث کا فرقہ کہتا ہے، ان چیزوں کی نہایت ضرورت تھی، اور یہ حدیث کی ایک بہت عظیم الشان خدمت ہے''۔[3]

اہل علم جانتے ہیں کہ مخطوطہ پر کام کرنا ایک مشقت بھرا عمل ہے، اس کا پڑھنا، اس کی تصحیح کرنا، اگر مٹا ہوا یا کرم خوردہ حصہ ہے تو سیاق وسباق کی روشنی میں اس کا متعین کرنا، دیگر کتابوں کی مراجعت سے اس کی تائید فراہم کرنا اور مشکل وغریب الفاظ کی مناسب تشریح کرنا یہ سب ایسے کام ہیں جو ذہانت وفطانت، استعداد وصلاحیت، قوت حفظ وفہم کے ساتھ ساتھ انتہائی دیدہ ریزی اور بیحد عرق ریزی کا تقاضا کرتے ہیں، جاحظ نے تصحیح متون میں پیش آنے والی گوناگوں مشکلات کے پیش نظر اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور اپنی

شہرہ آفاق تصنیف کتاب الحیوان میں لکھا ہے:

وربما أراد مؤلف الكتاب أن يصلح تصحيفاً، أو كلمة ساقطة، فيكون إنشاء عشر ورقات من حر اللفظ وشريف المعاني، أيسر عليه من إتمام ذلك النقص، حتى يرده إلى موضعه من اتصال الكلام۔[4]

[کبھی ایک مصنف کسی تصحیف یا کسی ساقط کلمے کی اصلاح کرنے بیٹھتا ہے تو اس کے لئے عمدہ الفاظ اور بہتر معانی پر مشتمل دس ورق کا لکھنا، اس نقص کی تلافی کرنے اور متصل ومربوط عبارت میں صحیح لفظ کو اس کے مناسب مقام میں رکھنے سے کہیں آسان ہوتا ہے]

بلاشبہ تحقیق کی گوناگوں دشواریوں سے وہی واقف ہوتا ہے جو اس راہ سے گذرتا ہے اور خدا معلوم کتنی پیچیدہ، مشکل اور سنگلاخ وادیوں سے گذر کر منزل مراد تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے، آپ اگر علامہ اعظمی کے حالات زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں اور ان کے شب وروز کے معمولات کو یکجا کریں تو یہ بات صاف طور پر دکھائی دے گی کہ آپ نے پوری زندگی کتابوں کی ورق گردانی، بحر علم وتحقیق کی غواصی اور مخطوطات کی تلاش وجستجو میں صرف کی ہے اور صلہ وستائش اور صحت وتندرستی کی پرواہ کئے بغیر ان کی تحقیق وتعلیق میں ہمہ تن مصروف رہے ہیں، یہ آپ کا علمی مزاج اور دینی ذوق تھا، جس کے زیر اثر آپ نے احادیث نبویہ کی مبارک خدمت کی انجام دہی میں انتھک محنت کی اور پوری دیدہ ریزی کے ساتھ اس عظیم کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، آپ نے مسند حمیدی کے مقدمہ میں احادیث کی تحقیق وتعلیق کے تئیں اپنی سعی وکوشش کا تذکرہ کرتے ہوئے، لکھا ہے:

''وبذلت غاية جهدي في مراجعة مظان كل حديث حرصا على مزيد التصحيح واعتناء بإتمام ما عسى أن يوجد فيه من نقص واهتماما بتخريج كل حديث وإحالته إلى كتاب آخر من كتب الحديث وعنيت بشرح الحديث ما بدا لي من غريب ألفاظه وإيضاح معنى الحديث حيث رأيت الضرورة داعية إليه''۔[5]

[میں نے ہر حدیث کے امکانی مقامات کے مراجعہ میں بھرپور محنت کی ہے، اس لالچ میں کہ مزید تصحیح ہو سکے، کسی کمی کا احتمال ہے تو اس کو پورا کیا جاسکے، نیز حدیث کی تخریج اور کسی دوسری کتاب کا حوالہ دیا جاسکے، میں نے اپنے اعتبار سے غریب الفاظ حدیث کی شرح کی ہے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو حدیث کے معنی کی توضیح بھی کی ہے]

یوں تو آپ نے یہ بات مسند حمیدی کی تحقیق وتعلیق کے تعلق سے کہی ہے، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ آپ نے اپنی جملہ کتب وتصانیف میں ان امتیازات وخصوصیات کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے، اور یہی صورت حال آپ کی جملہ تحقیقات وتعلیقات میں پورے رنگ وآہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہے، اور اسی معیار تحقیق کے ساتھ آپ نے بہت ساری گراں قدر تصانیف حوالہ قلم کرکے اسلامی کتب خانے میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے، اور یہ سب اس وقت کیا ہے جب کہ اس طرح کی تحقیق وتعلیق کا کام آسان نہ تھا اور نہ اس کا چلن ہی عام تھا، بس خال خال اصحاب علم وتحقیق ہی کتب حدیث کے مخطوطات پر کام کیا کرتے تھے، وہ بھی عرب ممالک میں، ہندوستان میں یہ چیز تقریباً عنقا تھی، تعجب ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن میں تحقیق وتعلیق کا یہ عظیم ونادر خاکہ کیسے پیدا ہوا! اور متعلقہ کتابوں کی فراہمی کی کیا صورت نکلی اور بے سروسامانی کے عالم میں اتنی ساری کتابوں کی تحقیق وتعلیق کا اتنا بڑا کام وہ بھی اعلیٰ معیار کو برتتے ہوئے کیسے کرڈالا، آپ نے مصنف عبدالرزاق (گیارہ جلد)، مصنف ابن ابی شیبہ (تقریباً بارہ جلد)، مسند حمیدی (دو جلد)، کتاب الزہد والرقائق (ایک جلد)، کشف الاستار للبزار (دو جلد)، الحاوی لرجال الطحاوی (ایک جلد)، مختصر الترغیب والترہیب (ایک جلد)، سنن سعید بن منصور (دو جلد)، مسند اسحق ابن راہویہ (دو جلد)، المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیۃ (چار جلد)، تلخیص خواتم جامع الاصول فی بیان الاسماو الکنی والابناء والالقاب والانساب الواردۃ فی الکتب الستۃ (ایک جلد)، فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث (ایک جلد)، اسماء الثقات (ایک جلد)، مجمع بحار الانوار (پانچ جلد)، جیسی اہم ترین کتب احادیث کی تحقیق وتعلیق کا گراں قدر کارنامہ کامل دقت نظری اور پوری دیدہ ریزی کے ساتھ انجام دیا اور اس جامعیت واستحکام اور خوش سلیقگی کے ساتھ یہ کام کیا کہ وقت کے بالغ نظر محققین اس کی مدح وستائش میں رطب اللسان اور آپ کی علمی خدمات کے معترف اور قدر دان ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے ناقد وادیب بھی آپ کے معیار تحقیق اور جمع وترتیب کے جدید اسلوب کو دیکھ کر حیرت زدہ ہیں، لکھتے ہیں:

''حیرت ہوتی ہے، ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہوگئی''۔[6]

علم حدیث میں فن اسماء الرجال کو بہت اہمیت حاصل ہے، اس پر کامل دسترس حاصل کرنے کے لئے قوت حفظ واستحضار کی شدید ضرورت ہوتی ہے، اس کے بغیر اس فن پر قابو پانا نہایت مشکل امر ہوتا ہے، یہ اسی کے بس میں ہوتا ہے جو حفظ واستحضار کی بے بہا دولت سے مالا مال ہو، محدث اعظمی کو اللہ تعالیٰ نے دیگر خصوصیات وامتیازات کے ساتھ حفظ واستحضار اور ضبط واتقان کی اس عظیم نعمت سے سرفراز کیا تھا جس کی بنا پر آپ کو ہر فن کے عموماً اور علم حدیث کے خصوصاً تمام اسرار ورموز اور بنیادی نکات ہمہ وقت مستحضر رہتے اور جب کسی کتاب، مقالہ یا تحریر پر نظر ڈالتے تو اول وہلہ ہی میں اس کی

خوبی وخامی سامنے آجاتی اوران کے لئے اس کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہوجاتا،یہی وجہ ہے کہ ہرمسئلے میں آپ کا نقطہ نظر صاف، واضح اور دلائل سے مزین ہے،مناسب ہوگا کہ فن حدیث کے رموز ونکات سے آپ کی گہری واقفیت کے جاننے کے لئے چند مثالوں پرایک نگاہ ڈال لی جائے تاکہ آپ کے معیارتحقیق وتعلیق، دقت نظری، وسعت معلومات اور اس میدان میں آپ کے مقام ومرتبہ کاتھوڑا بہت اندازہ لگایا جاسکے:

۱-امام بخاری جب کسی راوی کے بارے میں ''فیہ نظر'' یا ''فلان سکتوا عنہ'' کہتے ہیں تو حافظ عراقی، علامہ ذہبی اور بہت سے اہل علم کے یہاں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ امام بخاری یہ الفاظ ان راویوں کے بارے میں کہتے ہیں جن کی حدیث کوعلمانے ترک کردیا ہے،لیکن علامہ اعظمی نے اس مطلب کوعلی الاطلاق تسلیم نہیں کیا ہے، بلکہ اس مطلب کے اختیار کرنے پر اظہار تعجب کیا ہے، اور اپنے عمیق مطالعہ اورفنی مہارت وممارست کی بنا پر بصراحت کہا ہے کہ یہ مطلب حقیقت واقعی کے خلاف ہے اس لئے کہ امام بخاری بہت سے رواۃ کے بارے میں فیہ نظر کہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بہت سے اکابرائمہ حدیث ان کی توثیق کرتے ہیں،علامہ اعظمی اپنے موقف کی وضاحت کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

لا ينقضي عجبي حين أقرأ كلام العراقي والذهبي هذا، ثم أرى أئمة هذا الشأن لا يعبأون بهذا، فيوثقون من قال فيه البخاري: فيه نظر، و يدخلونه في الصحيح [7]

[میرے تعجب کی انتہانہیں رہتی ہے، جب میں عراقی وذہبی کی اس گفتگو کو پڑھتا ہوں، پھر دیکھتا ہوں کہ اس فن کے ائمہ اس کو اہمیت نہیں دیتے، اورجن کے بارے میں امام بخاری فیہ نظر کہتے ہیں ان کی توثیق کرتے ہیں اوراس کوصحیح میں شامل کرتے ہیں]

علامہ اعظمی نے صرف یہ دعوی ہی نہیں کیا ہے، بلکہ اپنے اس موقف کو ثابت کرنے کے لئے بطورمثال گیارہ ایسے راویوں کا نام ذکرکیا ہے، جن کے بارے میں امام بخاری نے ''فیہ نظر'' کہا ہے،مگرمحدثین نے ان کی توثیق کی ہے، آپ نے اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حافظ عراقی کی یہ بات عام نہیں ہے اورنہ علی الاطلاق درست ہے،اس لئے کہ امام بخاری کتنی جگہ یہ بات کہتے ہیں، اوراس فن کے ماہرعلماء ان کی موافقت نہیں کرتے ، لکھتے ہیں:

والصواب عندي أن ما قاله العراقي ليس بمطرد ولا صحيح على إطلاقه، بل كثيرا ما يقوله البخاري، ولا يوافقه عليه الجهابذة، وكثيرا ما يقوله، ويريد به إسنادا خاصا [8]

[میرے نزدیک درست یہ ہے کہ علامہ عراقی کا قول عام نہیں ہے، اور نہ علی الاطلاق صحیح ہے، بلکہ امام بخاری بسا اوقات یہ بات کہتے ہیں اوراس فن کے ماہرین اس سلسلے میں ان کا ساتھ نہیں دیتے، اور بسا اوقات وہ یہ کہہ کر اس سے کوئی خاص سند مراد لیتے ہیں]۔

عالم اسلام کے عظیم عالم ومحقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اپنی تعلیقات میں اس گراں قدرتحقیق کا جابجا تذکرہ کیا ہے، اوراس کی اہمیت پرزور دیا ہے، نیز وقت کے دیگرمحققین نے بھی اپنی کتب وتصانیف میں اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کی افادیت کو واضح کیا ہے، چنانچہ مشہورمحقق اورمعروف عالم دین شعیب ارناؤط نے صحیح ابن حبان کی تعلیق کے ضمن میں ایک موقع پر اس نادرتحقیق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

قلت: وهذه فائدة نفيسة تنبئ عن إمامة هذا الشيخ -حفظه الله ونفع به- بعلم الجرح والتعديل، ودرايته واسعة بقضاياه [9]

[میں نے کہا: یہ بیش قیمت فائدہ ہے،جس سے علامہ اعظمی -حفظہ اللہ ونفع بہ- کی علم جرح وتعدیل میں امامت اوراس علم کے مسائل کی گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے]۔

۲- رجال حدیث کے بارے میں آپ کی دقت نظری کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ کسی روایت کے بارے میں ائمہ حدیث کے حکم کوآپ نے آنکھ بند کرکے تسلیم نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی چھان بین کرکے اگر مطمئن ہوئے توٹھیک،ورنہ مضبوط ومستحکم دلائل کی روشنی میں اس پرمناسب نقد کرکے صحیح صورت حال واضح فرمائی ہے اور جو بات آپ کے نزدیک صحیح ودرست نظرآئی اس کا برملا اظہارکیا ہے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ''ما بين بيتي أو قبري ومنبري روضة من رياض الجنة'' کے رواۃ کے بارے میں علامہ ہیثمی کا خیال ہے کہ وہ ثقہ ہیں، اورانھوں نے مجمع الزوائد میں اس کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے: ''رواه البزار والطبراني في الكبير ورجاله ثقات'' [10]

[اس کی روایت بزار نے اورطبرانی نے الکبیر میں کی ہے اوراس کے رجال ثقہ ہیں]۔

لیکن علامہ اعظمی اس حکم سے مطمئن نہیں ہوئے اورنہ اس کومن وعن تسلیم ہی کیا بلکہ ''کشف الاستار'' کی تحقیق وتعلیق کے دوران اس پرتعاقب کیااورکہا کہ اس میں ایک راوی اسحق بن محمد فروی ہیں جوغیرثقہ ہیں اگرچہ امام بخاری نے ان کی روایت کواپنی کتاب میں ذکرکیاہے، لکھتے ہیں:

قلت: كلا، بل فيه إسحاق بن محمد الفروي وليس بثقة وإن خرج له البخاري [11]

[میں نے کہا: ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس میں اسحق بن محمد الفروی ہیں، جو ثقہ نہیں ہیں، اگرچہ امام بخاری نے ان کی روایت کو نقل کیا ہے]۔

۳-شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ایک محقق عالم، بالغ نظر مصنف اور صاحب طرز ادیب ہیں، آپ نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی تصنیف لطیف ''الرفع والتکمیل'' کی تحقیق وتعلیق کی ہے، اس میں ایک مقام پر تحریف تھی، جس پر شیخ کو تنبہ نہ ہوسکا اور پہلے ایڈیشن میں اس کی اصلاح نہ ہوسکی، جب محدث اعظمیؒ کے مطالعہ میں وہ کتاب آئی تو آپ نے شیخ کو اس پر متنبہ کیا اور اس کی اصلاح ہوئی، ظاہر ہے کہ یہ وہی کرسکتا ہے، جسے اس فن میں مہارت تامہ حاصل ہو، شیخ ابوغدہ خود لکھتے ہیں:

وقع في الأصلين: (أحمد بن شعيب..) وهو تحريف، صوابه: (أحمد بن سعيد بن عقدة) وترجمته في الميزان: ١/٢٦٤، وكنت غفلت عن هذا التحريف في الطبعة الأولى، فنبهني إليه مشكورا من الهند شيخنا العلامة المحدث الكبير مولانا حبيب الرحمن الأعظمي فجزاه الله عني وعن العلم والسنة ورجاله خيرا۔[12]

[دونوں اصل میں احمد بن شعیب ہے، یہ تحریف ہے، صحیح احمد بن سعید بن عقدہ ہے، پہلی طبع میں میں اس سے بے خبر تھا، مجھے اس پر ہندوستان سے ہمارے شیخ محدث کبیر علامہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے متنبہ کیا، اللہ ان کو میری طرف سے، علم حدیث اور رجال حدیث کی طرف سے جزائے خیر دے]۔

شیخ ابوغدہ نے اپنی کتب وتصانیف اور تعلیقات وحواشی میں آپ کی اس طرح کی بہت سی تصویبات کا حسب موقع تذکرہ کیا ہے، اور شکریہ کے ساتھ ان کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا ہے، جس سے محدث اعظمی کی عبقریت، دقت نظری اور تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے کہ باریک سے باریک خامی کا بھی آپ کی نگاہ سے بچ کے نکل جانا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

علامہ اعظمی کو اس لحاظ سے تو ہر شخص جانتا ہے کہ رجال حدیث پر آپ کی نگاہ بڑی گہری اور گرفت بہت مضبوط تھی، لیکن اس کے صحیح علم وادراک کے لئے ضروری ہے کہ آپ کی تحقیقات وتعلیقات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے، اور ان رموز ونکات کے پالینے کی سعی بلیغ کی جائے، جنھیں علامہ اعظمی نے اپنی کتب وتصانیف میں سمو رکھا ہے، اور دیکھا جائے کہ آپ نے یہ عظیم کارنامہ کس باریک بینی اور کمال دقت نظری سے انجام دیا ہے، جب ایک قاری دوران مطالعہ دیکھتا ہے کہ بسا اوقات آپ ایک غلطی کی تصحیح محض اپنے ذوق ووجدان سے کرتے ہیں اور تلاش وجستجو کے بعد دوسری کتب رجال سے اس کی تائید ہوجاتی ہے تو اسے آپ کی عبقریت وتبحر علمی کا کامل اذعان ہوجاتا ہے، جیسا کہ علامہ اعظمی نے مسند حمیدی کی تحقیق وتعلیق کے دوران ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ اصل میں تو ''عن ابیه'' ہے لیکن میرے خیال میں صحیح ''عن أمه'' ہے، اولاً آپ نے اپنے وجدان کے مطابق اس کی تصحیح کردی، پھر جب طحاوی کی ذکر کردہ روایت سے اس کی تائید ہوئی تو اس پر اللہ کا شکر ادا کیا، لکھتے ہیں:

''في الأصول عن أبيه، والصواب عندي عن أمه واسمها مرجانة تروي عن عائشة، ويروي عنها ابنها علقمة، كما في التهذيب وغيره، علقت هذا وما قبله بشهادة الوجدان، ثم وجدت الطحاوي قد أخرج الحديث من طريق أبي الزناد عن علقمة بن أبي علقمة عن أمه فالحمد لله''۔[13]

[اصول میں ''عن ابیہ'' ہے مگر صحیح میرے نزدیک عن ''امہ'' ہے، ان کا نام مرجانہ ہے، عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں، اور ان سے ان کے صاحبزادے علقمہ روایت کرتے ہیں، جیسا کہ تہذیب وغیرہ میں ہے، یہ اور اس سے پہلے کا حاشیہ میں نے اپنے وجدان کی بنا پر لکھ دیا تھا، پھر میں نے طحاوی کو دیکھا کہ انہوں نے اس حدیث کو ابوالزناد عن علقمہ بن ابی علقمہ عن امہ کے طریق سے نقل کیا ہے، فللہ الحمد]۔

مولانا زین العابدین اعظمی سابق شیخ الحدیث جامعہ مظہر العلوم بنارس، اس مقام پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غور کیجئے کہ کس قدر عظیم ملکہ کی بات ہے کہ آباء سے نقل کرنے والے تو بہت سے محدثین ہیں، لیکن امہات سے نقل کرنے والے معدودے چند ہیں جیسے منصور بن صفیہ وغیرہ، لیکن اس عظیم محدث نے صرف ذوق کی بنیاد پر عن ابیہ کی غلطی کو حاشیہ پر درست کرکے عن امہ بنا دیا، پھر برابر تتبع میں رہے، یہاں تک کہ جب طحاوی کے طریق میں عن امہ مل گیا تب اصل میں تصحیح کیا''۔[14]

اسی طرح علامہ اعظمی نے مصنف عبدالرزاق کی تحقیق کے دوران ایک جگہ اپنی جانب سے بریکٹ میں (إلا) کا اضافہ کیا اور بعد میں آپ کو مصنف کے طریق سے بیہقی میں ایک روایت ملی جو بعینہ مولانا کی تحقیق کے مطابق ہے، لکھتے ہیں:

''إضافة من عندي، يدل عليه أن في ''ش'' من طريق شريك عن الجزري ثم قرأ (ولا جنبا إلا عابري سبيل) قال لا يمر في المسجد إلا أن لا يجد طريقا غيره ص٩٨، ثم وجدت الرواية في ''هق'' من طريق المصنف وفيه كما حققت، راجع ''هق'': ٢/٤٤٣)۔[15]

[یہ میری جانب سے اضافہ ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں شریک عن الجزری کے طریق سے ہے کہ پھر آپ نے (ولا جنبا

اِلا عابری سبیل) پڑھا، کہا مسجد میں نہ گذرے الایہ کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ ہو، ص ۹۸، پھر مجھے یہ روایت بیہقی میں مصنف کے طریق سے ملی جس میں بعینہ وہی ہے جو میں نے تحقیق کی ہے، دیکھئے بیہقی: ۲/ ۴۴۳]

علامہ اعظمی کی ایک اہم تصنیف ''الحاوی لرجال الطحاوی'' ہے، جو تقریبا ۲۹/ سال کی عمر میں سپرد قلم ہوئی ہے، مگر ابتدائی ایام کی اس تصنیف کے دیکھنے سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رجال حدیث پر آپ کی گرفت اس وقت بھی بہت مضبوط تھی، اس لئے کہ آپ نے اس میں بھی بہت سی جگہوں پر اپنے گمان کی بنا پر تصحیح کی ہے اور بعد میں دوسری جگہ سے اس کی تائید ہوئی ہے، چنانچہ علامہ اعظمی نے ''علی بن مر'' کے بارے میں لکھا کہ:

''علی بن مر، لعل الصواب: عمرو بن مر، هو الجملي، كنت كتبت هذا ظنا مني، ثم راجعت مسند الطيالسي فوجدت فيه هكذا، فالحمد لله حمدا كثيرا.''[16]

[علی بن مر، شاید کہ درست، عمرو بن مر الجملی ہے، میں نے یہ اپنے گمان سے لکھ دیا تھا، پھر مسند طیالسی سے مراجعت کی تو اس میں اسی طرح ملا، الحمدللہ حمدا کثیرا]۔

اسی طرح امام طحاوی کے شیخ احمد بن عبدالرحمٰن کے سلسلے میں ان کے سلسلہ نسب کی صراحت اپنے طور پر کی پھر اس کی صراحت طحاوی ہی میں دوسری جگہ ملی، لکھتے ہیں:

''أحمد بن عبد الرحمن شيخ الطحاوي، هو ابن وهب بن مسلم المصري، قلت: قد عينته من عند نفسي بأنه ابن وهب، ثم رأيت الطحاوي قد صرح به في مكان آخر.''[17]

[طحاوی کے شیخ احمد بن عبدالرحمٰن، ابن وہب بن مسلم مصری ہیں، میں نے کہا: ابن وہب کی تعیین میں نے اپنی طرف سے کی تھی پھر میں نے دیکھا کہ طحاوی نے اس کی دوسری جگہ صراحت کی ہے]۔

اسی طرح آپ نے مصنف عبدالرزاق کی تحقیق کے دوران متعدد مقامات پر بہت سی باریک خامیوں کی اصلاح کی ہے، جن پر عام کیا خاص لوگ بھی کم ہی متنبہ ہو پاتے ہیں، مثلا آپ نے ''عبد الرزاق عن ابن عيينة عن أبي سنان عن الضحاك'' پر حاشیہ لکھتے ہوئے ایک باریک خامی کی وضاحت کی ہے، کہ اصل نسخہ میں ''ضحاك بن مسعود'' ہے جو کاتب کی سبقت قلمی کے سبب ایسا ہو گیا ہے، لیکن صحیح ''ضحاک ان ابن مسعودؓ'' ہے:

في الأصل ''الضحاك بن مسعود''، وهو من سبق قلم الناسخ، والصواب ''عن الضحاك أن ابن مسعود''، كما في ''ش'' وهو الضحاك بن عبد الرحمن بن عزرب، من رجال التهذيب''.[18]

[اصل نسخہ میں ''الضحاک بن مسعودؓ'' ہے، اور یہ کاتب کی سبقت قلمی ہے، صحیح ''عن الضحاک ان ابن مسعودؓ'' ہے، جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ اور یہ تہذیب والے ضحاک بن عبدالرحمٰن بن عزرب ہیں]۔

اسی طرح محدث اعظمی نے حسب عادت دارمی کی ایک سند ''عن حماد بن خالد عن العمری (عبداللہ) عن عبیداللہ'' کے بارے میں وضاحت کی کہ ''العمری'' سے مراد ''عبداللہ'' ہیں، اور اس کتاب کے ناشر و مصحح نے جو ''العمری عبیداللہ'' کر دیا ہے وہ درست نہیں ہے، یا تو یہ نسخہ کی غلطی ہے جس پر اس کو تنبہ نہ ہو سکا یا ناسمجھی میں خود غلطی کر بیٹھا، لکھتے ہیں:

أخرجه الدارمي من طريق المصنف، وش عن حماد بن خالد عن العمري (عبد الله) عن عبيد الله بن عمر و: ۱/۵۵- ولكن ناشر الكتاب وهو القائم بتصحيحه لم يتنبه على الغلط في نسخته أو كان في نسخته على الصواب فحرفه وطبعه ''عن العمري عبيد الله''، والحال أن حماد بن خالد إنما يروي عن عبد الله.[19]

[دارمی نے اس کی تخریج مصنف اور ابن ابی شیبہ کے طریق سے عن حماد بن خالد عن العمری (عبداللہ) عن عبیداللہ بن عمرو: ۱/ ۵۵- نقل کیا ہے لیکن کتاب کے ناشر کو جب کہ وہی اس کے مصحح بھی ہیں اس کے نسخہ کی غلطی پر تنبہ نہیں ہوا یا نسخے میں صحیح تھا اور اس کو ''عن العمری عبیداللہ'' کر کے شائع کر دیا، جب کہ حماد بن خالد صرف عبداللہ ہی سے روایت کرتے ہیں]۔

اہل علم و دانش اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بحث و تحقیق کے میدان میں محدث اعظمی کا یہ بھی ایک زندہ جاوید کارنامہ ہے کہ جب مصر کے عظیم محدث احمد محمد شاکر نے ۱۳۶۵ھ میں مسند احمد پر تحقیق و تعلیق کا عظیم کام انجام دیا، تو تیسری جلد میں ازراہ اخلاص دنیا کے تمام علماء حدیث کو دعوت نقد و نظر دی، تاکہ کہیں سے کوئی کمی یا خامی باقی نہ رہ جائے، لکھتے ہیں:

ثم إني أتوقع أن يعني إخواني علماء الحديث في أقطار الأرض بأن يرسلوا إلي كل ما يجدون من ملاحظة أو استدراك أو تعقيب أو بحث في أحاديث المسند، كلما وصل إليهم جزء من أجزائه، وستكون هذه الملاحظات منهم موضع العناية والدرس، ثم سأثبت ما ينتهي إليه فيها البحث، فيما سيأتي من الأجزاء إن شاء الله منسوبا كل منها إلى المتفضل على به.''[20]

[میں امید کرتا ہوں کہ تمام دنیا کے علماء حدیث اس بات پر توجہ دیں گے کہ جیسے جیسے اس کتاب کی جو جلد بھی ان کے پاس پہونچے گی اس پر اپنی رائے یا استدراک یا نقد یا مسند کی احادیث میں کوئی بحث میرے پاس لکھ بھیجیں گے، ان کے ملاحظات کو در خور اعتنا سمجھا جائے گا اور آئندہ جلدوں

میں انشا اللہ اس کے بھیجنے والے کی جانب منسوب کر کے شامل کتاب کیا جائے گا]۔

شیخ احمد محمد شاکر کی جانب سے استدراک وتعقیب کی یہ مخلصانہ دعوت، مسند احمد کی تیسری جلد میں ۸ / شوال ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۴ / اگست ۱۹۴۷ء کو دی گئی جس کو محدث اعظمی نے نہایت سنجیدگی سے لیا اور مسند احمد کی دستیاب ۸ / جلدوں کا ناقدانہ مطالعہ کیا اور جگہ جگہ اپنے استدراکات قلم بند کر کے ۲۶ / ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ کو محدث نیل کے پاس ارسال کر دیا، جس کا انہوں نے مسند احمد کی پندرہویں جلد میں ذکر کیا ہے اور آپ کے کمال علم وفضل کا بھر پور اعتراف کیا ہے، لکھتے ہیں:

”ثم جاءني كتاب من أخ عالم كريم، لم يكن لي شرف معرفته من قبل، وقد عرفت من كتابه فضله وعلمه وتحققه بالبحث الدقيق، وكتابه هذا مؤرخ ۲۶/ذي القعدة سنة ۱۳۷۵ھ، وطواه على استدراكات، وتعقيبات دقيقة من الجزء الأول إلى الجزء الثامن، هذا الأخ العلامة: هو الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي خادم الحديث في جامعة مفتاح العلوم (مئو-أعظم جراه) سابقا وعضو المجلس النيابي في إمارة الإيالة الشمالية من الهند حالا۔“[21]

[پھر میرے پاس ایک بڑے عالم کا ایک خط آیا، جن سے میری پہلے سے کوئی شناسائی نہیں تھی، میں نے ان کے خط سے ہی ان کے علم وفضل اور دقت بحث پر ان کی گرفت کو جانا، یہ خط مورخہ ۲۶ / ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ کا ہے، جو پہلی جلد سے آٹھویں جلد تک کے دقیق استدراکات وتعقیبات پر مشتمل ہے، یہ عالم، جامعہ مفتاح العلوم مئو کے سابق استاذ حدیث اور یوپی کے موجودہ ایم، ایل، اے، علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی ہیں]۔

شیخ احمد محمد شاکر کو علم وتحقیق سے بھرے ہوئے اس محدثانہ خط سے بیحد خوشی ومسرت حاصل ہوئی اور آپ کو شکریہ کا خط لکھا نیز حسب وعدہ پوری فراخ دلی کے ساتھ علامہ اعظمی کے استدراکات کو اپنی کتاب میں ”قال الأعظمي“، کے عنوان سے شامل کیا، اور آپ کی دقت نظری سے متاثر ہو کر جگہ جگہ بے ساختہ مدح وستائش کی اور ان کے لئے دعا خیر کی، اس سے جہاں محدث اعظمی کی دقت نظری اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں محدث مصر کی علم دوستی اور وسعت ظرفی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

محدث اعظمی نے حدیث اور رجال حدیث کے تعلق سے جہاں بھی کوئی کمی یا خامی دیکھی اس کی اصلاح کے لئے پورے طور پر فکر مند ہو گئے، کسی کی شہرت وشخصیت سے قطعا متاثر یا مرعوب نہیں ہوئے بلکہ علم وتحقیق کا حق پوری دیانت وامانت کے ساتھ ادا کر کے امت کی صحیح رہنمائی کی، چنانچہ جب آپ نے دیکھا کہ شیخ البانی اپنی تمام تر خصوصیات وامتیازات اور لائق صد تحسین خدمات کے باوصف بہت سے اکابر ائمہ حدیث پر بے جا تنقید کرنے میں کچھ زیادہ ہی بے باک ہیں، توضروری سمجھا کہ ان کے علمی تسامحات کی بھی واضح طور پر نشاندہی کر دی جائے تاکہ وہ بھی اپنی فروگذاشتوں سے مطلع ہو کر اپنا محاسبہ کر سکیں اور جو لوگ ان کے بلند بانگ دعووں سے متاثر ہو کر دانستہ یا نادانستہ طور پر ان کے ہم نوا ہو گئے ہیں انہیں بھی سوچنے سمجھنے کا موقع فراہم ہو جائے، علامہ اعظمی شیخ البانی کی مزاجی کیفیت اور اس کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

الشيخ ناصر الدين الألباني شديد الولوع بتخطئة الحذاق من كبار علماء الإسلام، ولا يحابي في ذلك أحدا كائنا من كان، فتراه يوهم البخاري ومسلما، ويغلط ابن عبد البر وابن حزم وابن تيمية والذهبي وابن القيم وابن حجر والصنعاني والشوكاني، ويكثر من ذلك، حتى يظن الجهلة والسذج من العلماء أن الألباني نبغ في هذا العصر نبوغا يندر مثله۔[22]

[شیخ ناصر الدین البانی کو ماہر فن اکابر علمائے اسلام کو غلط قرار دینے میں کافی دلچسپی ہے، اس سلسلے میں وہ کسی کو نہیں بخشتے، خواہ وہ کوئی ہو، آپ دیکھیں گے کہ وہ بخاری ومسلم کو واہم بتاتے ہیں، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابن تیمیہ، ذہبی، ابن قیم، ابن حجر، صنعانی اور شوکانی کی تغلیط کرتے ہیں، اور ایسا بہت کرتے ہیں، یہاں تک کہ ناواقف اور سادہ لوح علماء یہ سمجھنے لگے ہیں کہ البانی عصر حاضر کے ایک نادرونایاب عالم ہیں]۔

نیز یہ بھی دیکھا کہ شیخ البانی کو اپنے علم وتحقیق پر اس درجہ کامل اعتماد ہو گیا ہے کہ دوسرے اکابر ائمہ حدیث کی نقل کردہ احادیث پر بہت اعتماد نہیں کرتے ہیں اور لوگوں کو صرف اپنی تحقیق شدہ صحیح احادیث پر عمل کرنے کی نصیحت کرتے ہیں، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ کی کتاب ”الکلم الطیب“ کے بارے میں لکھتے ہیں:

أنصح لكل من وقف على هذا الكتاب (الكلم الطيب لابن تيمية) وغيره أن لا يبادر إلى العمل بما فيه من الأحاديث إلا بعد التأكد من ثبوتها، وقد سهلنا له السبيل إلى ذلك بما علقنا عليه، فما كان ثابتا منها عمل به...... وإلا تركه۔[23]

[ہر اس شخص کے لئے جو اس کتاب (الکلم الطیب لابن تیمیہ) وغیرہ سے واقف ہو میری نصیحت ہے کہ جب تک کہ اس کی احادیث کے ثبوت کا یقین نہ ہو جائے ان پر عمل کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لے، میں نے اس پر اپنی تعلیقات کے ذریعہ اس کا راستہ آسان کر دیا ہے، لہٰذا جو حدیث ثابت ہو اس پر عمل کرے، ورنہ چھوڑ دے]۔

پھر شیخ البانی کا یہ خیال صرف علامہ ابن تیمیہ کے بارے میں نہیں ہے بلکہ دیگر ائمہ حدیث کے تعلق سے بھی ان کا نقطہ نظر یہی ہے، علامہ اعظمی لکھتے ہیں:

ولیس هذا الأمر من الألباني مقصورا على كتب ابن تيمية، بل هو عام شامل لأكثر كتب الحديث، فقد صرح أن واقع حال أكثر كتب الحديث، فضلا عن غيرها، أن فيها ما لا يثبت نسبته إلى النبي صلى الله عليه وسلم، بل وما هو موضوع(صحيح الكلم الطيب ص ۴)۔[۲۴]

[البانی کا یہ معاملہ صرف ابن تیمیہ کی کتابوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ اکثر کتب حدیث کے بارے میں ان کا یہی رویہ ہے، انھوں نے بصراحت کہا ہے کہ دیگر کتابوں کو تو چھوڑیئے اکثر کتب حدیث کا یہ حال ہے کہ: ان میں ایسی باتیں موجود ہیں جن کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ثابت نہیں ہے، بلکہ وہ موضوع ہیں]۔

اس صورت حال کے پیش نظر علامہ اعظمی نے شیخ البانی کی بہت ساری فروگذاشتوں کی نشاندہی کر کے علمی دنیا کے سامنے واضح کر دیا ہے کہ ایک دو نہیں نہ جانے کتنے مقامات پر شیخ البانی سے بھی بشری تقاضے کے تحت لغزشیں ہوئی ہیں، اور بعض تو ایسی فاش چوک ہوئی ہے کہ اس پر بیحد تعجب ہوتا ہے، دیکھئے، حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت میں ہے:

"قال فلانة تصلي المكتوبة وتصدق بأثوار (من الأقط) ولا تؤذي أحدا، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: هي من أهل الجنة"

[کہا: فلاں عورت فرض نماز پڑھتی ہے، پنیر کے ٹکڑے صدقہ کرتی ہے، کسی کو ایذا نہیں پہنچاتی، آپ نے فرمایا: یہ جنتی ہے]۔

شیخ البانی نے "تصدق بأتوار من الأقط" پڑھا اور اسی کے مطابق اس کی تشریح کی جو درست نہیں ہے، علامہ اعظمی نے اس پر گرفت کی اور کہا:

إنه يقرأ "تصدق بأتوار من الأقط" ويفسره هكذا (أتوار) جمع تور بالمثناة الفوقية: إناء من صفر (الصحيحة: ۲/۱۶۱) وآحاد الطلبة يعرفون أن الصواب "بأثوار من الأقط" والأثوار جمع الثور، وهو قطعة من الأقط، كما في النهاية: ۱/۱۶۳۔[۲۵]

[یہ "تصدق باتوار من الاقط" پڑھتے ہیں اور اسی کے مطابق اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ "اتوار" "تور" کی جمع ہے، جس کے اوپر دو نقطے ہیں، پیتل کا برتن (الصحیحہ: ۲/۱۶۱) جب کہ بہت سے طلبہ جانتے ہیں کہ صحیح "باثوار من الاقط" ہے، "اثوار" ثور کی جمع ہے، جس کا معنی ہے پنیر کا ٹکڑا، جیسا کہ "النہایہ: ۱/۱۶۳" میں ہے]۔

تعجب ہوتا ہے کہ شیخ البانی سے یہ چوک کیسے ہوگئی جب کہ حدیث کی متداول شرح "مرقاۃ المفاتیح" میں ملا علی قاری نے اس کی بصراحت وضاحت کی ہے، لکھتے ہیں:

"(الأثوار) جمع ثور بالمثلثة وهي قطعة من الأقط، ذكره الجوهري"۔[۲۶]

[اثوار، ثور کی جمع ہے جس کے اوپر تین نقطہ ہے، یہ پنیر کا ایک ٹکڑا ہے، جوہری نے اس کا ذکر کیا ہے]۔

اسی طرح شرح معانی الآثار کی ایک حدیث "أن النبي صلى الله عليه وسلم مر بأرض تسمى عزرة، فسماها خضرة" کے لفظ "عزرة" کے بارے میں شیخ البانی نے کہا کہ شاید کہ "عذرة" صحیح ہے، لکھتے ہیں:

تنبيه: "عزرة" كذا في الطحاوي بالزاي، وفي المجمع "عذرة" بالذال ولعله الصواب۔[۲۷]

[تنبیہ "عزرة" طحاوی میں اسی طرح زاء کے ساتھ ہے، اور مجمع الزوائد میں "عذرة" ذال کے ساتھ ہے، شاید کہ یہی درست ہے]

علامہ اعظمی نے کہا کہ شیخ البانی کا یہ خیال درست نہیں ہے، صحیح "غدرة" ہے، جیسا کہ علامہ ابن اثیر جزری نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر" میں اس کی صراحت کی ہے، علامہ اعظمی لکھتے ہیں:

"قلت: بل الصواب غدرة بالمعجمة في أولها والمهملة بعدها كما في النهاية، قال ابن الأثير: كأنها كانت لا تسمح بالنبات أو تنبت ثم تسرع إليه الآفة فشبهت بالغادر لأنه لا يفي"۔[۲۸]

[میں نے کہا: بلکہ درست "غدرة" ہے، غین اور دال کے ساتھ، جیسا کہ "نہایہ" میں ہے، ابن اثیر نے کہا: گویا کہ اس زمین میں پودا اگتا ہی نہیں، یا اگتا ہے مگر جلد ہی اس کو کوئی عارضہ لگ جاتا ہے، اسی وجہ سے اس کو غدار سے تشبیہ دیدی گئی، اس لئے کہ وہ وفادار نہیں ہوتا]۔

بہرحال جب علامہ اعظمی نے شیخ البانی کی یہ اور اس طرح کی بہت ساری فروگذاشتوں پر مضبوط گرفت کر کے علمی دنیا کو اس بات سے روشناس کرایا کہ بحث وتحقیق کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے، اور کسی شخص کا اپنے علم وتحقیق کو حرف آخر سمجھنا زمینی حقیقت کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے تو دیکھا گیا کہ اس سے اصحاب بحث وتحقیق کو حوصلہ ملا اور شیخ کے تسامحات وتناقضات پر بہت سی اہم کتابیں مرتب ہو کر منظر عام پر آئیں، یہ علامہ اعظمی کی علمی گرفت کا ثمرہ تھا کہ اس سے بحث وتحقیق کی خوشگوار فضا قائم ہوئی اور دعوی ہمہ دانی کا زور ٹوٹا۔

اہل علم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آپ کا دائرۂ تحقیق صرف مخطوطات تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ دیگر تمام علمی موضوعات پر آپ کو یکساں

قدرت حاصل تھی، اور ہر میدان میں آپ کا اشہب قلم معیار تحقیق کی بلندیوں سے ہوکر گذرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتب وتصانیف کی طرح مقالات میں بھی وہی شان بحث وتحقیق پورے طور پر نمایاں ہے، آپ نے حسب ضرورت بہت سے مقالات سپرد قلم کئے ہیں، جن میں سے کچھ تو وقت کے موقر رسائل ومجلّات میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر اصحاب علم وفضل سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اور کچھ بشکل مسودات آپ کے ذخیرہ علمی میں محفوظ رہ گئے تھے جو بعد میں کتابی صورت میں طبع ہوکر منظر عام پر آئے، یہ مقالات عموماً کسی علمی مسئلے کی تحقیق، کسی مستند صاحب قلم کے تسامحات کی نشاندہی، کسی مسئلے میں دو اہل علم کے درمیان اختلاف رائے ہونے کی صورت میں محاکمہ، اور کسی علمی مسئلے کے اہم پہلو پر توجہ دلانے کی غرض سے لکھے گئے ہیں، جن کے لفظ لفظ سے تحقیق وتفتیش کی روشنی پھوٹتی ہے اور اصحاب بحث وتحقیق کے لئے مشعل راہ بنتی ہے، آپ مقالات ابوالمآثر کی صرف تیسری جلد ہاتھ میں لیں اور سرسری طور پر اس کی ورق گردانی کریں تو معلوم ہوگا کہ آپ نے اس میں سید سلیمان ندوی کے حکم سے سیرۃ النبی کی بعض احادیث کی اعلیٰ تحقیق کی ہے، زراعت وجاگیرداری کے مسئلے میں مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی کے درمیان اختلاف رائے ہونے پر ایک فاضلانہ محاکمہ سپرد قلم کیا ہے، الذخائر والتحف کے مصنف کی تعیین میں قاضی اطہر مبارکپوری اور ڈاکٹر حمید اللہ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا کہ وہ باپ ہیں یا پوتا تو اس موقع پر بھی آپ نے ایک نہایت اہم اور چشم کشا محاکمہ حوالہ قلم کیا ہے، مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے ایک مضمون پر عربی زبان وادب کی روشنی میں ایک اہم تنقیدی مقالہ ہے، رجال السند والہند پر ایک مفید ناقدانہ گفتگو ہے، مولانا سید محمد میاں صاحب کی کتاب عہد زریں پر خود ان کے اصرار پر ایک جامع اور پر مغز تبصرہ کیا ہے، الدرایہ فی تخریج الہدایہ کے ایک نادر نسخے کی نشاں دہی ہے، حد تو یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کے انتقال پر لکھے گئے آپ کے قطعہ تاریخ پر بغرض اصلاح قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کی ایک جزوی ترمیم کا علامہ اعظمی کی جانب سے فنی جائزہ لیا گیا ہے جو علامہ اعظمی کی فن عروض پر گہری گرفت کا آئینہ دار ہے، یہ اور اس طرح کے خالص علمی مسائل پر آپ نے علم وفن اور بحث وتحقیق کے جو لعل وگہر بکھیرے ہیں، قابل دید ہیں اور اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے، تاکہ اس سے جہاں ایک طرف علم وتحقیق کا بیش بہا خزانہ حاصل ہو سکے، وہیں دوسری طرف علامہ اعظمی کی عبقریت، دقت نظری، وسعت مطالعہ، تبحر علمی، اور محدثانہ محققانہ مقام ومرتبہ کا صحیح اندازہ بھی ہوسکے، الغرض آپ کی کتب وتصانیف، مقالات ومضامین اور تحقیقات وتعلیقات کے مطالعہ سے یہ بات پورے طور پر عیاں ہوجاتی ہے کہ آپ کو تفسیر وحدیث، فقہ وادب، تاریخ وسیر اور دیگر متداول دینی علوم وفنون پر پورے طور پر قدرت حاصل تھی، یہ اور بات ہے کہ آپ نے حدیث ورجال حدیث، اور مخطوطات کی تحقیق وتعلیق کو علمی سرگرمی کا میدان بنایا اور تادم واپسیں اسی عظیم کام میں اپنے کو ہمہ تن مصروف رکھا، اور اسی حیثیت سے علمی دنیا میں ''محدث کبیر ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی'' کے نام سے مشہور ومتعارف ہوئے۔ اور عرب وعجم کی عبقری شخصیات نے آپ کی علمی عظمت وجلالت کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

حواشی

۱- ترجمان الاسلام: ۳۳
۲- مقدمہ مسند الحمیدی: ۱/ ۲
۳- خطبات ابوالمآثر: ۱۹۹
۴- کتاب الحیوان: ۱/ ۵۵
۵- مقدمہ مسند الحمیدی: ۱/ ۵-۴)
۶- صدق جدید لکھنؤ: ۱۲/ اگست ۱۹۶۸ء بحوالہ ترجمان الاسلام: ۱۵۸
۷- قواعد فی علوم الحدیث: ۱۵۶- ۱۵۵
۸- قواعد علوم الحدیث: ۱۵۶- ۱۵۵
۹- صحیح ابن حبان: ۴/ ۳۹۲)
۱۰- مجمع الزوائد: ۴/ ۹
۱۱- کشف الاستار: ۲/ ۵۶
۱۲- الرفع والتکمیل: ۳۵۰)
۱۳- مسند حمیدی: ۲/ ۱۰۳
۱۴- ترجمان الاسلام: ۱۰۰
۱۵- مصنف عبدالرزاق: ۱/ ۴۱۲
۱۶- الحاوی لرجال الطحاوی: ۲۷۶
۱۷- الحاوی لرجال الطحاوی: ۵
۱۸- مصنف عبدالرزاق: ۱/ ۲۴۱
۱۹- مصنف عبدالرزاق: ۱/ ۲۵۴
۲۰- مسند احمد: ۳/ ۳۶۵
۲۱- مسند احمد: ۱۵/ ۲۵۱
۲۲- الالبانی، شذوذہ واخطاءہ: ۱/ ۹
۲۳- صحیح الکلم الطیب ص ۴
۲۴- الالبانی شذوذہ واخطاءہ: ۱/ ۴۰
۲۵- الالبانی شذوذہ واخطاءہ: ۱/ ۱۰
۲۶- مرقاۃ: ۸/ ۳۱۲۶
۲۷- سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ: ۱/ ۴۱۹
۲۸- الالبانی شذوذہ واخطاءہ: ۱/ ۱۲،

حضرت ابوالمآثر محدّث اعظمیؒ اور دفاعِ صحابہؓ

ضیاء الدین قاسمی ندوی★

اقبال سہیل جیسے مایہ ناز ادیب وشاعر نے خطۂ اعظم گڈھ کی علمی عظمت اور امتیازی حیثیت کو اپنے اس شعر میں فصاحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کر دیا ہے یہ ان کی قادر الکلامی کا ثبوت تو ہے ہی خطۂ اعظم گڈھ کی ایک ایسی حقیقت ہے جس میں ذرہ برابر مبالغہ آرائی بھی نہیں ہے، فرماتے ہیں:

اس خطۂ اعظم گڈھ پر مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

شعر وادب میں تو خود اقبال سہیل کی اپنی ذات تھی جو فن شاعری کی دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے اور تاریخ نویسی وسیرت نگاری، انشاء پردازی میں علامہ شبلی نعمانی اور ان کے شہرہ آفاق تلامذہ تھے جب کہ اعظم گڈھ شہر کے مشرقی قصبات میں مبارکپور میں اگر آسمان علوم ومعرفت میں نیر اعظم بن کر درخشانی کرنے والی شخصیات مولانا عبد الرحمٰن صاحب مبارکپوری، مولانا عبید اللہ صاحب مبارکپوری، مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری اور مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری تھے تو مئو شہر (جو بعد میں ضلع بنا ہے) کے افق پر نمودار ہو کر دمکنے والے اور خورشید مبین بن کر چمکنے والے نفوس قدسیہ کا ایک سلسلۃ الذہب قائم تھا، جن میں حضرت مولانا عبد الغفار صاحب مئو، ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی، محدث شہر حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی، مجاہد ملت خطیب الاسلام مولانا عبد اللطیف صاحب نعمانی، ڈاکٹر مصطفی الاعظمی، حضرت مولانا ضیاء الحسن صاحبؒ مئوی سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء، ترقی پسند شاعر فضا ابن فیضی کو دنیائے علم وادب میں جو شہرت وعزت حاصل ہوئی وہ تاریخ کا زریں باب ہے، جب کہ باحیات بلند مرتبہ شخصیت ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن صاحب الاعظمی الندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ذات گرامی ایک مستند ومعتبر ادیب وخطیب کی حیثیت سے دیار عرب میں (اہل مئو کے حق میں ہی نہیں بلکہ اہل ہند کے حق میں قابل فخر) قدر ومنزلت کی بلندیوں پر فائز ہے۔

ان بلند مرتبت شخصیات میں جو وقار وتمکنت اور عزت وشہرت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوالمآثر محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی (۱۹۰۱-۱۹۹۲ء) کو عطا فرمائی وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوئی اور دین حنیف کی حفاظت وصیانت، سنت رسول کی ترویج واشاعت، فن حدیث کی نقاحت وخدمت کا عظیم کام جس قدر وسیع پیمانہ پر اللہ نے حضرت محدث اعظمی نور اللہ مرقدہ سے لیا وہ خال خال محدثین وفقہاء کی قسمت میں ہوتا ہے۔

حضرت ابوالمآثر رحمۃ اللہ علیہ ذہانت وفطانت اور قوت حافظہ میں آیۃ من آیات اللہ تھے، تمام مروجہ علوم وفنون میں جو عربی مدارس ومعاہد میں رائج ہیں ان کو درک ورسوخ حاصل تھا، علم وتحقیق کی دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے اور خاص طور پر ان کا میدان کار فن حدیث اور اسماء الرجال تھا، ان کے ہم عصر محدثین عظام اور علماء عرب وشام نے حضرت محدث اعظمی کو اپنے عہد وزمانہ کا ذہبی وابن حجر عسقلانی لکھا ہے، احادیث رسولؐ کی تحقیق وتخریج میں منصب امامت پر فائز ہونے کا اعتراف مصر وشام، عراق وسعودی عرب کے علماء حدیث نے فراخدلی سے کیا ہے اور ان کو امیر المومنین فی اسماء الرجال کہا ہے، رواۃ حدیث کی تعدیل وتجریح میں ان کی عظمت شان کا لوہا طوعاً یا کرہاً اس میدان کے شہسواروں نے مانا ہے۔

حضرت ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ ان نفوس قدسیہ میں تھے جن کو قرون وسطیٰ کے محدثین ومحققین کے کاروان عزیمت ودعوت کا بچھڑا ہوا فرد کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی، جس کو اللہ رب العزت نے بیسویں صدی کے باطل فرقوں کی بیخ کنی، اور گمراہ جماعتوں کی ریشہ دوانیوں کے سد باب کے لیے سنت وحدیث کے قصر متین کا محافظ وپاسبان بنا کر پیدا کیا تھا، خاص کر گستاخان رسالت اور ناموس صحابہ پر حملہ آور ہونے والے روافض ونواصب کے لیے محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود سعید برق بے اماں سے کم نہ تھا، ان کی ایمانی غیرت، اسلامی حمیت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے بے پناہ عقیدت ومحبت کسی بھی حالت میں اسلام کے مستحکم قلعہ پر دشمنان حدیث کی یلغار کو برداشت نہیں کر پاتی تھی، اور جب بھی کبھی کوئی ایسا واقعہ ان کے علم میں آیا کہ بدبخت روافض نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وثقاہت پر تبرابازی کے تیر چلائے ہیں اور ان نفوس قدسیہ کو طعن ولعن کا نشانہ بنایا ہے تو اسلام کا شیر دل سپاہی اپنی کمین گاہ سے غراتا ہوا نکلتا تھا پھر تو تحقیق وتالیف کے نام پر شور مچانے والے رافضی گیدڑوں کی جان آفت میں پڑ جاتی تھی، جب کہ تاریخ اسلام کا سب سے تاریک والمناک حصہ وہ ہے جس میں شیعوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذات بابرکات کو نشانہ بنایا ہے اور ان کی دیانت وعدالت پر شکوک وشبہات کے کیچڑ اچھالنے کی سعی نا تمام کی ہے۔

★ دار العلوم تحفیظ القرآن، سکھٹی مبارک پور، اعظم گڈھ

صحابہ کو مطعون کرنے کا مقصد

آخر وہ کون سی وجوہات ہیں کہ روافض نے خاص کر اصحاب رسول کو لعن وطعن کا محور بنایا ہے؟ اس کا جواب مختصراً یہ ہوگا کہ چوں کہ دین اسلام کی عظیم الشان عمارت اور احادیث رسول کی روایت کی اساس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم ومعارف اور روایات پر قائم ہے، اصحاب رسول ہی کی عدالت عامہ کے عقیدہ کے بغیر اسلام اپنی اصالت پر قائم نہیں رہ سکتا اور پوری شریعت مطہرہ غیر معتبر داستانوں کا پلندہ بن کر رہ جائے گی، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کامل کی حقیقت واصالت کو تا قیامت باقی رکھنے کا ذمہ خود لیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کا سب سے اہم اور معتمد ذریعہ بنایا ہے، لہٰذا جس طرح اللہ نے اپنے رسول آخر الزماں کے مخاطبین اولین کا انتخاب بھی فرمایا تھا اور مابعد کے عہود کے لوگوں کے ایمان کی صداقت کا معیار بھی انھیں نفوس قدسیہ کو مقرر کیا تھا آمنوا کما آمن الناس، چنانچہ جماعت صحابہ کی تعلیم وتربیت بھی خود رسول کائنات امام الانبیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے عزیز طلبہ کا امتحان لے کر ان کی دیانت، عبادت، امانت، عدالت، صلاح وتقویٰ کی سچائی کا اعلان بھی فرمادیا، ان کی مدح میں آیات بھی نازل کیں اور اپنی رضا بھی عطاء فرمائی:

(۱) محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود۔ (فتح، آیت: ۲۹)

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ جو لوگ ہیں وہ کافروں پر بہت سخت اور آپس میں رحم دل ہیں تم ان کو رکوع وسجدہ کی حالت میں دیکھو گے اپنے رب کا فضل ورضا تلاش کرتے ہوئے ان کی خاص علامت ان کے چہروں میں ظاہر ہیں سجدوں کے اثر سے۔''

(۲) أولئك الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوی۔ (حجرات، آیت: ۳)

''یہی (صحابہ کرام) وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے تقویٰ کو اللہ نے جانچ لیا ہے۔''

(۳) ولکن اللہ حبب إلیکم الإیمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ إلیکم الکفر والفسوق والعصیان وأولئك ھم الراشدون۔ (حجرات، آیت: ۷)

''اور لیکن اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور تمہارے دلوں کو اس سے مزین کردیا اور تمہارے لیے کفر وفسق اور عصیان کو ناپسند بنا دیا اور وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

لہٰذا جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کی ذات اور ان کے ایمان وتقویٰ، عدالت وثقاہت، روایت ودرایت کے اساس ہی پر قصر اسلام کی پرشکوہ عمارت قائم ہے تو لازمی طور پر باطل فرقوں اور شیعوں کی دسیسہ کاریوں، افتراء پردازیوں، بہتان تراشیوں، تبرابازیوں کا دندان شکن جواب دینا اور ان نفوس قدسیہ کی عظمت وجلالت کا دفاع کرنا ہر دور کے عظیم المرتبت علماء صالحین وراسخین پر لازم ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ ہے اور حضرت ابوالمآثر محدث اعظمی انھیں جلیل القدر عظیم الشان محدثین عظام میں سے ہیں جو اپنے عہد کے صف اول کے علماء کے درمیان شیعوں کے خلاف سرگرم نظر آتے ہیں، یہاں راقم سطور حضرت ابوالمآثر کے جواں سال محقق نواسے اور حیات ابو المآثر کے مرتب ڈاکٹر مولانا مسعود احمد الاعظمی کی تحریر نقل کرتا ہے، جس سے روافض کی فطرت سمجھنا آسان ہوگا:

''دیگر دشمنان اسلام کی طرح شیعوں کو بھی کلمہ اسلام کی سربلندی ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے، اسلامی تعلیمات کا فروغ ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے، اسلام کا دم بھر کر اسلام کی روح کو جو نقصان انھوں نے پہونچایا ہے اس کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے، ان شیعوں نے اپنے بغض وعداوت کا سب سے پہلا نشانہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قدسی صفات نفوس کو بنایا، اور چند صحابہ کا استثناء کر کے باقی تمام حضرات پر تبرابازی کی، ان کی شان میں گستاخانہ اور اہانت آمیز باتیں گھڑیں اور دشنام وبہتان سے ان کے دامن تقدس کو پامال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، اور جب صحابہ کرام کے مقدس نفوس ان کے خباثت آمیز زبان وکلام سے محفوظ نہیں رہے تو دیگر علماء کرام اور محدثین عظام کے دامن عزت وحرمت ان کی ناروا جسارتوں سے کب محفوظ رہ سکتے تھے، ان کی کارستانیوں کے پس پشت اِس کے علاوہ اور کون سی روح کارفرما ہوسکتی تھی کہ ان پاکیزہ ہستیوں کی امانت ودیانت کو مشکوک اور مجروح کر کے تعلیمات اسلام کی پرشکوہ عمارت کو زمین بوس کر دیا جائے۔''[۱]

دفاع صحابہؓ اور محدث اعظمیؒ

حضرت ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کے تاریخ ساز دینی وتحقیقی کارناموں میں سے دفاع صحابہ ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی احسان مند پوری امت مسلمہ رہے گی اور محدث اعظمی کی ان خدمات کو تاریخ اسلام میں سنہری حروف سے لکھا جاتا رہے گا، آپ نے اپنے گہربار حق نویس قلم سے شیعوں کی علمی خیانت کو طشت از بام کیا ہے، دفاع صحابہ میں آپ کی دو اہم ترین

کتابوں کو دینی وعلمی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اوران کو مرجع ومصدر کی حیثیت حاصل ہے، ایک ''عظمت صحابہ'' کے نام سے ۸۸ رصفحات پر مشتمل رسالہ ہے جو بنارس کے ایک نام نہاد مصنف بابا خلیل احمد بنارسی کے رسالہ مسمّٰی ''اصحاب رسول اور معاویہ کی صحابیت'' کا دندان شکن جواب ہے، اصحاب رسول کے مصنف نے اپنے رسالہ میں حضرات صحابہ کرام کی عدالت کی معتبریت پر حملہ کیا ہے اور اپنے زعم باطل میں قرآن کی آیات سے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام صحابہ کو عادل ماننا خود قرآن کے بیان کے خلاف ہے، دوسرے حضرت امیر معاویہ کی صحابیت سے انکار کیا ہے جو خود اس کے دماغی عدم توازن کو بتاتا ہے، حضرت محدث اعظمی نے عظمت صحابہ میں اولاً بہت تفصیل سے صحابہ کرام کے مقام ومرتبہ کو بیان فرمایا ہے، پھر اہل سنت وجماعت کے متفقہ عقیدہ ''الصحابۃ کلھم عدول'' کو مستند ترین دلائل، بلند پایہ محدثین وائمہ کرام کے اقوال سے بابا خلیل داس اور اس کے پس پردہ اصل مجرم نصائح کافیہ کے مصنف کا علمی تعاقب بھی کیا ہے اور اس کی حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے، اسی کے ساتھ صحابیِ جلیل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا عنوان قائم کر کے مستند ترین کتابوں کے حوالجات کی ایک طویل فہرست پیش کر دی جس میں حضرت معاویہ کے صحابیِ رسول ہونے کو تسلیم کیا گیا ہے۔

حضرت محدث اعظمی اپنی کتاب عظمت صحابہ کے تمہیدی کلمات میں فرماتے ہیں: حق تعالیٰ کی توفیق سے حضرت معاویہ کے باب میں جو بات حق اور اہل سنت وجماعت کا اجماعی مسلک ہے اس کو مدلل اور واضح طور پر لکھتا ہوں۔ و اللہ حسبی و نعم الوکیل

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایک سچے مومن ومسلم اور رسول خدا ﷺ کے قابل عزت صحابی تھے اور غلطیاں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، ان میں سے اکثر وبیشتر تو جھوٹ اور ان پر بہتان ہیں اور بعض جو صحیح ہیں جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا جنگ کرنا تو وہ از قبیل خطائے اجتہادی یا بنا بر غلط فہمی تھیں، اسی لیے ان پر لعن وطعن بلکہ ملامت بھی ناجائز ہے، یہ ہے اہل سنت وجماعت کا تحقیقی واجماعی مسلک[۲] حضرت کی یہ جامع عبارت ایک طرح سے ''اصحاب رسول اور معاویہ کی صحابیت'' نامی کتاب کے جواب میں لکھی گئی عظمت صحابہ کا نچوڑ اور خلاصہ ہے، جس پر راقم سطور آئندہ صفحات میں گفتگو کرے گا۔

حضرت محدث اعظمیؒ کی دفاع صحابہ اور دفاع احادیث رسول میں تحریر کردہ دوسری معرکۃ الآراء کتاب تعدیل رجال بخاری ۲۳۷ صفحہ پر مشتمل ہے جس کا سبب تحریر، نبیرہ محدث اعظمی جناب مولانا ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی کی زبان قلم سے سنیں:

''احادیث نبویہ کے خلاف شیعوں کے معاندانہ رویے کا اندازہ اس کتاب سے ہوسکتا ہے جس کو ایک لکھنوی شیعہ مولوی مرزا اعبد الحسین نے رجال بخاری کے نام سے لکھ کر اپنے نامہ اعمال کو سیاہ کیا تھا، کتاب کے مصنف نے محدثین اور رواۃ حدیث کے دامن تقدس کو تار تار کرنے اور ان کی عظمت کو مجروح کرنے کے لیے اپنی اس کتاب کے اندر تبرابازی، دروغ بافی اور کذب بیانی کا کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا تھا، اس نے اپنا نشانہ خاص طور پر صحیح بخاری کو بنایا جو حدیث کی سب سے معتبر کتاب ہے جس کی ایک ایک روایت اور ایک ایک حدیث کو ائمہ حدیث اور نقادان فن نے اصول روایت کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا ہے، مرزا اعبد الحسین نے سنت اور اہل سنت کے تئیں اپنے بغض وکینہ کی آگ بجھانے کے لیے اسی کتاب کو منتخب کیا اور جی بھر کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی''۔[۳]

اس کتاب کی اشاعت شیعوں کے بغض صحابہ کی ایک ایسی کرب ناک علامت تھی جس نے اہل سنت کے حلقوں میں آگ لگادی، امام اہل سنت کی درخواست اور مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحریک پر حضرت ابو المآثر محدث اعظمی نے اس کا دندان شکن جواب لکھنے کو منظور فرمایا اور آپ کی عبقری شخصیت ہی اس خدمت کی اہل بھی تھی، لہٰذا ان کا اشہب قلم دفاع صحابہ، دفاع محدثین، دفاع بخاری میں چل پڑا، آپ اس عمل میں کتنا سرگرم اور مشغول تھے اس کا ثبوت ان کا وہ خط ہے جو انھوں نے اپنے پیر ومرشد حکیم الامت حضرت تھانویؒ کو ۱۳۵۸ھ ۱۱ر محرم کو مرقوم فرمایا تھا:

''آج کل ایک شیعی رسالہ (رجال بخاری) کے رد میں منہمک ہوں، حضرات صحابہ کی شان میں سخت گستاخی کی گئی ہے، دیکھ کر خون کھولنے لگتا ہے اس کے رد میں اتنا انہاک ہے کہ بجز درس اور فرائض شرعی وضروریات کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے۔[۴]

حضرت محدث اعظمیؒ کی ان دونوں کتاب ''عظمت صحابہ'' اور تعدیل رجال بخاری پر ہمارے اس مقالہ کی اساس ہے اور طوالت ممل سے بچنے کے لیے راقم سطور نے خاص خاص مقامات سے ہی اقتباسات پر توجہ مبذول کی ہے جو حقیقت میں حضرت محدث اعظمی کی دینی حمیت، فن حدیث اور اسماء رجال میں مجتہدانہ رسوخ معرفت صحابہ واحوال محدثین میں ان کے نبوغ کے شواہد ہیں۔

عظمت صحابہ جو کہ ''اصحاب رسول اور معاویہ کی صحابیت'' کے مصنف کا جواب ہے، اس میں حضرت اعظمیؒ نے باب خلیل داس کی پول بھی کھولی ہے کہ وہ اس لائق ہی نہیں کہ اس موضوع پر کتاب لکھ سکے چناں چہ پس پردہ کون ہے؟ ملاحظہ فرمائیں حضرت ابو المآثر کے الفاظ میں:

"صاحب نصائح نہ کوئی دین دار آدمی تھا، نہ عالم، نہ سنی المذہب، وہ ایک سنی نما رافضی اور بدعقیدہ شخص تھا، اس کی مادری زبان عربی تھی، اس نے عربی میں ایک کتاب "النصائح الکافیہ" کے نام سے تصنیف کی جس میں سنی بن کر اس نے اپنے رافضیانہ عقائد وخیالات پیش کئے۔ مگر خلیل داس جیسے "علامہ" کو ان باتوں کا کیا پتہ، اس غریب کو تو کسی شیعہ نے یہ بتا دیا کہ یہ ایک سنی عالم کی کتاب ہے، پھر کتاب عبارتیں مع ترجمہ نقل کر کے اس شیعہ نے ایک تاب ترتیب دی اور ازراہ فریب اس کو خلیل داس کی تصنیف قرار دیا، اور اس کے ساتھ خلیل داس کو فاضل علوم شرعی کا ڈپلومہ عطا کر دیا، خلیل داس کو اس سے بڑی علمی معراج اور کیا حاصل ہو سکتی تھی جھٹ آپ نے اس کو اپنے نام سے شائع کرا دیا، اب یہ الگ خوش ہیں کہ ع:

"ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں"[۵]

چناں چہ اصحاب رسول کتاب کی حقیقت بس اتنی سی ہے کہ کہانی کسی نے لکھی نام ان کا ہو گیا، لہٰذا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت و دیانت پر جتنے بھی حملے ہیں یا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار دراصل صاحب نصائح کافیہ نے کئے ہیں، خلیل داس ایک مہرہ ہے۔

اصحاب رسول کے نام نہاد مصنف نے عدالت صحابہ کو مجروح کرنے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ان کا ہر اس شخص کو جس کا وہ اپنی اصطلاح کے موافق صحابی نام رکھ دیں، عادل ماننا غلط اور غیر مسلم ہے۔"[۶]

دوسری جگہ بابا خلیل بنارسی صحابہ کو غیر عادل ثابت کرنے کی کوشش میں یہ بتانا چاہتا ہے کہ صحابہ خود ایک دوسرے کو غیر عادل اور غیر معتبر مانتے تھے، لہٰذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر حملہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"حضرت سعد بن عبادہ اور اکثر انصار صحابہ نے حضرت صدیق اکبر سے حدیث "الائمۃ من قریش" کو قبول نہیں کیا۔"[۷]

اس کا رد کرتے ہوئے حضرت محدث اعظمی رقم طراز ہیں:

"سنی حضرات ملاحظہ فرمائیں کہ صاحب نصائح اور اس کے مقلد یہ جھوٹ بول کر باور کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت سعد اور اکثر انصار، صدیق اکبر کو العیاذ باللہ سچا اور عادل نہیں سمجھتے تھے، کیا صدیق اکبر کی نسبت ایسا باور کرانا کھلی ہوئی رافضیت نہیں ہے۔"[۸]

بہرحال آیئے میں آپ کو صاحب نصائح کی خباثت اور اس کا سفید جھوٹ دکھاؤں، صدیق اکبر نے یہ حدیث وفات نبوی کے بعد انصار کے اس مجمع میں سنائی جس میں صدیق اکبر کے ہاتھ پر مسلمانوں نے بیعت کی تھی، یہ واقعہ مسند احمد میں اور اس کے حوالے سے تاریخ الخلفاء ص ۴۸ میں مذکور ہے اور اس میں صاف صاف تصریح ہے کہ سعد بن عبادہ نے صدیق اکبرؓ سے یہ حدیث سن کر برجستہ کہا کہ صدقت (آپ نے سچ کہا) اور مان گئے کہ فرماں روا یا (امیر) صرف قریش میں سے ہوگا اور ہم انصار وزیر و مددگار رہیں گے، چناں چہ فرمایا "نحن الوزراء وانتم الأمراء"

اصحاب رسول کے مصنف نے قرآنی آیات میں بھی تحریف کی اور لفظ فاسق جو کہ آیت کریمہ "إن جاءكم فاسق بنبأ فتبينوا" میں آیا ہے، اس کا مصداق ایک صحابی رسول حضرت ولید کو قرار دیا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن بھی تمام صحابہ کو عادل نہیں مانتا۔

حضرت محدث اعظمی نے بہت تفصیل سے اس باطل نظریہ کا رد فرمایا ہے، عظمت صحابہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"لہٰذا جب کبھی تاریخ کی کتابوں کا بیان قرآن سے ٹکراتا ہے تو ہمیشہ یہی کرنا لازم وواجب ہے کہ قرآن کی تصدیق کی جائے اور تاریخ کا بیان ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے یا تاویل ممکن ہو تو تاویل کر لی جائے، مگر صاحب نصائح ایسا غلط کار اور قرآن پر اس کا ایمان اتنا کمزور ہے کہ وہ اس کے برعکس تاریخ کے بیان کو متواتر، قطعی اور حتمی مان کر قرآنی شہادتوں میں تاویل اور تحریف کی کوشش کرتا ہے۔"[۹]

محدث اعظمی نے پہلے بابا خلیل داس سے اس مسئلہ پر چند سوالات کئے ہیں، جس کو راقم نے چھوڑ دیا ہے۔ اور نصائح کافیہ کے مصنف کا رد کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ان سوالات کے بعد صاحب نصائح کے اس جھوٹ اور فریب کا پردہ بھی چاک کر دینا چاہتا ہوں کہ مسئلہ عدالت صحابہ قرآن کے خلاف ہے۔

سنئے صاحب نصائح نے اس مسئلہ پر یوں استدلال کیا ہے کہ ولید ایک صحابی ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں دو جگہ فاسق کہا، لہٰذا یہ کہنا کہ صحابہ سب عادل ہیں قرآن کے خلاف ہے۔

لیکن یہ استدلال محض فریب ہے اور مسئلہ عدالت صحابہ قرآن کے خلاف ہرگز نہیں بلکہ وہ قرآن کے عین مطابق ہے اور قرآنی آیات ہی پر تو اس کی بنیاد ہے۔"[۱۰]

عدالت صحابہؓ

چناں چہ حضرت ابوالمآثر محدث اعظمیؒ نے کتاب کے صفحہ ۱۷ پر عنوان قائم کیا ہے "تمام صحابہ عدل ہیں" اس کے تحت عدالت صحابہ پر دلائل واقوال ائمہ کا انبار لگا دیا ہے، سب کا نقل کرنا یہاں طوالت کا موجب ہوگا، چند پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوالمآثر رقم طراز ہیں:

’’اہل سنت وجماعت کا اجماعی مسلک، جس میں کسی سنی کا کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ ہے کہ صحابہ کل کے کل عدل ہیں، ان میں کوئی فاسق وفاجر نہیں ہے، اس عبارت کے بعد حافظ ابن عبدالبر صاحب استیعاب کا قول مع ترجمہ نقل کرتے ہیں:

فهم خير القرون وخير أمة أخرجت للناس ثبتت عدالة جميعهم بثناء الله عز وجل عليهم وثناء رسوله عليه السلام ولا أعدل ممن ارتضاه الله لصحبة نبيه ونصرته ولا تزكية أفضل من ذلك ولا تعديل أكمل منه۔[11]

صحابہ خیرالقرون اور خیرامت ہیں تمام صحابہ کی عدالت یوں ثابت ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے ان کی ثنا کی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا عادل نہیں ہوسکتا جس کو اللہ نے اپنے نبی کی صحبت اور نصرت کے لیے پسند کیا ہو اور اس سے بڑھ کر کوئی تزکیہ نہیں ہوسکتا نہ اس سے زیادہ کامل کوئی تعدیل ہوسکتی ہے۔

اور خطیب بغدادی نے اپنی کتاب الکفایہ (ص ۴۶) میں کہا:

عدالة الصحابة ثابتة معلومة بتعديل الله لهم واخباره عن طهارتهم واختياره لهم۔

صحابہ کی عدالت محقق ومعلوم ہے اللہ کے عادل قرار دینے کی وجہ سے ان کو اور ان کی پاکیزگی کی خبر دینے سے اور اپنے لیے ان کو چن لینے کی وجہ سے۔

علامہ ابن الاثیر جزری جامع الاصول میں فرماتے ہیں:

الصحابة كلهم عدول بتعديل الله عز وجل ورسوله صلى الله عليه وسلم لا يحتاجون إلى بحث في عدالتهم وعلى هذا القول معظم المسلمين من الأئمة والعلماء من السلف والخلف۔ (قلمی نسخہ: ندوہ شبلی لائبریری)

تمام صحابہ، اللہ اور اللہ کے رسول...... کے عادل قرار دینے کی وجہ سے عادل ہیں ان کی عدالت میں بحث کی حاجت نہیں ہے یہی قول مسلمانوں کے بڑے طبقے (اہل سنت وجماعت) کے اگلے وپچھلے تمام ائمہ وعلماء کا ہے۔

امام نووی شرح مسلم جلد دوم ص ۲۷۳ میں فرماتے ہیں:

اتفق أهل الحق ومن يعتد به في الإجماع على قبول شهاداتهم ورواياتهم وكمال عدالتهم رضي الله عنهم أجمعين۔

اہل حق اور وہ سب لوگ جن کا اجماع میں اعتبار ہے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ صحابہ کی گواہی اور روایت مقبول ہے وہ کامل طور پر عادل ہیں، ان سب سے اللہ راضی ہے۔

اور امام غزالی احیاء العلوم میں اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی اس کی شرح جلد ۲ / ۲۲۳ میں فرماتے ہیں:

واعتقاد أهل السنة والجماعة تزكية جميع الصحابة وجوباً۔

اہل سنت وجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کا تزکیہ واجب ہے۔[12]

اور حافظ ابن حجر نے اصابہ فی معرفۃ الصحابہ جلد اول ص ۲۷۶ میں لکھا ہے:

قد كان تعظيم الصحابة ولو كان اجتماعهم به صلى الله عليه وسلم قليلاً مقرراً عند الخلفاء الراشدين وغيرهم۔

صحابہ کی تعظیم اگرچہ ان کی ملاقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تھوڑی دیر رہی ہو، خلفاء راشدین وغیرہم کے نزدیک ایک مقرر اور جانی ہوئی بات تھی۔‘‘

ان سارے حوالوں کو نقل کرنے کے بعد حضرت محدث اعظمی فرماتے ہیں:

’’آپ ابن عبد البر، ابن الاثیر، خطیب بغدادی (وغیرہم) کی تصریحات میں ابھی پڑھ چکے کہ ہم تمام صحابہ کو صرف اس لیے عادل قرار دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عادل قرار دیا ہے اور ان کی ثناء کی ہے اور خطیب بغدادی نے اپنی کتاب الکفایہ کے ص ۴۶ میں متعدد آیات نقل بھی کردی ہے جن میں صحابہ کی تعدیل وثناء ہے، پس قرآن میں صحابہ کی تعدیل مذکور ہے۔‘‘[13]

رافضی کو منہ توڑ جواب

چوں کہ النصائح الکافیہ کے ملعون مصنف نے اِن جاءکم فاسقٌ سے مراد حضرت ولیدؓ صحابی کو لیا ہے اور دلیل دی ہے کہ قرآن سب صحابہ کو عادل نہیں مانتا تو حضرت اعظمی مذکورہ بالا عبارت کے بعد فرماتے ہیں:

’’اور زیادہ صاف سننا چاہتے ہیں تو سنئے آیت ’’اِن جاءکم فاسق‘‘ مسئلہ عدالتِ صحابہ کی قطعاً مخالف نہیں ہے؛ اس لیے کہ اول تو اس آیت میں کہیں نہ ولید کا نام آیا ہے نہ کسی دوسرے کا، اسی طرح اس میں کسی معین شخص پر لفظ فاسق کا اطلاق نہیں ہوا ہے بلکہ بلاتعیین وتشخیص بالکل عمومی طور پر فاسق کی خبر کا حکم بتایا گیا ہے، لہٰذا صاحب نصائح کا یہ کہنا کہ آیت میں ولید کا نام اللہ نے فاسق رکھا ہے بالکل غلط ہے، اگر ایسا ہوتا تو یہ حکم ولید کے ساتھ خاص ہوتا حالاں کہ تمام علماء اس حکم کو ہر فاسق کے لیے عام کہتے ہیں۔‘‘[14]

اصحاب رسول کے نام نہاد مصنف نے اپنی کتاب میں فضائل صحابہ کا باب قائم کیا ہے اور اس نے قرآن کریم کی آٹھ آیتوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی ایک خاص جماعت ہی کو معتبر، معیار اور عادل، واجب الاحترام قرار دیا ہے، سب صحابہ نہ عادل ہیں نہ ہی تعظیم وتوقیر کے مستحق ہیں، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ روافض کو چند مخصوص

صحابہ سے حد درجہ نفرت وعداوت ہے، ان میں حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، حضرت معاویہ، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن العاص، حضرت سمرہ بن جندب، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت زبیر بن العوام، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم اجمعین سرفہرست ہیں، ان پر لعن وطعن اور تبرابازی کو سب سے بڑا کار خیر قرار دیتے ہیں۔

خلیل داس نے جو آیتیں فضائل صحابہ ثابت کرنے میں درج کی ہیں اس میں بیعت رضوان کی آیت **لقد رضی اللہ عن المؤمنین** اور آیت **محمد رسول اللہ والذین معہ** بھی ہے، لہٰذا خلیل داس لکھتا ہے:

''آیت کریمہ میں جن مؤمنین کا ذکر آیا ہے وہ اصحاب بیعت الرضوان ہیں جب ان حضرات نے رسول اللہ...... کے دست مبارک پر اپنی جانیں قربان کرنے کی بیعت کی تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی رضا اور خوشنودی کے ساتھ مخصوص فرمایا۔''[۱۵]

حضرت محدث اعظمی نے اسی آیت کو دلیل بنا کر خلیل داس کی بخیہ ادھیڑ ڈالی ہے، لہٰذا تحریر فرماتے ہیں:

''اب میں خلیل داس سے پوچھتا ہوں کہ جب اصحاب بیعۃ الرضوان کو اللہ نے اپنی رضا وخوشنودی کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اور جب صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمان ہونے والوں کے حق میں آیت **محمد رسول اللہ والذین معہ**۔ الآیۃ نازل فرمائی ہے، جس میں ان کی مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ ہے اور جب فتح مکہ سے پہلے اور فتح مکہ کے بعد جہاد کرنے والے صحابیوں پر آتش دوزخ حرام ہے تو بتائیے کہ آپ نے حضرت عمرو بن العاص، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہم کو اشرار ومنافقین میں کیوں شمار کیا؟ (دیکھو اصحاب رسول ص ۸۱) یا نار کی طرف بلانے والا دوزخی کیوں کہا؟ (دیکھو اصحاب رسول ص ۴۹) یا ان کو عادل ماننے سے انکار کیوں کیا؟ (دیکھو اصحاب رسول ص ۵۵)

کیا آپ کا یہ فعل ان آیات کی تکذیب اور ان کو جھٹلانا نہیں ہے؟ اگر آپ کو معلوم نہیں ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ تینوں حضرات صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمان ہو چکے ہیں اور فتح مکہ سے پہلے اور بعد جہاد کر چکے ہیں اور حضرت مغیرہ بیعۃ الرضوان میں بھی شریک تھے۔

اس عبارت کے بعد حضرت ابوالمآثر استیعاب کی عبارت سے دلیل پیش کرتے ہیں:

حافظ ابن عبدالبر حضرت عمرو بن العاصؓ کی نسبت لکھتے ہیں: أسلم سنۃ ثمان قبل الفتح...... کان قدوم‍ہم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین بین الحدیبیۃ وخیبر۔ (الاستیعاب، ص ۲۳۴) یعنی حضرت عمرو بن العاص فتح مکہ سے پہلے ۸ ھ میں مسلمان ہوئے اور حدیبیہ اور غزوۂ خیبر کے درمیان مدینہ کی طرف ہجرت کی۔

اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں صاحب استیعاب لکھتے ہیں: أسلم عام الخندق وقدم مہاجرا۔ (۱/ ۲۵۰) وقیل: إن أول مشاہدہ الحدیبیۃ۔ (۱/ ۲۵۰) یعنی حضرت مغیرہ بن شعبہ غزوہ خندق کے سال اسلام لائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سب سے پہلا موقع جس میں وہ شریک ہوئے حدیبیہ کا موقع ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا حدیبیہ میں شریک ہونا جس میں بیعۃ الرضوان واقع ہوئی ہے، صحیح بخاری کتاب الشروط میں مصرح ہے۔ اور حضرت سمرہ کے بارے میں ترمذی میں ہے کہ انھوں نے آنحضرت...... کے ساتھ نماز کسوف ادا کی اور عہد نبوی میں نماز کسوف کا واقعہ ۶ ھ میں پیش آیا جیسا کہ امام نووی نے لکھا ہے، لہٰذا حضرت سمرہؓ بھی حدیبیہ کے پیشتر مسلمان ہوئے۔''[۱۶]

امیر معاویہ کی صحابیت کا اثبات

یہ بات کسی بھی (اہل سنت وجماعت کے) فرد پر مخفی نہیں کہ شیعوں نے ہمیشہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو گالیاں دی ہیں محرم کا مہینہ آتے ہی حضرت معاویہ اور یزید پر گالیوں، تبرابازیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، خلیل داس بنارسی نے بھی اپنی گھناؤنی گندی فکر کا ثبوت اپنی کتاب کے نام ہی سے دے دیا ہے ''اصحاب رسول اور معاویہ کی صحابیت'' اس نے شیعوں کی عادت کے مطابق حضرت معاویہ پر نازیبا الزامات لگائے ہیں اور چند قدم آگے بڑھ کر ان کی صحابیت ہی کا انکار کر دیا ہے، حضرت محدث اعظمیؒ نے حضرت معاویہ کی صحابیت کے سلسلہ میں عظمت صحابہ کے اندر اسی نام سے ایک باب قائم کر کے ان کی صحابیت کے ثبوت میں ائمہ حدیث اور علماء صالحین کے حوالے اور اقوال پیش کر کے ان کا پوری قوت سے دفاع فرمایا ہے، نیز خلیل داس کے قول کا رد بھی کیا ہے، جس نے لکھا ہے کہ صاحب یا صحابی کا اطلاق کافر یا منافق پر بھی ہوتا ہے، حضرت معاویہ کی صحابیت پر کلام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ صحابی کی تعریف بھی سامنے آجائے اور اس سلسلہ میں اہل سنت وجماعت کا عقیدہ بھی واضح ہو جائے، چناں چہ اپنی طرف سے کچھ کہنے اور تحقیق پیش کرنے سے بہتر ہے کہ خود حضرت ابوالمآثر محدث اعظمی کی تحریر سے استفادہ کیا جائے، انھوں نے عظمت صحابہ کے آغاز ہی میں عنوان قائم کیا ہے اور کے تحت لکھتے ہیں: (اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ راقم سطور)

صحابی کی تعریف:

محدثین کے نزدیک صحابی کی صحیح ومقبول ومعتمد تعریف وہ ہے جو صحیح

بخاری میں مذکور ہے:

من صحب النبي أو رآه من المسلمين فهو من أصحابه۔
مسلمانوں میں جو نبی کی صحبت پائے یا آپ کو دیکھے وہ آپ کے اصحاب میں سے ہے۔

اور یہی تعریف واضح الفاظ میں یوں ذکر کی گئی ہے:

الصحابي من لقي النبي صلى الله عليه وسلم مؤمناً ومات على الإسلام۔ صحابی وہ ہے جو آنحضرت...... سے ایمان کی حالت میں ملاقات کرے اور اسلام پر مرے۔

اسی تعریف کی نسبت حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصح ما وقفت عليه لکھا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے:

هذا التعريف مبني على الأصح المختار عند المحققين كالبخاري وشيخه أحمد بن حنبل ومن تبعهما۔ (اصابہ: ۴-۵) یہ تعریف مبنی ہے اس بات پر جو اصح اور مقبول ہے، محققین کے نزدیک جیسے بخاری اور ان کے شیخ امام احمد بن حنبل اور ان کے متبعین۔

اور یہی جمہور محدثین کا قول ہے جیسا کہ فتح الباری میں ہے:

والذي جزم به البخاري هو قول أحمد وجمهور المحدثين۔ (ج ۷/ص ۴) جس تعریف پر جزم کیا ہے بخاری نے، وہی قول امام احمد وجمہور محدثین کا ہے۔(۱۷)

صحابیت کے لیے مدت شرط نہیں:

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حضرت سعید بن المسیّب نے صحابی کہلانے کے لیے رسول خدا ﷺ کے ساتھ ایک سال رہنے یا کسی لڑائی میں آپ کے ساتھ شریک ہونے کی شرط لگائی ہے، تو اس کی نسبت حافظ زین الدین عراقی نے فرمایا کہ ابن المسیّب کی طرف اس قول کی نسبت صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے، اور ابن حجر نے کہا کہ عمل اس کے خلاف ہے''۔ (زرقانی: ۷/ ۲۴)[۱۸]

ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد محدث اعظمی فرماتے ہیں:

''حاصل کلام یہ ہے کہ راجح اور صحیح قول کی بنا پر صحابی ہونے کے لیے صحبت کی کوئی مدت معین نہیں ہے، جس نے بھی ایک نظر آنحضرت...... کو دیکھا اور مؤمن مرا وہ صحابی ہے، ہاں بعض لوگ سال دو سال صحبت میں رہنا یا کسی لڑائی میں شریک ہونا ضروری قرار دیتے ہیں، مگر یہ قول معتبر نہیں ہے۔[۱۹]

حضرت محدث اعظمی نے درحقیقت صحابی کی تعریف میں اہل سنت و جماعت کے متفقہ عقیدہ کی واضح انداز میں ترجمانی کی ہے، اس سے ایک جانب تو شیعوں کی سازش کی عمارت زمیں بوس ہوگئی جو قرآنی آیات میں تحریف اور معنی مراد میں التباس پیدا کر کے بہت سے صحابہ کرام کو اصحاب رسول کے زمرہ سے خارج کرنا چاہتے ہیں تو دوسری جانب اہل سنت و جماعت میں کے بہت سے پرجوش علماء جو صحابیت کے لیے رسول اللہ...... کے ساتھ سال دو سال کی شرط کو قابل اعتناء جانتے ہیں اور اس نظریہ کے مؤید ہیں، ان کی دانستہ یا نادانستہ لغزش پر گرفت بھی ہو جاتی ہے۔

ابھی حال میں ایک مؤقر عالم دین نے اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اور ان لوگوں کے اقوال کو راجح قرار دیا تھا جنھوں نے سال دو سال یا کچھ مدت کی قید صحابیت کے لیے لگائی ہے، نیز حضرت معاویہ وحضرت خالد جیسے کبار صحابہ کے بارے میں انھیں آراء کا اظہار فرمایا تھا جو شیعوں کے نظریات ہیں، لیکن اہل سنت وجماعت کے طبقہ علماء نے ان کی مذمت کی اور صاف اعلان کیا کہ ہر وہ شخص صحابی رسول ہے جس نے اہل سنت وجماعت کے عقیدہ کے مطابق حالت ایمان میں ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ کے رسول ﷺ سے ملاقات کی اور حالت ایمان پر اس کی موت بھی ہوئی۔

چناں چہ جس کو بھی صحابیت کا درجہ حاصل ہوگیا اس کی تنقیص اور اس پر قدح وطعن حرام ہے، زندقہ ہے، امام ذہبی لکھتے ہیں: فمن طعن فيهم أو سبهم فقد خرج من الدين ومرق من المسلمين۔ (كتاب الكبائر للذهبي)

حضرت امیر معاویہؓ کی صحابیت کا دفاع

چوں کہ دیگر روافض کی طرح بابا خلیل داس بنارسی اور النصائح الکافیہ کے ملعون شیعی مصنف نے تمام تر حقائق وشواہد کو درکنار کرتے ہوئے بہت بے شرمی سے صحابی رسول حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار کیا ہے اور نعوذ باللہ ان کو منافق قرار دیا ہے جیسا کہ اس نے اپنی کتاب کا نام رکھا ہے ''اصحاب رسول اور معاویہ کی صحابیت'' اور ہم لکھ چکے ہیں کہ رافضیوں کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بے پناہ نفرت وعداوت ہے جب کہ وہ کبار صحابہ میں سے ہیں اور ان پر اللہ کے رسول ﷺ کو اتنا اعتماد تھا کہ ان کو کاتبین وحی میں شامل فرمایا تھا جو ایسا اعزاز ہے کہ قسمت والوں کو ہی ملتا ہے، قیامت کے دن تک اس میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں، امیر معاویہ کے بارے میں مفکر اسلام مفتی محمد تقی عثمانی رقم طراز ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کا دور حکومت تاریخ اسلام کے درخشاں زمانوں میں سے ہے جس میں اندرونی طور پر امن واطمینان کا دور دورہ بھی تھا اور ملک سے باہر دشمنوں پر مسلمانوں کی دھاک بھی بیٹھی ہوئی تھی، لیکن حضرت معاویہ کے مخالفین نے ان پر اعتراضات والزامات کا کچھ اس انداز سے انبار لگایا ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ تابناک زمانہ سبائی

پروپگنڈے کے گرد وغبار میں روپوش ہوکر رہ گیا۔‘‘[20]

چناں چہ حضرت ابوالمآثر محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی بابا خلیل داس بنارسی کے کذب وافتراء کا جواب دیتے ہوئے حضرت معاویہ کی صحابیت کا دفاع فرمارہے ہیں:

’’حضرت معاویہ کا صحابی ہونا ایسی مشہور ومتواتر بات ہے کہ اس کے ثبوت کے لیے کسی خاص حوالہ کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی عوام کی واقفیت کے لیے اتنا بتاتا ہوں کہ امام بخاری کی تاریخ کبیر ج ۴، ص ۳۲۶ میں، ابو بشر دولابی نے الکنی ج ۱، ص ۷۹ میں، ابن سعد نے طبقات ج ۷، ص ۱۲۸ میں، حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب ج ۲، ص ۲۵۳ میں، حافظ ذہبی نے تجرید اسماء الصحابہ ص ۸۹ اور تذکرۃ الحفاظ ص ۴۴ میں بضمن عملاء صحابہ جن کی روایات صحاح ستہ میں ہیں، اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے الاصابہ ج ۶ ص ۱۲، اور تہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۲۰۷، اور تقریب ص ۳۵۷ اور فتح الباری (شرح بخاری) ج ۷ ص ۸۰ میں، علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء ص ۱۳۰ میں، ان کے صحابی ہونے کی تصریح کی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ابن عم رسول حبر الامۃ حضرت ابن عباس نے ان کے صحابی ہونے کا اعلان کیا ہے، صحیح بخاری میں فإنہ قد صحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔‘‘[21]

حضرت محدث اعظمیؒ نے کل ۲۴ رامہات الکتب اور احادیث وصحابہ کرام کے احوال کے مراجع کا حوالہ ذکر فرمایا ہے جن میں سے چند کا نام راقم السطور نے لکھا ہے۔

بزرگان دین، فقہاء اسلام، محدثین عظام کے اقوال سے بھی استدلال کیا ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت کے بارے میں نقل فرماتے ہیں اور ان اقوال کو بھی نقل کیا ہے جن میں حضرت معاویہ پر سب وشتم کو ناجائز اور حرام کہا گیا ہے، لہٰذا فرماتے ہیں:

’’امام نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۷۲ میں لکھتے ہیں: وأما معاویۃ رضی اللہ عنہ فھو من العدول الفضلاء والصحابۃ النجباء وأما الحروب التی جرت فکانت لکل طائفۃ شبھۃ اعتقدت تصویب أنفسھا بسببھا وکلھم عدول متأولون فی حروبھم۔

حضرت معاویہ اصحاب عدل وفضل اور برگزیدہ پسندیدہ صحابہ میں سے تھے اور ان کے درمیان جو جنگیں ہوئیں تو وہ شبہے کی بنیاد پر تھیں جس کی وجہ سے ہر جماعت خود کو برحق خیال کرتی تھی اور یہ سب حضرات اپنی مورچہ بندی میں تاویل کرتے تھے، اس لیے سب عدول ہیں۔‘‘[22]

نیز امام نووی آگے ص ۳۱۰ میں لکھتے ہیں:

’’واعلم أن سبّ الصحابۃ حرام من فواحش المحرمات سواء من لابس الفتن منھم وغیرہ لأنھم مجتھدون فی تلک الحروب ومتأولون۔

اور جان لو کہ صحابہ کی شان میں بدگوئی کرنا حرام اور سخت ممنوع ہے خواہ وہ صحابہ ہوں جو فتنوں میں شریک رہے یا ان کے علاوہ ہوں اس لیے وہ حضرات ان جنگوں میں مجتہد ومأول تھے۔‘‘[23]

اس کے علاوہ حضرت محدث اعظمی نے ہندستانی موقر علماء کے اقوال بھی نقل کئے ہیں: مولانا محمد معین فرنگی محلی اپنے فتویٰ میں ابوزید مالکی اور ابن تیمیہ کے اقوال نقل فرماتے ہیں:

’’قال المحققون من الحنفیۃ والمالکیۃ والحنبلیۃ والشافعیۃ أن معاویۃ من العدول الفضلاء والصحابۃ الخیار۔۔۔۔۔۔ الخ۔

حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ اور شافعیہ کے محقق اہل علم نے فرمایا ہے کہ حضرت امیر معاویہ عادل وفاضل اور منتخب صحابہ میں سے تھے۔‘‘

حضرت مولانا عبدالحلیم لکھنوی والد ماجد مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے مذکورہ بالا فتویٰ کی تصحیح وتصویب فرمائی ہے۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی فرماتے ہیں:

’’حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت ثابت ہے اور ان سے خطائے اجتہادی لائق تر ہے باعتبار خطائے منکر کے ان کے متعلق یہی اعتقاد اہل سنت کا ہے وہ ماجور ہیں، اگرچہ مصیب نہیں اور سب سے بڑھ کر خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے: قتلای وقتلی معاویۃ فی الجنۃ۔ (مجمع الزوائد: ۹ / ۳۵۷، تطہیر الجنان، ص ۳۹، ازالۃ الخفاء) یعنی میرے اور معاویہ (دونوں گروہوں کے مقتول لوگ جنت میں ہیں۔‘‘

فضائل معاویہؓ

حضرت محدث کبیر مولانا اعظمی نے حضرت معاویہ کے فضائل سے متعلق احادیث اور اقوال صحابہ کو بھی تاریخ بخاری جلد چہارم سے نقل فرمایا ہے جن کا یہاں ترجمہ تحریر کرتا ہوں:

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: میں نے حضرت معاویہؓ سے زیادہ حکومت کا سزاوار کسی کو نہیں دیکھا اور عبدالرحمٰن بن عمیرہ، رسول اللہؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: اے اللہ! معاویہ کو حساب سے سکھا اور اس کو عذاب سے بچا اور عبدالرحمٰن بن عمیرہ مزنی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو حضرت معاویہ کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اے اللہ! تو ان کو ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنا اور ان کو ہدایت دے اور ان کے ذریعہ (لوگوں کو) ہدایت پر لگا۔ اللھم اجعلہ ھادیاً مھدیاً

واهديوا اهديتم۔[۲۴]

دفع المجادلۃ عن آیۃ المباہلۃ

حضرت ابو المآثر محدث اعظمیؒ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دفاع میں نہ صرف غالی تبراباز شیعوں کی صحابہ کرامؓ کے خلاف لکھی کتابوں کا عالمانہ محققانہ جائزہ لے کر رد کیا بلکہ آیات اللہ کی تفسیر میں ان کی تحریفات اور من مانے ترجمے کا دندان شکن جواب بھی لکھا، چناں چہ جب آپ کے علم میں آیا کہ حضرت امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کی کتاب تفسیر آیۃ مباہلہ کے جواب میں شیعی عالم اعجاز حسن بدایونی نے برہان المجادلہ نام سے کتاب لکھی ہے تو آپ نے اس خرافاتی کتاب کا منھ توڑ جواب تحریر فرمایا جو برہان المجادلہ کی حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے، محدث اعظمی نے اپنی کتاب کا نام دفع المجادلہ عن آیۃ المباہلہ رکھا، کیوں کہ یہ ایک جانب اعجاز حسن بدایونی کا جواب ہے تو اسی کے ساتھ حضرت امام اہلسنت کی کتاب کا دفاع بھی ہے، یہ بھی جان لیں کہ امام اہلسنت نے تفسیر آیۃ مباہلہ کیوں تحریر فرمائی تو اس کا پس منظر یہ ہے کہ ممبئی کے روافض ہر سال عید مباہلہ کے نام سے ایک مجلس منعقد کرتے تھے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل الصحابہ آیت مباہلہ سے ثابت کرتے تھے، جس کو سیدھے سادھے سنی مسلمان بھی مجلس میں سننے جایا کرتے تھے، لہٰذا ان کے متاثر ہوکر بہکنے کا خطرہ تھا، چناں چہ مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی نے ضروری جانا کہ آیت مباہلہ کی سچی تفسیر سامنے آئے تاکہ شیعوں کی فریب دہی اور دسیسہ کاری سے پردہ اٹھ جائے، بہر حال نتیجہ مثبت انداز میں ظاہر ہوا اور شیعوں کی مجلس میں سنی مسلمانوں نے جانا ترک کردیا جس سے غضبناک ہو کر بدایونی صاحب نے برہان المجادلہ لکھی تو اس کا جواب بھی ان کو مل گیا، رہی سہی عزت بھی خاک میں مل گئی، حضرت محدث اعظمی برہان المجادلہ کی حقیقت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''رسالہ کیا ہے خرافات کی پوٹ، مفتریات کا مجموعہ اور مذہب شیعہ کی خصوصیات کا ایک مظہر اتم اور مصنف کی علمی قابلیتوں کا آئینہ، یہ رسالہ ہرگز اس قابل نہ تھا کہ وقت عزیز کا کوئی حصہ اس کا جواب لکھنے میں صرف کیا جائے لیکن اس خیال سے کہیں برخود غلط مصنف اس سکوت کو عجز پر محمول نہ کرے، لہٰذا اس رسالہ کا دانداں شکن جواب لکھتا ہوں اور اپنے رسالہ کو دفع المجادلہ عن آیۃ المباہلہ کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔[۲۵]

محدث اعظمیؒ نے آیت مباہلہ کے بارے میں شیعوں کے عقیدہ کا ذکر فرماتے ہوئے لکھا ہے:

''(کہ شیعہ کہتے ہیں کہ) اس آیت سے حضرت علی کی خلافت بلافصل ثابت ہوتی ہے کیوں کہ اس کے نزول کے بعد رسول خدا نے حضرت علی و فاطمہ اور حسنین کو مباہلہ میں شریک کرنے کے لیے اپنے ساتھ لیا اور کسی کو اپنے ساتھ نہیں لیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ...... کو جو کچھ تعلق تھا وہ صرف انھیں حضرات سے تھا، پھر تمام مفسرین کا (شیعہ مفسرین مراد ہیں) اجماع ہے کہ انفسنا سے حضرت علی اور ابناءنا سے حضرات حسنین اور نساءنا سے حضرت فاطمہ مراد ہیں، بس معلوم ہوا کہ حضرت علی نفس رسول تھے اور ظاہر ہے کہ نفس رسول کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو خلیفہ بنانا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔''[۲۶]

شیعوں کی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد حضرت ابو المآثر تحریر فرماتے ہیں:

''ناظرین اس اقتباس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیعوں کا یہ عقیدہ کس قدر خطرناک اور ایمان سوز ہے، شیعوں کی اس بکواس اور ہفوات کو ذرا دیر کے لیے بھی تسلیم کرلیا جائے تو صدیق وفاروق اور عثمان (رضی اللہ عنہم) کی خلافت راشدہ خلاف شرع ہوکر رہ جائے گی، یہی وجہ ہے کہ اس تفسیر کی خرابی اور ہولنا کی ثابت کرنے کے لیے حضرت امام اہل سنت کو تفسیر آیت مباہلہ تحریر کرنی پڑی چناں چہ اس تفسیر کے سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت کریمہ فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم'' کی صحیح تفسیر بیان کرکے روز روشن کی طرح دکھایا گیا ہے کہ اس آیت کریمہ سے حضرت علی کی خلافت بلافصل یا ان کی افضلیت تمام صحابہ پر ثابت کرنا قرآن شریف کی تحریف ہے۔''[۲۷]

دفاع صحابہ بعنوان تعدیل رجال بخاری

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ شیعوں کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاکیزہ جماعت پر تبرا کرنا سب سے بڑی عبادت شمار ہوتا ہے جیسا کہ رجال بخاری کے مصنف مرزا عبدالحسین کا جواب دیتے ہوئے رقم فرمایا:

''آپ کی مذہبی کتابیں تو بتاتی ہیں کہ گالی بکنا خدا کے ذکر سے بھی زیادہ موجب ثواب ہے، کیا آپ کی کتابوں میں یہ نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر وعمر پر لعنت ہر صبح بھیجنا ستر (۷۰) نیکیوں کے برابر ہے؟ کیا آپ کے مذہب میں لعن عمر ذکر الٰہی وتلاوت قرآن مجید پر ترجیح نہیں ہے؟''[۲۸]

اور محدث اعظمیؒ نے شیعوں کی معتبر کتاب منتہی الکلام سے اس کی کچھ مثالیں بھی نقل کفر، کفر نہ باشد کی بنیاد پر پیش کی ہیں جن کو یہاں نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔ راقم رجال البخاری کے مصنف مرزا عبدالحسین نے بخاری شریف کے رواۃ کو نشانہ بنانے کی جسارت کی ہے اور اس کو آڑ بنا کر احادیث رسول کو غیر معتبر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو غیر ثقہ ثابت کرنے کی کوشش کا اصل مقصد

شریعت مطہرہ کو نا قابل اعتبار بنادے اور اسلام کی مستحکم عمارت کو زمیں بوس کردے کیوں کہ سبائی جو درحقیقت یہودیوں کی پیداوار ہیں، اول دن ہی سے یہودیوں کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں، جب کہ اہل سنت وجماعت کے نزدیک اسلامی تعلیمات کی عمارت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وروایت پر قائم ہے، انھوں نے ہی رسول اللہؐ سے براہ راست قرآن کریم کی آیات کی سماعت کی اور اس کو سینوں میں محفوظ کیا، احادیث رسول کو سنا اور اس کو محفوظ رکھا اور روایت کی جب کہ قرآن وحدیث ہی اسلام کی روح ہیں، اجماع امت بھی انھیں دونوں مصادر شریعت کی روشنی میں ہوگا اور قیاس بھی۔

چناں چہ مرزا عبد الحسین اپنی کتاب رجال بخاری کے ص ۳ پر سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”عام طور پر صحاح ستہ بالخصوص صحیح بخاری کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کی روایتیں صحیح السند اور اس کے رواۃ معتبر ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے اکثر راوی وہ حضرات ہیں جو کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہوسکتے، اسی بناء پر ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے رواۃ کے متعلق علم رجال وتاریخ کی بنا پر ایک تبصرہ تحریر کریں۔“[۲۹]

یہ تھی مرزا رافضی کی عبارت جس کے جواب میں امام الجرح والتعدیل حضرت ابوالمآثر محدث اعظمی تحریر فرماتے ہیں:

”لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکابر اہل سنت پر ناجائز حملہ اور اہل سنت کی دلآزاری کے سوا مصنف رسالہ کا اور کوئی منشا نہیں، یہی وجہ ہے کہ صحاح کے ان رواۃ پر مصنف رسالہ نے کوئی جرح نقل نہیں کی ہے، جن کو شیعہ اپنا امام یا اپنا موافق خیال کرتے ہیں، حالاں کہ جن کتابوں کے حوالوں سے مصنف نے اپنا اعمال نامہ سیاہ کیا ہے، انھیں میں ائمہ مقبولین کی نسبت بھی کافی مصالحہ موجود ہے، کیا یہ کھلا ہوا ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ مصنف رسالہ نے سبب تالیف کے بیان کرنے میں اپنا وہ فریضۂ مذہبی ادا کیا ہے جو ان کے دین کے دس حصوں میں سے نو ہے (جیسا کہ شیعوں کی کتاب اصول کافی ص ۴۸۴ پر ہے) التقیۃ تسعۃ أعشار الدین۔“[۳۰]

مرزا کی کتاب کی حقیقت

مرزا عبد الحسین رافضی کی کتاب افتراء وکذب کا پلندہ ہے، حضرت محدث اعظمی نے اس کے صریح جھوٹ اور فریب کو بارہ مثالیں پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ اس نے کس طرح ان افراد کو صحیح بخاری کا راوی لکھا ہے، جن کی کوئی روایت بخاری میں ہے ہی نہیں، نمونہ کے طور پر مرزا نے زید بن حارثؓ بدری صحابی کو بخاری کا راوی بھی لکھا ہے اور ان کو قاتلین حسین کا شریک بھی قرار دیا ہے، حضرت محدث اعظمی نے دونوں کا رد کیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مرزا نے عبید اللہ بن زیاد کو ابوداود کا راوی قرار دیا ہے جس کو محدث اعظمی نے رد کیا ہے۔

ابوہریرہؓ پر طعن

مرزا عبد الحسین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر طعن کیا ہے کہ ان کی کثرت روایت کی وجہ سے صحابہ ان پر اعتبار نہیں کرتے تھے گویا غیر معتبر اور غیر عادل تھے، حضرت محدث اعظمی نے اس کے رد میں تحریر فرمایا:

”مرزا صاحب نے اپنے تخیل کی بنیاد فیض الباری ترجمہ بخاری پر رکھی ہے مگر ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اہل سنت کے نزدیک یہ کوئی مستند ترجمہ نہیں ہے نہ اس کا مصنف کوئی مستند عالم ہے علاوہ بریں وہ (یعنی مرزا) بھی یہ لکھتا ہے کہ بطور طعن کے مجھ کو کہتے ہیں (یہ جملہ ابوہریرہ کا ہے) کہ شاید ابوہریرہ اپنے پاس سے حدیثیں بنا بنا کر بیان کرتا ہے، یعنی جو مجہول اشخاص ابوہریرہ پر طعن کرتے تھے وہ بھی یقین کے ساتھ اور کسی ثبوت کی بیناد پر ان کو الزام نہیں دیتے تھے، پس میں کہتا ہوں کہ ایسے بے بنیاد الزامات سے کسی کی صداقت مشکوک قرار دی جاسکتی ہے تو پھر کون ہے اس سے بچ سکے۔“[۳۱]

مرزا رافضی نے حضرت ابوہریرہ کو جھوٹا ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے حضرت عبد اللہ بن عمر کے قول ”أكثر علينا أبو هريرة“ کا ترجمہ اس نے ابوہریرہ نے ہم لوگوں پر بہت افتراء کیا ہے (ص ۵) سے کیا ہے، حضرت محدث اعظمیؒ لکھتے ہیں:

”ناظرین ملاحظہ فرمائیں! مرزا صاحب نے ترجمہ کیسی کھلی ہوئی بے ایمانی کی ہے، اکثر کے معنی افتراء دنیا کے کسی لغت میں نہیں ہے، بلکہ اکثر کے معنی زیادہ کیا، قاموس میں ہے: أكثر أتى بالكثير علاوہ بریں عقلا بھی یہ ترجمہ ممکن ہے، اس لیے حضرت ابوہریرہ آنحضرتؐ کی حدیثیں زیادہ بیان کرتے تھے، اس لیے اگر حضرت ابن عمر، ابوہریرہ کو افتراء کا الزام بہ فرض محال دیں گے تو آنحضرتؐ پر افتراء کا الزام دیں گے“۔[۳۲]

نیز محدث اعظمیؒ نے اس عبارت کے معنی ومفہوم کو سمجھانے کے لیے امام نووی کے قول کو نقل بھی کیا ہے:

أكثر علينا أبو هريرة معناه أنه خاف (يعني عبد الله بن عمر) لكثرة رواياته أنه اشتبه عليه الأمر في ذلك أو اختلط حديث بحديث لا أنه نسبه إلى رواية ما لم يسمع۔[۳۳]

یعنی اکثر علینا ابوہریرہ کا معنی یہ ہے کہ ابن عمر نے حضرت ابوہریرہ کی کثرت روایت کی وجہ سے یہ اندیشہ کیا کہ کہیں ان کو اشتباہ نہ ہو گیا ہو یا ایک

حدیث دوسری حدیث سے ملتبس ہوگئی ہو، یہ بات نہیں ہے کہ ابن عمر نے ابو ہریرہ کی طرف بے سنی حدیث کی روایت کی نسبت کی یہ عبارت مع ترجمہ نقل کر کے محدث اعظمی فرماتے ہیں :

''میں کہتا ہوں کہ پھر پوری روایت سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حضرت ابن عمر نے جو اندیشہ ظاہر کیا تھا وہ بھی زائل ہوگیا چناں چہ خود ابن عمر نے اس کا اقرار کیا ہے۔[۳۴]

رجال بخاری کا رافضی مصنف ایک جگہ لکھتا ہے :

''ابو ہریرہ سے (حاکم مدینہ) مروان نے کہا: خدا نے ضائع کر دیا حدیث رسول کو، اس لیے تیرے سوائے کسی دوسرے شخص نے اس کی روایت نہیں کی۔''

مروان کے اس قول پر مرزا عبدالحسین اپنا نظریہ بشکل فیصلہ پیش کرتا ہے :

''معلوم ہو گیا کہ جس حدیث کی نقل میں ابو ہریرہ متفرد ہوتے تھے اس کو لوگ غلط و موضوع سمجھتے تھے''۔[۳۵]

حضرت محدث اعظمیؒ اس بکواس کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں :

''مرزا صاحب نے یہاں بھی خیانت کی ہے، اصل واقعہ عقد فرید میں یوں ہے کہ حضرت حسن بن علیؓ کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کی قبر روضہ نبوی میں کھودنا چاہی تو مروان نے روک دیا، تب حضرت ابو ہریرہ نے مروان سے کہا: تو ان کو ان کے نانا کے پاس دفن ہونے سے کیوں روکتا ہے، میں آنحضرتؐ سے اس حدیث کے سننے کی گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: حسن وحسین اہل بہشت کے سردار ہیں۔

ناظرین! یہاں شیعہ کی محبت اہل بیت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ تو حسن وحسین کی حمایت میں ان کے مناقب بیان کر رہے ہیں اور شیعہ مؤلف ان کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، شرم شرم، نیز یہ بھی دیکھیں کہ واقعہ میں صرف مروان کا حدیث ابو ہریرہ پر اعتماد نہ کرنا مذکور ہے اور شیعہ مؤلف نے مروان کے بجائے لوگ کر دیا۔''[۳۶]

حضرت ابوموسیٰ اشعری پر طعن

رجال بخاری کے مؤلف نے حضرت معاویہ اور ان کے اصحاب کو ہی نہیں نشانہ بنایا بلکہ حضرت علی کے قریبی لوگوں کو بھی نہیں بخشا، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے کون واقف نہیں، جنگ صفین میں صلح کی گفتگو کے لیے حضرت علی نے ان کو حکم بنایا تھا اور بعد میں کچھ اسباب کی وجہ سے ابوموسیٰ اشعری، حضرت علی سے الگ ہوئے تھے، سرگرم نہیں رہے، مرزا عبدالحسین کو اسی کا قلق اور غصہ ہے، لہٰذا ان پر طعن ولعن کرتے ہوئے اس نے حضرت عمار کی جانب منسوب ایک قول نقل کیا ہے کہ وہ ابوموسیٰ اشعری سے کہتے ہیں :

''میں نے لیلۃ الجبل کے موقع پر سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھ پر لعنت کرتے تھے۔''[۳۷]

حضرت ابوالمآثر محدث اعظمیؒ اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

''یہ قول کنز العمال سے نقل کیا گیا ہے لیکن بددیانتی یہ کی گئی ہے کہ آگے اس روایت کا جو حال مذکور ہے اس کو چھپایا گیا ہے، صاحب کنز العمال نے آگے لکھا ہے کہ اس قول کو ابن عدی نے روایت کیا ہے اور اس کو سخت کمزور و بے جان ثابت کیا ہے، ناظرین کو شیعہ مصنف کی اس حرکت پر تعجب نہ ہونا چاہئے، اس لیے کہ اس غریب کے مذہب کی بنیاد ہی جھوٹ اور فریب پر ہے۔ اس حدیث کو ابن جوزی نے موضوع کہا ہے۔ (دیکھو لآلی مصنوعہ، ج ۱ص ۲۲۲)''[۳۸]

حضرت ابوالمآثر محدث اعظمیؒ نے ابوموسیٰ اشعری کے دفاع میں بہت تفصیل سے کلام کیا ہے، جس کو تعدیل رجال بخاری میں دیکھا جائے۔

انس بن مالکؓ پر طعن کا رد

مرزا عبدالحسین نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو مصلحت پسند قرار دیا ہے، اس کے جواب میں حضرت محدث اعظمی کی تحریر ملاحظہ فرمائیں :

''انس بن مالک، ان پر مرزا صاحب کا یہ الزام ہے وہ اظہار واقعہ میں ذاتی مصلحتوں کا لحاظ کرتے تھے، اس لیے معتبر ہونا مشکل ہے۔[۳۹] اور ثبوت میں ابن صباغ مالکی کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے مگر از راہ فریب وخیانت اس کے اس حصہ کا ترجمہ نہیں کیا ہے جس سے اس تراشے ہوئے الزام کی بیخ کنی ہوتی ہے۔''

اس عبارت کے بعد حضرت اعظمیؒ نے روایت کی تفصیل اور اس کا حاصل تحریر فرمایا ہے (جس کو راقم سطور نے چھوڑ دیا ہے) مرزا نے یہی نہیں بلکہ حضرت انس پر کتمان حدیث اور شان رسالت میں گستاخی و بے ادبی کی تہمت بھی لگائی ہے، لکھتا ہے کہ حضرت انس حدیث **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** کے چھپانے اور حضرت علی کے بددعاء کرنے سے مبروص ہو گئے تھے۔

حضرت محدث اعظمیؒ اس کے رد میں فرماتے ہیں :

''اگر ذرا سی بھی حیاداری ہوتی تو وہ اس مضمون کو لکھ کر اپنی رسوائی کا سامان نہ کرتے، ابن ابی الحدید شیعی اور عبید اللہ امرتسری (جس کی تحریر شاہد ہے کہ وہ شیعہ ہے) کے بیانات سے اہل سنت کو الزام دینا کتنی دفعہ بتایا جائے کہ جہالت ہے، بالخصوص جب کہ ہماری مستند کتابوں سے یہ ثابت ہے

کہ یہ مضمون بالکل جھوٹا اور سراسر جعلی ہے، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۱۰۸، طبرانی میں صراحۃ مذکور ہے کہ مسجد کوفہ میں جن صحابہ نے اس حدیث کی شہادت دی تھی ان میں حضرت انس بھی تھے، فقام اثنا عشر رجلا منهم أبو هريرة وأبو سعيد وأنس بن مالك فشهدوا أنهم سمعوا رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ پر بہتان

شیعوں کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگانے میں بہت لذت ملتی ہے، اور مرزا رافضی کی خباثت کی انتہاء دیکھئے کہ اس نے حضرت صدیقہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دے کر مار ڈالنے کی تہمت لگا دی ہے، اس کے رد میں حضرت محدث اعظمی کی ایمانی غیرت اور جلال علم ملاحظہ فرمائیں! لکھتے ہیں:

''مؤلف نے ایمان کو بالائے طاق رکھ کر شرم وحیا کو خیر باد کہہ کر خدائے قہار کے انتقام سے قطعاً بے خوف ہو کر یہ بھی کہہ ڈالا کہ عائشہ نے زہر دے کر اپنے شوہر کا خاتمہ کیا۔؎

اس افتراء و بہتان طرازی کے لیے حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کو آڑ بنایا کہ ''میں نے پیغمبر خدا کو ان کے مرض میں دوا پلانا چاہی، حضرت نے اشارہ سے منع کیا، میں نے کہا: مریض کو دوا سے نفرت ہوتی ہے، میں نے وہ دوا منھ کھول کے پلا دی، جب حضرت کو غشی سے افاقہ ہوا تو مجھے حکم فرمایا کہ سب کو یہی دوا پلائی جائے سوائے عباس کے کہ وہ تم لوگوں میں موجود نہیں ہے۔''

اس کو ذکر کے بعد محدث اعظمیؒ نے اولاً مرزا کے ترجمہ پر گرفت کی ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں:

''حاصل یہ ہے کہ زبردستی منھ کھول کے پلانا تو درکنار اصل حدیث میں اس کا کوئی نام ونشان نہیں ہے کہ حضرت عائشہ نے دوا پلائی، یہ سب مؤلف کا رافضیانہ افتراء وبہتان ہے، اسی طرح مؤلف کا یہ سفید جھوٹ ہے کہ آنحضرتؐ نے عائشہ کو جب یہ حکم دیا کہ سب کو یہی دوا پلاؤ تو انھوں نے افشاء راز کے ڈر سے اس حکم رسول کی تعمیل نہیں کی، حدیث میں ہرگز یہ نہیں ہے کہ حضرت عائشہ کو یہ حکم دیا، حدیث میں یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی، یہ سب باتیں مؤلف کے رافضی دماغ کی پیداوار ہیں، مؤلف کو اپنی جہالت کی وجہ سے یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ واقعہ کہاں اور کس طرح اور کس کے مشورے سے پیش آیا، اس لیے یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت میمونہ کے گھر میں اور حضرت ام سلمہ ام المؤمنین اور حضرت اسماء بنت عمیس کے مشورے سے پیش آیا (یہ دونوں صحابیاں شیعوں کے یہاں درجہ اعتبار رکھتی ہیں اور نہایت مقبول ہیں) طبقات ابن سعد، مجمع الزوائد اور فتح الباری میں یہ تصریحات ملاحظہ کی جائیں۔''؎۱

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص پر حدیثیں گھڑنے کی تہمت کا رد

شیعی مؤلف مرزا عبدالحسین نے رجال بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص پر حدیث وضع کرنے کی تہمت لگائی ہے اور کذب بیانی سے کام لیا ہے، دلیل کے طور پر یہ بات نقل کی ہے کہ جب حضرت معاویہ کو عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی ایک بات پہونچی تو انہوں نے کہا ''بلغني أن رجالا منكم يحدثون أحاديث ليست في كتاب الله ولا تؤثر عن رسول الله فأولئك جهالكم'' مجھے معلوم ہوا کہ تم میں سے کچھ لوگ ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں نہ آنحضرت...... سے نقل کی جاتی ہیں یہ تمہارے جہال ہیں۔

اس دلیل کا رد کرتے ہوئے محدث اعظمیؒ فرماتے ہیں:

''مؤلف نے یہاں یہ بے ایمانی کی ہے کہ اس مقولہ میں یحدثون احادیث کا ترجمہ ''ایسی جھوٹی باتیں بیان کرتے ہیں'' کیا، حالاں کہ اس عبارت میں کسی لفظ کا ترجمہ جھوٹی نہیں ہوسکتا، مؤلف نے اس کو اپنی طرف سے بڑھا دیا تاکہ اس کا دعویٰ ثابت ہو جائے، لیکن اگر جھوٹ بولنے سے دعویٰ ثابت ہوجایا کرے تو دنیا میں کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے جو ثابت نہ ہو جائے۔

بہر حال حضرت معاویہؓ نے حضرت عبداللہ پر جھوٹی حدیثیں بنانے کا الزام ہرگز نہیں رکھا ہے، اور کیوں رکھیں گے جب کہ ان سے یہ بیان ہی نہیں کیا گیا ہے عبداللہ فلاں، فلاں حدیث رسول بیان کرتے ہیں۔

اس پر حاشیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اور کسی جگہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ جو بات پہونچائی گئی تھی اس کو حدیث رسول کے عنوان سے عبد اللہ نے بیان کیا ہے۔''؎۲

حضرت خالدؓ بن ولید کا دفاع

رافضی مصنف نے سپہ سالار اسلام پر تہمت لگائی ہے کہ انھوں نے ایک صحابی کو قتل کیا، اس کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مالک بن نویرہ صحابی کو قتل کیا اور اس کی زوجہ قبل عدت گذرنے کے تصرف کیا۔''؎۳

حضرت ابوالمآثر اس کے افتراء کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مرزا صاحب نے مالک بن نویرہ کو صحابی لکھ کر ناظرین کو اس دھوکہ میں ڈالنا چاہا ہے کہ وہ قتل کے وقت مسلمان تھا، حالاں کہ یہ بالکل غلط ہے، مالک کو بے شبہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کی وصولی پر مامور فرمایا تھا، مگر

جب اس نے آنحضرتؐ کی خبر وفات سنی تو جتنا کچھ وصول کر چکا تھا وہ سب اپنی قوم کو واپس کردیا اور کہا: لواب تم کو اس شخص سے نجات مل گئی۔[۴۴]

اور حافظ ابن عبدالبر استیعاب میں لکھتے ہیں:

قتل على يديه أكثر أهل الردة منهم مسيلمة ومالك بن نويرة۔ یعنی خالد کے ہاتھوں سے اکثر مرتدین قتل ہوئے، انھیں میں سے مسیلمہ اور مالک بن نویرہ بھی ہیں۔‘‘[۴۵]

حضرات گرامی!

شیعوں کی خصلت وعادت کے مطابق رجال بخاری کے مصنف نے صحابہ کرام کی بہت بڑی جماعت (جن سے امام بخاری نے روایت حدیث قبول کی ہے) کو نعوذ باللہ غیر عادل، کاذب اور موضوع احادیث کی روایت کرنے کا الزام دینے میں ہر قسم کے جھوٹ، فریب کا سہارا لیا ہے، جن صحابہ کرام کا راقم نے ذکر کیا ان کے علاوہ عبادہ بن صامت، عبداللہ بن زبیر، عبد الرحمٰن بن عوف، زبیر بن العوام، عمرو بن العاص، سیدنا عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، عبداللہ بن مسعود، حضرت ابومسعود انصاری، حضرت ابوبردہ اشعری وغیرہم رضی اللہ عنہم کے خلاف اپنے دلی بغض وکینہ اور عناد کا خوب خوب خمار نکالا ہے۔

الحمدللہ حضرت ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہ نے قدم قدم پر مرزا کا تعاقب کیا ہے، اس کے بہتان وافتراء کا دندان شکن جواب تحریر فرما کر حضرات صحابہ کرام کی پاکیزہ جماعت کا بھرپور دفاع فرمایا ہے اور مسکت، منھ توڑ دلائل وشواہد سے رافضی مصنف کی ہر دلیل اور ہر عبارت کی ہوا نکال دی ہے۔

مقالہ کی طوالت کے خوف سے ہم نے مشتے نمونہ از خروارے پر عمل کرتے ہوئے جو کچھ پیش کیا ہے وہ حضرت محدث اعظمیؒ کی عظمت شان اور فن رجال حدیث میں مہارت تامہ کو سمجھانے کے لیے بہت کافی ہے، مزید جانکاری کے لیے ان کی تحریر کردہ کتاب عظمت صحابہ اور تعدیل رجال بخاری کا مطالعہ ان شاء اللہ بہت مفید ہوگا۔

اللہ رب العزت حضرت ابوالمآثر محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو امت مسلمہ کی طرف سے جزائے جزیل اور اجر جمیل عطاء فرمائے کہ انھوں نے دین وشریعت کی حقانیت اور صحابہ کرام کی صداقت وعدالت ثابت کرنے کا حق ادا فرمایا۔□□

حواشی

۱- تعدیل رجال بخاری، ص ۱۷
۲- عظمت صحابہ، ص ۷-۸
۳- تعدیل رجال بخاری (تمہید) ص ۱۸
۴- حیات ابوالمآثر، ص ۶۸۴ ماخوذ از تعدیل رجال بخاری، ص ۱۹
۵- عظمت صحابہ، ص ۲۳-۲۴
۶- اصحاب رسول، ص ۲۲-۲۳
۷- اصحاب رسول، ص ۴۵
۸- عظمت صحابہ، ص ۳۵
۹- عظمت صحابہ، ص ۲۶
۱۰- عظمت صحابہ، ص ۲۹-۳۰
۱۱- الاستیعاب، ج ۱ ص ۲
۱۲- عظمت صحابہ، ص ۱۸-۱۹-۲۰
۱۳- عظمت صحابہ، ص ۳۰
۱۴- عظمت صحابہ، ص ۳۰
۱۵- اصحاب رسول، ص ۶۴)
۱۶- عظمت صحابہ، ص ۴۴-۴۵
۱۷- عظمت صحابہ، ص ۸-۹
۱۸- عظمت صحابہ، ص ۲
۱۹- عظمت صحابہ، ص ۱۰
۲۰- حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق (حرف آغاز) ص ۵، مصنف محمد تقی عثمانی پاکستان
۲۱- عظمت صحابہ ص ۵۸
۲۲- عظمت صحابہ، ص ۶۹
۲۳- عظمت صحابہ، ص ۷۰
۲۴- تاریخ بخاری، ج ۴
۲۵- حیاۃ ابوالمآثر، ج ۲ ص ۱۹۶
۲۶- دفع المجادلۃ، ص ۸
۲۷- دفع المجادلۃ، ص ۱۵-۱۶
۲۸- دفع المجادلۃ عن آیۃ المباہلۃ، ص ۵
۲۹- رجال بخاری، ج ۱ ص ۳ بحوالہ تعدیل رجال بخاری حصہ اول ص ۱-۲
۳۰- تعدیل رجال البخاری، حصہ اول ص ۲
۳۱- تعدیل رجال البخاری، ص ۱۵۔
۳۲- تعدیل رجال البخاری، ص ۱۵-۱۶
۳۳- نووی: ۱/ ۳۰۷)
۳۴- تعدیل رجال بخاری، ص ۱۶
۳۵- رجال بخاری، ص ۹۰ بحوالہ تعدیل رجال بخاری، ص ۲۳
۳۶- تعدیل رجال بخاری حصہ اول ص ۲۳
۳۷- رجال بخاری، ص ۲۲ ماخوذ از تعدیل رجال بخاری، ص ۴۳
۳۸- تعدیل رجال بخاری، ص ۴۴
۳۹- رجال بخاری، ص ۳۵
۴۰- رجال بخاری، ص ۱۳۱
۴۱- تعدیل رجال بخاری، ص ۲۱۷-۲۱۸
۴۲- تعدیل رجال بخاری ص ۲۳۴۔
۴۳- رجال بخاری، ص ۱۱۶
۴۴- تحفۂ اثناعشریہ، ص ۵۳۳، ترجمہ ابن خلدون، ج ۳ ص ۲۶۳
۴۵- تعدیل رجال بخاری، ص ۹۲-۹۳

حضرت محدث اعظمیؒ اور ردِّ شیعیت

مولانا عبد العلی فاروقی★

یوں تو محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کا اپنا پسندیدہ ومنتخب کردہ میدانِ خدمت علم حدیث اور اس کی بھی سب سے مشکل و امتیازی فرع ''اسماء الرجال'' تھا اور اس میدان کے وہ ایسے فرد فرید تھے کہ عرب وعجم کے محدثین وکبار علماء نے ان کی اس فن میں مہارت وبرتری کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ حسب توفیق ان سے استفادہ کرنے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے پر فخر کیا و ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ لیکن اس علم شریف میں مکمل انہماک کے باوجود حق تعالیٰ نے ان سے اپنے دین حق کی نصرت وحمایت کا دیگر عنوانات سے بھی ایسا کام لیا کہ ان کے اخلاف ہی نہیں، ان کے معاصر علمائے اعلام بلکہ اور آگے بڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اپنے اکابر نے بھی انہیں قدر و رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ان پر اعتماد بھی کیا اور ان کی خداداد صلاحیتوں کو اظہار وابلاغ کے مواقع فراہم کرتے ہوئے امت مسلمہ کو اس چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کے سامان بھی فراہم کئے۔ چنانچہ تحریر وتقریر اور مباحثہ ومناظرہ کے ذریعہ احقاق حق اور ابطال باطل کی جو خدمت ان کے ذریعہ انجام پائی اس کی مثال ان کے معاصر عہد میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر ملک کے اہم ترین اور مرکزی دینی مدارس دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں خدمت حدیث کے حوالہ سے ان کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ان مدارس سے باقاعدہ وابستگی کے لئے ان سے اصرار ہوا تو ختم نبوت کی حفاظت وحمایت، فتنۂ انکار حدیث کے رد وابطال اور رد شیعیت، رد رضا خانیت، رد غیر مقلدیت وغیرہ جیسے ''بہ ظاہر داخلی فتنوں'' کے تعاقب کے لئے بھی ان کے خردوں وہم سروں ہی نے نہیں ان کے بڑوں نے بھی ان کی خدمات حاصل کیں، اور حق تعالیٰ کی خصوصی مدد اور توفیق سے انہوں نے ہر محاذ پر دین حق کی شبیہ کو خس و خاشاک سے پاک کرتے ہوئے اپنی مدلل اور مسکت و دندان شکن تحریروں وتقریروں کے ذریعہ ہوس پرستوں ورخنہ اندازوں کے حوصلے پست کرتے ہوئے ان کے اس طرح دانت کھٹے کئے کہ ان کی کمر ٹوٹ گئی اور حق روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آ گیا۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

اس مقام پر اس ''عمومی مریضانہ ذہنیت'' کی طرف اشارہ کرنا بھی مناسب ہے کہ ارباب علم واصحاب فیض کے اعتراف اور ان کی خدمات کی حوصلہ افزائی کے لئے ''معاصرت'' کے حجاب کی ہر دور میں کارفرمائی رہی ہے۔ اور ماضی قریب سے لے کر ماضی بعید تک تاریخ کے ذخیرہ سے ایسی بے شمار شخصیات کو نکال کر پیش کیا جا سکتا ہے جن کے کمالات اور فیوض علمی کا کما حقہ اعتراف واظہار ان کے معاصرین کی طرف سے نہیں ہو سکا، لیکن حضرت محدث اعظمی کی علمی جلالت اور دائرۂ خدمات کے اعتراف اور ان سے استفادہ کا سلسلہ ان کے معاصرین ہی کی طرف سے ہونے لگا تھا، اور راقم الحروف کا اپنا حسن ظن یہ ہے کہ یہ برکت اس علم شریف کی ہے جسے حضرت والا کا طغرائے امتیاز قرار دینا مناسب وموزوں ہے، یعنی علم الحدیث اور اس کے ذیل میں ان کی جاں سوزی وجگر کاہی، اور اس کے نتیجہ میں ان لعل وگہر کی دریافت جس نے معاصر اکابر واعاظم کو بھی ان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا؟ اور پھر اس علم مبارک سے ایسی گہری وابستگی اور اس کے ساتھ امتیازی انہماک ہی کا ایک اثر خود ان کی اپنی شخصیت پر یہ ظاہر ہو کر رہا کہ درس گاہ نبوت کے اولین وبلا واسطہ طلبہ یعنی حضرات صحابہ کرامؓ سے عقیدت ومحبت کے سلسلہ میں ان کی ''ایمانی حس'' اس درجہ بیدار تھی کہ وہ اس قدوسی جماعت کے کسی بھی فرد کے سلسلہ میں اشارتاً وکنایۃً بھی کسی ادنیٰ بے توقیری کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کو ''معیار حق'' یقین کرنے وجہ سے ان کی روش سے انحراف کرنے یا ان کی کسی بھی درجہ میں تخفیف کرنے والے کسی بھی گروہ یا فرد کو وہ گمراہ گردانتے ہوئے اسے کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے بلکہ اور اس سلسلہ میں انہیں ''خوشگوار'' کے ساتھ ہی ''ناخوشگوار فریضہ'' بھی اس وقت انجام دینے میں کوئی تامل نہیں ہوا جب انہوں نے غیرت حق سے سرشار ہو کر ''اپنوں'' کا بھی محاسبہ اسی طرح کیا جس طرح ''غیروں'' کا کیا؟ یہی وجہ ہے کہ رد وابطال کے سلسلہ میں حضرت محدث اعظمیؒ کے تحریری مواد کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ معاندین ومبغضین صحابہؓ کے سلسلہ میں ان کے قلم کی دھار اور کاٹ کا بھی کچھ دوسرا ہی رنگ ہوتا ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں ان کی زخمی روح کی صدائیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔

جہاں تک مذہب شیعہ کا معاملہ ہے تو چوں کہ اس مذہب کی اساس و بنیاد ہی بغض وعناد صحابہؓ پر ہے اس لئے اس مذہب کے مزخرفات کا رد وابطال کرتے ہوئے ان کے قلم میں کچھ اور بھی تیکھا پن اور ان کی تحریروں میں

★ مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''البدر'' وناظم دارالعلوم فاروقیہ کاکوری لکھنؤ

شوخی کا رنگ کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوتا ہے۔مثال کے لئے صرف دو تحریری حوالے یہاں پیش کئے جا رہے ہیں:

(۱)''ہم کو اس بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ آپ نے اتحاد پر تقریر کی یا نہیں کی، لیکن اتنا تو ہم ضرور کہیں گے کہ آپ نے اگر اتحاد کی دعوت بھی دی ہوگی تو اس کی حقیقت دھوکے کی ٹٹی سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگی کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً اور ناواقف سنیوں کو اتفاق کا سبز باغ دکھا کر اپنے مذہب کی اشاعت کی خفیہ کارروائی کے سوا آپ کا اور کوئی مقصد نہیں ہوگا اس لئے ہم آپ کی کوششوں کی کوئی داد نہیں دے سکتے۔ ہمارے نزدیک تو اس منافقانہ اتحاد سے وہ اختلاف ہزار درجہ بہتر ہے جس کی بنیاد نیک نیتی پر ہو۔اور آپ سے زیادہ مجھے ان علمائے اہلسنت پر افسوس آتا ہے جنہوں نے آپ کی جبلّی خصوصیات کے جاننے اور اس دعوت اتحاد کی حقیقت سمجھنے سے پہلے آپ کی آواز پر لبیک کہنے کو آمادہ ہوئے کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاءً ونداءً۔ یہ ان بے چاروں کی سادہ لوحی ہے۔ اور اگر جان بوجھ کر اغماض کیا ہے تو مداہنت فی الدین ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اہل سنت کی یہی غفلت و بے پروائی آپ کے مذہب کے شیوع وترقی کا باعث ہے ورنہ اگر علمائے اہل سنت نے آپ کی تلبیسات وتمویہات اور آپ کے مکائد سے واقف ہونے کی کوشش کی ہوتی اور عوام کو بھی اس سے آگاہ وخبردار کرتے تو مذہب شیعہ اب سے بہت پہلے زھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً کا مصداق بن چکا ہوتا......(مقدمہ دفع المجادلۃ عن آیۃ المباہلۃ ص ۳-۴، طبع قدیم)

(۲)''......اسی وجہ سے اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ صحابہؓ و خلفاءؓ کے تقدس و بزرگی کا قائل نہ ہونا اور ان کی دین داری وتقدس میں قدح کرنا، قرآن واسلام کے انکار وتکذیب کے مرادف ہے۔مگر دنیا میں اللہ کی ایک ایسی مخلوق بھی آباد ہے جو باوجود ادعائے اسلام، صحابہ کرام سے بغض و عداوت رکھنے اور ان کے حق میں بدگوئی اور گستاخی کرنے اور ان کی تکفیر وتضلیل کو عبادت عظمٰی بلکہ لازمۂ دین وایمان تصور کرتی ہے، اور اس کی اصلاً پرواہ نہیں کرتی کہ اس کے عقیدہ سے قرآن کریم کی کتنی آیات کی تکذیب لازم آتی ہے۔آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ میرا روئے سخن شیعہ صاحبان کی طرف ہے، شیعہ صاحبان کا یہ عقیدہ قطعاً محل تعجب نہیں ہے جو جانتا ہے کہ شیعہ صاحبان کا براہ راست قرآن کریم کی نسبت اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن اصلی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، نہیں ہے بلکہ موجودہ قرآن میں ہر قسم کی تحریفات ہیں۔ ہاں یہ بات البتہ محل تعجب ہے کہ اپنے مزعومہ ائمہ معصومین کے جن اقوال و افعال کو وہ قرآن سے زیادہ واجب التعظیم وقابل احترام سمجھتے ہیں، صدہا دوسرے مسائل کی طرح مسئلہ تعظیم و اکرام صحابہ وخلفاء میں بھی ان کی تکذیب اور مخالفت کو ضروری جانتے ہیں۔''

(مقدمہ ارشاد الثقلین ۲۔بجواب اتحاد الفریقین، ص ۲ طبع قدیم)۔

درج بالا دونوں تحریریں بہ طور نمونہ حضرت محدث اعظمیؒ کی دنیا کے سب سے بڑے گستاخان صحابہؓ یعنی شیعوں کے جواب پر تیکھی ودھاردار اور بے لاگ عبارت آرائی کی مثال میں پیش کی گئیں، جہاں تک ردشیعیت کے سلسلہ میں حضرت محدث اعظمیؒ کی مدلل گرفتوں کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں مجموعی طور پر اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ انہوں نے حسب ضرورت جن جن موضوعات پر قلم اٹھایا اپنے حریف کو لاجواب ومبہوت کر کے چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی پاکیزہ عمارت کے مقابلہ میں تعمیر کئے جانے والے شیعیت کے''شیش محل'' کو زمین بوس کرنے والی چودہویں صدی ہجری کی مسلم الکل و معتمد علیہ شخصیت امام اہلسنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ کو حضرت محدث اعظمیؒ پر بھرپور اعتماد تھا، اور حضرت اعظمیؒ کی ردشیعیت کے موضوع پر بیشتر تحریریں حضرت امام اہلسنتؒ کی فرمائش نیز ترغیب وتحریض پر ہی معرض وجود میں آئیں، اس طرح انہوں نے اپنی بے پناہ دیگر علمی مشغولیات میں سے وقت نکال کر ایک دینی فریضہ سمجھتے ہوئے حضرت امام اہل سنتؒ کو اپنا بیش قیمت علمی تعاون ہی نہیں عطا کیا بلکہ اسلام کے خلاف ہونے والی''سبائی سازش'' کے تار و پود بکھیر دیئے۔ظاہر سی بات ہے کہ حضرت محدث اعظمیؒ کا اپنا جو بااعتماد علمی وتحقیقی رنگ تھا وہ ردشیعیت کے سلسلہ میں ان کی تحریروں میں بھی ظاہر ہوا اور ان کے جچے تلے و مدلل تجزیوں نے حریف کی لن ترانیوں پر قدغن لگانے کا کام انجام دیا، اس جگہ چند مثالوں کے ذریعہ اس کی وضاحت کرنا مناسب ہوگا، جو درج ذیل ہیں:

۱:-''ابوالائمہ کی تعلیم'' میں حضرت امام اہلسنتؒ نے خلفائے ثلاثہ (حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ) سے حضرت علیؓ کے انتہائی خوشگوار تعلق و رشتوں کا ثبوت شیعوں کی مستند ومعتبر کتابوں سے پیش کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ حضرت علیؓ ان تینوں کو اپنا امام وپیشوا تسلیم کرتے ہوئے ان کی اقتدا میں نمازیں بھی ادا کرتے تھے۔

اس کے جواب میں''اتحاد الفریقین'' کے شیعہ مصنف نے جو تاویلات فاسدہ کی ہیں، ان کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حضرت محدث اعظمیؒ یوں رقم طراز ہیں:

''شیعہ صاحب اس کا بھی انکار نہیں کر سکے ہیں کہ حضرت علیؓ خلفاء کے پیچھے نماز پڑھتے تھے لیکن جب اس واقعہ کا انکار ممکن نہ ہوا تو تاویل کے درپے ہو گئے، غنیمت تھا کہ وہ اس کی کوئی لطیف اور قابل قبول تاویل کرتے، لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے دو تاویلیں کیں اور دونوں نہایت بھونڈی۔ پہلی تاویل یہ کی ہے کہ اہلسنت کی صحاح سے ثابت ہے کہ فاجر کے پیچھے بھی نماز

ہوجاتی ہے،لیکن کوئی شیعہ مصنف سے پوچھے کہ آپ کو کچھ بسنت کی خبر ہے؟ اہلسنت کی کتابوں سے اگر یہ ثابت ہے تو آپ کو کیا فائدہ؟ آپ کے مذہب میں تو اس کے خلاف یہ تصریح مجود ہے فلا تجوز الصلوۃ خلف الفاسق و لاخلف مجہول الحال (دیکھو نعم الزاد وغیرہ فقہ شیعہ) یعنی فاسق کے پیچھے اور جس کا حال معلوم نہ ہو اس کے پیچھے بھی نماز جائز نہیں ہے۔اسی کو کہتے ہیں سوال از آسمان، جواب از ریسمان۔

دوسری تاویل یہ کی ہے کہ کسی کے پیچھے نماز کے لئے کھڑے ہوجانے سے اقتدا نہیں ثابت ہوتی جب تک کہ پیچھے کھڑا ہونے والا اقتدا کی نیت نہ کرے۔اس تاویل کی ''معقولیت'' میں شبہ نہیں،لیکن مصنف ذرا یہ فرمادیں کہ حضرت علی خلفاء کے پیچھے صرف کھڑے ہی ہوتے تھے یا ان کے ساتھ ساتھ مقتدیوں کی طرح رکوع وسجدہ اور قومہ وقعدہ بھی کرتے تھے؟اگر یہ سب افعال بھی کرتے تھے اور یقینا کرتے تھے تو بتایئے بلا نیت اقتدا ایسا کرنا صریح فریب کاری اور سخت گمراہ کن حرکت تھی یا نہیں؟......یہ بات حضرت علی کے ساتھ کچھ مخصوص نہیں، دوسرے ائمہ بلکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی شیعوں نے اس قسم کی باتیں نہایت بے با کی سے منسوب کی ہیں۔، چنانچہ کافی کی کتاب الجنائز میں اس قسم کی چند حدیثیں مذکور ہیں۔ نمونہ کے طور پر حضرت امام حسینؓ کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

''امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ منافقوں میں سے ایک شخص مر گیا تو امام حسین علیہ السلام اس کے جنازہ کے ساتھ (تھے؟) راستہ میں امام حسین علیہ السلام کا ایک غلام ملا، امام نے اس سے پوچھا کہ تو کہاں جاتا ہے، اس نے کہا کہ میں اس منافق کی نماز جنازہ سے بھاگتا ہوں، امام حسین علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ تو میرے دائیں طرف کھڑا ہوجا اور جو مجھے کہتا سنے وہی کہتا جا، جب اس میت کے ولی نے تکبیر کہی تو امام حسین نے اللہ اکبر کے بعد یہ کہنا شروع کیا کہ اے اللہ تو اپنے بندے پر ہزار لعنتیں بھیج جو ساتھ ساتھ ہوں، مختلف نہ ہوں، اے اللہ اپنے اس بندے کو تمام بندوں میں اور شہروں میں ذلیل کر اور رسوا کر اور اپنی آگ کی سوزش میں اس کو پہنچا اور اپنا سخت ترین عذاب اس کو چکھا، بیشک وہ ان میں سے تھا جو تیرے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں، اور تیرے نبی کے اہلبیت سے بغض رکھتے ہیں'' (کافی، کتاب الجنائز، ص ۹۹)

غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی فریب کاری ہے کہ ایک منافق کی نماز جنازہ میں امام معصوم شریک ہوئے، یہ مانا کہ آپ نے اس کے لئے بددعا کی، لیکن لوگوں کو اس کی کیا خبر؟ لوگوں نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ آپ نے میت کے لئے دعائے خیر کی ہوگی اور میت کو دعائے خیر کا اہل سمجھا ہوگا، حالاں کہ وہ ایسا نہیں تھا، پھر اس فریب کے لئے یہ اہتمام کہ ایک شخص اس کی نماز پڑھنے سے بھاگتا تھا تو اس کو بھاگنے بھی نہ دیا۔

پھر شیعہ مصنف یہ بھی بتائیں کہ حضرت کو اس نمائشی اقتدا کی کیا ضرورت تھی؟ اگر یہ کہیں کہ شیخین اور ان کے ہم نواؤں کی ایذا رسانی کے اندیشہ سے ایسا کرتے تھے تو یہ غلط ہے۔اس لئے کہ جس روایت میں حضرت علی کا خلفاء کے پیچھے نماز پڑھنا مذکور ہے اسی میں ان کی معجزانہ قوت وشجاعت کا راگ یوں الاپا گیا ہے کہ ''حضرت علی نے خالد بن ولید کا گلا اپنی دو انگلیوں سے اس طرح گھونٹ دیا کہ خالد کی آنکھیں نکلی پڑتی تھیں، حضرات شیخین اور دیگر صحابہ دیکھتے رہے اور کچھ بول نہ سکے، آخر جب لوگوں نے بہت کہا سنا تو حضرت علی نے چھوڑا'' اور اسی روایت میں ہے کہ

''اس کے بعد حضرت علی نے ایک دفعہ لوہے کا ایک ستون موڑ کر خالد کی گردن میں طوق کی طرح پہنا دیا، خالد اور خالد کے تمام حمایتیوں نے اس کو توڑ کر نکالنا چاہا مگر نکل نہ سکا، آخر حضرت علی ہی نے نکالا تو نکلا۔''

پس جس شخص کی بہادری کا یہ حال تھا اس کو کسی کا کیا ڈر ہوسکتا تھا؟

(ارشاد الثقلین، ص ۱۱، تا ۱۳)

(۲) مشورہ غزوۂ روم: نہج البلاغہ میں ایک دوسرا مشورہ بھی مذکور ہے جو حضرت علیؓ نے سیدنا امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو جنگ روم کے موقع پر دیا تھا ''ابو الائمہ کی تعلیم'' میں اس مشورہ کو نقل کر کے لکھا گیا ہے کہ اس سے حسب ذیل قیمتی نتائج حاصل ہوتے ہیں:

(۱) حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کو اپنا مخلص جانتے تھے، مشورہ اسی سے طلب کیا جاتا ہے جس کی محبت واخلاص پر پورا پورا اعتماد ہوتا ہے۔

(۲) حضرت علیؓ نے اس دین کے متعلق جو حضرت عمرؓ کا اور تمام صحابہؓ کا تھا فرمایا کہ اللہ اس کی عزت کا ذمہ دار ہے، اور اس دین والوں کی خدا نے بے سروسامانی میں مدد کی، وہ خدا اب بھی موجود ہے۔معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ کے نزدیک حضرت عمرؓ کا اور تمام صحابہؓ کا دین وہی تھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے، کیوں کہ یہ سب اوصاف اسی دین کے ہیں۔

(۳) حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کی ذات اقدس کو بے مثل و بے نظیر جانتے تھے اور ان کا یہ اعتقاد تھا کہ حضرت عمرؓ کے بعد مسلمانوں کو روئے زمین پر کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

(۴) حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو مسلمانوں کا مددگار اور ملجا و ماویٰ فرمایا۔

(۵) حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو میدان جنگ میں جانے سے روکا کہ مبادا وہ شہید نہ ہوجائیں، اگر بقول شیعہ حضرت علی کو ان سے عداوت ہوتی تو روکنے کے بجائے میدان جنگ میں جانے کی ترغیب دیتے اور ان کی

شہادت کو مسلمانوں کے لئے راحت تصور کرتے۔

ہاں ضمیمہ اتحاد الفریقین میں سید العلماء صاحب نے اس مشورہ کی توجیہہ میں پہلے سے زیادہ اپنی لفاظیوں کے جوہر دکھائے ہیں اور ان امور میں جن کا تاریخ میں کہیں نشان تک نہیں ہے، وہ وہ قیاس آرائیاں کی ہیں کہ یوروپین مورخین جو اس میں بہت بدنام ہیں ان کو بھی سید العلماء نے شرما دیا ہے۔ سید العلماء کی عبارت کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، لکھتے ہیں:

''انسان کی بلند ترین صفت یہ ہے کہ جب مفاد شخصی اور مفاد نوعی و اجتماعی میں تصادم ہو تو مفاد نوعی کو مقدم رکھا جائے، انسان کی بلند صفت یہ ہے کہ وہ فرض شناسی کو ہر مقام پر مقدم رکھے، اگر وہ اس کے کسی نفسانی جذبہ کے خلاف ہو...... حضرت علی نے کبھی اسلامی و اجتماعی معاملات میں اپنی ذاتی مخالفت اور نفسانیت دشمنی و عداوت کو دخل نہیں دیا...... بلکہ ہمیشہ امانت و دیانت کے خیال کو ذاتی اغراض و مقاصد اور خیالات پر مقدم کیا''۔

پھر لکھتے ہیں:

''ذاتی اختلاف کے ساتھ مصالح عامہ کی طرف صحیح رہنمائی کرنا وہ صفت ہے کہ جو انسانی اوصاف کا جوہر امتیاز ہے اور وہی امیر المومنین کے طرز عمل میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

حق برزبان جاری

الحمدللہ کہ سید العلماء نے علی الرغم تسلیم کر لیا کہ حضرت علی کی امامت نہ منصوص من اللہ تھی نہ حضرت علی کا یہ دعویٰ تھا،......اس حق گوئی کے صلہ میں ہم سید العلماء کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اہل سنت کو خوشخبری سناتے ہیں کہ۔

للہ الحمد میان من و او صلح فتاد

حوریاں رقص کناں ساغر و پیمانہ زدند

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اپنے عمیق رنج اور انتہائی آزردگی بلکہ نفرت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ سید العلماء نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ان کے الفاظ سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان ساری باتوں کا تعلق شخصی مفاد سے تھا، امامت کی خواہش ہو یا فدک کا مطالبہ یا دوسرے امور، یہ سب نفسانی جذبہ اور ذاتی اغراض و مقاصد کے ماتحت تھے (أستغفر اللہ)

اہلسنّت کے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دامن عزت ان تمام آلائشوں سے بالکل پاک و صاف ہے، اور کوئی سنی اس توہین کو برداشت نہیں کر سکتا۔

سطور منقولۂ بالا سے شیعہ حضرات کے دعویٰ محبت اہلبیت کی حقیقت خوب منکشف ہوگئی اور ہر صاحب نظر نے دیکھ لیا کہ دوستی کے پردہ میں کیا کارروائیاں کی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کے مشورۂ غزوۂ روم نے شیعہ حضرات کو حواس باختہ کر دیا ہے، وہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اکابر نے بڑی محنتوں سے جو گھروندا بنایا تھا وہ اس مشورہ کے الفاظ کی ایک ایک ٹھیس سے خاک کے برابر ہوتا چلا جا رہا ہے...... کہاں تو یہ دعویٰ تھا کہ حضرت علی کی امامت منصوص من اللہ تھی، تمام انبیاء سے ولایت علی و بقیہ ائمہ کا عہد و میثاق لیا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار تاکید ہوئی کہ امامت علی کا اعلان کیجئے اور جب مخالفین کی وجہ سے آپ کو کچھ تامل ہوا تو آیت یا ایہا النبی بلغ ما انزل الیک من ربک فان لم تفعل فما بلغت رسالتہ نازل ہوئی۔ لہٰذا آپ نے غدیر خم میں امامت علی کا اعلان کیا اور لوگوں سے اس پر عہد لیا، لیکن اس عہد پر سوائے ابوذر، عمار، مقداد، اور سلمان کے اور کوئی قائم نہ رہا، عقائد کی کتابوں میں نہایت دھوم دھام سے یہ ثابت کیا کہ مسئلہ امامت بھی اصول دین میں سے ہے جس طرح توحید و رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مسئلہ امامت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے......لیکن سید العلماء صاحب جب علی کے اس مشورہ (غزوۂ روم کے موقع پر حضرت عمرؓ کو مشورہ) کی توجیہ کرنے بیٹھے تو ان ساری باتوں کو بھول گئے اور حضرت علی کی مخالفت خلفاء کو ذاتی مخالفت و نفسانیت، ان کے اختلاف کو ذاتی اختلاف اور حضرت علی کے مخالفانہ جذبات کو نفسانی جذبات، اور ان کے اغراض و مقاصد کو ذاتی اغراض و مقاصد قرار دینے لگے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر مسئلہ امامت کا اصول دین سے ہونا صحیح ہے تو سید العلماء کی مذکورہ بالا توجیہ غلط ہے اور اگر یہ توجیہہ مطابق واقع ہے تو مسئلہ امامت کی جو مذہبی اہمیت بیان کی جاتی ہے وہ سب غلط ہوئی جاتی ہے۔ (تلخیص از ارشاد الثقلین، ص ۲۱، تا ص ۲۵، مصنفہ حضرت محدث اعظمیؒ)۔

(۳) امام اہلسنت حضرت مولانا محمد عبد الشکورؒ نے آیۃ مباہلہ کی تفسیر لکھی، جس کے جواب میں شیعہ عالم اعجاز حسن بدایونی نے ''برہان مجادلہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھ دی۔ اس جواب کے جواب میں حضرت محدث اعظمیؒ کی فیصلہ کن اور ختام المسک کتاب ''دفع المجادلۃ عن آیۃ المباہلۃ'' شائع ہوئی۔ جس میں شیعوں کے قبلہ و کعبہ کا تعاقب کرتے ہوئے حضرت اعظمیؒ نے ان تمام ہرزہ سرائیوں کا بھرپور جواب دیا ہے۔ قبل اس کے کہ اس کتاب سے حضرت محدث اعظمیؒ کی تحقیق و تدقیق اور دندان شکن جوابات کے کچھ نمونے پیش کئے جائیں، مناسب ہے کہ اس کتاب کے مقدمہ سے ایک

اقتباس پیش کردیا جائے جس میں حضرت محدث اعظمیؒ کے تحریری رنگ و آہنگ ہی نہیں، مذہب شیعہ پر ان کی گرفت اور اپنے مذہب حقہ اور اس کے ترجمانوں پر اعتماد کا بھی پوری طرح اظہار ہو رہا ہے۔ چنانچہ حضرت اعظمیؒ رقم طراز ہیں:

"چوں کہ اس سلسلہ میں شیعوں نے واقعہ مباہلہ کی بہت زیادہ غیر معمولی اہمیت بیان کی اور آیۃ مباہلہ کا صحیح مفہوم مسخ کر کے اپنی باطل آرا تقریروں سے بہت سے غلط اور بے بنیاد مفاہیم کو اس کا مفاد قرار دیا، اس لئے ناصر ملت حنفیہ، حامی سنت سنیہ، شجو الحساد و غیظ العناد حضرت مولانا مولوی محمد عبدالشکورؒ صاحب مدیر "النجم" نے آیۃ مباہلہ کی صحیح تفسیر لکھ کر شیعوں کی تمویہات کا پردہ چاک کر دیا اور وہ قصر خلافت بلافصل جس کی بنیاد شیعوں نے اس آیت کے غلط مفہوم پر رکھی تھی، خاک کے برابر نظر آنے لگا۔ اگلوں اور پچھلوں کی محنت کو یوں برباد ہوتے دیکھ کر مولوی اعجاز حسن بدایونی آپے سے باہر ہو گئے اور ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، آپ نے تفسیر آیت مباہلہ کا جواب لکھنے کی ٹھان لی، آپ کو شیعہ جماعت کا کافی تجربہ ہے اور معلوم ہے کہ اس جماعت کا مبلغ علم وفہم کیا ہے؟ آپ پر یہ بھی اچھی طرح واضح ہے کہ یہ جماعت صرف اتنا دیکھتی ہے کہ فلاں رسالہ یا کتاب کے جواب کے نام سے کوئی رسالہ چھپ گیا ہے باقی ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کیا جواب ہوا اور جواب صحیح بھی ہے یا نہیں، اس لئے آپ کو جواب لکھنے میں کوئی زحمت بھی نہ تھی، چنانچہ آپ نے "تفسیر آیۃ مباہلہ" کو سمجھنے سے پہلے اور اس بات پر غور کرنے سے قبل کہ اس کی کن کن باتوں کا کیا کیا جواب ہو سکتا ہے، ایک رسالہ بنام "برہان مجادلہ" اس کے جواب میں شائع کر دیا۔ رسالہ کیا ہے خرافات کی ایک پوٹ مفتریات کا ایک مجموعہ اور مذہب شیعہ کی خصوصیات کا ایک مظہر اتم اور مصنف کی علمی قابلیتوں کا ایک آئینہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ ہرگز اس قابل نہ تھا کہ وقت عزیز کا کوئی حصہ اس کا جواب لکھنے میں صرف کیا جائے لیکن محض اس خیال سے کہ کہیں (بر؟) خود غلط مصنف اس سکوت کو عجز پر محمول نہ کر لے، لہٰذا اس رسالہ کا دنداں شکن جواب لکھتا ہوں اور اپنے رسالہ کو "دفع المجادلۃ عن آیۃ المباہلۃ" کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔ و اللّٰہ ولی التوفیق و منہ الہدایۃ الی سواء الطریق "ص ۲-۳"

اس مقدمہ کے بعد حضرت محدث اعظمیؒ 'برہان مجادلہ' کے مشمولات کو زیر بحث لاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اس کے بعد مصنف رسالہ نے مقابلہ میں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو بزعم مصنف ارض اللہ میں فساد پھیلاتے ہیں اور ان کی مفسدہ پردازی یہ دکھائی ہے کہ وہ شیعوں کی تکفیر کرتے ہیں اور اس کے وجوہ تکفیر پر کلام کیا ہے، ہم کو اس بحث میں چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ آپ نے تکفیر کو مفسدہ پردازی کہتے وقت شاید امام جعفر صادق کا وہ قول فراموش کر دیا تھا جس میں انہوں نے چار کے سوا بقیہ تمام صحابہ رسول کو مرتد و کافر کہہ ڈالا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے جو شیعوں کی تکفیر کرنے والوں کو ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون کا مصداق قرار دیا ہے، اس سے آپ کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ مہربان! جب آپ کے زعم میں تکفیر شیعہ پر نہ آیۂ قرآنی موجود ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث متواتر۔ (دیکھئے برہان مجادلہ، ص ۸) تو آپ کی تکفیر حکم بما انزل اللہ ہوئی یا عدم حکم بما انزل اللہ؟ اگر پہلی شق ہے تو صحیح ہے لیکن آیت مذکورہ بالا میں اس کا بیان نہیں ہے، اور اگر دوسری شق ہے تو کیسے؟

دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے تکفیر شیعہ کی جو پہلی وجہ بیان کی ہے، اس کا جواب لکھا ہے، اس میں سخت غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کس مفتی نے یہ لکھا ہے کہ صحابہ کرام کو شیعہ گالیاں دیتے ہیں لہٰذا یہ لوگ کافر ہیں؟ علمائے اسلام تو قدیماً وحدیثاً یہ تصریح کرتے چلے آرہے ہیں کہ سبّ صحابہ کی وجہ سے شیعہ کافر نہیں ہیں بلکہ فاسق ہیں۔ اس کے بعد آپ کا یہ لکھنا کہ ہمارے مذہب میں گالی بکنا قطعاً حرام ہے۔ دوسرا جھوٹ ہے۔ آپ کی مذہبی کتابیں تو یہ بتاتی ہیں کہ گالی بکنا خدا کے ذکر سے بھی زیادہ موجب ثواب ہے۔ کیا آپ کی کتابوں میں یہ نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر وعمر پر لعنت ہر صبح بھیجنا ستّر نیکیوں کے برابر ہے؟ اور کیا آپ کے مذہب میں لعن عمر رضی اللہ عنہ کو ذکر الٰہی و تلاوت قرآن مجید پر ترجیح نہیں ہے؟ (تحفہ، ص ۵۶۲) کیا آپ کی کتابوں میں یہ مذکور نہیں ہے کہ ایک شخص امام جعفر صادق کے پاس دو قمیص سی کر لایا اور کہا کہ ایک کو ذکر الٰہی کر کر کے سیا ہے اور دوسری کو لعن و تبرائے شیخین کر کے، تو امام صادق نے قبائے لعنت کو پسند کیا؟ اور کیا یہ واقعہ آپ کی معتبرات میں نہیں ہے کہ سید الساجدین کے سامنے ایک شخص نے پانی پیا اور پانی پی کر شیخین پر لعنت بھیجی اور جب وہ جانے لگا تو امام مذکور نے اس کو بلایا اور فرمایا کہ اگر میں تم سے کچھ مانگوں تو دے سکتے ہو؟ اس نے کہا حضور کا غلام ہوں یہ میری عین سعادت مندی ہے کہ حضور کی کوئی خدمت بجا لاؤں، آپ نے فرمایا کہ ان کلمات لعن کا ثواب مجھے دے دے اور پورے ایک دن اور ایک رات کی میری عبادتوں کا ثواب مجھ سے تو لے لے۔ (منتہی الکلام، ص ۴۹۴)

اللہ اکبر! کیا ان روایات کے بعد بھی کوئی شیعہ یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ گالی بکنا ہمارے مذہب میں جرم ہے؟ حضرت! آپ کے مذہب کا یہ

مسئلہ اتنا مشہور ہے کہ شعراء نے بھی اس کو نظم کر دیا ہے ؎

دشنام بہ مذہبے کہ طاعت باشد
مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم

چوتھی بات یہ ہے کہ جس طرح تکفیر کی پہلی وجہ مصنف کی خودساختہ ہے اسی طرح یہ بھی مصنف کا افتراء واختراع ہے کہ اہل سنت تبرا بازی اور انکار خلافت ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی وجہ سے شیعوں کو کافر کہتے ہیں......''

(دفع الجادلۃ، ص ۴-۵ طبع قدیم)

(۴) قرآن مجید میں سورۂ آل عمران کی آیت کریمہ فقل تعالوا ندع ابناءنا و ابناءکم و نساء نا و نساءکم و انفسنا و انفسکم ثم نبتہل الخ میں حق تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عیسائیوں سے جس دعوت مباہلہ کا حکم دیا ہے، اس کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے شیعہ حضرات اس آیت کریمہ کے ذریعہ حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل اور تمام صحابہ کرام میں ان کی افضلیت ثابت کرنے کی بات کرتے ہوئے حضرت علیؓ کو نفس رسول قرار دیتے ہیں بی بی حضرت امام اہلسنتؒ نے اس ''آیۃ مباہلہ'' کی صحیح تفسیر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ اس آیت میں واقع لفظ انفسنا کا صریح مفہوم خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت (تمام صحابہ کرامؓ) ہے۔ اور اس سے حضرت علیؓ کو مراد لینا، اور آیت کریمہ سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل یا تمام صحابہ پر ان کی افضلیت ثابت کرنا قرآن مجید کی تحریف ہے بی بی اور اپنے اس دعویٰ کو انہوں نے قرآن و حدیث نیز کتب شیعہ کے حوالوں اور نقلی وعقلی دلائل سے مدلل کیا ہے۔ ''برہانہ مجادلہ'' کے شیعہ مصنف مولوی اعجاز حسن بدایونی نے امام اہلسنتؒ کی اس تفسیر کا رد کرتے ہوئے اپنے موقف پر اصرار کیا اور اپنے زعم فاسد کے مطابق ''تفسیر آیت مباہلہ'' پر ایسے ایسے مضحکہ خیز اعتراضات کئے کہ دنیائے علم وعقل کو حیران کر دیا۔ حضرت محدث اعظمیؒ نے ''دفع المجادلہ'' نامی رسالہ لکھ کر نہ صرف بدایونی صاحب کے اعتراضات کے مسکت و دندان شکن جوابات دیئے بلکہ ''برہان مجادلہ'' کے مصنف کے مبلغ علم کی نقاب کشائی کرتے ہوئے ان کی اور ان کے ہم مذہبوں کی ''دیانت داری'' کا پردہ بھی فاش کیا ہے۔ جس کے چند نمونے حسب ذیل ہیں:-

واضح رہے کہ حضرت اعظمیؒ نے مجادلہ کے عنوان سے مولوی اعجاز حسن کا اعتراض اور دفع کے عنوان سے اس اعتراض کا اپنا جواب نقل فرمایا ہے:

''(مجادلہ) اگر آپ نے ساری جماعت صحابہ کو رسول کا اپنے ساتھ لینا ثابت کیا تو خیر، ورنہ آپ کے قول سے رسول اللہ پر عدول حکمی کا جرم عائد ہوگا۔

(دفع) اجی حضرت! مباہلہ ہوا کہاں، اور عیسائی مباہلہ کے لئے آمادہ کب ہوئے جو رسول اللہ کا ساری جماعت صحابہ کو ساتھ لینا ہم ثابت کریں، اور بصورت عدم اثبات معاذ اللہ عدول حکمی کا الزام عائد ہو؟۔ ہم آگے اسی روایت سے جس کو آپ متواتر کہتے ہیں، ثابت کریں گے کہ نجران کے عیسائی پہلے دن آمادۂ مباہلہ نہ ہوئے بلکہ یہ کہا کہ کل غور کر کے اور مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ دوسرے دن جب ملے تو مباہلہ سے صاف صاف انکار کر دیا۔ ایسی حالت میں یہ کتنا احمقانہ مطالبہ ہے کہ رسول اللہ کا ساری جماعت صحابہ کو ساتھ لے جانا ثابت کرو۔ یہ تو جب ہوسکتا تھا کہ پہلے دن انہوں نے کہا ہوتا کہ ہم مباہلہ کے لئے تیار ہیں، پھر دوسرے دن آں حضور تشریف لے جاتے تو آپ کہہ سکتے تھے کہ جماعت صحابہ کو ساتھ لے جانا ثابت کیجئے۔ علاوہ ازیں بعض روایات سے ثابت ہے کہ باوجودیکہ عیسائی آمادہ نہ ہوئے تاہم آپ نے بعض صحابہ کرام اور ان کی اولاد کو بلایا تھا۔ آپ نے اس روایت میں یہ قدح کی ہے کہ یہ ابن عساکر کا قول ہے جو غیر معصوم اور خاطی ہے لہٰذا اس کے قول پر آپ کا عقیدہ حرام ہے (ص ۲۱) مگر یہ جناب کی خوش فہمی ہے، وہ ابن عساکر کا قول نہیں ہے بلکہ آپ کے امام باقر کا قول ہے۔ غیر معصوم کے قول پر عقیدہ رکھنے کی حرمت کا فتویٰ بھی جناب کی ذہانت اور علمی قابلیت کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ آپ نے جہاں سے اس کو اخذ کیا ہے اس مقام پر ایک بار پھر پڑھئے اور اپنے فہم کا ماتم کیجئے۔ آگے آپ کا یہ فرمانا کہ ابن عساکر نے روایت معہودہ کو امام جعفر صادق کی طرف منسوب کیا ہے مگر یہ انتساب غلط ہے، امام ممدوح کا مذہب مباہلہ کے متعلق ساری دنیا کو معلوم ہے کہ آپ کے نزدیک رسول اللہ نے ہرگز کسی صحابی کو اپنے ہمراہ نہیں لیا۔ یہ بھی آپ کی ہمہ دانی کی ایک دلیل ہے، ابن عساکر نے اس روایت کو امام جعفر کی طرف منسوب نہیں کیا ہے بلکہ امام باقر کی جانب منسوب کیا ہے۔ دیکھئے تفسیر آیت مباہلہ، ص ۵ میں جعفر بن محمد عن ابیہ مذکور ہے۔ اب اس انتساب کو غلط ثابت کرنے کے لئے آپ امام باقر کا صریح قول پیش کیجئے کہ رسول اللہ نے کسی صحابی کو اپنے ہمراہ نہیں لیا۔'' (ص ۱۱)

''(مجادلہ) دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور خاتم الانبیاء نے اپنے صحابہ اور ازواج کو ہمراہ نہ لے کر اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ ان میں سے کوئی مصداق آیت نہیں۔

(دفع) اس دلیل کا جواب بار بار ہو چکا ہے مختصراً پھر لکھا جاتا ہے کہ اولاً تو یہی غلط ہے کہ اور کوئی ہمراہ نہ تھا، اور اگر آپ اپنے قول پر مصر ہیں تو آپ اپنے امام معصوم (امام باقر) کی تکذیب کر رہے ہیں۔ ثانیاً مباہلہ واقع نہیں ہوا اس لئے قبل از وقت کسی کو ہمراہ لینے سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ وہی مصداق آیت ہے۔ ہاں اگر مباہلہ ہوتا اور کوئی ساتھ نہ ہوتا تو ممکن تھا۔

(مجادلہ) تیسری دلیل قول جابر انصاری ہے جو موقع پر حاضر تھے قال جابر أنفسنا رسول الله وعلي ونساءنا فاطمة وأبناءنا الحسن والحسين۔

(دفع) اولاً جابر کی طرف اس قول کی نسبت میں کلام ہے۔ ابن کثیر میں ہے هكذا رواه الحاكم في مستدركه (إلى قوله) وقد رواه أبو داؤد والطيالسي عن شعبة عن المغيرة عن الشعبي مرسلاً وهذا أصح۔

ثانیاً جب حضرت جابر موقع پر حاضر تھے تو آپ نے دوسری دلیل میں یہ کیسے کہہ دیا کہ حضور نے اور کسی کو ہمراہ نہ لیا؟

(مجادلہ) نفس رسول ہونے کے یہ معنیٰ نہیں کہ جناب امیر بعینہٖ رسول اللہ تھے یا آں جناب کے حقیقتاً نفس تھے کہ یہ دونوں باتیں عقلاً محال ہیں۔ بلکہ آپ مجازاً نفس رسول تھے، مگر وہ مجاز جو حقیقی معنی کے قریب ہوتا ہے جو حقیقتاً کی جگہ مستعمل ہوتا ہے جسے اصطلاح میں کنایہ کہتے ہیں۔

(دفع) سبحان اللہ! کیا تحقیقات ہیں، ''وہ مجاز جس کو اصطلاح میں کنایہ کہتے ہیں'' آج ہی سنا ہے، بالکل نئی تحقیق ہے۔ آج تک تو تمام علماء بیان، سکاکی، صاحب تلخیص، تفتازانی وغیرہم کنایہ کو مجاز کا قسیم کہتے آئے ہیں، مگر مولوی اعجاز حسن صاحب کے نزدیک یہ مجاز کی ایک قسم ہے؟ سچ ہے۔

ہم پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
کچھ طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے''

(دفع المجادلۃ، ص۱۹-۲۰)

حضرت محدث اعظمیؒ کی ردشیعیت پر درج بالا دو کتابوں ارشاد الثقلین اور دفع المجادلۃ کے علاوہ اور بھی متعدد کتابیں و مقالات مثلاً تنبیہ الکاذبین، ابطال عزاداری، تعدیل رجال بخاری، عظمت صحابہؓ، اور حضرت معاویہؓ کی شان میں سوء ادبی اور اس کا جواب وغیرہ ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے اپنے مخصوص تحقیقی رنگ و آہنگ میں اس ضال و مضل فرقہ کی سیاہ کاریوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اس فرقہ کے تمام اکابر واصاغر کے دجل وفریب کا پردہ تو چاک کیا ہی ہے، اسی کے ساتھ مذہب حقہ اہلسنت و جماعت اور حضرات صحابہ کرامؓ کے ساتھ اپنی بھرپور اور شعوری و نا قابل شکست وابستگی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

اس سلسلہ میں اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ عموماً حضرت والا کا اس موضوع پر دفاعی نوعیت کا کام ہے کہ مذہب حقہ اہل سنت و جماعت کے اصول وفروع اور مآثر ومخارج پر اچھالی جانے والی غلاظتوں کو صاف کرنے کے لئے ان کو قلم یا زبان کا استعمال بدرجہ مجبوری کرنا پڑا، تو کیا ہے بی بی یہ الگ بات ہے کہ اس دفاع کی زد میں آنے سے کمزور گھروندے ٹوٹ کر بکھر گئے ہوں اور انہیں بنانے اور ڈھونے والے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہوں کہ۔

یہ عذرِ امتحانِ جذب دل کیسا نکل آیا
ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

حق تعالیٰ حضرت والا کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور اپنے دین حق، نبی برحق اور ان کے سچے و اولین جانشین یعنی صحابہ کرامؓ کا دفاع کرنے والے کو اپنی شان عطا کے مطابق صلہ عطا فرمائے۔ (آمین) □□

صدارتِ تدریس کے لئے دارالعلوم دیوبند کی پیشکش

اکابرینِ دارالعلوم دیوبند نے چاہا حضرت محدثِ اعظمیؒ یہاں تشریف لے آئیں، مگر حالات نے اجازت نہیں دی بلکہ بذات خود شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ اور حکیم الاسلام حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ حضرتؒ کی قیامت گاہ مئو تشریف لے گئے۔ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی کی وفات کے بعد صدارتِ تدریس پیش کی گئی مگر اس پر بھی معذرت کرنا پڑی۔ مفلانا محمد ظفیر الدین مفتاحی نے علامہ کی وفات کا جو خط لکھا تھا اس میں یہ بھی لکھا کہ دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس کے لیے اب لوگوں کی نظر حضرت والا پر ہے، اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''علامہ کی وفات کے بعد دیوبند سے جو خط لکھا تھا، وہ پہلے مل گیا تھا، آج وطن سے بھیجا ہوا تمہارا خط ملا، تم نے جو باتیں لکھی ہیں، وہ بعید از قیاس نہیں ہیں، میرا خیال ہے کہ ہر دو فریق مجھے اس لیے گوارہ کرلیں گے کہ ہر ایک کے سامنے آئندہ جو اندیشے ہوں گے، وہ میرے باب میں یا تو نہ ہوں گے، یا بہت کم ہوں گے، مگر میں اپنے دل کو جہاں تک ٹٹولتا ہوں، میرے دل کے کسی گوشہ میں یہ تمنا نہیں ملتی میں وہاں کے ماحول سے بہت متوحش ہوں، میں انشاء اللہ وہاں کا رنگ قبول نہیں کرسکتا، اور امید نہیں کہ میرا رنگ وہاں مقبول ہو'' (مکتوب ۲۵؍شوال ۸۷ھ)

حضرت کو دیوبند کی آب وہوا کبھی موافق نہیں آئی، جب کبھی شوریٰ میں تین دن کے لیے بھی آئے تو بیمار ضرور ہوئے اور مجھے دوا کی فکر کرنا پڑی، ایک بڑی وجہ دیوبند سے وحشت کی یہ بھی تھی۔

حضرت محدث اعظمؒ اور دفاعِ اہلِ سنت

مولانا عطاء الرحمن بھاگلپوری★

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم!

آسمانی ہدایات کا جو مقدس سلسلہ اللہ رب العزت نے انبیائے سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے شروع کیا تھا، اس کی تکمیل اس نے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر فرمادی اور آپؐ کے ختم نبوت کے اعلان کے ساتھ پوری دنیا والوں کو یہ بھی سمجھا دیا کہ اب شریعت محمدی ہی قیامت تک کے لیے کامیابی اور نجات کی ضمانت دے گی۔ اور یہی طریقہ قیامت تک کیلئے اللہ کا پسندیدہ اور بندوں کے لیے مفید اور نفع بخش رہے گا۔ اور چونکہ یہی طریقہ اللہ کا عطا کردہ اور پسندفرمودہ ہے، اس لئے اس سے ہٹ کر کوئی طریقہ خواہ وہ کتنا ہی دلنشیں اور جاذب نظر کیوں نہ لگے خالق کونین کی بارگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں، اور وہ بہر حال نامقبول اور مردود ہوگا۔ اور اس علیحدہ طریقے کو اختیار کرنے والا خواہ اپنے کو کتنا ہی کیوں نہ فریب دے اور بہلا لے لیکن کامیابی کے زینے ہرگز طے نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ تمام آسمانی کتابوں پر تو خود پرستوں نے ہاتھ صاف کر کے انھیں محرف کردیا، اور انکی حفاظت کا بھی قدرت کی طرف سے کوئی معقول بندوبست نہیں کیا گیا، مگر چونکہ محمدی شریعت قیامت تک کے لیے اتاری گئی ہے اس لئے اس کی دستوری کتاب قرآن مقدس کی حفاظت کا اتنا معقول اور پختہ انتظام کیا گیا کہ آج تک اس کے بدترین مخالف بھی اپنی ہزار نا محدود کوششوں کے باوجود اس کے کسی نقطے اور حرکت کو بھی اس کے مقام سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوسکے، اور ہدایت کی یہ مقدس کتاب جس طرح اتاری گئی تھی آج تک بعینہٖ اپنی اسی صورت میں پوری عظمت وشوکت اور پورے وقار وجلال کے ساتھ موجود ہے۔

لیکن انسانی فطرت بھی اپنے آپ میں ایک عجیب خاصیت رکھتی ہے۔ اسے ہر نئی چیز زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہے چاہے وہ پرانی سے بدرجہا کمتر کیوں نہ ہو۔ اور اس کی یہ پسند مادی اشیا تک محدود نہیں، بلکہ اس نے دین کو بھی عقائد و اعمال کے باب میں آلودہ کر ڈالا۔ انبیائے سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دور میں بھی بدعت کے اس فتنے نے لوگوں کو راہ راست سے دور کردیا اور شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر بھی یہ اپنا دست تصرف بڑھانے سے باز نہ آیا۔ جبکہ اسکے متعلق خود بانیٔ شریعت جل مجدہٗ نے ہدایت فرمادی تھی کہ تمھیں یہاں اپنا دماغ استعمال کرنے کی ضرورت واجازت نہیں، ہم ابدی علم کے مالک ہیں، اور تمھاری ابدی کامیابی کے لئے ہم نے جو طریقہ تمھیں دیا ہے تمھارے لئے بس وہی کافی ہے، اور تمھاری سرفرازی صرف اسی کی پابندی میں ہے۔ وہ طریقہ ہم نے اپنے رسولؐ کو دے دیا ہے، اور ان پر کھول دیا ہے، وہ چاہے اس کے متعلق تمھیں ہدایت دیں یا خاموشی سے اس کے مطابق عمل تمھارے آگے پیش کریں۔ تمھاری کامیابی صرف اور صرف طریقۂ نبوی کی اطاعت اور اس کی پیروی میں ہے۔ اور اس سے سرِمُو انحراف تم سے تمھاری کامیابیوں کی منزل چھین لے گا۔ **ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا**۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو تمھیں دے دیں اسے پکڑ لو۔ اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔ یہیں اس بات کا اشارہ بھی موجود ہے کہ آپؐ نے جس بات کو نہیں چھیڑا، اور اس کی صراحت نہیں فرمائی، تمھیں بھی اس سے نہیں چھیڑنا اور اس سے بحث نہیں کرنی ہے۔ اور اگر اس کا تعلق عمل سے ہو تو اپنا دامن اس سے بچائے رکھنا ہے۔ قرآن کریم نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اعلان کرنے کا حکم فرمایا۔ **إن ہذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ**۔ بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے۔ تم اسی پر چلتے رہو۔ اور مختلف راستوں کے پیچھے مت بھاگو کہ وہ تمھیں درست راہ سے بہکا دیں گے۔ قرآن کریم اور سنت مطہرہ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ یہاں اطاعت پر حد سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ جو بات قرآن کریم، سنت مطہرہ اور آثار صحابہ کی روشنی میں کسی تک پہنچ جائے، اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے بے چون وچرا مان لے۔ اور اس میں کسی بھی طرح عقلی گھوڑے نہ دوڑائے۔ اسی میں اس کی خیریت ہے۔ اگر کوئی صورت کسی کو اچھی لگتی ہو لیکن دربار نبوی سے اس کا تعلق نہ ہو تو بظاہر خوبصورت دکھائی دینے کے باوجود حقیقت اور اصل کے لحاظ سے وہ انتہائی مکروہ اور قبیح ہے۔ کچھ لوگ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عبادت کے معمولات دریافت کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ اور جب انھیں آپؐ کے معمولات کا علم ہوا تو انھوں نے اسے بہت تھوڑا خیال کیا۔ اب یہاں انھوں نے اپنی منطق استعمال کی اور سوچا کہ کہاں ہم اور کہاں رسول اکرمؐ؟ آپ کی اگلی پچھلی لغزشیں تو اللہ نے معاف فرمادی ہیں۔ اگر ہم بھی اتنے ہی پر اکتفا کرلیں تو ہمارا حال کیا ہوگا؟ یہ سوچتے ہی ایک نے کہا۔ میں تو ہمیشہ رات بھر نمازیں پڑھا کرونگا، دوسرا

★ مہتمم جامعہ حبیبیہ، پورینی، بھاگلپور

بولا میں ہمیشہ سب دن روزے رکھا کروں گا۔تیسرے نے کہا۔میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔آپؐ کو پتہ چلا تو آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا۔تم ہی لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ بخدا میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سے زیادہ پرہیزگاری اختیار کرنے والا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا بھی ہوں نہیں بھی رکھتا، نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔تو جو میرے طریقے سے الگ ہوا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔(متفق علیہ) اس باب میں بڑی سخت تاکید فرمائی گئی ''خبردار دین میں نئے طریقے مت نکالنا، ہر نیا طریقہ بدعت اور ہر بدعت گمراہی ہے'' دوسری جگہ فرمایا ''میرے اس طریقے میں جس نے نئی بات پیدا کی وہ مردود ہے''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ناثابت شدہ طریقے ایجاد کرنے والا خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس نگاہ میں اس قدر مبغوض قرار پایا کہ وہ تو وہ، اگر کوئی دوسرا شخص اس بدعتی کا اکرام کرے تو وہ بھی آپؐ کی نظروں میں ناپسندیدہ اور مبغوض قرار پایا۔ ارشاد ہوا۔جس نے کسی بدعتی کی عزت کی وہ اسلام کی عمارت ڈھانے میں اس کا مددگار ہوگیا۔ یہاں سے ایک بات اور معلوم ہوئی کہ عقیدہ ہو یا عمل جو طریقہ حضور اکرمؐ ورصحابہ کرام سے ثابت نہیں، اسے ایجاد اور قبول کرنا گو یا اسلام کی عمارت کو ڈھادینے کے مترادف ہے۔

بدعت خواہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، درحقیقت وہ ایک راہ بغاوت ہے، اور صاحب شریعت سے بے اعتمادی کا کھلا اظہار یعنی اپنی حماقت سے یہ سمجھنا کہ یہ نئی راہ جو ہم اختیار کررہے ہیں، وہ کامیابی اور نجات کی راہ ہے، جو صاحب شریعت نے ہم پر ظاہر نہ فرمائی اور ہم سے چھپا کر رکھا۔جبکہ جس وقت دین کی تکمیل کا خدائی اعلان ہورہا تھا، اس وقت اس نئے طریقے کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔اور جب اس مفروضہ طریقے کے بغیر دین کی تکمیل فرمائی گئی تو یہ طریقہ دین سے ہی باہر ہوا۔اور اپنے من پسند طریقے کو دین میں شامل بتانا سرکاری مہر کے بغیر جعلی نوٹ چلانے کی طرح ہے، جو قابل مواخذہ اور شدید جرم ہے، خواہ نوٹ کا کاغذ کتنا ہی عمدہ اور اسکی چھپائی کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔

بدعت دراصل آوارہ مزاجی، کج فکری اور آزادبے راہ روی کا دوسرا نام ہے، جس کا سیدھا ٹکراؤ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت سے ہے۔اور اسکی ابتدا دور تابعین ہی میں ہوگئی تھی۔

حضرت سیدنا عبداللہ ابن مسعودؓ کو خبر دی گئی کہ چند سر پھرے مسجد میں جمع ہو کر درود پاک اور کلمۂ طیبہ کی زور زور سے گردان کرتے ہیں۔حضرت تشریف لائے اور فرمایا تم نے بڑی قبیح بدعت نکالی ہے۔خوب خوب ڈانٹ پلائی اور تمام سر پھروں کو مسجد سے نکلوادیا۔

یہ فکری آوارگی خلافت راشدہ کے آخری زمانے میں ہی نمودار ہو چکی تھی، چنانچہ اسی کے تحت خوارج نے خلیفہ راشد حضرت علیؓ کی اطاعت سے سرتابی کی راہ پکڑی اور قرآن کریم کی آیت **ان الحکم الا للہ** کو نفسانیت کی تکمیل کے لئے اپنا تختۂ مشق بنایا جب کہ اگر آیت سے نکالا ہوا ان کا خانہ ساز مضمون درست ہوتا تو یہ آیت حضرات خلفائے ثلثہ کے زمانے میں بھی تھی، پھر تو یہی کہا جانا چاہئے تھا کہ ان کے دور میں مقدس صحابہ کی جماعت نے جو متفقہ طور پر ان کی اطاعت فرمائی تو یا تو انھوں نے آیت کے مفہوم کو نہیں سمجھا یا پھر جان بوجھ کر قرآن کے حکم کی خلاف ورزی فرمائی (معاذ اللہ) پھر یہی فکری آوارگی حضرت علیؓ کے دور میں حب اہل بیت کا چولا پہن کر نمودار ہوئی، جس نے حضرات خلفائے ثلثہ بلکہ تمامی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو امت کی نگاہوں میں بے اعتماد کرنے کی سازش رچی اور اس کی تکمیل میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا۔ وہی فتنہ آج شیعیت اور اثناعشریت کی شکل میں موجود ہے۔حضرت سیدنا امام احمد ابن حنبلؒ کے دور میں اسی فکری آوارگی نے شورش برپا کی۔اور پیروان سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ابتلائے عظیم بنکر ظاہر ہوئی خلاصہ یہ کہ اعتقادی ہو یا عملی بدعت کا یہ بھوت ہر دور میں اہل حق کیلئے مسائل کھڑے کرتا رہا ہے۔اور ہر دور میں اللہ رب العزت نے ایسے صاحبان علم عزیمت بزرگوں کو اس کے بالمقابل آنے کی توفیق بخشی ہے جنھوں نے کسی مصلحت، کسی اندیشے اور کسی انجام کی پرواہ کئے بغیر اس سے دو دو ہاتھ کئے ہیں، اسے شرمناک ہزیمت سے دوچار کیا اور امت کو گمراہی کی آندھی سے بچا کر انھیں جادۂ مستقیم پر جمے رہنے کا حوصلہ عطا کیا۔

جب مکار انگریزوں کے عیار قدم اس ملک میں آئے تو انھوں نے بہت سے ہوس پرست نام نہاد علماء کو اپنا زرخرید بنایا، اور انھیں استعمال کر کے امت میں بدعت کے مختلف مراکز تیار کئے جن میں سے کچھ براہ راست اسلامی عقائد سے متصادم تھے۔ اور کچھ بظاہر تو بے ضرر نظر آتے تھے لیکن حقیقتاً وہ بھی بغاوت ہی کا ایک حصہ تھے۔ قادیانیت، شیعیت، رضاخانیت، عمل بالحدیث یہ سب اسی فتنے کے خدوخال ہیں جنھوں نے برصغیر میں ملت کا شیرازہ برہم کر دیا۔

مگر یہ بھی اللہ کی قدرت کا ایک قانون ہے کہ وہ ہر فرعون کیلئے کوئی نہ کوئی موسیٰ ضرور پیدا کرتا ہے جو اسکی ساری فرعونیت کا بیڑا غرق کردے۔ جب جب دین کو ضرورت پڑی ہے اللہ تعالیٰ نے دفاعی مورچے پر کسی نہ کسی سرفروش جیالے کو ضرور کھڑا کیا ہے، جو ہر قسم کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر باطل سے پنجہ آزمائی کے لیے خود کو پیش کرے۔ اور کوئی خوف کوئی مصلحت، کوئی عاقبت اندیشی اور کوئی انگشت نمائی اس کی راہ روکنے کی ہمت نہ کرسکے۔

اس میں سب سے پہلا نام تو خلیفۂ اول امیر المومنین حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا ہے جنھوں نے مسند خلافت پر قدم رکھتے ہی تمام نومولود فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ فرمایا اور گویا انھیں پسپا کر کے اسلام کی جڑیں جما دیں۔ حضرت سیدنا عمر فاروقؓ جیسے بالغ نظر اور انتہائی جری بزرگ نے بھی آپ کو مصلحت بینی کا مشورہ دیا تو آپ نے انھیں سخت الفاظ میں اَجَبَّارٌ فِی الجَاھِلیۃِ وَخَوَّارٌ فِی الاِسلَامِ کا تاریخی جواب عنایت فرمایا۔

اکبری بدعت کے مقابلے پر اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ کو عزیمت بخشی اور لال قلعہ کی چہار دیواری سے نکلنے والی بدعتوں کے ازالے کیلئے رب العزت نے ولی اللّٰہی خاندان کو قبول فرمایا۔

حق ہمیشہ ایک ہے، اور باطل کے روپ بہت سے۔ اندھیرے مختلف صورتوں میں چھائے ہیں اور روشنی کی ایک کرن انکی ردائیں چاک کر دیتی ہے۔ پختہ یقین، اور ٹھوس ایمان والے بزرگوں کو باطل سے چومکھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔

شیخ العلماء حضرت محدث کبیر ابو المآثر جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ جس ماحول میں پل کر اپنے سن شعور کو پہونچے، اس میں ایک طرف ترک تقلید، دوسری جانب انکار حدیث، ساتھ ہی اہل بدعت رضا خانیوں کی طرف سے اسلامی احکام کی نئی تعبیر اور حرام شدہ چیزوں کی تحلیل ایک عظیم فتنہ بن کر ظاہر ہو رہی تھی پھر ایک طرف رافضیت تھی جو نوابین اودھ کی سرپرستی میں اہل سنت پر مظالم ڈھا رہی تھی اور حضرت امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنؤ میں رہ کر ان کی چیرہ دستیوں کا علاج فرمارہے تھے۔ حضرت ابوالمآثر کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت نے بھی ہر قسم کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر ابتدائے جوانی سے ہی ہر موڑ پر ان فتنوں کی سرکوبی کا عزم فرمایا۔ اور پوری پامردی کے ساتھ اہل سنت کی طرف سے مدافعت میں کھڑے ہو گئے شاید آپ کے عزم میں یہ پختگی حضرت امام اہل سنت کی بابرکت ہم نشینی سے بھی آئی ہو کہ حضرت امام لکھنؤ میں تمام ابتلاؤں کا سامنا کرتے ہوئے روافض کے بالمقابل مرد آہن بنے ہوئے تھے۔ جہاں حضرات خلفائے ثلثہ پر تبرا اور سب وشتم کا جلوس تو نکلتا تھا، اہل سنت کو علی الاعلان مدح صحابہ کی اجازت نہ تھی۔ ادھر شیعہ نوابوں اور رئیسوں کی پوری جماعت تھی اور ادھر چند کمزور بےسروسامان۔ لیکن یہ عزیمت کا کمال تھا کہ اس مرد مجاہد نے اہل سنت کو اُن کا حق دلوایا اور باعزت زندگی کا حوصلہ بخشا۔

حضرت ابوالمآثر امیر الہندؒ کو اللہ رب العزت نے دریائے علم سے خوب خوب سیراب فرمایا تھا۔ اب ایک صورت تو یہ تھی حضرت صرف مسند علم کو زینت بخشتے، تحقیق وتدقیق کے بحر ذخار میں غواصی فرماتے، اور حاصل شدہ انمول جواہر اہل علم پر نثار کرتے، اور اس طرح کسی کو اپنا مخالف نہ بنا کر سب سے خوب خوب داد وصول فرماتے۔ بلاشبہہ یہ عظیم کارنامہ بھی آپ نے جس شان سے انجام دیا ساری علمی دنیا اس کا اعتراف کرنے اور آپ کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہے۔

لیکن آپ اس مقدس علم کے تقاضوں کو خوب جانتے تھے۔ آپ کے سامنے اپنے آقا حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی تھا: **یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاھلین -تحریف الغالین ای المبتدعۃ الذین یتجاوزون فی کتاب اللہ وسنۃ رسولہ عن المعنی المراد فیحرفون عن جھتہ**

(مرقات برحاشیہ مشکوٰۃ،ص:۳۶)

منجانب اللہ ایسے ذمہ دار علماء اس علم کو حاصل کریں گے جو غالیوں کی الٹ پھیر، باطل پسندوں کے غلط دعووں اور جاھلوں کی بےمحل تاویلوں کی تردید فرمائینگے غالیوں کی الٹ پھیر کا مطلب یہ کہ جو غلو پسند بدعتی کتاب وسنت کو اس کے اصلی مرادی معنی سے پھیر دیتے ہیں۔ یہ حق پرست علمائے راسخین ان کی دسیسہ کاریوں کا پردہ چاک فرمادیں گے۔ علم کا جب یہ تقاضہ آپ کے سامنے آیا تو آپ بھی اہل سنت کی طرف سے مدافعت کے لیے کھڑے ہو گئے، اور اس کیلئے آپ نے تمام تر بےسروسامانی، اور وسائل کی انتہائی قلت کے باوجود باطل سے مقابلے کیلئے اپنی کمر کس لی۔ انکار حدیث کا پرویزی فتنہ اٹھا تو آپ نے اہم ترین علمی مشاغل کے باوجود ''نصرۃ الحدیث'' جیسی گراں قدر کتاب تالیف فرمائی، اور منکرین حدیث کے تمام اوھام اور شبہات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اور اس طرح ایک اچھے خاصے بڑے حلقے کی فضا کو مسموم ہونے سے بچالیا۔ منکرین حدیث کی کتاب نقیب اہل حدیث مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے پریس سے چھپ کر سامنے آئی تھی اس پر آپ نے اخیر میں شکوہ بھی فرمایا کہ مولانا آپ اپنے پریس میں منکرین حدیث کی کتاب چھاپ کر ان کی اعانت کے باوجود اہل حدیث کہلاتے رہیں۔ اور ہمیں اس کا بھرپور جواب دینے کی توفیق نصیب ہو پھر بھی آپ کی طرف سے ہمیں بےحدیث ہونے کا طعنہ ملتا رہے یہ کہاں کا انصاف ہے؟ حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اس کتاب پر انتہائی وقیع الفاظ میں آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ ''میں خود بھی چاہتا تو ایسی کتاب نہ لکھ پاتا''۔

مبتدعین نے جب رسول اکرم ﷺ کو مختار کل مان کر تحلیل وتحریم کو بھی آپ ہی کی طرف منسوب کیا اور قرآنی تعلیم کے برخلاف عوام میں یہ مشہور کرنا چاہا کہ شارع تو رسول اکرم ﷺ ہی ذات گرامی ہے۔ اور اس

موضوع پر خانوادۂ کچھوچھہ کے مولوی سید محمد صاحب نے بزعم خود دلائل جمع کر کے ایک کتاب شائع کی تو حضرت محدث جلیلؒ نے ''شارع حقیقی'' کے نام سے اس کا منہ توڑ جواب دیا، انکے مزعومہ دلائل کے پرزے بکھیر کر یہ ثابت فرمایا کہ شارع حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے اسی طرح اہل بدعت نے مزاروں پر چڑھاوے یا اولیاء اللہ کے نام پر ذبیحے کو جائز اور حلال قرار دیا، تو آپ نے اہل سنت کی طرف سے اس کی بھرپور مدافعت فرمائی اور ''احکام النذر لاولیاء اللہ'' لکھ کر دلائل قاہرہ سے ثابت فرمایا کہ اولیاء اللہ کے نام سے منسوب جانور کا ذبیحہ حرام ہے، خواہ اسے اللہ کا نام لے کر ہی کیوں نہ ذبح کیا جائے۔ بوقت اذان واقامت نبی اکرم ﷺ کا مبارک نام سن کر اپنے انگھوٹے چومنے کو اہل بدعت نے ایک طرح اپنا شعار بنالیا، اور اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت سے استدلال کیا تو آپ نے اس مسئلے کی تحقیق فرمائی اور اس روایت کا نامعتبر بلکہ موضوع ہونا مستند کتابوں سے ثابت فرما کر ان کے دلائل کی خاک اڑادی۔

رافضی اثناعشری فتنہ جو اہل ہوا و بدعت کا قدیم ترین فتنہ ہے، جس کی بنیاد ہی قدح صحابہ پر رکھی گئی تھی۔ ان کا جواب بھی آپ نے بھرپور انداز میں سپرد قلم فرمایا۔

اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہی جانے والی کتاب بخاری شریف جسے حضرت امام بخاریؒ نے کڑی شرطوں کے ساتھ بڑے احتیاط اور بڑے اہتمام سے مرتب فرمایا تھا، اور جو فقہ اسلامی کی ترتیب میں قرآن کریم کے بعد گویا اساسی حیثیت رکھتی ہے، روافض نے اس کی حیثیت مجروح کرنے کیلئے رجال بخاری نام کی کتاب لکھ کر اس کے راویوں کو نامعتبر اور مشکوک ظاہر کرنا چاہا تو آپ نے ''تعدیل رجال بخاری'' کے نام سے رافضی بدعتیوں کا کامیاب تعاقب فرما کر تحقیقی کتاب مرتب فرمائی، اور شیعہ مؤلف کی تمام تر خباثتوں اور فریب کاریوں کا پردہ چاک فرمادیا۔

اللہ آپ کو تمامی اہل سنت کی طرف سے بے حد جزائے خیر عطا فرمائے۔ روافض نے ہی حضرات خلفائے ثلٰثہ اور حضرت سیدنا علیؓ کے مابین مخاصمت دکھانے کے لئے اتحاد الفریقین کے نام سے گمراہ کن کتاب شائع کی تو آپ نے ''ارشاد الثقلین'' کے نام سے اس کا پورا پورا آپریشن فرمایا، اور اس میں پیش کردہ فریب کاریوں کو منظر عام پر لا کر اس کے تمام پر فریب دلائل کے بخیے ادھیڑ دیے۔ شیعوں کی ہی قبیح اور مشرکانہ رسم عزاداری کے خلاف تحقیقی مواد پیش کر کے آپ نے ''ابطال عزاداری'' کی تالیف فرمائی، اور دلائل کی روشنی میں اس کا بے سروپا، مشرکانہ اور باطل ہونا اظہر من الشمس کردیا۔

اہل سنت کی طرف سے مدافعت کی جو خدمت ممکن ہوسکی، آپ نے بحسن وخوبی انجام دی اور اسلام کے ایک پرجوش وپرخلوص جانباز سپاہی کی طرح ہر محاذ پر نہ صرف مورچہ بندی فرمائی بلکہ معاندین سنت کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔

آپ کے دور میں اہل بدعت ترک تقلید کے پردے میں عمل بالحدیث کا خوشنما لباس پہن کر نمودار ہوئے، جن کا اصل منشاء فقہ اسلامی سے بغاوت کر کے عام مسلمانوں کو اس سے بدظن کرنا، اور فرنگی اشارے پر مسلمانوں کو ایک اور تقسیم کا شکار بنانا تھا۔ اصلاً اس کی بنیاد عبدالحق بنارسی نے رکھی تھی جو رافضی خیالات کا مالک تھا۔ اور جسے اس کی ناشائستہ حرکتوں کی وجہ سے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ نے اپنی جماعت سے خارج کردیا تھا۔ مئو اور اس کے نواح میں یہ فتنہ مولوی نذیر حسین کے شاگردوں کی وجہ سے اپنے پر پرزے نکالنے لگا تو آپ کو اس کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑا۔ آپ کے عنفوان شباب کے دور میں غیر مقلدین کے قدآور بزرگ مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ''مہوا بسم اللہ خاں'' میں حضرت امام اہل سنتؒ کے حکم سے اور آپ کی موجودگی میں آپ کا مقابلہ ہوا۔ پروفیسر عبدالحفیظ رحمانی نے اس کی مفصل روئداد اپنے مضمون میں بیان فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں نے مولانا امرتسری کا بڑا نام سن رکھا تھا۔ عمل بالحدیث کے دعویدار متمول طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اور اہل سنت کا طبقہ کمزوروں اور غریبوں پر مشتمل تھا۔ ایک قدآور شخصیت کے بالمقابل اہل سنت نے جب ایک غیر معروف نوجوان کو دیکھا تو دل تھام کر رہ گئے کہ اب تو بس خدا ہی خیر کرے۔ موضوع بحث قرأۃ فاتحہ خلف الامام قرار پایا۔ مولانا امرتسری نے ایک نوجوان کو اپنا حریف دیکھا تو حضرت امام اہل سنت کے استفسار پر حضرت محدث کبیر کو پہلے گفتگو کرنے کی اجازت دی، اور جب حضرت نے محدثانہ رنگ میں اس موضوع سے متعلق حدیثوں کی تحقیق پیش کرنی شروع کی تو اہل سنت کا اندیشہ حیرت اور پھر مسرت میں تبدیل ہوگیا۔ حضرت والا پوری متانت اور پورے وقار کے ساتھ مخالفین کے استدلال کی بخیہ ادھیڑتے رہے، اور اگلے دن جب مولانا امرتسری کی باری آئی تو تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ موصوف جمع غائب ہوچکے ہیں۔ حضرت والا کی تحقیقی وضاحت سے اہل سنت کو اس قدر حوصلہ ملا کہ بعد کے دنوں میں ریالوں کی چمک دمک بھی ان کے پائے استقلال میں لرزش پیدا نہ کرسکی۔

انھیں برخود غلط خانہ ساز مجتہدین نے اپنے کو اہل حدیث مشہور کیا اور اپنی کانفرنس میں اپنا رشتہ قرون اولیٰ کے اہل الحدیث یا اصحاب الحدیث سے قائم ہونے کا پر فریب دعویٰ کیا تو آپ نے پوری جرأت کے ساتھ ان کا شجرہ

اہل نظر کے سامنے پیش کیا اور ’’تحقیق اہل حدیث‘‘ لکھ کر ثابت فرمایا کہ یہ لوگ اہل حدیث بالکل نہیں، اپنے ساتھ اہل حدیث کا معزز لقب جوڑنا ان کا زبردست فریب ہے۔ انکا خیر القرون کے اصحاب الحدیث سے کسی طرح کا دور کا بھی کوئی رشتہ نہیں۔ ورنہ کہاں وہ شب و روز حدیثوں کی تحقیق اور ان کی خدمت میں ڈوب کر امت کی طرف سے اپنے لئے اہل الحدیث کا خطاب پانے والے اہل علم اور کہاں یہ ایک ہوا پرست طائفہ جس کا ایک جاہل بھی اہل حدیث کہلاتا ہے۔

چہ نسبت خاک رابا عالم پاک

تراویح کی بیس رکعتوں پر دور فاروقی سے لے کر آج تک چند بدعت پسندوں کو چھوڑ کر پوری امت کا اتفاق رہا ہے۔ یہاں تک کہ حرمین شریفین میں بھی آج تک تراویح کی بیس ہی رکعتیں پڑھی جارہی ہیں۔ ان غیر مقلدوں نے شور مچانا شروع کیا کہ مسنون تراویح تو اصل میں آٹھ رکعات ہی کی ہے، بیس رکعت کی ادائیگی محض بدعت ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تمھاری پیدائش سے پہلے بارہ سو برسوں کے عرصے میں دنیا کی کس مسجد میں تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ذرا تاریخ کے حوالے سے اس کا کوئی ثبوت تو پیش کرو۔ کیا نبیٔ اکرم ﷺ کی یہ بیش قیمت سنت بارہ سو برسوں تک روپوش رہی اور اب تمھیں انگریزی دور میں فرنگی چشمے کی مدد سے اسکی اصلی صورت دکھائی دی ہے؟ فیاللعجب!

بہر حال غیر مقلد بدعتیوں نے اس موضوع پر غوغا برپا کیا اور حدیث پاک کو غلط رنگ میں پیش کر کے لوگوں کو گمراہ کرنا چاہا تو آپ نے ’’رکعات تراویح‘‘ مرتب فرمائی، اور محدثانہ شان سے تراویح کی بیس رکعتوں کو ہر جہت سے مدلل اور ثابت فرمایا۔

ایک ہی مجلس میں تینوں طلاقوں کے وقوع کا مسئلہ اہل سنت کا اجماعی مسئلہ ہے، عمل بالحدیث کے مدعی شیعیت کے طرفدار وکیلوں نے جب تین طلاقوں کو ایک قرار دے کر امت کیلئے حرام کاری کا دروازہ کھولنا چاہا تو آپ نے ’’اعلام مرفوعہ‘‘ لکھ کر احادیث کریمہ فتاوائے خلفائے راشدین، اور تابعین کے آثار سے تین طلاقوں کے وقوع کو ثابت فرمایا کہ ہر دور میں تین طلاقیں متفرق ہوں یا اکٹھی، تین ہی مانی جاتی رہی ہیں۔ اور تین کو ایک ماننا صراحۃً کتاب وسنت کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ اس پر مئو ہی کے کسی غیر مقلد نے آثار متبوعہ کے نام سے جواب شائع کرا کر اپنی برادری کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی تو حضرت نے ’’ازہار مربوعہ‘‘ کے نام سے مؤلف کی تمام جہالتوں اور خیانتوں کو منظر عام پر لاکر حجت پوری فرمادی اور یوں کہئے کہ ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

اسلامی معاشرے کو اسلامی احکام و اقدار کی پابندی سے آزاد کرانے کے لیے اس بدعتی ٹولے نے بڑے حربے اختیار کئے ہیں۔ حقیقت سے چشم پوشی کو انھوں نے تحقیق کا نام دے کر اہل حق کو گمراہ کرنے کی منصوبہ بند کوششیں کی ہیں۔ انھیں مذموم کوششوں میں سے ایک، حدیثوں کی تصحیح وتضعیف کا الٹ پھیر بھی ہے۔ یعنی جو حدیثیں ان کے خلاف مطلب نظر آئیں صحیح ہوتے ہوئے بھی انھوں نے ان کو ضعیف حدیثوں کی قطار میں کھڑا کردیا۔ اور جو مفید مطلب دکھائی دیں انھیں ان کے ضعف کے باوجود صحیح حدیثوں کی مسند پر بٹھادیا۔ یہ کام جتنی دیدہ دلیری کے ساتھ ان کے شیخ ناصر الدین البانی مرحوم نے کیا ہے۔ دوسرے حضرات ان سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ حضرت محدث کبیر نے تمام عواقب سے بے نیاز ہوکر اس فتنے کا بھی تعاقب فرمایا اور ’’الالبانی شذوذہ واخطاءہ‘‘ چار اجزاء میں شائع فرما کر اس غبارے کی ہوا نکال دی۔

حضرت والا کو تمام تر انتہائی گراں قدر علمی مشاغل اور ان میں حد درجہ انہماک کے باوجود مبتدعین کی طرف سے اٹھنے والے فتنے اور اس کے دفاع کی انتہائی فکر رہا کرتی تھی۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جب صادق سیالکوٹی صاحب نے ’’صلوٰۃ الرسول‘‘ لکھی اور صرف اپنے مطلب کی حدیثیں جمع کر کے اس غلط فہمی کو رواج دینا چاہا کہ احناف کی نماز نبیٔ اکرم ﷺ کی نماز سے میل نہیں کھاتی، اور نماز کا وہی طریقہ درست اور نبیٔ اکرم ﷺ سے ثابت ہے جسے غیر مقلدین اپنائے ہوئے ہیں، تو آپ نے فرمایا اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جن صحیح اور قوی حدیثوں، اور آثار وقرائن کی بنیاد پر حنفیوں نے اپنی نماز کی ہیئت اختیار کی ہے، اور جو خلفائے راشدین، اجلۂ صحابہ اور تابعین سے منقول ہوتی ہوئی ان تک پہنچی ہے، ان احادیث، آثار اور شواہد کو جمع کر کے لوگوں کے سامنے لایا جائے اور انھیں دکھایا جائے کہ یہ ہے ’’صلوٰۃ الرسول‘‘ قسّامِ ازل نے آپ کو جو اعلیٰ ترین علمی مقام عطا کیا تھا، اس کی روشنی میں آپ چاہتے تو نزاعی اور دفاعی مسائل سے صرف نظر فرما کر بھی بلند پایہ علمی خدمات انجام دیتے رہتے اور اسی طرح اپنوں اور غیروں میں یکساں مقبول ومحبوب بنے رہتے۔ لیکن اسے کیا کہئے کہ خالق نے آپ کا خمیر جس مٹی سے تیار کیا تھا اس میں اس نے غیرت وحمیت بے نفسی اور جرأت، صلابت واستقامت، حق بینی وحق نمائی احکام شرعیہ کی پابندی سنتوں کا عشق اور اس کی سر بلندی کے لئے جاں سپاری اور فدائیت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی یہی وجہ ہے کہ بلا خوف لومۃ لائم آپ زندگی کی آخری سانس تک اہل سنت کے دفاع میں سینہ سپر رہے۔ اور ضرورت پڑی تو سنت کا علم اٹھائے میدان کی صف اول میں

نظر آئے۔ آپ کی دینی حمیت وصلابت نے کبھی کسی مصلحت کی پرواہ نہ کی۔

اباحیت کی بدعت جب مصلحت کی ریشمی قبا اوڑھ کر اہل علم کے ذہنوں پر نہ صرف دستک دے رہی تھی بلکہ ان پر اپنی گرفت بھی مضبوط کر رہی تھی، اسی زمانے میں حضرت سے کسی نے کہا۔ آپ حضرات کی شدت اگر یوں ہی برقرار رہی تو ڈر ہے کہ نئی پود کہیں اسلام سے دور نہ ہوجائے۔ آپ نے پورے وقار سے ارشاد فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اباحیت کا یہ جنون اسی طرح ترقی کرتا رہا تو کہیں اسلام ہی اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہنے پائے۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے میرا دورۂ حدیث کا سال تھا، ۱۸-۱۹ کا سن، کسی صاحب علم نے دوران گفتگو کہا کہ حضرت اگر اختلافی موضوعات پر اپنا وقت ضائع نہ فرماتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس وقت میرا شعور بھی بیدار نہ ہوا تھا، میں تو اس وقت خاموش رہ گیا۔ اب سوچتا ہوں۔ کاش ان سے ملاقات ہوجائے تو ادب سے ان کی خدمت میں عرض کروں۔

ہائے ظالم تو نے پی ہی نہیں

اختلاف کا نام ہی سن کر بہت سی پیشانیاں شکن آلود ہونے لگتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ پھر علمی ذمہ داری کیا ہے؟ اور مداہنت کس چڑیا کا نام ہے؟ ایسے مواقع پر بہت سے ہوش مندوں کو نعرۂ اتحاد یاد آتا ہے۔ مگر پھر سوال کھڑا ہوتا ہے کہ نقطۂ اتحاد کے بغیر اتحاد کا مفہوم اور اسکی حقیقت کیا ہے؟ آج اس سوال پر نزاکت وقت کی دہائی دی جاتی ہے، مگر کیا انگریزوں کے دور میں ان سے مقابلے کے لیے جس اتحادی قوت کی ضرورت تھی، آج اس سے زیادہ مطلوب ہے؟ پھر کیا حضرت شیخ الہندؒ کو یہ اتحادی مصلحت دکھائی نہ دی تھی کہ آپ نے اختلافی موضوع پر ادلۂ کاملہ شائع فرمائی؟

سچی بات یہ ہے کہ وارث علم تک جو وراثت پہنچی ہے اس میں احقاق حق بھی ہے اور ابطال باطل بھی اور ایک سچا وارث جو اندر سے دیانتدار اور اپنے مورث کا وفادار بھی ہو۔ وہ ضرورت پڑنے پر کبھی خود کو روک ہی نہیں سکتا اور انجام کی پرواکئے بغیر میدان میں کود پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرتؒ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا میں نے اکثر آپ کو زیر لب یہ مصرعہ گنگناتے ہوئے دیکھا ہے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اب حضرت والا تو اپنی علمی اور منصبی ذمہ داری بحسن وکمال پوری فرما کر حصول انعام کے لیے مولیٰ کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ اب ہمارے سامنے دام ہمرنگ زمین ہے۔ مخالفین کی ریشہ دوانیاں ہیں۔ اور اپنوں کے پاس اپنے مشاغل ہیں، اتحاد کا پر فریب نعرہ ہے، مصلحتوں کی بلند وبالا دیواریں ہیں اب تو بس یہی کہا جاسکتا ہے

قضیۃ ولا أبا حسن لہا

پروردگار عالم سے دعاء ہے کہ وہ اپنے دریائے نوازش وکرم سے حضرت والا کو خوب خوب سیراب کرے اور امت کو آپ کا جانشیں کوئی درویش صفت، دردمند مسیحا عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین □□

مخالف مسلک کے سلسلہ میں محدث اعظمیؒ کا نظریہ

محدثِ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے جس قدر بھی علمی اور تعلیمی کام کیا، سب گھر پر بیٹھ کر کیا، ظاہری طور پر شہرت کی وجہ آپ کے ساتھ کچھ بھی نہیں تھی، جو کچھ تھا وہ آپ کی علمی خدمت، علوم دینیہ میں مہارت بالخصوص علم حدیث سے شغف تھا، اللہ تعالیٰ نے دل ودماغ اور فکر وذہن متقدمین جیسا عطا کیا تھا، مئو جیسی چھوٹی اور صنعتی جگہ میں رہ کر پورے عالم اسلام میں روشناس ہوئے اور برصغیر سے لے کر سعودی عرب، کویت اور مصر تک علماء کرام نے آپ سے حدیث کی سند اور اجازت حاصل کی، طبیعت غیور اور بے نیاز پائی تھی، شہرت طلبی کے جذبہ سے سینہ پاک تھا، نام ونمود سے کوسوں دور تھے مگر مقبولیت خداداد تھی، اور غالباً علوم نبوت سے دلچسپی کا فیضان تھا۔

مخالف مسلک والوں سے جنگ کا جذبہ قطعاً نہیں تھا لیکن جب کوئی مسلک حق پر حملہ آور ہوتا تو پھر اس وقت خاموش بھی نہیں رہ سکتے تھے، شیعوں اور رافضیوں کا منہ توڑ جواب لکھا، بدعتیوں کو دنداں شکن جواب دیا اور غیر مقلدوں کو ان کے گھر تک پہنچایا یہ سب دفاعی تھا، اقدامی نہ تھا۔ درس حدیث میں فرماتے تھے کہ مجھے کسی سے عناد نہیں ہے حدیث میں نماز کے سلسلے میں متعدد روایتیں آئی ہیں ایک پر اگر غیر مقلد عمل کرتے ہیں تو ان سے کیوں لڑا جائے جب کہ وہ بھی حدیث سے ثابت ہے لیکن جب وہ حنفیوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث پر عمل نہیں کرتے، قیاس پر عمل پیرا ہیں، تو اس وقت سوچو کیسے خاموش رہا جائے، اور یہ کیوں نہ بتایا جائے کہ حدیث پر تم سے زیادہ عمل کرنے والے ہیں۔ اور تم سے زیادہ حدیث جاننے والے ہم ہیں۔

المحدث الفقیہ الشیخ حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ
اور تحقیق و تعلیق مسند حمیدی

مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی★

تمھید

اسلامی تاریخ بلکہ انسانی تاریخ کے ہر دور میں ایسی عبقری شخصیات ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں جنھیں خلاق کائنات نے بیک وقت گوناں گوں صفات و صلاحیتوں سے نوازا، جن کی بدولت انھوں نے علوم وفنون کی ہمہ جہات میں کمال مہارت کے ساتھ عظیم خدمات انجام دیں اور جریدۂ عالم پر مہر دوام ثبت کی، انھیں عباقرہ میں پندرہویں صدی ہجری کی ایک نمایاں شخصیت محدث فقیہ شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمۃ کی ذات عالی صفات ہے، جنھیں اللہ عزوجل نے بیک وقت محدث ومفسر، محقق وفقیہ، شاعر وادیب، مدرس ومناظر اور مرجع الخلائق بنایا تھا، شاعر ابونو اس نے بجا کہا ہے کہ:

لیس علی اللہ بمستنکر أن یجمع العالم فی واحد

حضرۃ الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمۃ والرضوان جو مشرقی یوپی میں ''بڑے مولانا'' کے لقب سے آج بھی معروف ہیں، آپ کا تاریخی نام ''اختر حسن'' اور معروف نام ''حبیب الرحمٰن'' ہے، ''ابوالمآثر'' کنیت اور ''الاعظمی'' نسبت سے مشہور ہیں، وطن ہے مشرقی یوپی کا ایک چھوٹا لیکن معروف شہر ''مئوناتھ بھنجن'' جو کبھی ضلع ''اعظم گڑھ'' کا ایک قصبہ تھا اور شاید اسی نسبت سے اور غالب گمان یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ پر عمل پیرا ہونے کے سبب خود کو ''الاعظمی'' سے معروف کیا اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ غیر مقلدین کے ساتھ مناظروں میں ان کے رفیق، معروف سیاستداں، متبحر عالم مولانا عبداللطیف نعمانی صاحب مئوی نے امام صاحب کے اسم گرامی نعمان بن ثابت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے لئے ''نعمانی'' نسبت اختیار فرمائی تھی، اور ممکن ہے ان نسبتوں کو اختیار کرنے کا باعث یہ رہا ہو کہ اس دور میں ایک نیا فتنہ ''عدم تقلید'' کا بہت تیزی سے فروغ پا رہا تھا، جس نے اپنا شعار تو ''عمل بالحدیث'' ظاہر کیا، لیکن اس کی ساری تگ ودو، قرآن وحدیث پر مبنی مذاہب فقہیہ کی مخالفت، اور خاص طور سے امام اعظم ابوحنیفہؒ پر طعن وتشنیع، مذہب حنفی کی بیخ کنی اور عوام الناس کو اس سے بیزار کرنے کے لئے ہوا کرتی ہے۔ مشرقی یوپی کے اضلاع میں اس فتنہ کی سرکوبی، اور عوام کو اس کے شر سے محفوظ رکھنے میں مولانا اعظمی اور مولانا نعمانی علیہما الرحمۃ نے بھرپور محنت کی، تحریر و تقریر اور مناظروں کے ذریعہ یہ حقیقت علماء اور عوام کو باور کرائی کہ مذہب حنفی مکمل قرآن وحدیث ہی پر مبنی ایک طریقۂ عمل ہے، اس کے ساتھ ہی اپنی جلالت علمی کے ساتھ اس نسبت کو ملحق کر کے امام اعظم نعمان بن ثابت رحمہ اللہ کی فقہ سے عوام کے اعتماد کو برقرار رکھا۔

مولانا اعظمی رحمہ اللہ وسعت مطالعہ، استحکام علم، کثرت استحضار، تحقیق مسائل، دقت نظر اور ضبط واتقان میں علماء سلف اور ائمۂ محدثین کی مثال، وسعت علم میں علامہ ذہبیؒ کی نظیر، تحقیقات کی درستگی اور رائے کی پختگی میں حافظ ابن حجرؒ کا نمونہ، اور اپنے علمی کارہائے گرانمایہ کے سبب پندرہویں صدی ہجری کے عباقرۂ اسلام کے طبقۂ اولی میں شمار کئے جانے کے اہل ہیں۔ اللہ عزوجل نے آپ کی ذات میں طلب وجستجو، تحقیق وتدقیق اور معاملہ فہمی کی صلاحیت پورے طور پر ودیعت فرمائی تھی، شخصیت ہمہ جہت وہمہ گیر تھی، تفسیر واصول تفسیر، حدیث واصول حدیث، فقہ وفتاوی، شعر وادب، علم القوافی، رد فرق باطلہ، تحقیق وتعلیق تصحیح واستدراک، تاریخ وسیر، علم اسماء الرجال، تصوف وطریقت، غرض یہ کہ کوئی ایسا میدان علم نہیں جس میں آپ کے اشہب قلم نے اپنی منفرد شان نہ دکھلائی ہو، اور آپ کی تحریریں مرجع کی حیثیت نہ رکھتی ہوں، مگر عالمی پیمانہ پر اہل علم میں آپ کی شناخت اور شہرت علوم احادیث نبویہ کے تعلق سے عروج تک پہنچی۔

احادیث نبویہ

''شارع حقیقی'' وحدہ لاشریک نے اپنے ارشاد عالی {ثم جعلناک علی شریعۃ من الأمر فاتبعھا} (الجاثیہ:۱۸)، کے ذریعہ اپنے رسول خاتم النبیین ﷺ کو ایک مکمل اور جامع شریعت سے سرفراز فرمایا، اور اس کی تفصیل کے لئے اپنی آخری محکم کتاب قرآن مجید نازل فرمائی، جس کی تفسیر ووضاحت اور بیان کا عالی منصب بھی آپؐ کی ذات اقدس کو ہی عنایت فرمایا، ارشاد ربانی ہے: {وأنزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل إلیھم ولعلھم یتفکرون} (النحل:۴۴)، اس آیت کریمہ میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ کتاب اللہ کو سمجھنے اور اس پر عمل کے لئے رسول اللہؐ کے ارشادوفرمودات اور آپؐ کے طریقۂ عمل یعنی احادیث نبویہ کا جاننا، اس کی حفاظت کرنا اور اسے بعد والوں تک محفوظ طریقہ پر پہونچانا شریعت مطہرہ کو باقی رکھنے کے لئے ناگزیر ہے،

★ استاذ جامعہ عربیہ تعلیم الدین، مئو

چنانچہ امت مسلمہ نے عہد رسالت سے ہی ''نصرۃ الحدیث'' کا فریضہ انجام دیا، اوراحادیث نبویہ کومحفوظ رکھنے کا اہتمام کیا۔

کتب احادیث

رسول اللہؐ کی احادیث مبارکہ کو محفوظ رکھنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ انھیں یادر کھنے کا اہتمام کیاجائے جسے ضبط صدر سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے لئے صحابۂ کرام، رسول اللہؐ سے سننے کے بعد باہم احادیث کا مذاکرہ کرتے تھے، دوسری صورت لکھ لینے کی تھی جسے ضبط کتاب سے تعبیر کیا جاتا ہے، رسول اللہؐ کی حیات طیبہ سے ہی دونوں صورتوں کو اختیار کیا گیا، اگر چہ ابتداء میں پہلی صورت زیادہ رائج تھی، مگر صحابۂ کرام کی ایک معتد بہ تعداد احادیث نبویہ کولکھنے کا اہتمام بھی کرتی تھی جس کا علم بھی رسول اللہؐ کو تھا، اور آپ کی تائید بھی اسے حاصل تھی، جن صحابۂ عظام کے بارے میں احادیث نبویہ کوضبط تحریر میں لانے کا ذکر ملتا ہے ان میں سرفہرست عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے علاوہ جابر بن عبداللہ، سمرۃ بن جندب، ابو ہریرہ، سبیعۃ الاسلمیہ، سیدنا ابوبکر الصدیق ومتعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اسماء گرامی شامل ہیں، کتابت احادیث کا یہ سلسلہ اپنی ارتقائی منازل کو طے کرتے ہوئے تیسری صدی ہجری تک متون کتب حدیث کی متعدد اقسام - جوامع، سنن، مصنفات، مسانید اور اجزاء نیز صحاح وغیرہ - کی شکل اختیار کر چکا تھا، جن میں سے کچھ مطبوع اور بیشتر مخطوطات کی شکل میں مکتبات عالمیہ میں محفوظ ہیں، متون احادیث نبویہ کی جمع و ترتیب کے بعد ان کی شرح وتوضیح اور مخطوطات کی تحقیق وتعلیق کا دور شروع ہوا، جن ہندوستانی علماء نے مخطوطات حدیثیۃ پر تحقیق وتعلیق کی خدمت انجام دی ہے ان میں ایک عظیم نام محدث فقیہ شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمہ اللہ کا ہے، آپ نے سنن سعید بن منصور، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الزہد والرقائق، المطالب العالیہ، مسند حمیدی، اور دیگر متعدد اہم کتابوں پر تحقیق وتعلیق، تصحیح وتحشیہ اور استدراک و تعقیب کا فریضہ انجام دیا، اس مقالہ میں امام بخاری علیہ الرحمۃ کے استاذ ابوبکر عبداللہ بن زبیر الحمیدی کی تصنیف ''مسند الحمیدی'' کے مخطوطہ کی تصحیح و تحقیق کے تعلق سے کچھ معروضات اور نمونے پیش خدمت ہیں۔

مسند

کتب احادیث میں ''مسند'' اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں مؤلف اپنی مسموعات کوصحت وضعف اور ابواب وفصول سے قطع نظر مرویات صحابہ کی ترتیب پر جمع کرتا ہے، صحابہ کی ترتیب خواہ ان کے فضل ومراتب کے لحاظ سے ہو یا حروف معجم کی ترتیب سے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''صفۃ کتابۃ الحدیث'' کے ضمن میں لکھتے ہیں ''و صفۃ تصنیفہ، وذلک اما علی المسانید، بأن یجمع مسند کل صحابی علی حدۃ، فإن شاء رتبہ علی سوابقھم و ان شاء رتبہ علی حروف المعجم، و ھو أسھل تناولاً'' [اور اس کی تصنیف کا بیان: اور یا تو مسانید کی نوع پر، باین طور کہ ہر صحابی کی روایت کو سند کے ساتھ الگ الگ جمع کرے، پھر اگر چاہے تو اسے صحابہ کرام کی سابقیت ومنزلت کے لحاظ سے مرتب کرے یا حروف معجم کی ترتیب پر جمع کرے، اور استعمال کے لحاظ سے یہی زیادہ آسان ہے] (نزہۃ النظر: ص ۱۸۷) عموما 'مسند' کا لفظ جب مطلقا بولا جاتا ہے تو اس سے مراد کتاب ''مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ'' ہوتی ہے، ورنہ مسانید کی ترتیب متعدد محدثین نے دی ہے، مثلاً مسند ابوداؤد الطیالسی (متوفی ۲۰۴ھ)، مسند البزار (متوفی ۲۴۹ھ)، مسند بقی بن مخلد (متوفی ۲۷۶ھ)، مسند ابو یعلی الموصلی (متوفی ۳۰۷ھ) اور مسند حمیدیؒ۔

مخطوطہ اور اس کی تحقیق و تعلیق

مخطوطہ سے مراد کسی کتاب کا غیر مطبوعہ قلمی نسخہ ہوتا ہے'' المخطوطۃ: النسخۃ المکتوبۃ بالید''، ''المخطوط: المکتوب بالخط لا بالمطبعۃ، ج مخطوطات''، [مخطوطہ یعنی ہاتھ سے لکھا ہوا غیر مطبوعہ نسخہ، اس کی جمع مخطوطات آتی ہے]، (المعجم الوسیط) اور تحقیق کا لغوی معنی اثبات و تصدیق ہے، ''حقق الأمر: أثبتہ و صدقہ'' [کسی شئے کی تحقیق کی، یعنی اس کو ثابت کیا اور اس کی تصدیق کی]، کسی مخطوطہ کے بارے میں اس کے عنوان اور مصنف کی تعیین، مصنف کی طرف اس کی نسبت کی صحت، اور اس کی تاریخ نسخ وکتابت، اور ناسخ کی تعیین کا ثبوت فراہم کرنے، نیز اس کتاب کے دیگر موجودہ مخطوطات سے مقابلہ کو تحقیق سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس مخطوطہ کے مشتملات کی تصحیح یا اغلاط کی اصلاح، نقص کی تکمیل، زائد کی وضاحت یا مصنف کے کلام کی تفسیر یا اس پر نقد اور اپنی رائے کے اظہار کو تعلیق کہا جاتا ہے، ''وعلق علی کلام غیرہ: تعقبہ بنقد أو بیان أو تکمیل أو تصحیح أو استنباط'' [کسی کے کلام پر تعلیق کی، یعنی اس پر نقد کیا، یا اس کی وضاحت کی یا اس کی تکمیل کی یا اس کی تصحیح کی یا اس سے استنباط کیا]، (المعجم الوسیط)۔

تحقیق مخطوطات کا فائدہ

اسلامی شریعت کا اولین مرجع اور اساس، قرآن کریم اور احادیث رسولؐ ہیں، مکمل قرآن کریم کا ثبوت اور نقل عہد نزول سے ہی اس تواتر کے ساتھ رہا ہے کہ اس کے انکار یا اس میں شک پیدا کرنے کی کوشش پتھر سے سر ٹکرانے کے مرادف ہے، جبکہ بیشتر احادیث رسولؐ اخبار آحاد کی قبیل سے ہیں، لہٰذا دین اسلام کو غیر معتبر اور مشکوک بنانے کے لئے اہل کتاب، یہود و نصاریٰ کی طرف سے زیادہ کوشش یہی رہی کہ احادیث نبویہ کی رسول اللہؐ کی طرف نسبت کو مشکوک کر دیا جائے، کیونکہ احادیث نبویہ ہی کتاب اللہ کی

وضاحت کرنے والی ہیں، اور اسلامی شریعت کی تفصیلات احادیث رسول سے ہی معلوم کی جاتی ہیں، لہٰذا کتب احادیث نبویہ کے قدیم مخطوطات کے ظہور وانکشاف اور ان پر تحقیق وتعلیق کا ایک عظیم فائدہ یہ ہے کہ صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث مطبوعہ کے مصنّفین پر معاندین اسلام کی طرف سے جو یہ شکوک وشبہات ظاہر کئے جاتے ہیں کہ ان لوگوں نے موضوع اور من گھڑت سندوں سے احادیث جمع کردی ہیں اور ان کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف صحیح نہیں ہے، اس شبہہ کی مکمل طور پر تردید ہوجاتی ہے کہ جن رواۃ ورجال سے ان مطبوعہ کتابوں کے مؤلفین نے احادیث نقل کی ہیں، انھیں رواۃ سے ان سے پہلے کے محدثین نے بھی اپنی تالیفات میں ان احادیث کو ضبط کیا ہے جو ابھی مخطوطات کی شکل میں پردۂ خفا میں ہی رہی ہیں، عام نہیں ہوئیں، اور یہ کہ احادیث رسولؐ کی روایت کے تسلسل کا اہتمام بھی اول یوم سے ہی رہا ہے۔

چنانچہ محدث الاعظمی علیہ الرحمۃ کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ ان قدیم کتب حدیث کے مخطوطات کو منصۂ ظہور پر لایا جائے، اور ان کی تحقیق وتصحیح کے بعد انھیں شائع کیا جائے، جس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ اس سے استفادہ آسان اور عام ہوگا، دوسرا یہ کہ ان معاندین کی ہرزہ سرائی کی جگ ہنسائی بھی ہوگی، لکھتے ہیں: ''وكنت أود منذ أعوام أن لو وفق الله أحدا من أهل العلم أن يفتش عما بقي من هذه المسانيد في خزائن الكتب، فإن ظفر بشيء منها قام بتصحيحه ونشره، لكان خدمة لا تنسى ومنة في رقاب أهل العلم'' [برسوں سے میری یہ خواہش رہی کہ کاش اللہ عزوجل کسی صاحب علم کو یہ توفیق دیتے کہ مکتبات اور لائبریریوں میں باقیماندہ محفوظ ان مسانید کو تلاش کرتا اور دستیاب ہونے کے بعد ان کی تصحیح وطباعت کا فریضہ انجام دیتا تو یہ ایک ناقابل فراموش خدمت ہوتی اور اہل علم پر احسان ہوتا] (مقدمہ تحقیق مسند حمیدی: ۱/۲)

مسند حمیدی

یہ امام ابوبکر عبداللہ بن زبیر بن عیسی القرشی المکی کی تصنیف ہے، جو بنو اسد بن عبدالعزیٰ کے ایک بطن حُمید بن اسامہ کی طرف منسوب ہوکر ''حمیدی'' سے معروف ہیں (فتح الباری: ۱/۱۰) سفیان بن عیینہؒ سے سماع حدیث نیز مصر کے سفر میں امام شافعیؒ کے ساتھ رہے ہیں، ''قال أبو حاتم: أثبت الناس في سفيان بن عيينة الحميدي وهو رئيس أصحاب ابن عيينة'' [سفیان بن عیینہ کے تلامذہ میں سب سے معتبر حمیدی ہیں] (کتاب الجرح والتعدیل ۵/۵۷) ''وهو معدود في كبار أصحاب الشافعي ؒ'' [کبار شوافع میں ان کا شمار ہوتا ہے] (تذکرۃ الحفاظ: ص ۴۱۳)، اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے حدیث وفقہ میں بہت زیادہ کسب فیض کیا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے ''جزم كل من ترجم البخاري بأن الحميدي من شيوخه في الفقه والحديث''، [امام بخاری کے سارے ہی ترجمہ نگاروں نے قطعیت کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ فقہ وحدیث میں حمیدی ان کے استاذ ہیں] (مقدمہ تحقیق مسند الحمیدی: ص ۷)، ۲۱۹ھ میں ان کی وفات ہے، ان کی تصانیف میں ''مسند'' کے علاوہ ''کتاب التفسیر'' اور ''کتاب الرد علی النعمان'' کا ذکر بھی ملتا ہے، مگر زیادہ مشہور یہ مسند ہی ہے (مقدمہ تحقیق مسند الحمیدی: ۱/۸)، جس کے بارے میں مولانا اعظمی علیہ الرحمۃ کا خیال ہے کہ یہ اولین مسانید سے ہے ''قلت: ومن قدماء مصنفي المسند أبو بكر عبد الله بن الزبير الحميدي، المتوفى في سنة تسع عشرة ومائتين وظني أنه أول من صنف المسند بمكة وهو أقدم موتا من الحماني ومسدد، فهو أول وأحق بأن يعد من أوائل من صنف المسند'' [میں اس کا قائل ہوں کہ مسند کے اولین مصنّفین میں ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی بھی ہیں جن کی وفات ۲۱۹ھ میں ہے، اور میرا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے انھوں نے ہی مسند کو ترتیب دیا ہے، اور ان کی وفات حمانی اور مسدد سے پہلے ہے، لہٰذا یہ زیادہ مستحق ہیں کہ انھیں اوائل مصنّفین مسند میں شمار کیا جائے] (مقدمہ ۱/۲)، یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی (کوفہ) اور مسدد بن مسرہد (بصرہ) ہر دو کی وفات ۲۲۸ھ میں ہے۔

مخطوطۂ مسند حمیدی کی بازیافت

محقق الاعظمی رحمہ اللہ کو مسند حمیدی کا نسخہ سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے مکتبہ سے دستیاب ہوا، پھر دیسمبر ۱۹۵۸ عیسوی میں حیدرآباد کا سفر پیش آیا، جہاں ''مکتبہ سعیدیہ'' سے اس کتاب کے ایک دوسرے نسخہ کی فراہمی سے حوصلہ ملا کہ اس کتاب کی تصحیح وتعلیق کا بیڑہ اٹھایا جائے، اس ارادہ سے محدث الاعظمی نے حیدرآباد کا دوبارہ سفر کیا تاکہ دستیاب دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا جاسکے، اور ''مزے کی چیز ہے یہ ذوق جستجو بھی'' کہ اس مرتبہ قسمت نے مزید یاوری کی، مکتبہ جامعہ عثمانیہ میں ایک تیسرے نسخہ کا علم ہوا، ان تینوں نسخوں کی اساس پر عمل تحقیق وتعلیق کی ابتدا ہوئی، زیادہ تر کام ہوچکا تھا بلکہ طباعت کا سلسلہ بھی شروع ہوچکا تھا، کہ ''مکتبۃ النہضۃ الحدیثۃ، مکہ مکرمہ'' کے مالک شیخ عبدالشکور فدا صاحب کے توسط سے ایک چوتھا نسخہ موصول ہوا جو'' دارالکتب الظاہریۃ، دمشق'' میں موجود نسخہ کا فوٹو تھا، چنانچہ اس نسخہ کا بھی اصل نسخہ سے مقابلہ کیا گیا اور، غیر مطبوعہ حصہ کی تعلیقات میں اس نسخہ سے استفادہ بھی کیا گیا، اور اس سے ماخوذ وہ فوائد جن کا تعلق مطبوعہ حصہ سے تھا ان کو کتاب کے آخر میں ''الاستدراک والتعقیب'' کے عنوان سے مذکور تفصیل میں شامل کردیا گیا ہے۔

منہج عمل

اولاً: محقق الاعظمیؒ نے تینوں نسخوں کا مقابلہ کیا، اور ان کے لئے رموز

قائم کئے، دیوبند اور جامعہ عثمانیہ والا نسخہ دونوں کے لئے ''اصلین'' کا رمز متعین کیا، اور صرف دیوبند والے نسخہ کو ''اصل'' سے اور صرف جامعہ عثمانیہ والے نسخہ کو ''ع'' سے تعبیر کیا ہے، اور مکتبہ سعیدیہ والے نسخہ کے لئے ''س'' کا رمز قائم کیا، جبکہ دار الکتب الظاہریہ والے نسخہ کی طرف ''ظ'' سے اشارہ کیا ہے۔

ثانیاً: ہر نسخہ کا تعارف کرایا، جس کا ماحصل یہ ہے کہ دیوبند والا نسخہ ۱۳۲۴ھ میں لکھا گیا ہے، جو فاضل ادیب شیخ محی الدین الہ آبادی کی ملکیت میں تھا، اور انھوں نے ہی اسکو مدرسہ دار العلوم دیوبند کے لئے وقف کیا ہے، مکتبہ سعیدیہ والا نسخہ ۱۳۱۱ھ میں لکھا گیا ہے، اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بجز چند کلمات کے جو دیوبند والے نسخہ میں سہواً کتابت سے رہ گئے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیوبند والا نسخہ ''سعیدیہ'' والے نسخہ سے ہی نقل کیا گیا ہے، اور جامعہ عثمانیہ والا نسخہ ان دونوں سے قدیم ہے کیونکہ وہ ۱۱۵۹ھ سے پہلے کا لکھا ہوا ہے، (مقدمہ: ج ۱ص ۳ و ۴)، مگر ان تینوں مخطوطات کے کاتبین کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اور دار الکتب الظاہریہ والے نسخہ پر سن کتابت ۶۸۹ھ درج ہے، اور اس کے کاتب احمد بن النصیر ہیں (مقدمہ: ۱/ ۱۸)۔

ثالثاً: محققؒ نے صاحب کتاب ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدیؒ کا تعارف کرایا ہے، اہل علم اور ائمہؒ سے ان کے بارے میں منقول تعریفی کلمات اور ان کی عظمت شان و بلندیٔ مقام کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں ''هذا و لم أجد ما ينقم عليه إلا ما يحكى من شدته على فقهاء العراق و اطلاق لسانه فيهم، فإن صح ما يحكى عنه من ذلك كان الأليق بجلالته التحرز عما يمس كرامته و يجرح شرفه'' [اور فقہاء عراق کے ساتھ ان کے سخت رویہ اور ان کے متعلق ان کی زبان درازی کے سوا میں نے ان میں کوئی عیب نہیں پایا، اور اس قبیل کی جو باتیں ان کی طرف سے منقول ہیں اگر صحیح ہیں تو ان کی جلالت شان کے مناسب یہ تھا کہ ایسی باتوں سے بچے رہتے جو ان کی عزت و شرف کو مجروح کریں]، نیز لکھتے ہیں ''و الذي لا يمكن أن يكتم أن ما انتهى إلينا من شمائله و سيرته بطريق الرواة ينم عن كونه لا يملك نفسه إذا غضب و إن جبهه أحد بما لا يرضاه أقذع في الكلام و أفحش في الرد عليه''، [اور وہ امر جسے چھپانا ممکن نہیں کہ رواۃ کے توسط سے ان کی سیرت و شمائل سے متعلق جو باتیں ہم تک پہونچی ہیں، وہ غمازی کرتی ہیں کہ موصوف غصہ میں بے قابو ہوجاتے تھے، اور اگر کوئی ان کے سامنے ایسی بات کرتا جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتی تو اس کی تردید میں بدکلامی اور فحش گوئی سے پیش آتے تھے] (مقدمہ: ۱/ ۷)

رابعاً: کسی کتاب کے معتبر ہونے کے لئے اس کے مصنف کی جانب اس کی نسبت کا ثبوت درکار ہے، چنانچہ محقق اعظمیؒ علیہ الرحمۃ نے اس مسند کی

امام حمیدیؒ کی جانب نسبت کی صحت کے لئے اس کے رواۃ کا ذکر اور ان کا تعارف بھی کرایا ہے، حمیدیؒ سے اس مسند کو روایت کیا ہے بشر بن موسی الاسدی (۱۹۰-۲۸۸ھ) نے ان سے ابوعلی ابن الصواف (۲۷۰-۳۵۹ھ) نے ان سے عبد الغفار بن محمد (۳۴۵-۴۲۸ھ) نے ان سے ابومنصور الخیاط (۴۰۱-۴۹۹ھ) نے، ابومنصور الخیاط سے اس مسند کو دو محدثین نے روایت کیا ہے ابوالحسن سعد اللہ بن نصر (۴۸۲-۵۶۴ھ) اور ابوالمعالی احمد بن عبدالغنی (-۵۶۳ھ) نے اور ان دونوں سے روایت کیا ہے ابومحمد عبدالغنی بن عبد الواحد (-۶۰۰ھ) نے، جبکہ ایک اور راوی محمد بن عماد بن محمد (۵۴۲-۶۳۲ھ) نے تنہا ابوالحسن سعد اللہ بن نصر سے روایت کیا ہے۔

مگر نسخہ ظاہریہ کے سوا تینوں نسخے اس سے خاموش ہیں کہ اس مسند کو عبد الغنی بن عبد الواحد اور محمد بن عماد سے کس نے روایت کیا ہے، اور ''نسخہ ظاہریہ'' تحقیق و تعلیق کا کام تقریباً ختم ہونے کے بعد ہاتھ لگا ہے، اس لئے محقق اعظمی علیہ الرحمۃ نے توثیق کے لئے حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہا اللہ کی کتابوں میں مذکورہ بالا رواۃ مسند سے حمیدی علیہ الرحمۃ کی بعض منقول احادیث کا مراجعہ کیا، اور نسخوں میں موجود احادیث کی ان احادیث کے ساتھ موافقت سے اس امر پر اطمینان کیا کہ یہ مسند حمیدی کے ہی نسخے ہیں، چنانچہ مسند حمیدی المجلد الثانی کے مقدمہ میں محقق نے لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر نے بشمول مسند حمیدی آٹھ مسانید کو اپنی کتاب ''المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ'' میں جمع کیا ہے، جس کے جزء اول کا مخطوطہ محقق اعظمی علیہ الرحمۃ نے حیدرآباد میں دیکھا ہے، جس میں ہر کتاب کے شروع میں ابن حجرؒ نے اس کتاب کے مصنف تک اپنی سند کا ذکر کیا ہے، مسند حمیدی کے شروع میں لکھتے ہیں ''و أما مسند الحميدي فأخبرنا به عبد الرحمن بن أحمد بن المقداد الفيشي في كتابه إلينا من دمشق، أنا أحمد بن أبي طالب بن الفيبطي، أنا أحمد بن عبد الغني...... الخ'' (مقدمہ: ج ۲/ ۳)، (''الفیشی'' فاء اور شین معجمہ کے ساتھ، اسی طرح مقدمہ مسند میں مذکور ہے، اور خطأ و النسیان کی فہرست میں بھی اس کے متعلق کچھ مذکور نہیں، مگر یہ کتابت کی غلطی ہے، صحیح ''القیسی'' ہے قاف اور سین مہملہ کے ساتھ، جیسا کہ ''الجواهر و الدرر في ترجمة شيخ الاسلام ابن حجر، لشمس الدين أبي الخير محمد بن عبد الرحمن السخاوي المتوفى ۹۰۲ھ'' (۱/ ۲۱۹) میں ابن حجر رحمہ اللہ کے شیوخ کی فہرست میں صراحت ہے، نیز دیکھئے ''ذيل التقييد في رواة السنن و الأسانيد لمحمد بن أحمد بن علي الفاسي المتوفى ۸۳۲ھ'' (۲/ ۷۸)۔

بعدہٗ جب ''ظاہریۃ'' کا نسخہ فراہم ہوا تو اس کے کاتب نے اپنے نام

احمد بن نصیر اور سن کتابت ۶۸۹ھ کی صراحت کے ساتھ اس کی بھی تصریح کی ہے کہ ان کو اس نسخہ کی سماعت تین شیوخ عبدالنصیر بن علی المربوطی، یوسف بن عبدالمحسن الحمیری اور ابومحمد عبداللہ معروف بابن الشمعۃ سے حاصل ہے اور ان تینوں کو محمد بن عماد الحرانی سے سماعت حاصل ہے، نیز اس نسخہ پر دیگر متعدد معروف مشائخ کی سماعتوں کا بھی تذکرہ درج ہے، جس سے اس مسند کا حمیدی کی تالیف ہونا محقق ہوجاتا ہے،(مقدمہ:۱/ ۱۸)۔

خامساً: مسند حمیدی کے اجزاء کے بارے میں یہ وضاحت فرمائی ہے کہ علماء کے مابین معروف ہے کہ مسند حمیدی گیارہ اجزاء پر مشتمل ہے، لیکن کتاب میں گیارہویں جزء کا عنوان نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مخطوطات کے ناسخین نے حدیث نمبر ۱۲۴۶ کے بعد یہ تو لکھ دیا کہ جزء یعنی جزء عاشر تمام ہوا، مگر گیارہویں جزء کا عنوان نہیں قائم کیا، جبکہ صاحب نسخہ کی اسناد کے ذکر سے پہلے ان کو لازم تھا کہ گیارہویں جزء کا عنوان قائم کرتے، مگر شاید انھوں نے اصل میں یہ عنوان موجود نہیں پایا چنانچہ اسی کی اتباع میں اس کا ذکر نہیں کیا'' وثانیاً أن الناسخين قد أهملوا عنوان الجزء الحادي عشر بعد الحديث ۱۲۴۶، مع أنهم قد كتبوا في آخر الحديث "تم الجزء" يعنون الجزء العاشر فكان يلزمهم أن يكتبوا بعده عنوان الجزء الحادي عشر قبل أن يأخذوا في كتابة اسناد صاحب النسخة. وكأنهم لم يجدوا هذا العنوان في أصلهم فاقتفوا أثر كاتب الأصل. والحاصل أن من ذكر أن مسند الحميدي أحد عشر جزءاً فإنه قد عد ما بقي بعد تمام الجزء العاشر جزءاً واحداً وجعله الحادي عشر'' (مقدمہ:۱/ ۲۱)،

مسند حمیدی میں مذکور احادیث کی تعداد تیرہ سو(۱۳۰۰) ہے، جس میں اکثر احادیث مرفوع ہیں، کچھ تعداد صحابی یا تابعین پر موقوف احادیث کی بھی ہے، کتاب کی ابتدا سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث سے ہوتی ہے، اور اختتام حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث پر ہوتا ہے،

علامہ صدیق حسن قنوجیؒ نے ''اتحاف النبلاء'' میں مسند حمیدی کی پہلی حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث بتایا ہے، لکھتے ہیں:''اول مسندش این ست حدثنا سفیان حدثنا محمد بن علی بن الربیع السلمی عن عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب عن جابر بن عبداللہ۔۔۔الحدیث ''(اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین:ص ۱۴۶)، محقق اعظمیؒ نے اس پر تنبیہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ شاید علامہ قنوجی نے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تقلید میں یہ لکھ دیا ہے، کیونکہ ان سے پہلے شاہ صاحب نے یہی بات ''بستان المحدثین'' میں لکھی ہے،'' وظني أنه قلد في ذلك شيخ مشائخنا الشاه عبدالعزيز فإنه سبقه بهذا القول في بستان المحدثين ''(مقدمہ:۱/ ۲۱)،

بستان المحدثین میں حمیدی کے تذکرہ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں ''در اول مسندش میگوید: حدثنا سفيان ثنا محمد بن علي بن الربيع السلمي عن عبد الله بن محمد بن عقيل بن أبي طالب عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه يقول: قال لي رسول الله ﷺ: يا جابر أعلمت أن الله عز وجل أحيا أباك وقال: تمن، قال: أحيى فأقتل في سبيلك مرة أخرى، فقال: إني قد قضيت أنهم لا يرجعون''،(بستان المحدثین: ص ۱۳۳، مسند حمیدی)، دونوں کتابوں کی عبارت سے محقق اعظمیؒ کا گمان اس یقین کی ترجمانی کرتا ہے کہ علامہ قنوجی نے شاہ صاحب سے ہی اس قول کو لیا ہے، جبکہ مسند حمیدی میں اس حدیث کا رقم تسلسل ۱۲۶۵ ہے،

دونوں کتابوں میں اس حدیث کی سند میں ''محمد بن علی بن الربیع السلمی'' ہی مذکور ہے مگر ''بستان المحدثین'' کے معرّب دکتور محمد اکرم ندوی صاحب نے تعریب میں اس کو ''رُبیعۃ'' کردیا ہے، اور ''السلمی'' کو حذف کردیا ہے، نیز اس پر کوئی تعلیق بھی نہیں کی، جبکہ مناسب یہ تھا کہ اصل کی طرح تعریب میں بھی متن کو علی وجہہ باقی رکھا جاتا اور تعلیق میں اس کی اصلاح کردی جاتی، یا متن میں اصلاح کے بعد تعلیق میں اس کا ذکر کیا جاتا، محقق اعظمیؒ نے متن میں اس کی اصلاح ''رُبَيِّعة'' سے کرنے کے بعد اس پر تعلیق میں لکھا ہے:''في الأصول الربيع، والصواب "رُبَيِّعة" كما في الجرح والتعديل وقد وثقه يحيى بن معين، وظني أن هذا لخطأ قديم أو هو من بعض الرواة فقد نقله الشيخ عبد العزيز في البستان أيضاً على الخطأ'' [اصول میں الربیع ہے، اور صحیح رُبیّعۃ ہے جیسا کہ الجرح والتعدیل میں مذکور ہے، اور یحییٰ بن معین نے ان کی توثیق کی ہے، اور میرا گمان ہے کہ یہ غلطی دیرینہ اور قدیم ہے، یا کسی راوی سے سرزد ہوئی ہے، کیونکہ شیخ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بستان میں بھی غلطی کے ساتھ ہی نقل کیا ہے،](مسند الحمیدی: ۲/ ۵۳۳، حدیث:۱۲۶۵)

محقق علیہ الرحمۃ نے شاہ صاحب کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے:'' لعله لم يقف على مسند الحميدي وكان عنده نقل عن بعض المصنفين فاعتمده والواقع خلاف ذلك، فإن أول مسند الحميدي كما ترى حديث أبي بكر الصديق في صلوة التوبة'' [شاید انھیں مسند حمیدی فراہم نہ ہوسکی، اور ان کے پاس کسی مصنف کی خلاف واقع نقل کردہ (تحریر) موجود تھی جس پر انھوں نے اعتماد کیا، اس لئے کہ مسند حمیدی کی پہلی حدیث جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں نماز توبہ کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے

](مقدمہ:۱/۲۱) نیز آگے لکھتے ہیں ”وكيف يفتتح الحميدي مسنده بحديث جابر، وقد جرت عادة مصنفي المسانيد أنهم يفتتحون مسانيدهم بأحاديث ابي بكر الصديق رضي الله عنه، ثم يذكرون أحاديث من بعده من الخلفاء على ترتيبهم في الخلافة“[اور بھلا حمیدیؒ اپنی مسند کو جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے کیوں شروع کریں گے، جبکہ مسانید کے مصنّفین کی عادت رہی ہے کہ وہ اپنی مسانید کی ابتدا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی احادیث سے کرتے ہیں، پھر ان کے بعد کے خلفاء کی احادیث ان کی خلافت کی ترتیب سے ذکر کرتے ہیں] (مقدمہ:۱/۲۲)۔

سادساً: تحقیق وتعلیق اور تصحیح وتخریج احادیث: محقق اعظمی رحمہ اللہ نے مسند حمیدیؒ پر تحقیق وتعلیق کا کام اپنے وطن مئو میں رہتے ہوئے (۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ عیسوی سے پہلے) ایسے وقت میں انجام دیا جہاں اس جیسے اہم کام کے لئے اس وقت بقدر ضرورت مادی اسباب و وسائل اور سہولیات میسر نہیں تھیں، مگر ان کے پاس حوصلہ کی بلندی، محنت و جفاکشی، ذوق علم وفن اور توفیق خداوندی کے وسائل پورے طور پر فراہم تھے، جس کے ذریعہ انھوں نے اس عظیم کام کو اس نہج پر انجام دیا کہ:

(۱) مخطوطہ میں مذکور احادیث کی تصحیح کا غایت درجہ اہتمام کیا، ہر حدیث کے لئے کتب احادیث کا مراجعہ کیا تاکہ مخطوطہ میں موجود اغلاط واخطاء کی حتی الوسع اصلاح ہوسکے، یا کسی نقص کو دور کیا جاسکے، (**والعصمة لله**)

(۲) تخریج حدیث، یعنی مسند حمیدی میں مذکور حدیث کے لئے مطبوعہ کتابوں کا حوالہ فراہم کرنا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

(الف) حدیث اگر صحیحین یا اس میں سے کسی ایک میں مل گئی، تو صرف اسی کے حوالہ پر اکتفا کیا ہے، اور اگر وہ حدیث صحیحین کے علاوہ دوسری کسی کتاب میں بھی حمیدی یا ان کے شیخ کے واسطہ سے مل گئی تو اس کتاب کا بھی حوالہ دیا ہے۔

(ب) اور اگر کوئی حدیث صحیحین میں نہیں ملی تو زیادہ کوشش یہ رہی کہ سنن اربعہ میں سے کسی ایک میں مل جائے اور اس کے حوالہ پر اکتفا کیا جائے۔

(ج) ایسا بھی ہوا ہے کہ سنن اربعہ کے علاوہ کسی اور کتاب میں تلاش شروع کی اور حدیث مل گئی تو پھر سنن اربعہ میں نہیں تلاش کیا، اور اسی کے حوالہ پر اکتفا کیا، اگرچہ ممکن تھا کہ سنن اربعہ میں تلاش کی جاتی تو مل جاتی۔

(د) اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ حدیث ایک سے زیادہ کتابوں میں موجود ہے، یا سنن اربعہ اور ان کے علاوہ کتابوں میں بھی موجود ہے، تو اس صورت میں اس کتاب کی طرف نسبت اور حوالہ کو ترجیح دیا ہے، جس میں حدیث، حمیدی یا ان کے شیخ کی سند سے مذکور ہے، (مقدمہ مسند حمیدی: ج ۲/ص ۱)۔

(۳) جہاں ضرورت محسوس ہوئی حدیث کے مشکل اور غریب الفاظ کی شرح، نیز حدیث کے معنی ومفہوم کی وضاحت بھی کی گئی ہے، (مقدمہ مسند حمیدی: ج ۱/ص ۵)۔

سابعاً: مسند حمیدی میں کسی حدیث کی تلاش کو سہل اور آسان کرنے کے لئے، کتاب کی متعدد فہرست تیار کی ہے

(۱) پہلی فہرست جو مطبوع کتاب کے شروع میں دی گئی ہے، اجزاء اور مسانید صحابہ کی فہرست ہے، یعنی کس صحابی کی حدیث کس صفحہ سے شروع ہوتی ہے، اس فہرست کے بارے میں علامہ اعظمی نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ یہ ان کی تیار کردہ نہیں ہے، بلکہ یہ ”دیوبند“ والے نسخہ کے اخیر میں ملحق ہے جو ادیب فاضل محی الدین الہ آبادی کی تحریر کردہ ہے، ”وليس هذا الفهرس مما عملته، بل وجدته ملحقا بالنسخة الديوبندية بخط الشيخ الأديب الفاضل محي الدين الإله ابادي..... فرأيت أن أنشر هذا الفهرس كما هو، اعترافاً بفضله وأداء لحق شكره“ [اور یہ فہرست میری تیار کردہ نہیں ہے، بلکہ میں نے اسے ادیب فاضل شیخ محی الدین الہ آبادی کی تحریر سے دیوبند والے نسخہ میں ملحق پایا، تو مناسب سمجھا کہ ان کے فضل کے اعتراف اور حق شکر کی ادائیگی میں ہو بہو شائع کردوں] (مقدمہ: ج ۱/ص ۵)۔

(۲) دوسری فہرست صحیحین اور سنن یا بالفاظ دیگر فقہی ابواب کی ترتیب پر تیار کی گئی ہے، اس کا یہ فائدہ ہے کہ اگر حدیث کے راوی صحابی کا نام معلوم نہ ہو مگر یہ ذہن میں ہے کہ کس موضوع اور عنوان کی حدیث مطلوب ہے تو بہ نسبت پوری کتاب کے خاص اس موضوع اور عنوان کے تحت حدیث کا تلاش کرنا آسان ہوگا، ”ولما كان هذا الكتاب موضوعا على مسانيد الصحابة ولم يكن مبوبا على أبواب الفقه رأينا أن أجعل له فهرساً مرتبا على أبواب الفقه، فإذا أراد الباحث أن يكشف عن حديث لا يحفظ اسم راويه من الصحابة استعان في الكشف عن مطلوبه بهذا الفهرس ولم يحتج إلى أن يقرأ الكتاب من أوله إلى آخره“ [اور چونکہ یہ کتاب مسانید صحابہ کے طرز پر لکھی گئی ہے، اور فقہی ابواب کی ترتیب پر اس میں ابواب قائم نہیں کئے گئے ہیں تو مناسب معلوم ہوا کہ فقہی ابواب کی ترتیب پر اس کی ایک فہرست تیار کردوں تاکہ اگر کوئی حدیث کا طالب جسے مطلوبہ حدیث کے راوی صحابی کا نام یاد نہ ہو، اس فہرست سے اس کی تلاش میں اسے مدد مل جائے اور از اول تا آخر ورق گردانی کی مشقت سے بچ جائے](ص:۱/۵)۔

(۳) تیسری فہرست مسند حمیدی میں مذکور اسماء و اعلام کی ہے، کسی کتاب میں موجود مواد کی جستجو میں اس جیسی فہرست کا افادہ محتاج تعارف نہیں، حدیث میں وارد کسی شخص یا جگہ کا نام معلوم ہے تو اس جیسی فہرست یہ نشاندہی کرتی ہے کہ یہ لفظ کتاب میں کہاں کہاں ذکر ہوا ہے، اس سے بھی مطلوب تک پہونچنا آسان ہوجا تا ہے، چنانچہ علامہ اعظمیؒ لکھتے ہیں: ''ووضعت له فهرس آخر، فهرس الأعلام التي وردت في أثناء الحديث، لا لمجرد محاكاة الإفرنج بل لظهور نفعه، فقد دلت التجارب أنه يسهل الوصول إلى المطلوب ويصون كثيرا من الوقت عن الضياع'' [اور میں نے اس کے لئے ایک فہرست ان اسماء و اعلام کی تیار کی جن کا ذکر حدیث کے درمیان وارد ہوا ہے، اور یہ محض انگریزوں کی نقل میں نہیں کیا ہے بلکہ اس کے نفع کے واضح ہونے کے سبب کیا ہے، اس لئے کہ تجربہ سے ظاہر ہو چکا ہے کہ یہ فہرست مطلوب تک پہونچنے کو آسان کر دیتی ہے، اور بہت سارا وقت ضائع ہونے سے بچا لیتی ہے] (ص: ۱/ ۵)۔

تصحیح و تحقیق اور تخریج و تعلیق کے کچھ نمونے

(۱) تصحیح اغلاط اور علم الاسناد کا ذوق و وجدان:

(۱) ''حدثنا الحميدي قال: ثنا عبد العزيز بن محمد الدراوردي قال: أخبرني علقمة عن أمه عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من شاء منكم أن يهل بعمرة فليفعل، وأفرد رسول الله صلى الله عليه وسلم الحج ولم يعتمر''۔

''عن أمه'' کے تحت محقق اعظمیؒ تصحیح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: ''في الأصول ''عن أبيه'' والصواب عندي عن أمه واسمها مرجانة، تروي عن عائشة رضي الله عنها ويروي عنها ابنها علقمة كما في التهذيب وغيره، علقت هذا وما قبله بشهادة الوجدان ثم وجدت الطحاوي قد أخرج الحديث من طريق أبي الزناد عن علقمة بن أبي علقمة عن أمه، فالحمد لله'' [اصول میں ''عن ابیہ'' ہے، اور میرے نزدیک صحیح ''عن امہ'' ہے، اور ان کا نام ''مرجانہ'' ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں اور ان سے ان کے لڑکے علقمہ روایت کرتے ہیں، جیسا کہ ''تہذیب'' وغیرہ میں مذکور ہے، میں نے یہ اور اس سے ماقبل (ص ۱۰۳، تعلیق (۱)) کی تعلیق، وجدان کی گواہی پر کی، اس کے بعد میں نے امام طحاوی کو پایا کہ انھوں نے اس حدیث کو ابو الزناد کی سند سے ''عن علقمة بن أبي علقمة عن أمه'' ذکر کیا ہے، فالحمد للہ] (مسند حمیدی: ۱/ ۱۰۳، حدیث: ۲۰۴)، احادیث کی سند میں روایۃ الابناء عن الآباء (لڑکے کا اپنے والد سے روایت لینا) عام ہے، عن امہ یعنی ماں سے روایت بہت کم ہے، لہٰذا مخطوطہ میں مذکور ''عن أبيه'' کے غلط ہونے کا ادراک عام محدثین کے بس کی بات نہیں ہے، مولانا اعظمی رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح اولاً محض اپنے فنی ذوق اور وجدان کی بنیاد پر کی، پھر بعد میں امام طحاوی رحمہ اللہ کی روایت جب سامنے آئی تو اس سے آپ کی تائید بھی ہوگئی، جس وقت اس حدیث پر کام کیا گیا تھا اس وقت ''ظاہریہ'' کا نسخہ آپ تک نہیں پہونچا تھا، جب وہ نسخہ فراہم ہوا تو اس میں بھی وہی غلطی تھی جو ہندوستانی نسخوں میں تھی، چنانچہ مولانا اعظمی نے جلد اول کے آخر میں ''الاستدراک والتعقیب'' میں لکھا ہے: ''زد في آخره: وفي ''ظ'' أيضا عن أبيه ولكن فوقه علامة ( ) إشارة إلى أنه خطأ''، (ج۱، الاستدراک والتعقیب: ص۱۶)۔

(۲) ''حدثنا الحميدي، ثنا سفيان، ثنا الوليد بن مسلم وبشر بن بكر، قالا: ثنا الأوزاعي، قال: ثنا يحيى بن كثير، ثنا مولى ابن عباس أنه سمع ابن عباس يقول: سمعت عمر بن الخطاب يقول: سمعت رسول الله ﷺ يقول وهو بوادي العقيق: أتاني الليلة آت من ربي، فقال: صل في هذا الوادي المبارك، وقل عمرة في حجة''۔

اس حدیث کی تخریج کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''أخرج البخاري هذا الحديث من طريق الحميدي في الحج (ج۳ ص۲۵۲) وليس فيه ذكر سفيان، بل فيه: قال الحميدي حدثنا الوليد بن مسلم وبشر بن بكر، وأخرجه أحمد (ج۱ ص۲۲۵) وفيه أيضا ''قل عمرة في حجة''، وقد أخرجه أحمد عن الوليد ابن مسلم بلا واسطة، فذكر سفيان في هذا الحديث عندي سبق قلم من أحد النساخ'' [اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الحج میں حمیدی کی سند سے ذکر کیا ہے اور اس میں سفیان کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس میں مذکور ہے: قال الحميدي: حدثنا الوليد بن مسلم وبشر بن بكر، اور اس حدیث کو امام احمد نے بھی مسند میں نقل کیا ہے نیز اس میں مذکور ہے ''قل عمرة في حجة''، اور امام احمد نے بھی سفیان کے واسطہ کے بغیر ہی روایت کیا ہے، لہٰذا اس حدیث کی سند میں سفیان کا ذکر میرے نزدیک کسی کاتب نسخہ کی سبقت قلمی ہے] (مسند الحمیدی: ۱/ ۱۲ حدیث: ۱۹، تعلیق ۳)۔

اس تعلیق کا ماحصل یہ ہے کہ محقق اعظمی رحمہ اللہ کو اس حدیث پر تحقیق کے وقت مسند حمیدی کے مخطوطات کے جو نسخے فراہم تھے، ان میں اس حدیث کی سند میں ''حدثنا الحميدي'' کے بعد ''ثنا سفيان، ثنا الوليد بن مسلم وبشر بن بكر'' یعنی حمیدی اور ولید بن مسلم کے درمیان سفیان کا واسطہ مذکور ہے، جبکہ یہی حدیث امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حمیدی سے ہی

روایت کی ہے اور اس میں سفیان کا واسطہ مذکور نہیں ہے، اور یہی حدیث امام احمد نے اپنی مسند میں بھی اسی سند سے ذکر کیا ہے اور اس میں بھی سفیان کا واسطہ مذکور نہیں ہے، چنانچہ محقق اعظمی علیہ الرحمۃ نے اس پر یہ تعلیق فرمائی کہ میرے نزدیک یہ اضافہ مخطوطات کے ناسخین میں سے کسی کی سبقت قلمی ہے، یہ مسند حمیدی کی ابتدائی احادیث میں سے ہے، جس وقت اس حدیث پر کام کیا گیا، اس وقت مولانا اعظمی علیہ الرحمۃ کے پاس مکتبہ ظاہریہ کے مخطوطہ کی کاپی نہیں تھی، اس کا نسخہ بہت بعد میں فراہم ہوا جبکہ مسند حمیدی کے تحقیق شدہ حصوں کی طباعت کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا، جب مکتبہ ظاہریہ کا نسخہ ہاتھ لگا، تو مولانا اعظمی نے اپنے تحقیق کردہ حصوں کا بھی اس سے مقابلہ کیا، اور جو فرق ملا اسے ''الاستدراک والتعقیب'' کے تحت اخیر میں ملحق کر دیا، مکتبہ ظاہریہ کے نسخہ میں حمیدی اور ولید بن مسلم کے درمیان سفیان کا واسطہ مذکور نہیں ہے، چنانچہ الاستدراک والتعقیب ص ۳۰ میں مولانا اعظمی نے یہ صراحت فرمائی: ''زد في آخره: ثم وجدت في "ظ" ما حققته، ففيه: الحميدي ثنا الوليد بن مسلم، ليس بينهما سفيان'' یعنی میری تعلیق کے آخر میں یہ اضافہ کر لیا جائے کہ: پھر میں نے ظاہریہ کے نسخہ میں وہی پایا جو میری تحقیق تھی، چنانچہ اس میں حمیدی اور ولید بن مسلم کے مابین سفیان کا واسطہ موجود نہیں ہے۔

(۲) دقت نظر:

(۳) ''حدثنا الحميدي قال: ثنا سفيان قال بشير بن سليمان أبو اسماعيل عن مجاهد بن جبر عن محرز بن قيس بن السائب أن عبدالله بن عمرو أمر بشاة فذبحت فقال لقيمه: هل أهديت لجارنا اليهودي شيئاً فإني سمعت رسول الله ﷺ يقول: مازال جبريل عليه السلام يوصيني بالجار حتى ظننت أنه سيورثه''۔

اس حدیث کی سند میں ''مجاہد بن جبر'' کے بعد ''عن'' پر تعلیق میں لکھتے ہیں: ''هكذا في الأصلين، وكذا في ظ وهو من تصرفات النساخ قطعاً، فإن الحديث أخرجه الترمذي من طريق سفيان عن ثلاثة عن مجاهد عن عبد الله بن عمرو، وليس عنده بين مجاهد وعبد الله واسطة، وكذا أبو داؤد (ج ۲ ص ۲۱۲) والبخاري في الأدب المفرد (ص ۱۷) أخرجاه من طريق سفيان ولم يذكر بينهما أحداً، والصواب عندي مجاهد بن جبر محرر قيس بن السائب، فإن مجاهداً قد اختلف فيه أنه مولى من؟ أهو مولى عبدالله بن السائب أو مولى السائب بن السائب أو مولى قيس بن الحارث (كذا) (راجع الجرح والتعديل: ج ۴ ق ۱ ص ۳۱۹) وقال ابن سعد: "مجاهد بن جبر ويكنى أبا الحجاج مولى قيس بن السائب"، والمحرر بمعنى المولى. فظهر أن كلمة "عن" زادها أحد النساخ خطأ'' [دونوں اصل میں ایسے ہی ہے اور مکتبہ ظاہریہ والے مخطوطہ میں بھی ایسے ہی ہے، اور یہ یقینی طور پر کاتبین نسخ کا تصرف ہے، اس لئے کہ اس حدیث کو امام ترمذی نے سفیان کی سند سے تین لوگوں کے واسطہ سے ''عن مجاهد عن عبد الله بن عمرو'' نقل کیا ہے، اور ان کی روایت میں مجاہد اور عبد اللہ کے مابین کوئی واسطہ نہیں ہے، اور ایسے ہی ابوداؤد اپنی سنن اور امام بخاری نے ''الادب المفرد'' میں سفیان کی سند سے نقل کیا ہے اور ان دونوں (مجاہد اور عبداللہ) کے درمیان کسی کو ذکر نہیں کیا ہے، اور میرے نزدیک صحیح: ''مجاهد بن جبر محرر قيس بن السائب'' ہے، اس لئے کہ مجاہد کے بارے میں اختلاف ہے کہ کس کے مولی (آزاد کردہ) ہیں؟ عبداللہ بن سائب کے مولی ہیں یا سائب بن السائب کے یا قیس بن حارث کے۔۔۔ اور ابن سعد کا قول ہے کہ مجاہد بن جبر جن کی کنیت ابوالحجاج ہے قیس بن سائب کے مولی ہیں، اور محرر مولی کے معنی میں ہے، جس سے ظاہر ہے کہ کلمہ ''عن'' کسی ناسخ کی غلطی سے زائد ہو گیا ہے]، (مسند حمیدی: ۲/۲۷۰، حدیث: ۵۹۳) ظاہر ہے کہ اس نکتہ تک رسائی فنی ذوق کے حامل ثاقب الذہن محقق کی ہی ہو سکتی ہے۔

شیخ حبیب الرحمٰن الأعظمی رحمہ اللہ کی اس تعلیق پر اپنے مزید کسی تبصرہ کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسند حمیدی کے ایک دوسرے محقق ''حسن سلیم أسد الدارانی'' صاحب کا تأثر نقل کر دیا جائے: لکھتے ہیں ''في الأصلين "مجاهد بن جبر، عن محرز بن قيس" وأعجبني تعليق الشيخ حبيب الرحمن -رحمه الله- على هذا التعليق، لذا أثبته بنصه، قال رحمه الله: " وهو من تصرفات النساخ قطعاً، فإن الحديث... الخ'' [دونوں اصل میں مجاہد بن جبر عن محرر بن قیس ہے، اور مجھے اس تعلیق پر شیخ حبیب الرحمٰن رحمہ اللہ کی تعلیق پسند آئی چنانچہ میں نے ہوبہو انھیں کے الفاظ میں نقل کر دیا، انھوں نے کہا ہے کہ یہ (خطا) یقینی طور پر نساخ کے تصرف سے ہے]، (مسند حمیدی، تحقیق: حسن سلیم الدارانی: ۱/۵۰۴، حدیث: ۶۰۴) چنانچہ انھوں نے محقق اعظمی رحمہ اللہ کی عبارت بعینہ نقل کر دی ہے، فجزاہ اللہ خیرا، ان کی تحقیق کے ساتھ مسند حمیدی کی طباعت دو جلدوں میں دارالسقا، دمشق سے پہلی مرتبہ ۱۹۹۶ء میں عمل میں آئی۔

(۳) الاستدراک والتعقیب:

(۴) ''حدثنا الحميدي قال: ثنا سفيان قال: ثنا هشام بن عروة قال: أخبرني أبي عن أبي مراوح الغفاري عن أبي ذر رضي الله عنه قال قلت: يا رسول الله أي العمل أفضل؟ قال: ايمان بالله وجهاد في سبيله، قال قلت: فأي الرقاب أفضل؟ قال: أغلاها أثمانا وأنفسها

عند أهلها. قلت: فإن لم أقدر علی ذلک؟ قال: فتعين صانعا أو تصنع لأخرق...... الحديث"۔

اس حدیث میں "فإن لم أقدر علی ذلک" کے بعد "قال" پر تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "سقط من الأصل كلمة "قال" وهي ثابتة في الصحيح (ج ۵ ص ۹۰) ووقع فيه "فإن لم أفعل" بدل قوله "فإن لم أقدر". فحكى ابن حجر عن الاسماعيلي أنه قال أرأيت إن لم أفعل أي إن لم أقدر. وكأن الحافظ لم يستحضر رواية الحميدي" [اصل سے کلمہ "قال" ساقط ہے، اور یہ صحیح میں موجود ہے، اور اس میں "فإن لم أقدر" کی جگہ "فإن لم أفعل" وارد ہے، چنانچہ ابن حجر نے اسماعیلی سے "ان لم أفعل" کی تشریح "إن لم أقدر" نقل کی ہے]یعنی بقول ابن حجر اسماعیلی نے "إن لم افعل" کی تشریح "إن لم أقدر" سے کی ہے، جبکہ خود بعض روایت حدیث میں ہی یہ جملہ منقول ہے، محقق اعظمیؒ فرماتے ہیں: اگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو حمیدی کی اس روایت کا استحضار رہا ہوتا تو اسماعیلی کا قول نقل کرنے کے بجائے حمیدی کی اس روایت کے حوالہ سے اس کی وضاحت فرماتے۔

نیز "صانعا" پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "في جميع روايات البخاري وكذا في جميع روايات مسلم إلا رواية السمرقندي ضايعا بالضاد المعجمة وبعد الألف تحتانية. فقالوا: إن هشاما رواه هكذا وقد صحفه. والصواب بالصاد المهملة والنون. قلت: وعند الحميدي كما ترى: رواه سفيان عن هشام على الصواب. فإن لم يكن هذا من تصرف النساخ فاختلفت الرواية عن هشام ولم ينبه أحد على هذا الاختلاف فيما أعلم" [بخاری کی تمام ہی روایات میں اور روایت سمرقندی کے سوا مسلم کی تمام ہی روایات میں "ضايعا" ہے، چنانچہ محدثین نے کہا کہ ہشام نے ایسے ہی روایت کی ہے، اور انھوں نے تصحیف کی ہے، صحیح صاد اور نون کے ساتھ ہے، میرا کہنا ہے کہ حمیدی کی روایت میں جیسے ہے آپ دیکھ ہی رہے ہیں، سفیان نے ہشام سے صحت کے ساتھ روایت کیا ہے، لہٰذا اگر یہ کاتبین نسخ کی کارستانی نہ ہو تو ہشام سے روایت علی الاختلاف دونوں طرح منقول ہے، اور مجھے جہاں تک علم ہے کسی نے بھی اس اختلاف روایت پر متنبہ نہیں کیا ہے]یعنی ہشام سے ہی اس کی روایت "ضايعا" اور "صانعا" دونوں طرح منقول ہے، (مسند الحمیدی: ۱/ ۲۷، حدیث ۱۳۱)، لہٰذا اس صورت میں ہشام کی طرف تصحیف کی نسبت کی بجائے ان سے دونوں طرح روایت کا قول کرنے میں زیادہ احتیاط ہے، صحیح بخاری میں یہ روایت كتاب العتق. باب أي الرقاب أفضل میں مذکور ہے، "تعين ضايعا" کے تحت حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: "بالضاد المعجمة وبعد الألف تحتانية لجميع الرواة في البخاري كما جزم به عياض وغيره. وكذا هو في مسلم الا في رواية السمرقندي كما قاله عياض أيضاً...... وقال علي بن المديني: يقولون إن هشاما صحف فيه" (فتح الباری: ۵/ ۱۴۹)۔

(۵) "حدثنا الحميدي قال: ثنا سفيان قال ثنا يحيى بن سعيد أنه سمع محمد بن يحيى بن حبان يحدث عن عبدالله بن محيريز قال سمعت معاوية بن سفيان يقول قال رسول الله ﷺ لا تبادروني بالركوع ولا بالسجود فإني قد بدنت..... الحديث" (مسند الحمیدی: ۲/ ۲۷۳، حدیث: ۶۰۲)۔

اس حدیث کی تعلیق میں "بدنت" کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: من التبدين أي كبرت وضعفت. والبدن بالتحريک الرجل المسن. یعنی بدنت، تبدین (تفعیل) سے ہے، یعنی میں عمر دراز اور کمزور ہوگیا ہوں، اور لفظ "بدن" دال کے فتحہ کے ساتھ عمر دراز آدمی کے معنی میں ہے، (ص ۲۷۴، تعلیق ۱)۔

نیز اس حدیث کی تخریج میں عبدالرحمٰن مبارکپوری غیر مقلد عالم شارح ترمذی کی تعقیب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "أخرجه الطبراني في الكبير. قاله المباركفوري. وقد أبعد النجعة. والحديث عند أبي داؤد من طريق ابن عجلان عن محمد بن يحيى (ج ۱ ص ۹۶) وهي الطريق الثانية عند المصنف". (ص ۲۷۴، تعلیق ۲)، مبارکپوری نے کہا ہے کہ اس حدیث کو طبرانی نے المعجم الکبیر میں ذکر کیا ہے، اور یہ ان کی بڑی غلطی ہے، حدیث سنن ابو داؤد میں ابن عجلان کی سند سے موجود ہے، جو حمیدی کی مسند میں اس حدیث کے بعد مذکور ہے۔

(۴) ایضاح المعانی وشرح الغریب:

(۶) "حدثنا الحميدي. ثنا سفيان. ثنا جامع بن أبي راشد. وعبد الملک بن أعين عن أبي وائل عن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه. قال. قال رسول الله ﷺ: ما من أحد لا يؤدي زكاة ماله إلا مثل له شجاعا أقرع يطوقه يوم القيامة......... الحديث"۔

"شجاعا أقرع" پر تعلیق میں لکھتے ہیں: "قال الترمذي: معنى قوله شجاعا أقرع يعني حية. قلت: والأقرع الذي لا شعر على رأسه لكثرة سمه وطول عمره" یعنی امام ترمذی علیہ الرحمۃ نے "شجاع اقرع" کا معنی بتایا ہے کہ اس سے مراد سانپ ہے، اور محقق الاعظمی رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ اقرع (گنجا) سے مراد وہ سانپ ہے جس کے سر پر کثرت زہر اور طول عمر کی وجہ سے بال نہیں ہوتے، (مسند الحمیدی: ۱/ ۵۲، حدیث: ۹۳، تعلیق ۲)۔

(۷) حدثنا الحمیدی قال ثنا سفیان قال ثنا مطرف بن طریف و عبد الملک بن سعید بن أبجر جمیعا سمعا الشعبی یقول سمعت المغیرة بن شعبة علی المنبر یرفعه الی النبی ﷺ یقول إن موسی علیه السلام سأل ربه عز و جل فقال أی رب أی أهل الجنة أدنی منزلة فقال : رجل یجیء بعدما دخل أهل الجنة الجنة...... فقال موسی أی رب فأی أهل الجنة أرفع منزلة ؟ قال : إیاها أردت وسأحدثک عنهم، إنی غرست کرامتهم بیدی..... الحدیث (حدیث :۷۶۱) حدیث طویل ہے، اس کے تحت تعلیق (۴) میں ''إیاها أردت'' کے بارے میں لکھتے ہیں : ''قلت هکذا عند الحمیدی فی الأصلین ''إیاها أردت'' و کذا فی ''ظ''، والظاهر أنه بفتح التاء، والمعنی أنک یا موسی عن هذا أردت أن تسأل، یعنی مقصودک السؤال عن هذا، وإنما سألت عن أدنی أهل الجنة منزلة توطئة، ووقع عند مسلم: ''أولئک الذین أردت''، ''[دونوں اصل میں حمیدی کے نزدیک ایسے ہی ''إیاها أردت'' ہے اور ایسے ہی ''ظاہریہ'' کے نسخہ میں بھی ہے اور بظاہر یہ تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے ...... الخ]، (مسند الحمیدی: ۲/ ۳۳۶، حدیث :۷۶۱)، اس حدیث میں بروایت حمیدی: ''إیاها أردت'' اور مسلم کی روایت میں: ''أولئک الذین أردت'' کی وضاحت کی گئی ہے کہ ''أردت'' کا صیغۂ خطاب ہونا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، اور اللہ عزوجل موسی علیہ السلام سے خطاب فرماتے ہیں کہ آپ کا مقصد تو انھیں اعلی درجہ والوں کے بارے میں پوچھنا تھا، ادنی جنتی کے بارے میں تو آپ کا سوال بطور تمہید تھا، امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں بضم التاء، متکلم کا صیغہ قرار دیا ہے، ''ها'' ''أردت'' فبضم التاء و معناه :اخترت و اصطفیت'' (شرح صحیح مسلم: ۳/ ۴۶)۔

(۸) حدثنا الحمیدی ثنا سفیان ثنا الزهری عن أبی سلمة بن عبد الرحمن قال اشتکی ابو الرداد، فعاده عبد الرحمن بن عوف، فقال أبو الرداد :إن أخیرهم و أوصلهم ما علمت أبو محمد، فقال عبد الرحمن بن عوف سمعت رسول الله ﷺ یقول : یقول الله : أنا الله و أنا الرحمن خلقت الرحم و شققت لها اسما من اسمی، فمن وصلها وصلته و من قطعها بتته، (۱/ ۳۵ حدیث ۶۵)۔

''شققت'' پر تعلیق میں لکھتے ہیں: فی الأصل أشققت، و فی مسند أحمد : شققت، أخرجه أحمد عن سفیان و معمر، و فیه من طریق شعیب عن الزهری :و اشتققت، و اسناد هذا الحدیث ظاهره الانقطاع ان کان الصواب کون أبی الرداد من التابعین، وهو مختلف فی صحبته و الیه مال البخاری و غیره، و خطؤوا معمرا فی روایته عن الزهری عن أبی سلمة أن أبا الرداد حدثه، و خالفهم فی ذلک أحمد شاکر المصری و قال إن شعیبا و ابن أبی عتیق تابعا معمرا، و خطأ المصری البخاری و من حذا حذوه، راجع شرحه للمسند ج۳ص ۱۳۹ [اصل میں ''أشققت'' ہے، اور مسند احمد میں ''شققت'' ہے، امام احمدؒ نے اس حدیث کو سفیان اور معمر دونوں سے نقل کیا ہے، اور اس میں شعیب عن الزہری کی سند سے ''و اشتققت'' بھی منقول ہے، اور ابوالرداد کا صحابی ہونا مختلف فیہ ہے، اگر ان کا تابعین میں سے ہونا صحیح ہو، تو اس حدیث کی سند بظاہر منقطع ہے، اور بخاری وغیرہ کا میلان اسی جانب ہے اور معمر نے زہری سے اور انھوں نے ابوسلمہ سے جو یہ روایت کیا ہے کہ ابوالرداد نے ابوسلمہ سے یہ حدیث بیان کی ہے تو بخاری وغیرہ نے معمر کے اس طرح روایت کرنے کو غلط کہا ہے، اور احمد شاکر مصری نے ان لوگوں کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ شعیب اور ابوعتیق نے معمر کی متابعت کی ہے، اور مصری نے بخاری اور ان کے مثل قول کرنے والوں کو غلط قرار دیا ہے] (۱/ ۳۶، حاشیہ ۲)

احمد شاکر مصریؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو رداد اللیثی کو صحابہ کے تذکرہ میں بھی ذکر کیا گیا ہے اور ابن حبان نے ثقات تابعین میں بھی ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب میں ان کا ذکر ''رداد'' کے نام سے کیا ہے، مگر یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے ''ابو الرداد'' کہا ہے اور یہی مشہور ہے، احمد شاکر کہتے ہیں: ''قلت: هو الصواب'' [میرا کہنا ہے کہ یہی درست ہے]، آگے لکھتے ہیں کہ: اس حدیث کو ابوداؤد نے عبد الرزاق اور ترمذی نے سفیان بن عیینہ کی سند سے زہری سے عن ابی سلمہ عن عبد الرحمٰن روایت کیا ہے، اور معمر نے یہی حدیث ''عن الزهری عن أبی سلمه عن رداد اللیثی عن عبد الرحمن بن عوف'' روایت کیا ہے، جسے بخاری اور دیگر حفاظ نے غلط قرار دیا ہے، لکھتے ہیں: اگرچہ سفیان کی روایت میں ابوالرداد کا ذکر نہیں ہے اور معمر کی روایت میں ابوسلمہ اور عبد الرحمٰن کے درمیان ابوالرداد کا واسطہ مذکور ہے کہ ابوالرداد نے ابوسلمہ کو اس حدیث کی خبر دی، معمر کی روایت کو ضعیف نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ معمر خود حافظ اور ثقہ ہیں، اور اس حدیث کو اس سند کے ساتھ روایت کرنے میں اکیلے نہیں ہیں، شعیب بن ابی حمزہ نے ان کی متابعت کی ہے (حدیث مسند احمد میں مذکور ہے)، اور تہذیب میں حافظ کی نقل کے مطابق خود امام بخاری نے ''الادب المفرد'' میں بطریق ''محمد بن ابی عتیق عن الزهری عن ابی سلمه عن ابی الرداد اللیثی'' اس حدیث کو ذکر کیا ہے، یہ ایک دوسرے ثقہ کی متابعت ہے، آگے لکھتے ہیں: ''و أنا أظن أن حکم البخاری علی معمر بالخطأ إنما هو فیما جاء فی بعض الروایات عنه من ذکر ''رداد'' بدل ''أبی الرداد'' لا من جهة زیادة أبی الرداد فی الإسناد ولکن روایه أحمد هنا، فیها: ''أن أبا

الرداد" علی الصواب. فلیس الخطأ من معمر ولا من عبد الرزاق فلعله ممن روی عن عبد الرزاق أو من غیر عبد الرزاق ممن روی عن معمر..... الخ"[اور میرا (احمد شاکر مصری کا) گمان ہے کہ بخاریؒ کا معمر کو اس حدیث کی روایت میں غلط کہنا اس قبیل سے ہے کہ ان کی بعض روایات میں ابوالرداد کی جگہ رداد منقول ہے، نہ کہ سند میں ابوالرداد کے اضافہ کی قبیل سے، لیکن مسند احمد کی روایت میں ابوالرداد صحیح منقول ہے، لہٰذا غلطی معمر اور عبد الرزاق کی نہیں ہے، ممکن ہے یہ غلطی عبد الرزاق سے روایت کرنے والے کی ہو یا عبدالرزاق کے علاوہ معمر سے جس نے روایت کیا ہو اس کی غلطی ہو] (تحقیق مسند احمد: حدیث ۱۶۸۱، ج ۲ ص ۳۱۸)

اسی طرح اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مذکورہ حدیث کی سند کا بظاہر منقطع ہونا اس سبب سے نہیں ہے کہ ابوالرداد کا تابعین میں سے ہونا صحیح ہے، بلکہ بظاہر انقطاع کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسند حمیدی میں مذکورہ روایت کی سند میں ابوسلمہ نے محض ابوالرداد کی بیماری اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی عیادت اور دونوں کی گفتگو کا واقعہ نقل کیا ہے، اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ ابوسلمہ اس وقت وہاں موجود تھے، یا اس واقعہ کی خبر ان کو ابوالرداد سے ملی، یا ان کے والد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے یا کسی اور سے، اگرچہ فی نفسہ یہ حدیث عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے، امام ترمذیؒ نے سفیان کی ہی سند سے حمیدی کے مثل اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس پر صحیح کا حکم لگایا ہے، نیز معمر کی حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "**وروی معمر هذا الحدیث عن الزهری عن أبی سلمة عن الرداد اللیثی عن عبد الرحمن بن عوف. ومعمر کذا یقول. قال محمد: وحدیث معمر خطأ.**"[اور معمر نے اس حدیث کو زہری سے انھوں نے ابوسلمہ سے انھون نے ابولرداد اللیثی سے انھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت کیا ہے، اور معمر ایسے ہی کہتے ہیں، محمد یعنی امام بخاری نے کہا کہ معمر کی حدیث غلط ہے] (سنن الترمذی: ۴/ ۳۱۵، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی قطیعۃ الرحم، حدیث رقم: ۱۹۰۷)،

امام ترمذیؒ کی اس تصریح سے احمد شاکر مصری کی تائید بھی ہورہی ہے کہ امام بخاریؒ نے معمر کی روایت میں "ابوالرداد" کی جگہ "رداد" کے ذکر کو معمر کی غلطی قرار دیا ہو، ورنہ مسند امام احمد (حدیث رقم: ۱۶۸۰) نیز سنن ابوداوٗد (۲/ ۱۳۳، کتاب الزکاۃ، باب فی صلۃ الرحم حدیث رقم: ۱۶۹۵) میں عبد الرزاق نے معمر سے جو اس حدیث کی سند نقل کی ہے اس میں یہی مذکور ہے: "**أن أبا الرداد اللیثی أخبره**"، یعنی ابوسلمہ یہ صراحت کر رہے ہیں کہ ابوالرداد لیثی نے ان کو خبر دی، جب کہ اس حدیث کی بعض سندوں میں ابوسلمہ عن عبدالرحمٰن بھی مذکور ہے، لیکن ابوسلمہ کا اپنے والد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے سماع مختلف فیہ ہے، تہذیب میں مذکور ہے: "**وقال علی بن المدینی وأحمد وابن معین وأبو حاتم ویعقوب بن شیبة وأبو داؤد: حدیثه عن أبیه مرسل. قال أحمد: مات وهو صغیر. قال أبو حاتم: لا یصح عندی. وصرح الباقون بکونه لم یسمع منه**"[علی بن المدینی، احمد، ابن معین، ابوحاتم، یعقوب بن شیبہ، اور ابوداوٗد نے کہا ہے کہ ان کی حدیث ان کے والد سے مرسل ہے، احمد نے کہا کہ وہ وفات پاگئے حال یہ کہ یہ ابھی چھوٹے تھے، ابوحاتم نے کہا کہ یہ میرے نزدیک صحیح نہیں، اور باقی لوگوں نے ان کے ان سے نہ سننے کی صراحت کی ہے] (تہذیب التہذیب: ۱۲)، امام احمدؒ کے علاوہ بقیہ لوگوں نے عدم سماع کی صراحت کی ہے، اور امام احمد نے یہ کہا ہے کہ ابوسلمہ کی کمسنی میں ہی ان کے والد کی وفات ہوگئی تھی، ابوحاتم نے اس کے بارے میں کہا کہ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، ابوسلمہ نے بقول ابن سعد ۹۴ھ اور بقول واقدی ۱۰۴ھ میں وفات پائی، اس وقت ان کی عمر ۷۲ سال تھی، (تہذیب التہذیب: ج ۱۲، ترجمہ ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوف)، اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا سن وفات ۳۱ یا ۳۲ یا ۳۳ھ ہے، (تہذیب: ج ۶/ ص ۲۴۶)، لہٰذا بظاہر انقطاع کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کیونکہ مذکورہ حدیث کے سیاق سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ ابوسلمہ اس واقعہ کے شاہد ہیں جبکہ ابوسلمہ کا اپنے والد عبدالرحمٰن بن عوف سے سماع کا ثبوت مختلف فیہ ہے،، واللہ اعلم۔

(۶) علمی دیانت:

(۹) "**حدثنا الحمیدی قال (ثنا سفیان) ثنا الزهری قال أخبرنی سالم بن عبد الله عن أبیه قال: رأیت رسول الله ﷺ اذا افتتح الصلوة رفع یدیه حذو منکبیه. وإذا أراد أن یرکع وبعدما یرفع رأسه من الرکوع فلا یرفع ولا بین السجدتین**" (مسند حمیدی: حدیث: ۶۱۴)

اس حدیث پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "**أخرج البخاری أصل الحدیث من طریق یونس عن الزهری. وأما روایة سفیان عنه. فأخرجها أحمد فی مسنده وأبو داؤد عن أحمد فی سننه. لکن روایة أحمد عن سفیان تخالف روایة المصنف عنه. ففی مسند أحمد رأیت رسول الله ﷺ إذا افتتح الصلاة رفع یدیه حتی یحاذی منکبیه وإذا أراد أن یرکع وبعدما یرفع رأسه من الرکوع. وقال سفیان مرة: وإذا رفع رأسه وأکثر ما کان یقول: وبعدما یرفع رأسه من الرکوع ولا یرفع بین السجدتین. (ج ۲ ص ۸) ففیه کما تری: إثبات الرفع عند الرکوع والرفع منه ونفیه بین السجدتین. وفی روایة الحمیدی نفیه فی الرکوع والرفع منه وفیما بین السجدتین جمیعا. ولم یتعرض أحد من المحدثین لروایة الحمیدی هذه**

''[بخاری نے اصل حدیث یونس عن الزہری کی سند سے ذکر کی ہے، اور سفیان کی روایت زہری سے اس کو روایت کیا ہے احمد نے اپنی مسند میں، اور ابوداؤد نے احمد سے اپنی سنن میں، لیکن سفیان سے احمد کی روایت مصنف کی سفیان سے روایت کے خلاف ہے، مسند احمد کی روایت میں مذکور ہے: میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا: جب نماز شروع فرماتے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے کندھوں کی محاذاۃ تک اٹھاتے اور جب رکوع کا ارادہ فرماتے، اور رکوع سے اپنا سر اٹھانے کے بعد، اور کبھی سفیان نے روایت کرتے ہوئے کہا: اور جب اپنا سر اٹھاتے، اور زیادہ تر روایت کرتے ہوئے کہتے: اور رکوع سے اپنا سر اٹھانے کے بعد، اور دونوں سجدوں کے درمیان نہ اٹھاتے، (۸/۲)، تو اس روایت میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں رکوع میں جانے اور رکوع سے اٹھنے کے وقت رفع کا اثبات ہے، اور دونوں سجدوں کے درمیان اس کی نفی ہے، اور حمیدی کی روایت میں رکوع میں جانے اور رکوع سے اٹھنے میں اور دونوں سجدوں کے درمیان سب میں اس کی نفی ہے، اور محدثین میں سے کسی نے حمیدی کی اس روایت سے تعرض نہیں کیا ہے]

(مسند حمیدی: ۲/۲۷۷، حدیث: ۶۱۴، تعلیق: ۶)

مسند حمیدی کی یہ حدیث ان الفاظ میں تحریمہ کے علاوہ مواقع پر رفع یدین کی نفی کرتی ہے، اور دوسری کتابوں میں سفیان ہی کی مذکورہ سند سے اس کے خلاف رفع یدین کے اثبات کے ساتھ مذکور ہے، محقق اعظمی رحمہ اللہ مسند حمیدی کے ان مخطوطات پر کام کر رہے تھے جو آپ کو فراہم تھے، اس وقت مکتبہ ظاہریہ کا مخطوطہ آپ تک نہیں پہنچا تھا، لہٰذا اس حدیث پر کام کرتے وقت موجود مخطوطات میں جس طرح پایا ویسے ہی نقل کر دیا، اور اس پر تعلیق کرتے ہوئے اپنے حنفی ہونے کے باوجود کمال دیانت کے ساتھ سفیان سے یہ روایت دیگر کتب حدیث میں جن الفاظ میں مذکور ہے ان کو بھی صراحت کے ساتھ ذکر کر دیا اور یہ بھی صراحت کر دی کہ حمیدی کی روایت کے الفاظ دیگر کتب حدیث میں مذکور الفاظ کے خلاف ہیں، اور یہ بھی صاف وضاحت کر دیا کہ کسی محدث نے بھی حمیدی کی اس روایت سے تعرض نہیں کیا ہے یعنی اس کا ذکر نہیں کیا ہے،

''حیات ابو المآثر'' کے مؤلف ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ''اس میں خالص محدثانہ طرز اور محققانہ رنگ میں گفتگو کی ہے، اور مسلکی نوعیت کے کسی بھی اختلاف سے قطعی کوئی تعرض نہیں کیا ہے، اس سے بڑھ کر منصفانہ اور دیانت دارانہ تحقیق کیا ہو سکتی ہے'' (حیات ابو المآثر: ۲/ ۵۶۳) مگر برا ہو حسد و تعصب اور عیب جوئی و احسان ناشناسی کا کہ فرقہ لامذہبیت کے کور چشموں کو اسی دیانت میں بد دیانتی نظر آئی، اور انھوں نے اسے خیانت اور تحریف سے تعبیر کیا، اور مسند حمیدی پر تحقیق و تعلیق کی ستائش کے بجائے مولانا اعظمی پر بہتان و افتراء کے پتھر پھینکے، فضا ابن فیضی صاحب نے ٹھیک ہی کہا:

کیا توقع کور ذہنوں سے فضا کوئلوں سے روشنی پھوٹے گی کیا

ظاہر ہے کہ مخطوطہ میں جو بھی مرقوم و مکتوب ہے، اس کی ساری ذمہ داری کاتب مخطوطہ کی ہے، اس پر تحقیق کرنے والے کی دیانت کا تقاضا تو یہی ہے کہ اسے باقی رکھتے ہوئے اس سے متعلق معروضات کو جمع کر دے، اور مولانا اعظمی علیہ الرحمۃ نے یہی کیا، انھوں نے اپنی طرف سے اس پر صحت و سقم کا کوئی حکم نہیں لگایا، روایت ایک مختلف فیہ مسئلہ سے متعلق ہے جس کا مدار روایتوں پر ہی ہے۔

اس حدیث کی سند میں طباعت کی البتہ ایک غلطی ہوئی ہے کہ مخطوطہ میں موجود حمیدی اور زہری کے درمیان سفیان کا واسطہ یعنی ''نا سفیان'' کے الفاظ مطبوع نہیں ہیں، جس کو یہاں راقم نے بین القوسین حدیث کی سند میں ظاہر کر دیا ہے، اور تصحیح الاخطاء کی فہرست میں بھی اس کا ذکر نہیں ہو سکا، مگر یہ تو ایسی غلطی ہے کہ اگر حدیث کے الفاظ حمیدی کی روایت سے وہی منقول ہوں جو مخطوطات کے ان نسخوں میں مذکور ہیں جو مولانا اعظمی کے سامنے تھے تب بھی انقطاع کی وجہ سے یہ احناف کے لئے مفید نہ ہوتی، بھلا عدم رفع کا کوئی قائل قصداً ایسی غلطی کیوں کرے گا، جس سے یہ روایت کمزور ہو، اس غلطی کے بالقصد ہونے کا الزام تو کوئی صاحب علم نہیں لگا سکتا، کیا طباعت کی غلطیوں سے کوئی کتاب محفوظ ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں، اور مسند حمیدی کی تحقیق و تعلیق میں اس جیسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمہ اللہ کے تحقیقی ذوق و وجدان، تبحر علمی، کثرت استحضار، اصابت رائے اور قوت دلیل کی شاہد عدل ہیں، نیز مولانا اعظمی رحمہ اللہ علوم حدیث و فقہ میں گیرائی، قوت فیصلہ، غیرت دینی اور شان استغنائی کے باوصف مستحق ہیں کہ اپنے وقت کے ملک العلماء سے یاد کئے جائیں، آپ نے اپنے علمی مشغلہ کی قدر و منزلت اور خدمت احادیث نبویہ کے منصب عظیم کے پیش نظر بہت سے دنیوی عظیم اور معزز مناصب کو بھی قبول نہیں کیا، اور اپنی کتابوں کی رائلٹی کی لاکھوں کی رقوم کو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نے للہ اس کام کو انجام دینے کی نیت کر لی تھی، (دیکھئے حیات ابو المآثر: ۱/ ۴۶۵ و ۴۶۶)۔

مولانا اعظمی کی تحقیق کے ساتھ مسند حمیدی کی طباعت پہلی دفعہ ۱۳۸۲ ہجری/ ۱۹۶۲ عیسوی میں مجلس علمی ڈابھیل، سملک، گجرات سے ہوئی، اور ملک و بیرون ملک ہر چہار جانب سے اہل علم نے محقق اعظمی رحمہ اللہ کی اس علمی خدمت کو سراہا، اور انھیں خراج تحسین پیش کیا، فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔□□

محدّث اعظمیؒ: مؤرّخانہ ذوق اور فقہی بصیرت

ڈاکٹر عبدالمعید صاحب (کھیری باغ، مئو)

حضرت محدث اعظمیؒ بلند پایہ محدث، مفسر، فقیہ، مورخ اور ادیب وخطیب تھے، بقول اقبال سہیل ؎

وزاں پس آں حبیب ما ادیب ما خطیب ما
کہ ذاتش در مئو احناف را حصن حصین آمد

محدّث اعظمیؒ کے ہم عصر مورخ وادیب اور درویش عالم علامہ سید سلیمان ندویؒ کا محدث اعظمیؒ کے علم پر کتنا اعتماد تھا، مولانا ابوعلی آصفی اثریؔ (عبد الباری) دارالمصنّفین اعظم گڈھ، جو دونوں بزرگوں کے تعلقات کے عینی شاہد بھی ہیں کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

’’آخر عمر میں تو سید صاحب ان کے علم وفضل اور تفقہ کے بہت زیادہ قائل ہوگئے تھے اور اپنی ہر تحریر پر نظر ثانی کے لئے مئو بھیجتے تھے اور ان کی توثیق کے بعد پریس میں دیتے تھے، وہ ان کو دارالمصنّفین میں اپنا جانشین اور رفقاء اور مصنّفین کا نگراں بھی بنانا چاہتے تھے‘‘۔[1]

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (اعیان الحجاج جلد ۱) کے ’’پیش لفظ وتعارف‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں:

’’ضرورت تھی کہ کوئی صاحب نظر عالم اور مورخ ومحدث دوسرے موضوع پر قلم اٹھاتا اور تاریخ اسلام کے اکابر مشاہیر اور سلف صالحین کے واقعات حج جمع کردیتا، جن کو پڑھ کر افسردہ طبیعتوں میں حرکت وحرارت اور پست ہمتوں میں بلندی پیدا ہوتی، یہ تجربہ اور حقیقت ہے کہ واقعات کا قلب پر جو اثر ہوتا ہے وہ حقائق اور علمی مضامین کا نہیں ہوتا، شکر اور مسرت کا مقام ہے کہ فاضل گرامی محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے اس سلسلہ کو شروع کیا اور ایک نہایت مفید اور وقیع کتاب تیار فرمادی۔ ان واقعات کے ساتھ اپنے محدثانہ ومورخانہ ذوق کی بنا پر مفید معلومات اور تاریخی وعلمی واقعات کو بھی ضمناً ذکر فرمادیا جس سے اس کتاب کی قدر وقیمت وافادیت دوبالا ہوگئی‘‘۔[2]

مولانا عبداللہ زمزمی مکہ مکرمہ کے بڑے عالم اور صاحب کرامت بزرگ تھے اسی کتاب کے متعلق حضرت محدث اعظمیؒ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

یوم الأحد ۲۹ شوال ۱۳۷۷ھ

یا صاحب الفضیلۃ! قال في کشف الظنون عن کتاب القواعد لابن رجب إنھا من عجائب الدھر، وإن کتابکم أیضاً من عجائب الدھر في بابہ وأسلوبہ ومحتویاتہ، وابتدائکم فیہ بأشرف المخلوقات تجعلہ من أعجب العجائب إنھا مأمن اللہ سبحانہ وتعالی ..... الخ عبد اللہ زمزمي

۲۹ رشوال ۱۳۷۷ھ بروز اتوار

جناب محترم!

صاحب ’’کشف الظنون‘‘ نے ابن رجب کی کتاب ’’القواعد‘‘ کے بارے میں کہا ہے کہ بلاشبہ وہ کتاب عجوبہ روزگار ہے اور آپ کی کتاب بھی اپنے موضوع، اسلوب اور مضامین کے اعتبار سے عجوبہ روزگار ہے۔ اور اشرف المخلوقات صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرے سے ابتدا نے اسے بڑی انوکھی اور الہامی کتاب بنادیا ہے۔ عبداللہ زمزمی

(۱) حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کی کتاب ’’صدیق اکبرؓ‘‘ جب پہلی بار طبع ہوئی تو اس میں بہت سی خامیاں اور غلطیاں رہ گئیں تھیں۔ بہت سے اہل علم حضرات نے آپ کی توجہ اس طرف مبذول فرمائی۔ تصحیح کے لئے آپ کی نگاہ محدث کبیرؒ پر پڑی جس کی تفصیل خود انہی سے سنئے:

’’پھر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو- جن سے بڑھ کر فن حدیث اور اسماء الرجال کا محقق اور مبصر میرے نزدیک آج انڈو پاک میں کوئی عالم نہیں ہے- دیرینہ نیازمندی کی بنا پر خط لکھا:

’’اگر آپ ’صدیق اکبرؓ‘‘ کو ایک مرتبہ ملاحظہ فرمالیں تو مجھے اطمینان ہوجائے۔ مولانا نے از راہ شفقت بزرگانہ میری درخواست کو قبول فرمایا اور کتاب کا ایک ایک ورق پڑھ کر غلطیوں سے آگاہ فرمایا۔ میں نے نظر ثانی میں مولانا کے خط سے مکمل استفادہ کیا ہے اور اس غیر معمولی توجہ اور زحمت فرمائی کے لئے صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔[3]

(۲) مولانا اکبرآبادیؒ تحریر فرماتے ہیں:

محمد بن سعد المتوفی ۲۳۰ھ واقدی کے شاگرد اور ان کے کاتب تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے، مگر بغداد میں سکونت اختیار کرلی، ان کی کتاب الطبقات الکبیر جو عام طور پر طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے، صحابہ وتابعین کے حالات وسوانح پر نہایت جامع اور مستند کتاب ہے، جرمنی کے پروفیسر سخاؤ نے اس کو ایڈٹ کیا اور بارہ جلدوں میں شائع کرکے عالم اسلام پر احسان عظیم کیا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ دلچسپی سے سنا جائے گا کہ مولانا ابو البرکات عبدالرؤف دانا پوری نے اپنی کتاب اصح السیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ طبقات ابن سعد کو ایک غیر مسلم نے ایڈٹ کرکے چھاپا ہے، اس لئے یہ ایڈیشن معتبر اور مستند نہیں، کیوں کہ اس میں ایڈیٹر نے کمی بیشی کردی ہوگی، مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی جو اس زمانہ کے نامور محقق اور محدث ہیں، میں

نے ایک خط کے ذریعہ ان سے استصواب کیا تو مولانا نے تحریر فرمایا:

''پروفیسر سخاؤ پر یہ شبہ اور بدگمانی بالکل بیجا ہے، میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوطہ کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے عدم مطابقت نہیں پائی۔ ۴

اس تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محدث اعظمی کتنی دوررس نگاہ رکھتے تھے۔ طبقات ابن سعد چھپ کر آئی تو آپ نے مصروف ترین اوقات میں سے وقت نکال کر اتنی ضخیم کتاب جو 'دار صادر' (بیروت) سے نو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کے اصل مخطوطہ سے مقابلہ کر کے اطمینان حاصل کیا کہ اس میں کوئی قطع و برید نہیں کی گئی ہے۔ اگر محدث اعظمیؒ نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو یہ چند جملے نہ لکھے ہوتے تو علمی دنیا کو اس کام کا علم بھی نہ ہوتا کہ اس کی جانچ اور پرکھ میں کتنی جاں سوز محنت کی گئی ہے۔

(۳) محمد بن اسحاق اور واقدی کی حیثیت کے بارے میں محدث اعظمیؒ نے جو رائے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو لکھ کر بھیجا تھا، اس کے متعلق مولانا اکبرآبادی تحریر فرماتے ہیں:

''اس خط میں مولانا محمد بن اسحاق اور واقدی سے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں:

اگرچہ یہ دونوں حضرات بحیثیت محدّث متکلم فیہ ہیں، لیکن بحیثیت مورخ کے ان کی عظمت مسلم ہے، اس میں کلام نہیں ہوسکتا''۔ ۵

محدث اعظمیؒ کا خط وصول ہونے کے بعد مولانا اکبرآبادی نے اس کے متعلق جو لکھا تھا، اس میں تحریر فرمایا تھا:

''واقدی پر آپ کا نوٹ میرے نزدیک حرف آخر کا حکم رکھتا ہے، اب میں اپنے مضمون میں آپ کے حوالہ کے ساتھ نقل کروں گا، آپ کے نوٹ سے مجھے بڑی تقویت ہوئی، حضرت (علامہ انور) شاہ صاحب کی رائے بھی تقریباً یہی تھی، سخت افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ ہمارے ملک کے بعض علماء نے واقدی کی توہین و تنقیص کو گویا ایمان کو جزبنالیا ہے۔'' ۶

(۴) مناقب العارفین کا خلاصہ:

محدث اعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''پورب کے خطہ میں جو اولیاء کرام آسودۂ خاک ہیں اور ان کی شہرت کو دوام اور قبول عام حاصل ہے، ان میں ایک بہت برگزیدہ ہستی حضرت شاہ طیب بنارسی قدس سرہ کی ہے۔ ایک عرصہ سے مجھے موصوف کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کا شوق تھا، اور اس شوق میں مجھے 'مناقب العارفین' کی تلاش و جستجو تھی، جس کو ان کے صاحبزادے شاہ محمد یٰسین قدس سرہ نے تصنیف فرمایا ہے، خوش قسمتی سے بنارس میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا، اور میں اس کے مطالعہ سے بہرور ہوا۔ مجھے اس کتاب میں اچھا خاصا تاریخی و علمی مواد نظر آیا، اس لئے میں نے اردو میں اس کا خلاصہ قلمبند کرلیا اور آج اسی خلاصہ کو ناظرین ''معارف'' کے سامنے پیش کررہا ہوں۔ ۷

محدث اعظمیؒ نے اس خلاصہ کو 'پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں' کے نام سے 'معارف' میں شائع فرمایا۔ اس خلاصہ کو آپ نے مختلف ذیلی عنوان، ''مخدوم شاہ طیب بنارسی'' کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، بیعت، معمولات، وضع و قطع، طریق تربیت، توکل و قناعت، اخلاق و عادات، قوالی سے پرہیز اور پابندی شریعت کے ساتھ حضرت مخدوم کے خلفاء و مریدین کا ذکر تقریباً تیس صفحات میں کیا ہے۔

(۵) ''الذخائر والتحف'' کس کی تصنیف ہے؟

''کتاب الذخائر والتحف'' ڈاکٹر محمد حمید اللہ علیہ الرحمہ کے مقدمے کے ساتھ چھپی تھی، اس پر قاضی اطہر مبارک پوری نے مفصل نقد و تبصرہ فرمایا تھا، قاضی صاحب کا نقد و تبصرہ معارف کے دوشماروں اپریل و مئی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے مصنف القاضی الرشید ابن الزبیر کی نسبت اپنے مقدمے میں لکھا تھا کہ ان کا حال ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا، مگر کتاب کی اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے۔

قاضی صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اختلاف ہوا اور انھوں نے معارف دسمبر ۱۹۶۰ء میں اپنی تحقیق یہ لکھی کہ القاضی الرشید ابن الزبیر کا تذکرہ تاریخ ابن خلکاں میں موجود ہے، اور وہ پانچویں نہیں بلکہ چھٹی ہجری کے ایک جامع الفنون عالم تھے۔

اس اختلاف کے بعد علامہ اعظمی نے تقریباً سات صفحات پر مشتمل ایک نہایت محققانہ اور فاضلانہ محاکمہ تحریر فرمایا، جو فروری ۱۹۶۱ء کے معارف میں اشاعت پذیر ہوا۔

علامہ اعظمی نے قاضی اطہر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ قاضی رشید کا ذکر ابن خلکاں میں موجود ہے، اور اس معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انکا تفصیلی تذکرہ ابن خلکاں کے علاوہ یاقوت، معجم الادباء، یافعی کی 'مرآۃ الجنان' اور ابن العماد حنبلی کی 'شذرات الزھب' وغیرہ میں بھی ہے۔

لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے کہ کتاب الذخائران ہی القاضی الرشید کی تصنیف ہے یا کسی دوسرے کی؟ قاضی صاحب اس کو ان ہی کی تصنیف مانتے ہیں، اور ڈاکٹر صاحب اس کو تسلیم نہیں کرتے، کیوں کہ باپ، بیٹے اور پوتے تین آدمیوں کا لقب قاضی رشید ہے، ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ کتاب ابن خلکان والے کی تصنیف نہیں ہے، اس لئے کہ وہ چھٹی صدی کے

عالم تھے، اور کتاب کا زمانہ تصنیف پانچویں صدی ہے۔ دلیل کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے کتاب کی اندرونی شہادتیں پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ اور قاضی اطہر دونوں بزرگوں کو ابن خلکان والے قاضی الرشید کے والد اور دادا کا تذکرہ کتابوں میں نہیں مل سکا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے فرمایا کہ ان دونوں کا تذکرہ 'الطالع السعید' مطبوعہ مصر ۱۳۳۳ھ میں موجود ہے، اس طرح یہ تینوں قاضی رشید معروف ہیں، ابن خلکان والے کا نام احمد ہے، ان کے والد کا علی اور دادا کا نام ابراہیم ہے، علی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ فاضل، شاعر اور رئیس تھے، ان کی وفات ۵۲۵ھ میں ہوئی اور ابراہیم کی نسبت مرقوم ہے کہ وہ ۴۷۲ھ میں اضلاع قوص کے حاکم تھے اور رشید ومہذب ان کے پوتے تھے۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ اندرونی شہادتوں اور قاضی صاحب کے ذریعے کی جانے والی جرحوں کا تجزیہ کر کے ڈاکٹر صاحب کی رائے سے موافقت کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے شواہد اس بات کے مؤید ہیں کہ اس کے مصنف چھٹی صدی ہجری نہیں بلکہ پانچویں صدی میں گذرے ہیں، لہٰذا اس کتاب کا قاضی رشید احمد نہیں بلکہ ان کے دادا قاضی رشید ابراہیم کی تصنیف ہونا قرین صواب ہے۔

اس بحث کے بعد علامہ اعظمیؒ نے ان کے اختلاف کے علاوہ چند اور امور پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔[۸]

علامہ اعظمیؒ کا یہ مضمون معارف فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے اپنے محاکمہ سے فارغ ہونے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

''یہ چند سطریں صرف علم کی خدمت کے لئے لکھی گئی ہیں، کسی پر اعتراض یا تنقیص مقصود نہیں ہے، بالخصوص فاضل عزیز قاضی اطہر صاحب مبارکپوری سے میرے تعلقات کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ میرے معروضات کو ان پر اعتراض کی حیثیت دی جاسکے۔ مجھے جو بات صحیح سمجھ میں آئی اس کے اظہار میں محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے بھی معذرت خواہ ہوں۔''[۹]

(۶) ''مبارق الازہار'' کس کی تصنیف ہے؟

یہ ایک بہت ہی اہم علمی و تحقیقی مضمون ہے، 'مبارق الازہار' حدیث شریف کی مشہور اور معروف کتاب 'مشارق الانوار' کی شرح ہے، اس کے مصنف عبداللطیف بن عبدالملک یا ابن فرشتہ ہیں۔ یہ ایک مشہور اور نامور عالم تھے۔

'مبارق الازہار' کی نسبت قاضی سید نورالدین حسین نے معارف (جولائی ۱۹۴۹ء) میں، اور ڈاکٹر سید باقر علی استاد شعبۂ عربی اسماعیل کالج بمبئی نے معارف (اکتوبر ۱۹۵۰ء) میں یہ انکشاف کیا کہ وہ ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے، جو احمد آباد کے باشندے تھے، ان کے والد کا نام عبدالملک بنباتی تھا، اور ان کی وفات ۹۱۵ھ میں ہوئی، ان کے صاحبزادے بھی عالم تھے اور ان کا نام خلیل محمد عباسی تھا۔

علامہ اعظمیؒ نے ان دونوں مضمونوں کے شائع ہونے کے بعد ان کا تنقیدی جائزہ لیا، اور اس انکشاف کو تحقیقی اعتبار سے غیر معیاری اور تاریخی اعتبار سے ناقابل تسلیم قرار دیا۔ آپ نے نہایت تحقیق کے ساتھ اور بہت مدلل طریقے سے ان دونوں مضمون نگاروں کے تخیلات کا رد کیا ہے، اور اپنی بات کی تائید کے لئے تاریخ وتذکرہ اور فقہ کی متعدد کتابوں سے دلائل فراہم کئے ہیں، اور 'مبارق'' سے خود مصنف کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں انھوں نے اپنے نام کی تصریح کی ہے، وہ قول یہ ہے: وبعد فیقول العبد الضعیف العزیز عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف با بن الملک۔ اس سے ثابت ہوتا ہیکہ اس کے مصنف عبداللطیف ابن عبدالملک نہیں، بلکہ عبداللطیف ابن الملک ہیں۔

آگے لکھا ہے کہ اگر یہ خیال کیا جائے کہ 'مبارق' کے مصنف ابن فرشتہ ہی ہیں، مگر وہی عبدالملک کے لڑکے اور احمد آباد کے باشندے ہیں، تو یہ بات بھی قابل توجہ نہیں ہیں، پھر اس کا غلط ہونا متعدد وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ عبد اللطیف بنبائی اور ابن فرشتہ دونوں کے باپ، دادا، اور پردادا کے ناموں میں فرق ہے، بلکہ طاش کبریٰ زادہ کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترکی کے باشندے تھے۔[۱۰]

(۷) پروفیسر خلیق احمد نظامی (۱۹۲۵-۱۹۹۷ء) علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے پروفیسر اور صدر برصغیر کے عظیم مؤرخ اور اردو اور انگریزی زبانوں میں پچاس سے زائد وقیع اور تحقیقی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات نے مشہور اہل علم ودانش سے خراج عقیدت وصول کیا۔ ان کی کتاب ''حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ'' جب محدث اعظمی کے پاس پہنچی تو آپ نے انتہائی درجہ مسرت کا اظہار فرمایا اور تقریباً چالیس صفحے کا ایک مضمون تحریر فرمایا۔ اس مضمون کی ابتدائی سطریں ہدیۂ قارئین ہیں:

''فاضل گرامی جناب خلیق احمد صاحب نظامی ہم سب کے شکریہ کے مستحق اور قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے 'حیات شیخ عبدالحق' لکھ کر اردو میں بہت اہم اضافہ فرمایا، ان کی اس کتاب کو پڑھ کر میں بے حد محظوظ ہوا، اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص یہ کتاب پڑھ کر ان کی تلاش وجستجو اور محنت وکاوش کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس اعتراف کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف سے معافی چاہتے ہوئے اتنا اور بھی عرض کروں گا کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود کسی موقع پر توجہ نہ ہونے یا مواد نہ ملنے کی وجہ سے کچھ فروگذاشتیں بھی ہوگئی ہیں، جن کی نسبت میں امید کرتا ہوں کہ دوسرے ایڈیشن میں باقی نہ رہیں گی۔

اس وقت اس سلسلہ میں میرے سامنے جو چند باتیں ہیں ان کو اس لیے سپرد قلم کرتا ہوں کہ جب تک دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آتی، اس

وقت تک اگر انھیں چند سطروں کو چھاپ کر حیات عبدالحق کا ضمیمہ بنا دیا جائے، توفی الجملہ ان فروگذاشتوں کی تلافی ہوجائے گی۔

اس کتاب میں سب سے بڑی کمی جو مجھے نظر آئی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کتاب میں شیخ محدث کے تلامذہ ومسترشدین کا کوئی باب یا عنوان نہیں ہے، حالانکہ حیات شیخ کا یہ ایک نہایت سنہرا ورق ہے، جس کا اس لاجواب تصنیف میں موجود ہونا اس کی زیب و زینت کے لیے بھی ضروری تھا، نیز اس کے بغیر کتاب کا موضوع بھی تشنہ نظر آتا ہے۔

مگر ہم کو فاضل مصنف کی معذوری کا پورا احساس ہے، شیخ محدث کے معاصر یا قریب العہد تذکروں کی نایابی یا کم یابی کی وجہ سے اس باب کے لیے خاطر خواہ مواد فراہم نہیں ہوسکا، کتنے تعجب کی بات ہے کہ شیخ محدث بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اٹھارہ برس تک روانگی حجاز سے پہلے اور باون برس تک واپسی کے بعد مسند درس وارشاد پر متمکن رہے اور ہنگامہ تعلیم وارشاد برپا رکھا، اس طویل مدت میں خدا ہی بہتر جانتا ہے کتنے خوش نصیبوں نے ان کے سامنے زانوے تلمذتہ کیا ہوگا، اور کتنوں نے روحانی برکتیں حاصل کی ہوں گی، مگر آج ذرائع تحقیق وتفتیش کے فقدان کی وجہ سے معدودے چند ناموں سے زیادہ دستیاب نہیں ہوسکے، مجھ کو اس وقت جو نام مستحضر ہیں ان کو پیش کرتا ہوں۔[11]

مندرجہ بالا تحریر سے محدث اعظمیؒ کی تاریخی وسعت معلومات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

(۸) حضرت محدث اعظمیؒ، حضرت شیخ تقی مانکپوری حائک کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

آپ کا وطن کٹرہ مانک پور ہے، اخبار الاخیار میں ہے: درکٹرہ مانک پور بودحق سبحانہ وتعالیٰ تقویٰ و برکت وکرامت عطانمود نام او در بعۂ ہوام بغایت موثر است خصوصًا در دفع زہر مار چنانچہ در مارگیراں مشہور است۔[12]

اخبار الاخیار کی طرح ''خزینۃ الاصفیاء'' میں بھی شیخ تقی کو مانکپوری لکھا ہے، مگر شیخ عبدالرحمٰن نے شیخ کبیر کے حال میں لکھا ہے کہ: اول ارادت بخدمت شیخ تقی ابن شیخ رمضان حائک سہروردی داشت کہ او در قصبۂ جھونسی متصل شہر الٰہ آباد آسودہ است۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیخ تقی حائک وہ ہیں جن کا مزار جھونسی میں زیارت گاہِ خلائق ہے اور شیخ عبدالحق نے ان کو مانکپوری اس لیے لکھ دیا کہ جھونسی مانک پور کے قریب ہے یہ بھی ممکن ہے کہ مانک پور اور جھونسی دونوں میں اس نام کے بزرگ گزرے ہوں اور دونوں حائک ہوں۔

دوسری الجھن یہاں پر یہ ہے کہ ''نزھۃ الخواطر'' میں شیخ تقی جھونسوی کو حسینی لکھا ہے (دیکھو تذکرہ علی بن علی بن تقی الدین جھونسوی، ص:۹۳) اور ان کے والد کا لقب شعبان الملۃ لکھا ہے، (ص:۹۲) یہ دونوں باتیں عبدالرحمٰن چشتی کے بیان سے مختلف ہیں مگر چشتی کا بیان قابل ترجیح ہے اس لیے کہ نزھۃ الخواطر کا ماخذ منبع الانساب ہے جو بالکل غیر مستند اور بے سروپا بیانات بلکہ جعلی حکایات کا مجموعہ ہے۔

شیخ تقی کے سال وفات میں بڑا اختلاف ہے نزہتہ میں ۷۸۵ لکھا ہے لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ وہ کبیر داس کے پیر ہیں تو یہ سن وفات یقینًا غلط ہے کبیر داس سکندر لودھی کے عہد میں تھے اور ان کی وفات منوہر لال زتشی کی تحقیق کے بموجب ۹۲۳ھ ہے اس صورت میں کبیر داس، شیخ تقی کے مرید کیسے ہوسکتے ہیں؟ شیخ تقی کا سال وفات خزینۃ الاصفیاء میں ۹۸۲ لکھا ہے اور میری بیاض میں ۸۹۲ لکھا ہوا ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے اور خزینۃ الاصفیاء میں عددوں کی ترتیب بدل گئی ہے نو کا عدد پہلے اور آٹھ کا اس کے بعد لکھ دیا گیا ہے۔[13]

(۹) 'کبیر داس' کے بارے میں تحقیق انیق دیکھئے:

سکندر لودھی (المتوفی ۹۲۳) کے عہد حکومت (از ۸۹۴ تا ۹۲۳) میں گذرے ہیں۔ 'خزینۃ الاصفیاء' میں ہے کہ کبیر داس شیخ تقی مانکپوری کے مرید تھے، 'مرأۃ الاسرار' میں ہے کہ شیخ کبیر حائک ملامتی پہلے شیخ جھونسوی کے مرید تھے، اس کے بعد رامانند بیراگی کی صحبت میں ریاضات ومجاہدات کیے، مشرب توحید ان پر غالب آیا، ظاہر بینوں نے انھیں کافر سمجھا اور اہل باطن ان کو موحد بے ریا سمجھتے ہیں۔ آخر میں مخدوم بھیک کے ہاتھ سے سلسلہ فردوسیہ کا خرقہ پہنا اور صلح کل کے طریقہ سے تسکین پائی۔

کبیر کو ہندو مسلمان دونوں مانتے تھے، ان کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ مسلمان تھے یا ہندو 'مرأۃ الاسرار' کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کو مسلمان مانتے ہیں، چنانچہ ان کا اولیاء اللہ کے سلسلہ میں کبیر کو ذکر کرنا، اور شیخ تقی کا مرید بتانا اور مخدوم بھیک سے خرقہ پانا اس کی بین دلیل ہے، یہ بھی یاد رہے کہ خزینۃ الاصفیاء میں ان کا ذکر بعنوان ''شیخ کبیر'' ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ میرے چچا نے ایک روز میرے دادا شیخ سعد اللہ سے دریافت کیا کہ یہ کبیر جس کی ہندی نظمیں لوگ پڑھا کرتے ہیں، مسلمان تھا یا کافر؟ شیخ سعد اللہ نے فرمایا کہ موحد تھا۔ میں نے کہا کہ موحد کافر ومسلمان سے الگ کوئی قسم ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ اس بات کا سمجھنا دشوار ہے پھر سمجھ جاؤگے۔[14]

کبیر صاحب کے کلام میں شیخ تقی کا نام کبھی کبھی آتا ہے۔ مثلاً

گھٹ گھٹ میں ابنا سی سنو تقی تم شیخ[15]

اور مثلاً

مانک پور میں کبیر بس ری　　مدحت سن شیخ تقی کے ری
او جی سنی جونپور تھانا　　جھونسی سنی پیرن کے ناما

مسلماں کبیر پنتھیوں کا خیال ہے کہ کبیر شیخ تقی کے مرید تھے...... وسکٹ صاحب کی رائے ہے کہ اس نام کے دو بزرگ تھے، ایک کا مسکن الٰہ آباد اور فتحپور کے درمیان کڑا مانک پور کا قصبہ تھا یہ ذات کے نداف اور فرقہ چشتیہ کے صوفی تھے، ان کی اولاد اب تک اس گردونواح میں پائی جاتی ہے، دوسرے شیخ تقی الٰہ آباد کے قریب جھونسی کے رہنے والے اور فرقہ سہروردیہ کے صوفی تھے۔[۱۶]

(۱۰) ''تبصرہ بر شہید کربلا و یزید'':

مؤلف حیات ابوالمآثر ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی تحریر فرماتے ہیں:

''اسلامی تاریخ کے ایک باب سے تعلق رکھنے والی آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف ''تبصرہ بر شہید کربلا و یزید'' ہے، جو اگرچہ ایک کتاب کا جواب ہے اور رد ہے، لیکن اس میں واقعہ کربلا کے تمام پہلوؤں پر مؤرخانہ اور ناقدانہ انداز میں بحث کر کے ان کا تجزیہ کیا گیا ہے، جو اس سے متعلق افراط و تفریط سے الگ ہو کر علمی و تاریخی تحقیق کی روشنی میں جادۂ اعتدال کی طرف رہنمائی کرتا ہے''۔[۱۷]

پروفیسر ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، سابق صدر شعبہ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی نے مندرجہ بالا کتاب کو اپنی ''محسن کتاب'' میں شامل کیا ہے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے فیس بک کے پیج پر لکھتی ہیں:

''ستر کے عشرے میں بعض علمی جرائد میں بعض کتب پر اتنے سیر حاصل تبصرے شائع ہوتے تھے کہ اصل کتاب پس منظر میں چلی جاتی تھی۔ ایسا ہی ایک تبصرہ زیر نظر کتاب بھی ہے جو میں نے دو دن میں دو طویل نشستوں میں پڑھ کے کل ہی ختم کی ہے۔

گزشتہ صدی کے چھٹے عشرے میں محمود احمد عباسی کی کتاب ''خلافت معاویہؓ و یزید'' شائع ہوئی جس نے انڈیا اور پاکستان میں خاصہ ہنگامہ برپا کیا اور اس کے رد میں کچھ کتابیں سامنے آئیں، ان ہی میں سے ایک کتاب ''شہید کربلا و یزید'' بھی ہے، یہ دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب کی تھی۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ قاری طیب صاحب کی کتاب پر مزید رد عمل سامنے آیا اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب نے اس پر ایک انتہائی جامع تبصرہ لکھا جو پھیل کر خود ایک کتاب بن گیا، یہ کتاب ''تبصرہ بر شہید کربلا و یزید'' کے نام سے شائع ہوئی۔

اس کتاب کو پڑھ کر مجھے ستر کے عشرے کے بعض جاندار تبصرے یاد آ گئے، زیر نظر کتاب حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب کا انتہائی معیاری نقد اور عالمانہ تبصرہ ہے جو اعظمی صاحب جیسی جید شخصیت ہی کر سکتی تھی۔ اس میں انھوں نے قاری طیب صاحب کے کتاب کے اہم مباحث پر اپنی بھرپور اور بے لاگ رائے دی ہے جو قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے، جو نتائج بحث انھوں نے نکالے ہیں وہ میں نے پوسٹ میں شیئر کر دیے ہیں، ان نتائج نے اس علمی مسئلہ کو آئینہ کی طرح صاف اور واضح کر دیا ہے۔ اس میں نہ کج بحثی ہے اور نہ بحث برائے بحث بلکہ نہایت اصولی اور علمی انداز میں ایک واضح اور متوازن موقف قائم کیا گیا ہے۔ (Niyar 20 / 09 / 2018، 9/محرم الحرام)

فقہی بصیرت

حضرت محدث اعظمیؒ کی فقہی بصیرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جب کہ غیر منقسم ہندوستان تھا اور عباقرہ علماء بقید حیات تھے، اس وقت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے بنفس نفیس مئو کا سفر فرمایا اور حضرت محدث اعظمیؒ کو دارالعلوم دیوبند کی صدارت افتاء کی پیش کش فرمائی لیکن محدث اعظمیؒ کے حالات نے اجازت نہیں دی اور آپ نے معذرت فرما دی۔

(۱) شاہ بانو کا مقدمہ: مولانا افضال الحق جوہر قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

''وہ (مولانا اعظمیؒ) اپنی بات کے اظہار پر مختصر سے مختصر لفظوں میں ایسی قدرت رکھتے تھے کہ علماء مقتدر سر دھنتے تھے، فاضل بات، ضرورت سے زیادہ گفتگو، یا تقریر و تحریر کے قائل ہی نہیں تھے مثلاً شاہ بانو کا مقدمہ سپریم کورٹ نے خراب کر کے متاع کی بحث میں الجھا دیا تھا۔ اس پر علماء مقتدر نے سخت احتجاج کیا، مسلم پرسنل لاء بورڈ نے تحریک چلائی اور جمعیۃ علماء ہند نے ایک آل انڈیا اجتماع کر کے معاملہ کو مسلم پرسنل بورڈ کے حوالہ کر دیا، اس اجتماع میں ہر طبقے اور ہر سائز کے علماء مقتدر، اکابر داعیان نے حصہ لیا تھا، میں بھی میڈیکل علی گڈھ سے تین روز کی چھٹی لے کر شریک ہوا تھا اور اصل تجویز کی ترتیب و تسوید میں کافی حصہ لیا تھا، اتفاق سے اس کانفرنس میں حضرت مولانا بھی تشریف لائے تھے، ہم لوگوں نے تجویز مرتب کر کے حضرت مولانا کی تصویب کے لیے تبرکاً پیش کر دیا تو آپ نے اسے پڑھا اور کچھ نہیں فرمایا، پھر قلم اٹھایا اور برجستہ صرف ۸ اور ۹ سطروں میں پوری بات لکھ کر ہمارے حوالے کر دی جو مطبوعہ کاروائی میں آج بھی موجود ہے، اس تجویز کا لب لہجہ میرے لیے عجیب و غریب تھا، اس میں نہ کوئی بحث تھی نہ معذرت نہ تسلی و طنز بلکہ ایک عالمانہ اظہار رائے تھا اور پوری خود اعتمادی اور خود داری کے ساتھ تھا چنانچہ پہلا ہی جملہ مخاطب کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ ''ہم پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتے ہیں......'' اس سے معلوم ہوا کہ اصل ذمہ دار کون ہے؟ اس اعلانیہ کے لیے حضرت مولانا کے علمی دماغ نے ان لائنوں سے الگ اپنی راہ نکالی جس کو ہندوستان کے دوسرے علماء مقتدر تجویز کر رہے تھے، مولانا نے بحث کا بنیادی نقطہ ''متاع کا استعمال'' قرار دیا اور اس پر ایک مستحکم رائے کا اظہار فرما کر بحث ختم کر دی جو ایک عالمانہ مجمع کا کام تھا، اس طرح جو طویل مباحثہ چل رہا تھا اور پر تنقید بھی ہو گئی اور ایک مثبت طریقہ کار نے بحث کو سپریم کورٹ یا پارلیامنٹ سے اٹھا

کرعلماء کی بارگاہ میں بھی پہنچا دیا جواس مسئلہ کا آخری حل تھا،اس کا نام ہے ذہانت ،علمیت اور برجستگی جوصرف خدا کا عطیہ ہے، کسبی نہیں ہے۔[18]

(۲)امارت شرعیہ: ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کے بعد اور ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی سے پہلے ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء کا سہارنپور میں اجلاس ہوا،مئی جون کا سخت زمانہ تھا، اجلاس کا موضوع تھا''امارت شرعیہ'' اورمقصد تھا جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے امیرالہند کا انتخاب واعلان۔ اس اجلاس کے لیے جوایجنڈا تھااس کوان داعیان اجلاس نے مظاہرعلوم سہارنپوراور مولویان تھانہ بھون کوبھی بھیج دیا تھا۔ مولانا محمد شفیع صاحب اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھےاورحضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہرعلوم اور دونوں تھانہ بھون کے بہترین ترجمان تھے۔ جب ایجنڈا مظاہرعلوم پہنچا تو حضرت شیخ الحدیث نے فرمایا کہ ہم مظاہرعلوم کے ذمہ داروں نے اس پر بحث کی اور آخر ایک تحریرلکھ کر ہم نے ایک وفد کی شکل میں جا کر جمعیۃ علماء کے ذمہ داروں کوخود دی،مجلس عاملہ میں جوتجویز زیر بحث تھی اس کا مقصد تھا کہ ہندوستان کا امیرالہند منتخب کر کےاس کا اعلان کر دیا جائے اب اس کا وقت آ گیا ہے، اور مظاہرعلوم کی تحریر کا خلاصہ یہ تھا کہ امیرالہند کا انتخاب موجودہ غلامی کے ماحول میں جائزنہیں جب کہ ہم کسی معنی میں بااقتدارنہیں ہیں، امارت کے لیےاقتدارشرط اول ہے پھراس پرقرآن وحدیث اوراحکام السلطانیہ جیسی اہم کتابوں کے حوالے تھے، اس پر اکابر علماء ہند کے دستخط تھے جوتھانہ بھون اور مظاہرعلوم سے متعلق تھے۔

تحریراجلاس میں پیش ہوئی ،پڑھی گئی ،اورذمہ داروں کی موجودگی میں ان ذمہ داروں نے پڑھ کر سنائی ،اس پرمجاہدملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے برافروختہ ہوکرفرمایا کہ اب تک یہ حضرات کہاں تھے؟ جب ہم بحث کرتے کرتے آخری منزل پرہیں توان حضرات نے الگ سے ایک رائے کا اظہارفرمایا،شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی جیسا بزرگ مجاہد عالم اورفیصلہ کن شخص مجلس عاملہ کی صدارت کر رہا تھا، یہ مجلس اکابر کا نازک مرحلہ تھا، دونوں کے دلائل سن کرفیصلہ فرمایا کہ علماء مظاہرعلوم نے ایک عالمانہ اختلاف رائے کیا ہے اور آپ اس وقت اس کا جواب نہیں دے سکتے ،اس لیے اجلاس ملتوی کیجئے اور اس بحث کوکسی نتیجہ تک پہنچانے کے لیے ایک کمیٹی بنا دیجئے جس میں آپ کےمنتخب افرادہوں جوان حضرات سے بحث کر کے کوئی آخری شرعی حل تجویز کریں، اس مجاہدانہ فیصلے پر اجلاس عام کومجاہدملت مولانا حفظ الرحمٰن نے آخرملتوی کر دیا اورجن تین حضرات کی کمیٹی بنائی گئی ،اور متفقہ طور پراعلان کیا گیاان کے نام تھے مولانا عبدالحلیم صدیقی لکھنوی،حضرت مولانا ابوالوفا شاہ جہاں پوری اورحضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ،جبکہ حضرت مولانا الاعظمی اس اجلاس میں شریک بھی نہیں ہو سکے تھےمگر ایسے سنگین مسئلہ میں فقہی نقطہ نظرکوعلمی انداز سے حل کرنے کے لیے حضرت مولانا کی تلاش لازم تھی ،اس لیے تلاش کر کےآپ کا نام شامل کیا گیا کیوں کہ حضرت مولانا کی علمیت، ذہانت اورتفقہ پر پوری جماعت کو اعتماد تھا، یہ تھا علماء ہند میں مولانا کا علمی مقام۔[19]

ایک فقھی مسئلہ کا حل

فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ نقل درنقل ہوتا چلا آرہا ہے کہ''ایک حائک (کپڑا بننے والا) قریشی کا کفونہیں ہوسکتا'' حضرت محدث اعظمیؒ نے اسوۂ نبوی کے ساتھ خلفاء راشدین کااسوہ پیش فرما کراس مسئلہ کوآئینہ کی طرح صاف کردیا۔

(۱) حضرت قتیلہؓ بنت قیس کا آنحضرت ﷺ سے نکاح: یہ باعزت خاتون اشعثؓ بن قیس کندی صحابی کی بہن تھیں اشعثؓ کے والد قیس کپڑا بننے میں بڑے ماہراوراس سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، لسان العرب اور نہایہ میں ہے کہ اشعثؓ نے حضرت علیؓ سے کہا: ما أحسبك عرفتني يا أمير المؤمنين قال: بلى، وإني لأجد منك بنة الغزل أي ريح الغزل، رماه بالحياكة، قيل: كان أبو الأشعث يولع بالنساجة.

(میں سمجھتا ہوں آپ نے مجھے پہچانا نہیں، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں پہچانتا ہوں اور مجھ کوتم سے سوت کی بو آرہی ہے، حضرت علیؓ نے ان کی بافندگی پرتعریض کی۔ کہتے ہیں کہ اشعث کے باپ کوبافندگی سے شغف تھا)۔[20]

نیز حضرت علیؓ نے ایک باراشعثؓ بن قیس کے بارے میں فرمایا کہ:

إن أبا هذا كان ينسج الشمال باليمين۔[21]

یعنی ان کے باپ اپنے ہاتھ سے لنگیاں یا چادریں بنتے تھے، یہ فقرہ حضرت علیؓ کی فصاحت وبلاغت کا آئینہ دارہے۔[22]

شرح نہج البلاغہ لابن حدید، جلد ۱،ص:۹۶ وجلد ۱،ص:۹۹ میں ہے کہ ان کوحضرت علیؓ نے حائک بن حائک کہا ہے۔[23]

قتیلہؓ انھیں قیس کی بیٹی اور اشعثؓ کی بہن تھیں،سردار دوجہاں اشرف انبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کی لڑکی قتیلہ کوقبول فرما لیا تھا،قتیلہ یمن میں تھیں اوران کے بھائی اشعثؓ نے ولی بن کران کا نکاح آنحضرت ﷺ سے مدینہ میں کر دیا تھا، یہ نکاح ۱۰ ہجری کے آخر میں ہوا تھا،قتیلہ ابھی یمن سے رخصت ہوکرنہیں آئی تھیں کہ نصف صفر ۱۱ میں آنحضور ﷺ کی بیماری شروع ہوئی اورابن البر کے بیان کے مطابق ۱۲؍ربیع الاول ۱۱ کو آپ کی وفات سے دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔

دوسرا بیان یہ ہے کہ وفات سے دوماہ پیشتر نکاح ہوا اور تیسرا بیان ہے کہ آپ کی آخری بیماری ہی میں نکاح ہوا تھا اور آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں وصیت کی تھی کہ ان کو اختیار ہے کہ دوسری ازواج مطہرات کی طرح ان پربھی قانون حجاب نافذ ہواورحجاب قائم ہواس صورت میں میرے

بعد کسی سے نکاح کرنا جائز نہ ہوگا دوسری صورت یہ ہے کہ وہ طلاق قبول کر لیں اور جس سے چاہیں نکاح کر لیں، انھوں نے دوسری صورت اختیار کی اور آنحضرت ﷺ کے بعد عکرمہ (صحابی) سے نکاح کر لیا۔

بنکر گھرانے میں سب سے اعلیٰ واشرف نبی کا یہ رشتہ...... اس بات کی مستحکم دلیل ہے کہ بننے والے کی بیٹی ایک عربی بلکہ قریشی وہاشمی بلکہ سب سے اشرف واکرم ہاشمی کی کفو ہوسکتی ہے، اسی طرح وہ اس کی بھی کفو ہوسکتی ہے جو یہ پیشہ نہیں کرتا اس بحث میں فقہی کتابوں سے جو نقل کیا جاتا ہے، وہ سب غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس مسئلہ کے لیے اس دلیل کے بعد کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی مزید استحکام اور تائید اور ایضاح کے لیے ہم اسوۂ نبوی کے ساتھ خلفاء راشدین کی سنت واسوہ بھی پیش کرتے ہیں اس سے مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی سامنے آجائے گا اور وہ یہ کہ کپڑا بننے والے کا لڑکا ایک قریشی عورت کا کفو ہوسکتا ہے۔[۲۴]

(۲) حضرت ابوبکرؓ کی بہن ام فروہؓ کا اشعثؓ بن قیس سے نکاح:

معجم کبیر طبرانی میں روایت ہے کہ اشعث بن قیس (وفات نبوی کے بعد دین سے منحرف ہو گئے تھے) حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے (اور تائب ہو کر دین کی طرف دوبارہ رجوع کیا) تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے ہاتھ اور پیر کھلوائے پھر اپنی ہمشیرہ ام فروہ سے ان کا نکاح کر دیا، دیکھئے یہ وہی اشعث ہیں جن کو حضرت علیؓ حائک بن حائک کہا کرتے تھے، کپڑا بننے والے کا وہی لڑکا کسی معمولی عورت کا نہیں بلکہ صدیق اکبر کی ہمشیرہ کو کفو قرار دیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے لیے معجم کبیر طبرانی جلد اول، ص: ۲۰۸، بسند صحیح اور مجمع الزوائد جلد ۹، ص: ۴۱۵، اور اصابہ جلد ۱، ص: ۵۱، دیکھئے، اس نکاح کا ذکر دار قطنی اور ابن السکن نے بھی کیا ہے، آخر الذکر نے یہ لکھا ہے کہ اشعث کے دو لڑکے محمد اور اسحٰق ام فروہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، اصابہ جلد ۴، ص: ۴۸۳، اور استیعاب جلد ۴، ص: ۴۸۴، میں ہے کہ دو لڑکیاں بھی پیدا ہوئی تھیں ان میں سے ایک کا نام حُبابہ اور دوسری کا قریبہ تھا۔

حضرت ام فروہ کا یہی شرف کیا کم ہے کہ وہ صدیق اکبرؓ کی بہن، اور قریشیہ تھیں مگر وہ اس سے بھی کہیں زیادہ شرف اور برتری کی مالک تھیں، ان کا سب سے بڑا شرف یہ تھا کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے بیعت کی تھی، اس کے باوجود ایک بننے والے کے لڑکے کو ان کا کفو قرار دیا گیا، اور قرار دینے والا وہ ہے جو اسلام میں آنحضرت ﷺ کے بعد سب سے اونچا مقام رکھتا ہے اور جس کی نسبت آپ ﷺ سارے مسلمانوں کو حکم دیا ہے "اقتدوا بالذين بعدي أبي بكر وعمر" (وہ دونوں جو میرے بعد ہیں یعنی ابوبکرؓ وعمرؓ ان کے قدم بقدم چلو)۔[۲۵]

(۳) حضور ﷺ کے پردادا حضرت ہاشم کا قبیلہ بنی نجار میں نکاح:

حضرت ہاشم کا نکاح قبیلہ بنی نجار کی عورت سلمٰی بنت عمرو سے ہوا تھا، محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

تاریخ وسیر پر جن حضرات کی نظر ہے ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ کے جد امجد عبد المطلب کی نانہال مدینہ منورہ کے قبیلہ بنی نجار میں تھی، ان کی ولادت وہیں ہوئی اور وہیں ان کی پرورش ہوئی، پھر جب آنحضرت ﷺ کے والد ماجد شام کے سفر سے واپسی میں بیمار ہوئے اور مکہ آنا دشوار ہوگیا تو اپنے والد کی نانہال ہی میں رک گئے وہاں ان کے رشتہ داروں نے دل وجان سے تیمارداری کی مگر وقت پورا ہو چکا تھا، جان بر نہ ہو سکے وہیں ان کی وفات ہوئی اور بنو النجار ہی نے ان کی تجہیز وتکفین کی۔

عبد المطلب کی نانہال بالواسطہ آنحضرت ﷺ کی بھی نانہال ہے۔ اسی خصوصی تعلق کی بنا پر آنحضرت ﷺ اپنی پوشاک (اپنے استعمال کے کپڑے) بنی نجار ہی کے یہاں بُنواتے تھے اور جلد تیار کرنے کا تقاضا کرنے کے لیے خود جایا کرتے تھے۔

حافظ ابو الشیخ اصبہانی (المتوفی ۳۶۹) نے اپنی کتاب اخلاق النبی میں سند کے ساتھ یہ حدیث روایت کی ہے:

كان لرسول الله ﷺ ثوبان ينسجان في بني النجار وكان يختلف إليهما يقول: عجلوا بهما علينا نتجمل بهما في الناس۔[۲۶]

(آنحضرت ﷺ کے دو کپڑے بنی نجار کے یہاں بنے جارہے تھے اور آپ بار بار ان کپڑوں کو دیکھنے جاتے تھے، فرماتے ہم کو جلدی تیار کر کے دو ان کو پہن کر اچھی ہیئت میں لوگوں سے ملنا ہے)۔

حافظ ابو الشیخ نے حضرت سہل بن سعد سے یہ حدیث بھی بیان کی ہے کہ ایک بار آنحضرت ﷺ کے لیے بھیڑ کی اون کا ایک جبہ سی کر تیار کیا گیا، آپ نے اس کو پہنا تو ایسا پسند کیا کہ دوسرا کپڑا اتنا پسند نہیں کیا اس کو ہاتھ سے چھوتے تھے اور فرماتے تھے دیکھو کتنا اچھا ہے اتنے میں ایک اعرابی (بدو) آگیا اس نے کہا حضرت! یہ جبہ مجھے عنایت فرما دیجئے حضرت نے دے دیا اور ویسا ہی دوسرا بننے کا حکم دیا مگر اس کو زیب تن کرنے کی نوبت نہیں آئی اس لیے کہ وہ ابھی کارخانے میں تیار ہی ہو رہا تھا کہ آنحضرتؐ کی وفات ہوگئی۔[۲۷]

یہ کارخانہ بھی غالباً بنی نجار کا تھا، ورنہ بنو ساعدہ کا رہا ہوگا جو بنی نجار ہی کی طرح خزرج کی ایک شاخ ہے اس لیے کہ اس کے راوی سہل بن سعد ساعدی ہیں اور وہ اس کو جس واقفیت اور دقت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ان کا قریب کا تعلق ہے اس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ صحیح بخاری میں جو یہ حدیث مذکور ہے کہ ایک انصاری خاتون ایک کپڑا لائیں اور عرض کیا کہ حضرت! میں نے اس کو اپنے ہاتھ سے اس لیے بنا ہے کہ

آپ کو پہناؤں، تو اس کے راوی بھی حضرت سہل بن سعد ہی ہیں۔ بہر حال یہ تحقیق طلب ہے کہ جس (محاکہ) کا یہاں ذکر ہے وہ کس قبیلہ میں تھا، یہ تو یقینی ہے کہ وہ کارخانہ انصار ہی کا تھا۔ بنو النجار کی اعلیٰ درجہ کی شرافت کا اس سے بہتر معیار اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اشرف قریش عبدالمطلب کو کفو، اور رشتۂ ازدواج کے لیے قریش کے ہمسر تھے۔[28]

اندازہ لگائیے کہ ایک مسئلہ کی توضیح کے لیے محدث اعظمیؒ نے اسوہ نبوی ﷺ خلفاء راشدینؓ کی سنت کے ساتھ عہد جاہلیت سے بھی بنکر گھرانے میں قریش سے مناکحت کا ثبوت پیش فرما دیا۔ مندرجہ بالا واقعات سے استدلال حدیث وفقہ اور تاریخ میں محدث اعظمی کی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

ایک غلط فہمی

محدث اعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

احادیث میں بنو ہاشم کو زکوٰۃ لینے کی جو ممانعت ہے اس سے ہمارے مخاطبین نے یہ سمجھ لیا کہ اس حکم کا مبنی فضیلت نسبی ہے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ یہ بات ہوتی تو عبدالمطلب بن ہاشم کی کل اولاد ہاشمیت اور مطلبیت میں برابر ہے اور اس نسبی جہت سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے پھر کیا وجہ ہے کہ عبدالمطلب کی صرف تین اولاد عباسؓ، حارث اور ابو طالب ہی کی اولاد پر زکوٰۃ حرام ہے اور عبدالمطلب کے باقی نو لڑکوں کی اولاد پر حلال ہے۔ نیز نسبی فضیلت اس حکم کا مبنی ہوتی تو بنی ہاشم کے موالی (غلام اور آزاد شدہ غلام) پر زکوٰۃ کیوں حرام ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ اس حکم کا مبنی ہی غلط سمجھا گیا، صحیح مبنی یہ ہے کہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ سے ایسا تعلق رکھتے تھے کہ ان کا نفع حضرت کا نفع ہے، اس لیے اگر آپ ان کے لیے زکوٰۃ لینا جائز قرار دے دیتے تو کفار کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ محمد (ﷺ) اسلام کی دعوت روپیہ جمع کرنے کے لیے دیتے ہیں نیز ایسا کرنا "ما أسئلکم علیہ أجرا إلا المودۃ فی القربیٰ" کے اعلان کے خلاف ہوتا، جیسا کہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی نے شرح بخاری میں لکھا ہے۔[29]

الأزهار المربوعة في رد الآثار المتبوعة:

اس کتاب کے سرورق پر نام کے بعد اس کے موضوع کے بارے میں لکھا ہوا ہے: "جس میں ایک مجلس میں تین طلاقوں کے واقع ہونے کا تشفی بخش ثبوت اور فریق مخالف کے مایۂ ناز رسالہ "آثار متبوعہ" کی تمام باتوں کا نہایت مسکت جواب پیش کیا گیا ہے"۔[30]

علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسے معتدل مزاج وانصاف پسند اور بحث وتحقیق کے شیدا اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے معارف مئی ۱۹۳۷ء میں تحریر فرماتے ہیں: "اس بحث میں ہمارے ہندی دوست مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیب سابق شیخ ازہر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جنھوں نے اس بحث پر ایک رسالہ "الأبحاث في الطلقات الثلاث" لکھا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقلیات کے علاوہ نقلیات میں بھی ہندوستان کا علم بحمد اللہ مصر سے زیادہ ہے"۔[31]

شامی مطبوعہ میریہ میں غلطی: محدث اعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"شامی مطبوعہ میریہ مصر (ص:۳۳۱، جلد ۲، سطر: ۲۲) میں المعربۃ کا لفظ لغزش قلم یا تصحیف کاتب ہے، صحیح المعروبۃ ہے جیسا کہ اس صفحہ میں صاحب درمختار نے نقل کیا ہے"۔[32]

مندرجہ بالا تحریر سے محدث اعظمیؒ کی دقت نظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

□□

حواشی:

۱- ریاض الجنۃ مارچ/اپریل ۱۹۸۹ء ۲- اعیان الحجاج جلد ا، ص:۸
۳- مقدمہ صدیق اکبرؓ طبع دوم۔ ۴- عثمان ذوالنورینؓ، ص:۲۴
۵- عثمان ذوالنورین، ص:۲۴ ۶- مقالات ابوالمآثر جلد، ۲، ص:۸۶
۷- مقالات ابوالمآثر، جلد ۲، ص:۲۱۰ ۸- حیات ابوالمآثر، جلد ثانی، ص:۴۲۷
۹- ایضاً، ص:۴۲۸
۱۰- حیات ابوالمآثر، جلد ثانی، ص:۴۲۵
۱۱- مقالات ابوالمآثر، ص:۱۹۶
۱۲- اخبار الاخیار، ص:۱۷۱
۱۳- دست کار اہل شرف، ص:۳۹-۴۰
۱۴- دست کار اہل شرف، ص:۹۲، بحوالہ اخبار الاخیار، ص:۲۹۱
۱۵- ایضاً: ص۹۳
۱۶- دست کار اہل شرف، ص:۹۴، بحوالہ کبیر صاحب، ص:۶۷
۱۷- حیات ابوالمآثر، جلد ثانی، ص:۱۷
۱۸- ترجمان الاسلام خصوصی اشاعت ۱۹۹۲ء جامعہ اسلامیہ بنارس، ص:۱۷۳-۱۷۴
۱۹- ایضاً، ص:۱۷۴-۱۷۵
۲۰- لسان العرب، جلد ۱۶، ص:۶، ونہایہ، جلد ا، ص:۱۱۵، دست کار اہل شرف، ص:۵، مطبوعہ ۱۹۸۵
۲۱- نہایہ ابن الاثیر، جلد ۲، ص:۲۵۶
۲۲- دست کار اہل شرف، ص:۵
۲۳- ایضاً، ص:۵
۲۴- دست کار اہل شرف، ص:۱۱۸، از: محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی
۲۵- دست کار اہل شرف، ص:۱۱۸
۲۶- ص:۱۰۴
۲۷- اخلاق النبی، ص:۱۲۱
۲۸- دست کار اہل شرف، ص:۱۲۶-۱۲۷
۲۹- انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت، ص:۲۵-۲۶
۳۰- حیات ابوالمآثر جلد ثانی، ص:۱۷۶
۳۱- ایضاً، ص:۱۷۹
۳۲- انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت، ص:۵۳۔

حضرت محدث اعظمیؒ- فقہی بصیرت کے حوالے سے

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری★

افتاء اور فتویٰ نویسی ایک مشکل فن ہے، ہر زمانے میں اسے مشکل اور دقیق فن سمجھا گیا ہے۔ فقہ کی لاتعداد جزئیات کا استحضار اور متماثل جزئیات میں سے ہر ایک کو الگ الگ چھانٹ کر ان کے متعلق حکم کو معلوم کرنا آسان نہیں۔ یہ بے حد عمیق اور وسیع مطالعہ کو چاہتا ہے۔

اس حیثیت سے جب ہم حضرت محدث اعظمیؒ کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو حیرت انگیز صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسی صلاحیت جس پر وقت کی مؤقر اور قابل احترام عظیم شخصیات و اداروں نے بھرپور اعتماد کیا۔

یہاں چند مثالوں کے ذریعہ اسے مُبرہن کیا جارہا ہے:

۱:- سہ ماہی ترجمان الاسلام بنارس شمارہ ۱۳ میں مولانا اسیر ادروی صاحب لکھتے ہیں:

’’۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند سالانہ اجلاس سہارنپور میں ہوا، اس میں دوسرے مسائل کے ساتھ امارت شرعیہ کا نظام قائم کرنے کا مسئلہ در پیش ہوا، ورکنگ کمیٹی اس مسئلہ پر متفق ہوگئی، مگر علماء سہارنپور کو دلائل کی بنیاد پر اس سے اختلاف تھا اور یہ اختلاف تحریری طور پر ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش بھی کر دیا گیا، ارکانِ عاملہ میں برہمی پیدا ہوگئی، علماء سہارنپور اور مجلس عاملہ دونوں کو اپنے اپنے نقطۂ نظر پر اصرار تھا، اور محاذ آرائی کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا، جلسہ کی صدارت دنیائے اسلام کی ایک مقتدر شخصیت انجام دے رہی تھی وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ذات گرامی تھی، صدر نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے اس فیصلہ کو کالعدم قرار دے کر آئندہ کے لئے ملتوی کرنے کا حکم دیا اور یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کرائی کہ جمعیۃ علماء کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے جب بھی کوئی فقہی مسئلہ پیش ہو تو وہ محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی سے استصواب کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا، یہ تجویز پوری مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر منظور کی جب کہ مولانا اعظمی اجلاس میں موجود بھی نہیں تھے۔ یہ مولانا اعظمی کی فقہی بصیرت پر کلی اعتماد اور ان کے فضل وکمال کا اعتراف کئی درجن عظیم المرتبت علماء ومشائخ کی مجلس میں کیا جارہا ہے۔ اور کسی کو اس سے مجال اختلاف نہیں تھا‘‘۔[۱]

۲:- ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں جب دار العلوم دیوبند کو اپنے دارالافتاء کے لئے صدر مفتی کی ضرورت ہوئی تو نظر انتخاب حضرت والا پر ہی پڑی۔

اس سلسلے میں مولانا محمد منظور نعمانی رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند حضرت والا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

’’......شاید علم ہو کہ اس سال سے میں دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں لے لیا گیا ہوں، ۲۸-۲۹ ذی الحجہ کو مجلس کا انعقاد ہوا تھا، وہاں ایک چیز یہ طے کی گئی تھی کہ اپنے حلقہ کے جو ممتاز اہل علم ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ دار العلوم میں جمع کرنے کوشش کی جائے اور حتی الوسع انھیں سے دار العلوم بھرا جائے۔ اس سلسلہ میں میں نے مجلس کی جناب کی طرف توجہ دلائی اور یہ طے کرلیا گیا کہ ضرور لانے کی سعی کی جائے۔

......بہرحال میری گزارش پر مجلس نے بالاتفاق یہ طے کردیا ’’صدر مفتی‘‘ کی جگہ کے لئے جناب کو جلد از جلد بلانے کی کوشش کی جائے۔ اور طے یہ ہوا کہ چونکہ مفتاح العلوم کو چھوڑنا بھی آپ کے لیے آسان نہ ہوگا، اس لئے ان مشکلات پر قابو پانے کے واسطے بجائے خط وکتابت کے خود حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ اور مولانا محمد طیب صاحب مئو کا سفر کریں۔ بلکہ یہ تجویز خود حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ کی طرف سے آئی۔......میری تجویز کا حضرت مفتی صاحب[۲]، حضرت مولانا حسین احمد صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا خیر محمد صاحب، مولانا محمد طیب صاحب سب ہی نے نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا، اور بالخصوص حضرت مولانا مدنی، مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے تو میرے اندازوں سے زیادہ آپ کی مدح اور اعتماد کا اظہار کیا‘‘۔[۳]

ماہنامہ دار العلوم دیوبند وفیات نمبر میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جگدیش پوری استاذ دار العلوم دیوبند لکھتے ہیں:

’’۱۳۶۴ھ م ۱۹۴۵ء میں جب کہ محدث عصر مفتاح العلوم میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تدریسی وتعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دار العلوم دیوبند نے مئو آکر بیک زبان صدارت افتاء کا اہم ترین منصب پیش کیا، مگر اہل مئو بالخصوص جامعہ مفتاح العلوم کے ارباب بست وکشاد کسی طرح سے مفارقت پر راضی نہیں ہوئے‘‘۔[۴]

۳:- علامہ سید سلیمان ندویؒ نے دار المصنفین اعظم گڈھ کے لیے ایک

★ مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، نواداہ، مبارک پور، اعظم گڈھ، یوپی

مکتوب میں یوں پیشکش کی:

''آپ ہمارے مہمان ہوجائیں، یعنی دارالمصنفین آکر قیام فرمائیں، جو نذرانہ وہاں ملتا ہے وہی یہاں بھی حاضر رہے گا، سیرت وتالیفات میں میری مدد فرمائیں، فتاویٰ کا کام کریں اور جو مناسب موضوع نظر آئے تحقیقات کے لئے اور جو علمی کام مشورہ سے طے پائے''۔[۵]

۴:-حضرت محدث اعظمیؒ نے پہلا سفر حج ۱۹۵۰ء میں کیا تھا، اس موقع پر ۱۲؍ستمبر ۱۹۵۰ء کے اخبار الجمعیۃ دہلی میں ''افکار ومطالعات'' کے کالم میں علمائے ہند کا سفر حج کے عنوان سے کئی اہل علم کا نام چھپا جنھوں نے اس سال سفر حج کیا تھا، مثلاً مولانا عبدالحق مدنی، مولانا فخرالدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مرادآباد، مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی وغیرہ۔ ان حضرات کے نام کے ساتھ ان کا مختصر تعارف بھی تھا، اس فہرست میں جو نام سب سے پہلے درج تھا وہ یوں تھا:

''مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی''

اور جو تعارف چھپا تھا اس کی چند سطریں یہ ہیں:

''حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی موجودہ دور میں سلف کی زندہ یادگار ہیں، سینہ علوم وفنون کا سمندر ہے اور چہرہ مہرہ اسلامی اخلاق کا نمونہ یا علم وفضل کے اعتبار سے اپنی مثال آپ، علم وفضل کے مالک ہیں اور ہر علم میں کمال حاصل ہے۔ مدرسہ مفتاح العلوم مئو اعظم گڈھ کے شیخ الحدیث ہیں، دارالعلوم دیوبند کے مرکزی دارالافتاء میں جہاں ہر سال پچیس ہزار فتاویٰ کا جواب دیا جاتا ہے، حضرت مولانائے محترم کی فقہی رائے خاص طور پر مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہے''۔[۶]

۵:-کویت کے وزارت اوقاف کی طرف سے شائع شدہ موجودہ دور کا سب سے جامع فقہی انسائیکلو پیڈیا جو ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' کے نام سے موسوم ہے۔ اور جو چالیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب کے وقت ایڈیٹوریل بورڈ میں ممبر کی حیثیت سے حضرت محدث اعظمیؒ کو بار بار دعوت دی گئی۔ اس کی جمع وترتیب کے نگراں مشہور فقیہ شیخ مصطفی الزرقاء تھے، یہ دعوت انہی کی طرف سے بار بار آتی رہی اور کویت تشریف آوری کی گزارش کی جاتی رہی۔ محدث اعظمیؒ نے ارادہ بھی کرلیا تھا، مگر اعذار ومصروفیات کے باعث پہلے تو یہ سفر مؤخر ہوا، پھر منسوخ ہوگیا۔ یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔

حضرت نے اس کام کیلئے کویت کا سفر تو نہیں کیا، مگر ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' کے کچھ اجزاء کتاب الجنائز وغیرہ کا کام کیا۔ مئو میں اپنے سفالہ پوش مکان کے گوشے میں بیٹھ کر۔[۷]

یہ سارے حوالہ جات وواقعات ثابت کرتے ہیں کہ حضرت محدث اعظمیؒ کی فقہی بصیرت کو برصغیر ہی نہیں پورے عالم اسلام میں تسلیم کیا جاتا تھا۔

اب حضرت کی فقہی بصیرت کے کچھ نمونے بھی ملاحظہ کیجئے:

۱:-ایک بار لکھنؤ کے ایک موقر دینی ادارے کی طرف سے ہندوستان کے مشاہیر اصحاب درس وافتاء کا اجتماع کیا گیا اور بیمہ وانشورنس پر غور وخوض ہوا۔ اور متفقہ طور پر ایک تحریر تیار کی گئی، مگر اس کی عام اشاعت سے قبل ضرورت محسوس کی گئی کہ مولانا اعظمیؒ کی تائید وتصویب حاصل ہوجائے، چنانچہ یہ تحریر شرکاء اجتماع میں سے ایک ذہین وفطین عالم کے ذریعہ محدث اعظمیؒ کے پاس بھیجی گئی، آپ نے اس فتویٰ پر آٹھ صفحات میں اپنی رائے لکھی جو اس متفقہ فتویٰ کے خلاف تھی۔ جب یہ تحریر مذکورہ علماء کی مجلس میں پیش کی گئی تو سب نے اپنے سابقہ فیصلے اور فتوے کو واپس لے لیا۔[۸]

۲:-رویت ہلال کے مسئلے میں ۱۹۶۷ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے ایک فیصلہ دیا جو اس کے اجلاس میں پاس شدہ تھا اور روزنامہ قومی آواز لکھنؤ کے ۱۱؍مئی ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

مجلس کا فیصلہ یہ تھا:

''ریڈیو کا غیر مسلم ملازم بھی اگر کسی ذمہ دار ہلال کمیٹی یا جماعت علماء یا قاضیٔ شریعت -بتصریح نام- کے فیصلہ کا اعلان کرے تو یہ خبر بھی قابل تسلیم ہوگی، اور صوم وافطار صوم کا حکم درست ہوگا''

علامہ اعظمیؒ نے اس فیصلے کو مجلس کی عظیم الشان غلطی قرار دیا، اور بتایا کہ فقہائے احناف کی تصریحات کے مطابق ایسی خبر، خبر موجب نہیں، لہٰذا قابل قبول نہیں، پھر احادیث نبویہ اور عبارات فقہیہ کی روشنی میں مجلس کے فیصلے کا غلط ہونا ثابت کیا۔[۹]

۳:-۱۹۵۲ء و ۱۹۵۳ء میں ہندوستان کی دو عظیم شخصیات مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے درمیان زراعت وجاگیرداری کے متعلق ایک تحریری مباحثہ چلا، جو ماہنامہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہوا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے مضمون کا عنوان تھا ''نظام جاگیرداری وزمینداری کی اسلام میں کیا گنجائش ہے''۔ یہ مضمون دسمبر ۱۹۵۲ء وجنوری ۱۹۵۳ء کے شماروں میں چھپا، اس کے جواب میں مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے مضمون لکھا ''اسلام میں جاگیرداری اور زمینداری کا نظام''۔ یہ اپریل ومئی ۱۹۵۳ء کے شماروں میں شائع ہوا۔

حضرت محدث اعظمیؒ نے دونوں حضرات کی نگارشات پر محاکمہ تحریر فرمایا، جس کا آغاز یوں کیا:

''اس سلسلۂ بحث میں اصل بنیادی سوال اگرچہ یہ ہے کہ اسلام میں نظام جاگیرداری وزمینداری کی گنجائش ہے یا نہیں؟ مگر اس کے جواب میں

خواہ اثبات کا پہلو اختیار کیا جائے خواہ نفی کا، بہر صورت اسلام میں مزارعت کے جواز وعدم جواز کی تحقیق ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اور بڑی حد تک اس سوال کا جواب اس تحقیق پر موقوف نظر آتا ہے، اس لئے ہر دو سابق بزرگوں کے اتباع میں سب سے پہلے میں بھی اس مسئلہ پر اپنے معلومات پیش کرنا چاہتا ہوں''۔

علامہ اعظمیؒ نے یہ محاکمہ زراعت وجاگیر داری کے عنوان سے کیا تھا، بلاشبہ یہ ایک زبردست علمی محاکمہ ہے مگر غالباً ابھی تک طبع نہیں ہوا ہے، کیونکہ (حیات ابوالمآثر جلد دوم ص:۲۷۰) کے حاشیہ میں اسے ''قلمی'' لکھا گیا ہے۔ [۱۱]

اسی جلد میں (ص:۲۷۰ تا ص:۲۷۷) اس محاکمہ کا فاضل سوانح نگار نے خلاصہ تحریر کیا ہے جس کے اصل مضمون کی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے۔

۴:- حضرت محدث اعظمیؒ کی ایک کتاب ہے ''انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت''۔ اس کتاب کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ ۱۹۳۲ء کے قریب ہندوستان کے ایک مشہور عالم کی ایک کتاب شائع ہوئی جس میں سورۂ حجرات کی آیت کریمہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ . (آیت ۱۳)

کی تفسیر کرتے ہوئے انساب کے سلسلے میں اعلیٰ وادنیٰ برادریوں، پھر ایک برادری میں اعلیٰ وادنیٰ خاندانوں کا تصور پیش کیا تھا، علامہ اعظمیؒ نے اس پر زبردست گرفت فرمائی اور ان عالم صاحب کو آیت کریمہ کی تفسیر میں تحریف معنوی کا مرتکب قرار دیا۔

حضرت محدث اعظمیؒ لکھتے ہیں:

''میں یہاں یہ بتا دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ایک نوخیز مشہور عالم نے اس آیت کی تفسیر میں ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔ میں نے اس کو بہت غور سے بار بار پڑھا اور ہر بار انتہائی رنج اور دکھ کے ساتھ کتاب ہاتھ سے رکھ دینی پڑی، میں نہایت افسوس سے کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تفسیر، تفسیر نہیں، بلکہ آیت کی معنوی تحریف ہے۔ مصنف کے انداز بیان میں بعض اجلہ کی نقالی کی انتہائی کوشش کی ہے؛ لیکن جوش تفلسف میں اس کی کچھ پروا نہیں کی کہ اس کا خانہ ساز فلسفہ اور اس کا مخترع نظریہ کتنے نصوص سے ٹکراتا ہے''۔ [۱۲]

اس ضمن میں حضرت والا نے مسئلہ کفاءت پر بھی مفصل گفتگو کی ہے اور نکاح کے باب کفاءت کے کیا مراد ہے اور اس کی کیا حیثیت ہے، اس کی گرہیں بھی کھولی ہیں۔

خیال رہے کہ جس کتاب کا حضرت علامہؒ نے رد کیا ہے اس کا نام ''نہایات الارب'' ہے اور اس کے مصنف مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ تھے۔

۵:- اسلامی پرسنل لا میں باب کفو- حضرت محدث اعظمیؒ کا وہ مضمون ہے جس میں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد ہشتم میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے بہت سے ایسے فتاویٰ کا مدلل و مفصل رد وابطال ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی بالغہ جو نسباً صدیقی یا فاروقی ہو اور وہ کسی نعمانی یا افغانی یا قدوائی یا کمبوہ سے نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔

حضرت والا نے ہندو پاک کے نام نہاد نسب ناموں میں جو جعل سازی پائی جاتی ہے اور انساب کا جو انقطاع ہے، اس پر بھی تحقیقی کلام فرمایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حیرت ہے کہ ایک آدمی جھوٹ بول کر اپنے کو صدیقی کہلائے تو وہ شریف ہو گیا اور دوسرا جھوٹ سے پرہیز کر کے یہ کہے کہ میں پشتہا پشت سے مسلمان ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ میرے باپ دادا عرب سے آئے تھے یا یہیں مسلمان ہوئے تو وہ شرافت سے گر گیا، وہ صدیقیت کا باطل دعوی کرنے والے کا کفو نہیں ہو سکتا''۔ [۱۳]

آگے لکھتے ہیں:

''لہٰذا مسلم پرسنل لا کا جائزہ لینے والے محقق علماء مسئلۂ کفاءت پر قرآن وحدیث وفقہ کی روشنی میں از سرنو غور کریں اور ان غلطیوں کی اصلاح کریں جو ہمارے ہندوستانی مفتیوں نے پھیلا رکھی ہیں''۔ [۱۴]

۶:- اسی طرح محدث اعظمیؒ کی کتاب ''دارالاسلام اور دارالحرب'' بھی تفقہ، تبحر علمی، وسعت مطالعہ اور قوت استدلال کا شاہکار ہے، جس میں مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ ایڈیٹر ماہنامہ برہان دہلی کے اسی موضوع پر لکھے ہوئے مضمون کا پوری دقت نظر کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ حضرت محدث اعظمیؒ اس میں پورے وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں:

''ان سب باتوں کو نگاہ میں رکھئے تو اس بات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ فقہاء کے مذکورہ بالا ارشادات کے رو سے ہندوستان کا دارالحرب ثابت ہونا ناممکن ہے، اور ان کی رو سے وہ بلا شک وشبہہ دارالاسلام ہے''۔ [۱۵]

۷:- نکاح کے وقت لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے والوں کو کھانا کھلانا، کچھ مفتیان کرام [کے نزدیک]، جن میں مفتیان دارالعلوم دیوبند بھی شامل ہیں، ثابت نہیں اور قابل ترک ہے، لیکن حضرت محدث اعظمیؒ کو اس فتویٰ پر اشکال ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق ۴۸۹/۵ والی حدیث نقل کر کے اس کا جواز ثابت کیا ہے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''مفتی صاحب کا رجوع اور دیوبند کا فتویٰ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مفتی

صاحب نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے اگر وہ صحیح نہیں ہے تو زیادہ سے زیادہ مدعا کا ثبوت اس سے نہ ہوگا۔یعنی مسنون ہونا ثابت نہ ہوگا۔اس سے اس کے جواز واباحت کی نفی کیوں کر ہوگی؟ اور اس کا قابل ترک ہونا کس دلیل سے لازم ہوگا''۔[۱۵]

اسی سلسلے کے مستفتی کو خط میں لکھتے ہیں:

''نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کا کچھ لوگوں کو مدعو کر لینا اور ان کو کھانا کھلانا مصنف عبدالرزاق ۸۹/۵ ۴ والی حدیث کی بنا پر آں حضرت ﷺ کا پسند کیا ہوا ایک طریقہ ضرور ہے، چاہے اصطلاح فقہی کی بنا پر وہ سنت ہو یا نہ ہو،اور اس چیز کا مروجہ بارات سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔[۱۶]

۸: -حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ایڈیٹر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ نے شیعہ اثناعشریہ کے بارے میں حضرت محدث اعظمیؒ کے پاس ایک طویل استفتاء بھیجا۔جس میں انھوں نے شیعہ اثناعشریہ کے عقائد ونظریات کو بہت تفصیل کے ساتھ مستند حوالوں ودلائل کے ساتھ تحریر کیا تھا اور یہ چاہا تھا کہ حضرت محدث اعظمیؒ ان کے متعلق کوئی شرعی حکم تحریر فرمائیں۔حضرت نے استفتاء کا جواب لکھا اور اسے مزید مدلل ومبرہن کرتے ہوئے اثناعشری شیعوں کو ان کے عقائد کی روشنی میں خارج از اسلام قرار دیا۔مولانا نعمانیؒ نے استفتاء اور اس کا جواب پورے ملک کے مؤقر اصحاب افتاء اور اہل علم کے پاس بھیجا، سب نے حضرت محدث اعظمیؒ کے فتوے کی تائید کی، کسی نے اختلاف نہیں کیا۔

حضرت اعظمیؒ کے فتوے کی چند سطور یہ ہیں:

''اثناعشری شیعہ بلا شک وشبہہ کافر ومرتد ہیں، کیونکہ وہ تحریف قرآن کے برملا قائل اور معتقد ہیں۔اور اس کا خود شیعوں کو اعتراف ہے۔ان دونوں باتوں کا ناقابل تردید ثبوت خود مستفتی نے پیش کردیا ہے''۔

محدث اعظمیؒ کا یہ فتویٰ ۷رصفر المظفر ۱۴۰۷ھ کا تحریر فرمودہ ہے۔یہ فتویٰ مع استفتاء علماء کی تصدیقات کے ساتھ ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ کی خصوصی اشاعت اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء مطابق صفر المظفر تا ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ میں شائع ہوا ہے۔

حضرت محدث اعظمیؒ کی فقہی بصیرت کے یہ چند ناقابل تردید نمونے ہیں، تفصیل کے خواہشمند حضرات کو حضرت کی ان تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہیے جن کا حوالہ اس مضمون میں آیا ہے۔ان کے علاوہ حضرت کی دیگر تصانیف کا بھی جن سے حضرت العلامؒ کی دقت نظر عالم آشکارا نظر آتی ہے۔□□

حواشی:

۱- سہ ماہی ترجمان الاسلام، بنارس، شمارہ ۱۳، ص۵و۶

۲- حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

۳- حیات ابوالمآثر ۱/ ۲۰۲

۴- ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، وفیات نمبر ص ۱۵۴، ۱۵۵

۵- حیات ابوالمآثر: ۱/ ۲۰۴

۶- الجمعیۃ، ۱۲/ستمبر ۱۹۵۰ء مطابق ۲۶/ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ

۷- حیات ابوالمآثر: ۱/ ۳۱۰ تا ۳۱۴

۸- حیات ابوالمآثر: ۱/ ۴۸۰، سوانح نگار نے یہاں یہ واقعہ مولانا اسیر ادروی صاحب کے حوالے سے لکھا ہے، لیکن ''فقہیات'' کے مرکزی عنوان کے تحت حیات ابوالمآثر جلد دوم ص ۲۹۰ پر بھی غالباً یہی واقعہ درج ہے، اس کا ضمنی عنوان ہے ''بیمہ کی حقیقت اور اس کا حکم''، وہاں ادارہ کا نام ''مجلس تحقیقاتِ شرعیہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ'' لکھا ہوا ہے، جو عالم محدث اعظمیؒ کے پاس گئے تھے وہ مولانا محمد تقی امینی، ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، تھے، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے انھیں بھیجا تھا، اور حضرت محدث اعظمی کی تحریر چوبیس (۲۴) صفحات پر مشتمل تھی۔

۹- مسئلہ رویت ہلال، شائع شدہ مجلہ المآثر، شمارہ محرم- ربیع الاول ۱۴۲۴ھ

۱۰- حضرتؒ کی یہ طویل تحریر ہے، جو مقالات ابوالمآثر جلد سوم میں ص ۷۱ تا ۱۰۳ طبع ہوئی ہے، وہاں یہ پورا مقالہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔(مسعود الاعظمی)

۱۱- انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت: ص ۲۱

۱۲- المآثر: جلد ۸، شمارہ ۱، ص ۴۰

۱۳- مجلۂ مذکورہ: ص ۴۴

۱۴- دارالاسلام اور دارالحرب: ص ۲۸

۱۵- المآثر: ج ۵ ش ۳، ص ۹۱

۱۶- حوالۂ بالا: ص ۹۳

محدثِ اعظمی کی علمی غیرت وحمیت

حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ صاحب ایک مرتبہ بمبئی تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ایک غیر مقلد صاحب ملنے آئے اور تراویح کی رکعت پر بحث شروع کردی۔مولانا نے انھیں ٹالا مگر وہ بضد ہوگئے تو ان سے چند سوالات کیے اور وہی سوالات ان کا جواب بن گئے،مولانا نے دریافت فرمایا کہ تراویح سنت ہے یا مستحب یا بدعت؟ غیر مقلد صاحب نے کہا کہ سنت ہے پھر پوچھا کہ سنت کو قائم کرنے والا اہل سنت ہے یا اہل بدعت؟ انھوں نے کہا اہل سنت،حضرت مولانا نے فرمایا کہ آپ کے علامہ نے تراویح کو بدعت عمرؓ پھر کیسے قرار دیا ہے؟ وہ غیر مقلد صاحب سکتے میں رہ گئے اور چپ چاپ چلے گئے،مگر حضرت مولانا کو جلال آ گیا کہ چند حدیثوں کو یاد کر کے یہ جاہل لوگ ائمہ ہدیٰ، خلفاء راشدین کو برا بھلا کہتے ہیں،کوئی حد ہے اس جہل اور نادانی کی!اس کے بعد حضرت مولانا نے قلم اٹھایا اور لکھنے بیٹھ گئے، جب قلم رکھا تو 'رکعاتِ تراویح' مرتب ہو چکی تھی،اور موذن حی علی الصلوۃ پکار رہا تھا، رات کی تاریکی صبح کے لیے جگہ خالی کررہی تھی۔اس واقعہ میں جہاں مولانا کے علم وفضل، برجستگی، واستحضار کی جھلک ہے وہیں اس جذبے کی نشاندہی ہے جس نے مولانا سے عجیب عجیب کارنامے انجام دلائے ہیں۔

حضرت محدّث اعظمیؒ ایک باکمال اور منصف محقق
”تبصرہ بر شہیدِ کربلا اور یزید“ کی روشنی میں

محمد علاء الدین ندوی★

”شہید کربلا اور یزید“ کیوں منظر عام پر آئی؟

پاکستان کے بد نام زمانہ مصنف محمود عباسی کی کتاب ”خلافتِ معاویہ و یزید“ شائع ہوئی تو اس کے ردّعمل میں ہندوپاک میں متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ انہی میں ایک کتاب ”شہید کربلا اور یزید“ بھی تھی، جو دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے قلم گہر بار کی عطاتھی۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا، ہمارے سامنے اس وقت فیصل پبلی کیشنز کا ایڈیشن ہے جو ۲۰۱۰ء کا شائع شدہ ہے۔

تبصرہ کی ضرورت کیوں پڑی؟

مذکورہ بالا کتاب کے پہلے اڈیشن کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے اس پر تبصرہ وتنقید فرمایا تھا، یہ تبصرہ و تنقید شدہ مسودہ حضرت کے کاغذات میں محفوظ تھا اور تقریباً پچپن سال کے بعد ۲۰۱۵ء میں زیورطبع سے آراستہ ہوا، اس تصنیفِ انیق اور متوازن و معتدل تبصرہ کی تلخیص ۲۰۱۱ء میں ”حیات ابوالمآثر“ جو حضرت مولانا اعظمیؒ کی مفصل سوانح حیات ہے میں شائع ہوئی، ”حیات ابوالمآثر“ راقم کو بغرض تبصرہ بھیجی گئی، جس کے ذمہ ”ماہنامہ بانگ حراء“ کی ادارت تھی، نومبر ۲۰۱۱ء کے شمارے میں جب راقم کا تبصرہ شائع ہوا تو محدث جلیلؒ کے اس قیمتی اور علمی تبصرے بر ”شہید کربلا و یزید“ کے اب تک شائع نہ ہونے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

”حسینؓ و یزید کے معاملے میں برصغیر کے اہلِ سنت کا معاملہ افراط و تفریط سے مبرا نہیں ہے، تاہم علامہ اعظمیؒ کا رسالہ فکری اعتدال وتوازن میں قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔ تبصرہ نگار کو حیرت ہے کہ اس قدر مفید اور رہنما رسالے کو زیورطبع سے اب تک کیوں نہیں آراستہ کیا گیا، جبکہ اس کے منظر عام پر آنے سے خود اپنوں کی بہت ساری غلط فہمیاں دور ہوسکتی ہیں“

(تبصرہ بر ”شہید کربلا و یزید“ ص ۸)

محمود عباسی کی کتاب پہ تو متعدد اہل علم وارباب قلم نے خامہ فرسائی کی ہے، انہی میں حضرت قاری طیب صاحبؒ نے بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں، تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت محدث جلیلؒ نے اپنے تبصرے کے لئے حضرت قاری طیب صاحبؒ ہی کی کتاب کا انتخاب کیوں فرمایا؟ اور اس کیوں کا جواب، وہ دعوی ہے جو حضرت قاری صاحب کی ذاتی رائے کے متعلق کیا گیا ہے؛ یہ دعوی حضرت مولانا سالم صاحبؒ نے کتاب کے پیش لفظ میں کیا ہے، فرماتے ہیں۔

”یہ کتاب ”جماعت دارالعلوم دیوبند“ کے متفقہ مسلکِ حق کی ترجمان ہے......پیش نظر کتاب ”شہید کربلا و یزید“ (میں یزید) کی تردید اور موقفِ امام حسین رضی اللہ عنہ کی تائید میں علمی، فکری، تحقیقی اور مسلکی لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت سے پیش کی جارہی ہے۔“ (شہید کربلا و یزید ص:۵)

مبصر جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے اس دعوی کو تسلیم نہیں کیا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”امید تھی کہ مہتمم صاحب کا قلم اس مسئلہ کو پورے طور سے سلجھادے گا، لیکن کتاب پڑھ کر بہت مایوسی ہوئی اور خلاف امید آپ کے قلم نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا، مسئلہ کو الجھانے کے علاوہ مہتمم صاحب نے متعدد ایسے نظریے پیش کئے اور ایسے انداز میں پیش کئے کہ گویا وہ بالکل مسلم الثبوت اور ناقابل انکار ہیں، جن سے بہت سی غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اس لئے مجبوراً یہ چند سطریں محض غلط فہمیوں کے ازالہ کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ سب سے پہلی بات جو ہم کو بری طرح کھٹکتی ہے، یہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں حضرت حسینؓ کا جو موقف بیان کیا ہے اور یزید کی جو پوزیشن دکھائی ہے اس کو وہ عقیدہ کا درجہ دے رہے ہیں اور اس طرح یہ باور کرا رہے ہیں کہ اس کے خلاف جو بات بھی کوئی کہے وہ اہل سنت کے عقائد کے خلاف ہے، مہتمم صاحب کا یہ نظریہ سخت گمراہ کن اور بالکل خلاف تحقیق ہے۔“ (تبصرہ بر ”شہید کربلا و یزید“ ص ۱۱-۱۲)

شروع ہی میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت حسینؓ کی بابت حضرت محدث جلیلؒ اہل سنت کے عقائد ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں:

”اتنی بات تو طے ہے کہ حضرت حسینؓ کو دوسرے صحابہ اور اہل بیت کی طرح واجب الاحترام سمجھنا، ان سے محبت رکھنے کو موجب سعادت یقین کرنا،

★ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ان کے حق میں بدگوئی اوران کی اہانت وتحقیر کو ناجائز قرار دینا اوران کو ہراس فضیلت و بزرگی کا مستحق سمجھنا جو صحیح احادیث میں وارد ہوئی ہے عقائد اہل سنت میں داخل ہے، لیکن غلط فہمی اور خطائے اجتہادی کو ان کے حق میں محال سمجھنا ہرگز عقائد اہل سنت میں داخل نہیں ہے، چنانچہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے ایک مکتوب میں اس کی تصریح فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

''حضرت حسینؓ اور دوسرے ائمہٴ اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین اہل سنت کے نزدیک دوسرے ائمہ مجتہدین کی طرح امام اور مجتہد ہیں جن سے خطائے اجتہادی ممکن ہے، ہمارا عقیدہ شیعوں کی طرح یہ نہیں ہے کہ امام سے غلطی اور خطا ممتنع اور محال ہو (تذکرہ ماہ اکتوبر ۱۹۵۹ء،ص:۱۵)''

(تبصرہ بر''شہید کربلا ویزید''ص:۱۲)

زیرنظر مقالے میں راقم نے حضرت محدث جلیل کے جامع تبصرے سے دو مسئلوں کو عنوان بنا کر اہل سنت کے معتدل رویہ کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے، اگرچہ ضمناً دوسری باتیں بھی آ گئی ہیں:

اول: حضرت حسینؓ کا خروج کس مقصد کے لئے تھا؟

دوم: کیا یزید فاسق اور مستحق لعنت تھا؟

حضرت حسینؓ کا خروج کس مقصد کے لئے تھا؟

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت حسینؓ کا خروج اقتدار کی ہوس میں، یا طلب خلافت کے لئے نہیں تھا، بلکہ ظلم واستبداد کو ختم کرنے کے لئے تھا۔ حضرت محدث جلیلؒ حضرت مہتمم صاحبؒ کے اس خیال کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مہتمم صاحب نے بخیال خویش یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت حسینؓ نے یزید کی حکومت سے جوٹکر لی تھی، اقتدار کے ہوس میں نہیں لی تھی بلکہ یزید کے ظلم واستبداد اور شروفساد کو نیست و نابود کرنے کے لئے انہوں نے سردھڑ کی بازی لگائی تھی۔'' (ایضاً ص:۱۳)

حضرت مہتمم صاحبؒ کی اصل عبارت ملاحظ ہو:

''حقیقت یہ ہے کہ حضرت ممدوحؓ کا یزید اور یزیدوں کے مقابلے پر کھڑا ہونا نہ طلب خلافت کے لئے تھا، نہ حصول جاہ واقتدار کے لئے، بلکہ مظلوموں کو ظالموں کے پنجوں سے رہائی دلانے کے لئے تھا''

(شہید کربلا ویزید ص:۷۳)

قاری طیب صاحبؒ نے فتاوی عزیزی سے شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کا ایک فتوی بھی نقل کیا ہے:

''امام حسینؓ کا یزید کے خلاف کھڑا ہونا دعویٔ خلافت راشدہ کی بنا پر نہ تھا، جو تیس سال گزرنے پر ختم ہو چکی تھی، بلکہ رعایا کو ایک ظالم (یزید) کے ہاتھ سے چھڑانے کی بنا پر تھا اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی اعانت واجبات (دین) میں سے ہے'' (فتاوی عزیزی ۱/۲۱۔ ایضاً ص:۷۳)

مقالہ نگار کہتا ہے کہ یہ فتوی ان روایات کے خلاف جاتا ہے جنھیں محدث جلیلؒ نے اپنی کتابوں میں نقل فرمایا ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''حضرت حسینؓ کا خروج یزید کے مظالم کے دفعیہ کے لئے تھا خود اس کے رفع کرنے کے لئے نہ تھا'' (ایضاً ص:۸۳)

ایک جگہ فرماتے ہیں:

''ظاہر ہے قلبی تطہیر کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ قلب دنیوی رذائل، حب جاہ ومال اور ہوسِ اقتدار و ریاست سے بری ہو جائے اور آدمی عبد الدینار، عبدالدرہم اور عبدالخمیصہ نہ رہے، اس لئے حضرت حسینؓ صحابی ہونے کے علاوہ اہل بیت میں سے ہونے کی وجہ سے بھی بلاشبہ ان کا ان رذائل سے قلب (کا) پاک اور بری ماناجانا بطور عقیدہ کے ضروری ہے'' (ایضاً ص:۶۰)

مذکورہ بالا عبارتوں کے تناظر میں محدث جلیلؒ فرماتے ہیں:

''مہتمم صاحب کا یہ دعوی اگر صرف تاریخی تحقیق کی حد تک ہوتا تو ہم کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن اس کو عقیدہ کا درجہ دینے کا تو مطلب یہ ہے کہ اس کے خلاف جو کہتا ہے یا لکھتا ہے، وہ سنی نہیں ہے اور مسلکِ اہلِ سنت کی وہ مخالفت کرتا ہے، بس اس چیز سے ہم کو اختلاف اور سخت اختلاف ہے۔ ہوس اقتدار وغیرہ تو مہتمم صاحب کے خطیبانہ وانشا پردازانہ الفاظ ہیں، ان کے بجائے طلبِ امارت، یا طلبِ خلافت کے الفاظ رکھ کر ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اکابر اہل سنت میں کتنے اہل علم ہیں جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کا مقصد اسی کو قرار دیا ہے۔'' (تبصرہ بر شہید کربلا ویزید ص:۱۳-۱۴)

اس دعوی کی تردید میں محدث جلیل نے متعدد روایت نقل کی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ اگر حضرت حسینؓ طلب خلافت کے لئے روانہ ہوئے تھے تو ایسا کرنا اور کہنا عقائد اہل سنت کے خلاف نہیں تھا اور اگر تھا تو کیا مندرجہ ذیل حضرات صحابہؓ نے عقائد اہل سنت کے خلاف مشورہ دے ڈالا، یا اقدام کیا؟

اولاً: اس سلسلے میں ابن کثیر (۸/ ۱۶۳) کے حوالے سے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے، جس میں انہوں نے حضرت حسینؓ کو جب انہوں نے کوفہ تشریف لے جانے کا ارادہ کیا تو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: آپ اس کو نہ پائیں گے یعنی دنیا کو (**لا تنالها يعني الدنيا**) ایک دوسری روایت (ابن کثیر: ۸/ ۱۶۰) میں حضرت حسینؓ کے خروج کو طلب ملک کے لئے سمجھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاشمی حکومت کا زمانہ انقضائے دنیا

کے قریب ہوگا، روایت کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

عجّل حسینؓ قدرہ، واللہ لو أدرکتہ ما ترکتہ یخرج إلا أن یغلبنی۔

حضرت حسینؓ نے امر مقدر میں جلدی کی، بخدا اگر میں ان کو پاتا تو نکلنے نہ دیتا الا یہ کہ وہ مجھ پر غالب آجاتے۔ (ملاحظہ ہو تبصرہ، ص: ۱۴-۱۵)

ثانیاً: حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت حسینؓ سے فرمایا تھا: مجھے بتائیے کہ اہل کوفہ نے اپنے حاکم کو ختم کر دیا ہے؟ اور اپنے دشمنوں کو ملک بدر کر دیا؟ اور اپنے شہروں کو قابو میں کر لیا ہے؟ اس کے بعد آپ کو بلاتے ہیں تو ضرور جائیے اور اگر ان کا حاکم زندہ، ان کے سر پر سوار اور ان کو دبائے ہوئے ہے اور اس کے عمال محاصل وصول کر رہے ہیں، تو یہ کوفی صرف کشت وخون کے لئے آپ کو دعوت دے رہے ہیں۔ (ابن کثیر ۸/ ۱۵۹)

ثالثاً: حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ایک عنوان اس طرح قائم کیا ہے:

"قصۃ الحسین بن علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہما، وسبب خروجہ بأھلہ من مکۃ إلی العراق فی طلب الإمارۃ، وکیفیۃ مقتلہ رضی اللہ عنہ حضرت حسین بن علیؓ کا قصہ اور امارت کی طلب میں اہل وعیال کو ساتھ لے کر مکہ سے عراق جانے کے سبب اور ان کی شہادت کی کیفیت کا بیان۔

"اس میں ابن کثیر نے صاف لفظوں میں تصریح کر دی ہے کہ حضرت حسینؓ کا خروج طلب امارت کے لئے تھا۔" (تبصرہ، ص: ۱۷)

رابعاً: اہل کوفہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تابڑ توڑ اور بے شمار خطوط لکھے، ان خطوط کا لب لباب یہ تھا کہ

"ہم نے یزید کی بیعت نہیں کی ہے، ہمارا کوئی امام نہیں ہے، والئ کوفہ کے پیچھے ہم جمعہ وعیدین میں شریک نہیں ہوتے، آپ کی تشریف آوری کی خبر مل جائے تو ہم والئ کوفہ کو یہاں سے نکال دیں، ہم آپ کے منتظر ہیں، آپ جلد تشریف لائیے تا کہ آپ کے ہاتھ پر ہم بیعت کریں۔ (دیکھیے ابن کثیر ۸/ ۱۵۔ ۸/ ۱۵۲۔ ۸/ ۱۶۱-۱۶۵۔ اور الصواعق المحرقہ ۱ور الاصابہ ۱/ ۳۳۳۔ تعجیل المنفعۃ ص: ۴۵۳۔ تہذیب التہذیب ۲/ ۳۳۹۔ وابن الأثیر ۳/ ۲۱۶" تبصرہ، ص: ۱۷)

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کا مقصد یزیدیوں کے جور واستبداد اور ان کے ذاتیاتی فسق وفجور سے بڑھ کر ان کے اجتماعی فسق وفجور کو مٹانے کے لئے جان کی بازی لگانے کا تھا تو تاریخ اس کے ذکر سے خاموش کیوں ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس عظیم مقصد کے لئے کوفہ جانے کا خیال ازخود حضرت حسینؓ کے دل میں آیا؟ یا اہل کوفہ کے پیہم اصرار سے آپ نے وہاں جانے کا ارادہ کیا؟ اور اس مقصد کے لئے پہلے مسلم کو بھیج کر مزید اطمینان کر لیا، اگر کوفیوں نے آپ کو یہ فرض یاد دلایا تو حیرت کا مقام ہے کہ یک دینی فریضہ کا خیال ازخود حضرت حسینؓ کے دل میں تو نہ آیا بلکہ اہل کوفہ کو اس جانب توجہ دلانی پڑی؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ ۱۵/ رجب ۶۰ھ میں یزید کرسی اقتدار پر بیٹھتا ہے، اواخر رجب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ تشریف لے جاتے ہیں، اواخر ذی قعدہ میں آپؓ کوفہ کے لئے مع اہل وعیال روانہ ہوجاتے ہیں، ان چار مہینوں میں یزید کی حکومت میں "جبر واستبداد، شروفساد اور اجتماعی فسق" کے کیا کیا واقعات رونما ہوئے، ظالموں نے مظلوموں پر کیا کیا ظلم ڈھائے، کہاں کہاں احکام شریعت پامال کئے گئے، دو چار مثالیں ہی دے دی جاتیں تو یزید کو فاسق تسلیم نہ کرنے والوں کی خلش اور تردد دور ہوجاتا، یا کم از کم انہیں اپنے موقف پہ ازسرنو غور وفکر کی توفیق مل جاتی۔

کیا یزید فاسق تھا؟

حضرت قاری طیب صاحبؒ کی کتاب پڑھ کر جو ایک عمومی رجحان قاری کے ذہن پر مرتسم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ یزید پلید ایک فاسق وفاجر شخص تھا، اس کے ہاتھوں دین کی تباہی عمل میں آئی، یہ قابل عزل حکمراں تھا، وہ مستحق لعنت تھا اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ مستحق تکفیر ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان مذکورہ بالا امور کو ثابت کرنے کے لئے حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اس کام کے لئے اپنی نکتہ آفریں اور دقیقہ رس صلاحیت کی خوب جولانی دکھائی۔ ظاہر ہے جب "رجحان" نقطۂ نظر اور عقیدہ کی جگہ لے لے تو آدمی اپنے رجحان کے اثبات کے لئے دور قریب اور کھینچ تان کر دلائل مہیا تو کرے گا ہی۔

ذیل کی سطور میں ہم پہلے حضرت قاری صاحبؒ کی وہ عبارتیں اور اُن کے اپنے فراہم کردہ دلائل نقل کرتے ہیں، جو یزید کے فسق کو ثابت کرنے کے لئے لائی گئی ہیں، اس کے بعد حضرت محدث جلیلؒ کا تبصرہ سامنے لایا جائے گا۔

۱- یزید کے اندر فسق وفجور پیدا ہونی ہی تھی

حضرت قاری صاحبؒ نے یزید کے فسق کے دعوی پہ جو دلائل رقم فرمائے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

سب سے پہلے ابن خلدون کی ایک عبارت نقل فرمائی ہے:

"وما حدث فی یزید ما حدث من الفسق، اختلف الصحابۃ فی شأنہ حینئذ، فمنہم من رأی الخروج علیہ، ونقض البیعۃ من أجل ذلک، کما فعل الحسین وعبد اللہ بن الزبیر ومن تبعہما فی ذلک...... اور جب یزید میں وہ بات پیدا ہوگئی جو پیدا ہونی تھی یعنی فسق وفجور، تو صحابہ اس کے بارے میں مختلف الرائے ہوگئے، بعضوں نے اس کے خلاف کھڑے ہوجانے اور اس

کی بیعت توڑ دینے کو ضروری سمجھا اس فسق کی وجہ سے، جیسا کہ حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن الزبیرؓ اور ان کے پیروؤں نے کیا'' (شہید کربلا اور یزید ص ٦٥)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن خلدون آٹھویں صدی کے مورخ ہیں، انہوں نے اپنے دعوی پر کوئی حوالہ نہیں دیا، آخر کس بنیاد پر ابن خلدون کی بات آنکھ بند کر کے صحیح مان لی جائے، کیا صرف اس لئے کہ وہ عظیم مورخ ہیں۔ آخری جملے ''بعضوں نے اس کے خلاف کھڑے ہونے اور اس کی بیعت توڑ دینے کو ضروری سمجھا اس فسق کی وجہ سے''۔

حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسینؓ تو مکہ میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے تھے، پھر وہ بیعت توڑنے والے کون تھے اور بیعت توڑنے کا یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟ ابن خلدون کی عبارت اس معاملے میں صریح نہیں ہے۔

٢ - یزید کا فسق مسلم تھا

حضرت قاری صاحبؒ فرماتے ہیں: ''اس دور کے تمام لوگوں کے نزدیک یزید کا فسق مسلم تھا جس کے مقابلے کے لئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنی قلبی عزیمت کی بنا پر کھڑے ہو گئے۔'' (شہید کربلا، ص ٦٦)

اپنے اس دعوی کی تائید میں ابن خلدون ہی کی عبارت نقل کی ہے، جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

''فإنه لما ظهر فسق يزيد عند الكافة من أهل عصره، بعثت شيعة أهل البيت بالكوفة الحسين أن يأتيهم فيقوموا بأمره، فرأى الحسين أن الخروج على يزيد متعين من أجل فسقه۔

تو جب یزید کا فسق و فجور اس کے دور کے سب لوگوں کے نزدیک نمایاں ہو گیا تو کوفہ کی اہل بیت کی جماعت (شيعة أهل البيت) نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اہل کوفہ کے پاس تشریف لے آئیں، تو وہ سب ان کی اطاعت میں کھڑے ہو جائیں گے، اس وقت حضرت حسینؓ نے جان لیا کہ اب یزید کے خلاف کھڑے ہو جانا متعین ہے، اس کے فسق کی وجہ سے۔'' (شہید کربلا، ص ٦٦-٦٧)

اسی اقتباس میں ابن خلدون نے یہ بھی ذکر کیا ہے: ''جہاں تک اہلیت کا تعلق ہے تو وہ بلا شبہ اُن میں تھی، جیسا کہ انہوں نے گمان کیا، لیکن جہاں تک شوکت اور قوت کا تعلق ہے تو اپنے اندر اس کے سمجھنے میں غلطی کھائی۔'' (ایضاً ص: ٦٧)

یہاں بادی النظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ١٥ / رجب ٦٠ھ کو یزید کرسی پر بیٹھتا ہے، ٢٨ / رجب کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں، کیا ١٣ ہی دن میں یزید کا فسق سب کے نزدیک کھل کر سامنے آ گیا؟ آیا اس کا فسق اور اس کا فاسق ہونا پہلے سے معروف تھا، اگر پہلے سے فاسق تھا تو ٦٠ صحابہ کرام نے اس کے ہاتھ پر بیعت کیسے اور کیوں کر لیا تھا؟

٣- یزید کا فسق متفق علیہ تھا

آگے حضرت قاری صاحبؒ نے فرمایا: ''یزید کے فسق کے بارے میں صحابہ کی دو رائیں نہ تھیں، بلکہ اس کے خلاف کھڑے ہونے میں دو رائیں تھیں اور وہ بھی ان کی اہلیت و نااہلیت کے معیار سے نہیں، جبکہ فسق مسلمہ کل تھا۔'' (شہید کربلا ص: ٦٧)

آگے تحریر فرماتے ہیں: ''اسی سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یزید کا فسق کھلنے کے بعد صحابہ میں نقض بیعت کا مسئلہ بطور اصول شرعی کے شرعی حیثیت سے سامنے آیا۔'' (ایضاً ص: ٦٧)

آگے فرماتے ہیں:

''بہر حال مخالفینِ یزید تو اُسے فاسق جانتے ہی تھے، مبائعین یزید بھی اسے فاسق ہی سمجھتے تھے، اس لئے اُس کا فسق متفق علیہ تھا، جسے ابن خلدون نے عند الکافۃ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔'' (ایضاً ص: ٦٩)

٤- یزید کا مستحق عزل ہونا بھی متفق علیہ تھا

آگے فرماتے ہیں: ''اب اگر یزید عموم فسق کے ساتھ فاسق تھا اور بلا شبہ تھا جیسا کی احادیث کے اشارات، صحابہ اور علماء مابعد محدثین، فقہاء، متکلمین اور مورخین کی تصریحات سے ثابت ہو چکا ہے، تو بلا شبہ وہ عرض کردہ فقہی اصول کی روشنی میں مستحق عزل بھی ہو چکا تھا اور اگر اس کا فسق متفق علیہ تھا تو دوسرے لفظوں میں اس کا استحقاق عزل بھی متفق علیہ تھا، گو اس پر خروج کرنے میں اثارتِ فتنہ کے معیار سے رائیں دو ہو گئی تھیں۔'' (ایضاً ص ٧٤-٧٥)

آگے رقم طراز ہیں: ''اندریں صورت جب کہ ایک غیر عادل یا فاسق امیر مسلط تھا، جس کا فسق و فجور انفرادیت کی حد سے گزر کر جماعتی رنگ اختیار کر چکا تھا حتی کہ امیر فاسق کے نوخیز جو شیلے اور سفیہ العقل عمال بر سر اقتدار آ کر شیوخ و اکابر کی حق تلفی اور توہین و تحقیر پر اترے ہوئے تھے اور اس طرح یہ امیر فاسق مستحق عزل ہو چکا تھا۔'' (ایضاً ص: ٧٥-٧٦)

٥ - یزید کا فسق اجتماعی رنگ کا تھا

اس فاسق کے سمع و طاعت کے سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں: جہاں تک فسق کے ہوتے ہوئے سمع و طاعت کا حکم ہے، اس سے ذاتی اور انفرادی فسق مراد ہے، جس کا اثر متعدی ہو کر حکام و رعایا تک نہ پہنچے۔'' (ایضاً ص: ٧٨)

یزید کا فسق حضرت قاری صاحبؒ کی نظر میں انفرادی اور ذاتی نوعیت کا نہ تھا، بلکہ اجتماعی حیثیت کا تھا جس کا اثر متعدی تھا، فرماتے ہیں:

''حدیث کے مدلول کا حاصل یہ ہوا کہ امام فسق و فجور میں غرق بھی ہو جائے، مگر یہ فسق ذاتیاتی قسم کا ہو تو اس پر خروج جائز نہیں، لیکن جب وہ

جماعتی رنگ کا ہوجائے، جس میں کھلم کھلا حق کا معارضہ ہوا ور کفار کی طرح امیر اپنے اقتدار کی پیچ میں آکر منکرات میں کھیل کھیلے، تو وہ مستحق عزل ہوجائے گا اوراس پر خروج جائز ہوجائے گا۔'' (ایضاً ص: ۸۱-۸۲)

(حدیث سے مراد حضرت عبادہ بن صامت سے مروی روایت ہے جسے ص: ۸۰ میں ذکر کیا گیا ہے اور جس کا آخری ٹکڑا ہے: ولاننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحا، عندکم من اللہ برھان)

یزید کو فاسق ثابت کرنے کی دھن میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رجحان کا تدریجی ارتقا آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں، ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں: ''جبکہ بنیادی طور پر تاریخی شہادتوں سے یہ متعین ہوگیا کہ اس زمانے کے تمام اکابر اتقیا خواہ یزید سے بیعت کئے ہوئے ہوں یا نہ کئے ہوئے ہوں سب اُسے فاسق اور بالفاظ دیگر مستحق عزل جانتے تھے۔'' (ایضاً ص: ۸۸-۸۹)

''لیکن جس فسق نے اسے مبغوض خلائق بنادیا، وہ اس کا اجتماعی رنگ کا فسق تھا، جس نے امت میں فتور پیدا کردیا، ذاتی فسق سے تو محض ذات تباہ ہوتی ہے لیکن اجتماعی فسق سے امت اور اجتماعیت تباہ ہوکر رہ جاتی ہے، اس لئے علماء اور فقہاء نے زیادہ تر یزید کے اسی فسق کا ذکر کیا ہے۔'' (ایضاً ص: ۹۶-۹۷)

حضرت محدث جلیل کیا فرماتے ہیں؟

مذکورہ بالا سطور میں ہم نے تفصیل کے ساتھ حضرت قاری صاحبؒ کے وہ فرمودات نقل کردیئے جو قائل کی نگاہ میں یزید کے فاسق ہونے کے لئے کافی مضبوط دلائل ہیں۔ اب ہم محدث جلیلؒ کی تحریریں پیش کرتے ہیں۔

یزید کا فسق کب سے ظاہر ہوا؟

''یزید کی خلافت کی بیعت جب لی جانے لگی تو سب نے بیعت کرلی صرف چار حضرات نے بیعت نہیں کی، مگر بیعت نہ کرنے کا یہ سبب کسی نے بیان نہیں کیا کہ یزید فاسق وفاجر یا شرابی کبابی ہے، بلکہ کسی نے یہ کہا کہ یہ تو قیصر وکسریٰ کی سنت ہے، کسی نے کہا: یزید سے زیادہ مستحق ہم ہیں، کسی نے کہا: ایک وقت میں دو خلیفہ کے لئے بیعت نہیں ہوسکتی (یعنی حضرت معاویہ ؓ کی موجوگی میں یزید کے لئے) کسی نے کہا: خلفائے راشدین میں سے کسی نے اپنے بیٹے کو جانشین نہیں بنایا۔'' (تفصیلات ابن کثیر ۸/ ۸۰۔ تاریخ الخلفاء ص ۱۳۳ اور تاریخ کی دوسری کتابوں میں دیکھئے: (تبصرہ بر'' شہید کربلا و یزید'' ص: ۳۵)

آگے فرماتے ہیں: ''حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں جس وقت یزید کے لئے بیعت لی تھی، اس وقت ایک متنفس نے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ فاسق وفاجر، یا نااہل ہے اور خود حضرت مہتمم صاحب کی تحریر کے بموجب یہی لازم وضروری ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کی وفات تک فاسق وفاجر نہ ہو۔

مہتمم صاحب کے جد امجد حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ نے تو اس کی تصریح کردی ہے، فرماتے ہیں: جس وقت حضرت امیر معاویہؓ نے یزید کو اپنا ولی عہد کیا تھا اس کا فسق ظاہر نہ تھا۔ البتہ امیر معاویہ کے انتقال کے بعد یزید نے ہاتھ پیر پھیلائے''۔ تذکرہ ۵/ ۲۹ (تبصرہ بر شہید کربلا و یزید ص: ۳۵-۳۶)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت معاویہؓ کی زندگی میں یزید کا فسق و فجور ظاہر نہیں ہوا تھا، اس کا ناقابل تردید ثبوت جنگ قسطنطنیہ میں اس کی سپہ سالاری اور اس کی ماتحتی میں صحابہ کی ایک جماعت کا شریک جہاد ہونا، حضرت ابوایوب انصاریؓ کا اس کی فوج میں ہونا اور آپؓ کا یزید کو اپنا وصی بنانا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت حسینؓ کا یزید کی ماتحتی میں شریک جہاد ہونا ہے۔'' (ملاحظہ ہو تبصرہ، ص: ۳۶)

مذکورہ بالا باتیں ابن کثیر وغیرہ کے حوالے سے ذکر کرنے کے بعد محدث جلیلؒ فرماتے ہیں:

''اب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ یزید شراب خوار ہوتا، بے نمازی ہوتا اور دوسرے معاصی میں ملوث ہوتا تو صحابہؓ کی ایک جماعت بلاکراہت ونفرت اس کی ماتحتی قبول کرلیتی؟'' (ایضاً ص: ۳۷)

''الحاصل ۴۱ھ میں حضرت حسنؓ وحضرت معاویہؓ میں صلح ہوجانے کے بعد انیس برس تک صحابہ وتابعین اور اشراف مکہ ومدینہ حضرت معاویہؓ کے پاس آتے جاتے رہے، مگر کسی نے یزید کے فسق وفجور کے باب میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہا (اگر کہا تو تاریخوں سے کوئی ایک حوالہ پیش کیا جائے۔ (ایضاً ص: ۳۷)

۱۵ رجب ۶۰ھ کو یزید کرسی خلافت پر بیٹھ جاتا ہے، ۲۸ رجب کو حضرت حسینؓ مکہ کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں، عراقیوں کو حضرت حسینؓ کے مکہ میں قیام کا علم ہوتا ہے، تو اپنے یہاں آنے کی دعوت دینے کے لئے تابڑ توڑ خطوط لکھنا شروع کردیتے ہیں، تو کیا یہ مان لیا جائے کہ ۱۲-۱۳ دن میں یزید فاسق وفاجر ہوگیا؟

حضرت محدث اعظمیؒ فرماتے ہیں:

''الحاصل حضرت حسینؓ کی مدینہ سے روانگی سے لے کر حادثۂ کربلا کے پیش آنے تک تاریخوں میں کوئی ایک شہادت بھی یزید کے فسق وفجور کی نہیں ملتی اور ملنا ممکن بھی نہیں، اس لئے کی جس عہد میمون کی یہ بات ہے، اس وقت تک ملت اسلامیہ کا ضمیر اتنا مردہ نہیں ہوا تھا کہ سب کے سب چپ چاپ ایک فاسق وفاجر اور شرابی کبابی کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔'' (ایضاً ص: ۴۰)

مکہ سے نکل کر کربلا پہنچنے تک چار مواقع ایسے آئے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

جو واپس جانا چاہے، وہ واپس چلا جائے۔ (ابن کثیر ۳/۲۷۸)

یا یہ کہا: لوگو! میں خود نہیں آیا، تمہارے اصرار پیہم پہ آیا ہوں، اگر میرے آنے کو تم پسند نہیں کرتے ہو تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں لوٹ جاتا ہوں۔ (ابن کثیر ۳/۲۸۰)

یا خدا اور اسلام کا واسطہ دے کر فرمایا: مجھے امیر المومنین یزید کے پاس روانہ کر دو کہ میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں (ابن کثیر ۸/۱۷۰)۔ بلکہ یہ بھی تصریح ہے کہ آپ نے یزید کی طرف جانے کے لئے اپنا رخ موڑ بھی دیا فانطلق یسیر نحو یزید بن معاویۃ (ابن کثیر ۸/۱۷۰)۔

اب ان باتوں کو دھیان میں رکھ کر بتائے کہ اگر یزید فاسق ہوتا اور حضرت حسینؓ اس کے فسق و فجور کو مٹانے کے لئے نکلے ہوتے تو یہ مذکورہ باتیں کیوں کہتے؟ چونکہ وہ اپنے کو یزید سے افضل اور اس سے زیادہ اپنے کو مستحق خلافت سمجھتے تھے - یزید تو آپؓ کی جوتیوں کے تسمہ کے برابر بھی نہیں تھا - لہٰذا آپؓ اس کو حق دار خلافت نہیں سمجھتے تھے...... لیکن راستہ میں مسلم کی شہادت کی خبر سن کر آپ کا یقین بدل گیا، آپؓ پر کوفیوں کا فریب کھل گیا اور علی وجہ البصیرۃ معلوم کر لیا کہ ان حالات میں صحیح امارت کا قیام ناممکن ہے، اس لئے واپسی کی سوچنے لگے'' (تبصرہ بر شہید کربلا و یزید، ص: ۴۱-۴۲)

یزید کے فسق و فجور کے بارے میں علمائے اہل سنت کا موقف

یزید مسلمان تھا

حضرت محدث جلیل رقم طراز ہیں:

''یہاں پہنچ کر ہم ایک بار پھر اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد ہرگز ہرگز یزید کو ولی، یا خلیفۂ راشد، یا امام و مقتدیٰ ثابت کرنا نہیں ہے، نہ ہم اس کو زمرۂ ابرار و اتقیائے مسلمین میں شمار کرنے کو کہتے ہیں، نہ شمار کرتے ہیں اور نہ ہم اس کے ساتھ ایسی حسن عقیدت رکھنے کی دعوت دیتے ہیں، جو عقیدت خلفائے راشدین، ائمۂ دین، بزرگان اسلام، صالحین و متقین، یا متشرع و عادل بادشاہوں کے ساتھ رکھی جاتی ہے۔

ہمارا مقصد تو صرف اتنا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ سنی ہونے اور مسلک اہل حق پر اپنے کو قائم ثابت کرنے کے لئے یزید کے فسق و فجور کا اعتقاد رکھنا ضروری نہیں ہے، نہ یہ بات عقائد اہل سنت میں داخل ہے۔

یزید کے فسق پر چشم دید گواہی مفقود ہے

نیز یہ کہ یزید جمہور اہل سنت کی تصریح کے بموجب مسلمان تھا اور کسی مسلمان کو فسق و فجور کے ساتھ متصف ماننے اور ثابت کرنے کے لئے شرعی اصول سے ضروری ہے کہ اس کے فسق و فجور کی چشم دید شہادتیں موجود ہوں۔'' (تبصرہ بر ''شہید'' ص: ۴۹-۵۰)

''واقعہ تو یہ ہے کہ آنکھ سے دیکھ کر کہنے والا ایک شخص بھی نہیں ہے اور دعویٰ کر دیا جاتا ہے تواتر کا، حالانکہ اس صورت سے تواتر تو در کنار شرعی اصول سے بداعمالیوں کا مطلقاً ثبوت نہیں ہوتا، ایسی صورت میں یزید پر شرعی اصول سے فاسق ہونے کا حکم کیسے لگے گا'' (ایضاً ص: ۵۱)

''ہر افواہ جو پھیل جائے اس کو متواتر کہنا تواتر کی سخت توہین ہے، تواتر کے لئے جہاں اور شرطیں ہیں اس کی ایک شرط یہ ہے کہ اگر خبر کا تعلق دیکھنے کی چیز سے ہو تو ضروری ہے کہ اس کا مستند انتہا مشاہدہ ہو، ورنہ وہ متواتر نہیں ہو سکتی'' (ایضاً ص: ۵۰)

محرم ۶۱ھ تک یزید کے فسق کا ذکر نہیں ملتا

''محرم ۶۱ھ تک یزید کے فسق و فجور کی کوئی شکایت تاریخوں میں نہیں ملتی، پہلی مرتبہ ابن الزبیرؓ کے ایک خطبہ میں اس کے فسق و فجور کا ذکر ملتا ہے، لیکن اس میں یزید کے نام کی تصریح نہیں ہے۔ تاریخ میں دوسری مرتبہ یزید کے فسق و فجور کا ذکر اس وقت ملتا ہے جب مدینہ سے شام جانے والا وفد واپس آیا اور یہ کہہ کر کہ یزید شرابی ہے، بدمست رہتا ہے اور بدمستی میں نماز بھی ترک کر دیتا ہے، اس کی بیعت توڑ دی...... موقع پر ابن الاثیر کے الفاظ یہ ہیں: فلما قدم أولئک النفر الوفد المدینۃ قاموا فیھم وأظھروا شتم یزید وعیبہ (ابن الاثیر ۳/۲۰۷) (تبصرہ...... ص: ۴۸)

حضرت محمد ابن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت

لیکن تاریخوں میں جہاں یہ مذکور ہے، وہیں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت محمد ابن الحنفیہ نے نہایت سختی سے اس کی تردید کی...... ان کا وہ ارشاد آج بھی اس معاملہ میں افراط و تفریط سے کام لینے والوں کے لئے سرمایۂ عبرت و ہدایت ہے اس لئے بجنسہٖ پورا نقل کیا جاتا ہے:

ابن کثیر لکھتے ہیں: جب مدینہ والوں کا وفد شام سے واپس آیا تو عبداللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی ابن الحنفیہ کے پاس آئے اور ان کو بھی خلع بیعت پر آمادہ کرنا چاہا، تو انہوں نے انکار کر دیا، پھر ان کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی:

عبداللہ بن مطیع: یزید شراب پیتا ہے، نماز ترک کرتا ہے اور کتاب اللہ کے حکم سے تجاوز کرتا ہے۔

ابن الحنفیہ: میں نے تو وہ باتیں نہیں دیکھیں جو تم ذکر کرتے ہو، میں اس کے پاس گیا ہوں، اور اس کے پاس ٹھہرا ہوں، میں نے تو اس کو برابر پابند نماز اور بھلائی کا طالب اور اس کا قصد کرنے والا دیکھا، وہ احکام شرع کو پوچھتا رہتا ہے اور میں نے اس کو سنت کا التزام کرنے والا دیکھا ہے۔

عبداللہ بن مطیع: وہ سب آپ کو دکھانے کے لئے بناوٹ سے کرتا تھا۔
ابن الحنفیہ: مجھ سے اس کو کیا خوف تھا، یا کیا امید تھی کہ وہ میرے لئے خشوع ظاہر کرے گا؟ اچھا تم جو اس کی شراب خواری کا ذکر کرتے ہو تو کیا اس نے تم کو اس پر مطلع کیا ہے؟ اگر مطلع کیا ہے تو تم اس کے شریک (بزم وحریف بادہ) ہو اور اگر اس نے تم کو مطلع نہیں کیا ہے، تو تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ جس بات کا تم کو علم نہیں ہے اس کی شہادت دو۔
عبد اللہ بن مطیع: ہمارے نزدیک تو وہ حق ہے، اگرچہ ہم نے دیکھا نہیں ہے۔
ابن الحنفیہ: اللہ نے شہادت دینے والوں کو اس کی اجازت نہیں دی ہے، بلکہ انکار کیا ہے، وہ فرماتا ہے: ﴿الا من شهد بالحق وهم يعلمون﴾ (مگر جو حق بات کی گواہی دے دراں حالیکہ وہ اس کا تحقیقی علم بھی رکھتا ہو) اور میں تمہارے اس کام سے بیزار ہوں۔
بس یہ ہے کل ثبوت یزید کے فسق و فجور کا اور یہ ہے اس ثبوت پر امام ربانی حضرت محمد ابن الحنفیہ کی شرعی جرح کا اور یہ ہے ان کا قرآنی فتوی یزید کو فاسق وفاجر کہنے کے جواز وعدم جواز کے باب میں۔
کیا حضرت حکیم الاسلام اس پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے؟"
(تبصرہ بر شہید کربلا، ص: ۴۸-۴۹)

اسی کے مماثل ایک دوسرا واقعہ

شبّاک بن عائذ القبسی کہتے ہیں عمرو الحزور الجریری نے نہیک بن عمرو قیسی کے واسطے سے ہمیں یہ خبر دی ہے: ہم یزید بن معاویہ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ رے شہر میں اس کے مکان پر بطور سائبان پردہ لگا ہوا ہے، پھر ایک منادی نے آواز لگائی کہ اہل بصرہ کا وفد کہاں ہے؟ امیر المومنین نے تمہارے لئے اتنے اور اتنے عطیے کا حکم دیا ہے۔ اس طرح تین مرتبہ منادی کی گئی، ہم نے آپس میں کہا کہ ہمارا خیال ہے کہ وہ بیٹھا پی رہا ہے، اتنے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس نے پردے کے کنارے کو ہٹا دیا تو ہم نے دیکھا کہ وہ بیٹھا قرآن پڑھ رہا ہے۔" (التاریخ الکبیر للبخاری ۴/۱۲۷۰)

امام غزالیؒ اور قاضی ابوبکرؒ کی رائے

"امام غزالی فرماتے ہیں: لا يجوز نسبة المسلم الى كبيرة من غير تحقيق (شرح فقہ اکبر) کسی مسلمان کو کسی گناہ کبیرہ کی طرف بغیر تحقیق منسوب کرنا جائز نہیں۔" (تبصرہ بر شہید کربلا، ص: ۵۱)
قاضی ابوبکر ابن العربی نے العواصم من القواصم (ص: ۲۲۳) میں لکھا ہے: اگر کہئے شروط خلافت میں سے علم اور عدالت بھی ہے تو ہم کہیں گے کہ ہم کس دلیل سے یہ سمجھیں کہ وہ (یزید) عالم یا عادل نہیں تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ تینوں حضرات فضلاء (عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، ابن الزبیرؓ اور ابن عمرؓ) جنہوں نے حضرت معاویہ کو یزید کی بیعت نہ لینے کا مشورہ دیا تھا یزید کی جہالت اور فسق کا ضرور ذکر کرتے، ان لوگوں نے تو صرف یہ اعتراض کیا کہ یہ تحکم وخود رائی ہے، خلیفہ کا انتخاب شوری سے ہونا چاہیے۔" (ایضاً ص: ۵۲)
اس کے بعد ص: ۲۷۷ میں فرماتے ہیں: "اگر کہا جائے کہ یزید شرابی تھا تو ہم کہیں گے کہ دو عینی شاہدوں کی شہادت کے بغیر ایسا کہنا حلال نہیں ہے، پس بتاؤ کہ کس نے اس کے خلاف یہ چشم دید گواہی دی ہے؟ اس کے بر خلاف ایک عدل (یعنی عادل) نے اس اس کی عدالت کی شہادت البتہ دی ہے" (مراد ہیں امام لیث۔ ایضاً ص: ۵۲)

یزید کی تکفیر کا مسئلہ

فسق کے اثبات کے بعد حضرت قاری صاحبؒ نے یزید کی تکفیر کے مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے، فرماتے ہیں:
"فسق تو فسق بعض ائمہ کے یہاں تو یزید کی تکفیر تک کا مسئلہ بھی زیر بحث آ گیا، جن کو اس کے قلبی دواعی اور اندرونی جذبات کھلنے پر ان کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس پر کفر تک کا حکم (لگا) دیا، گو یہ جمہور کا مسلک نہیں، لیکن اس سے کم از کم اس کے فسق کی تصدیق اور تاکید تو ضرور ہو جاتی ہے" (شہید کربلا و یزید، ص: ۱۰۸-۱۰۹)
اس مسئلہ کی تائید میں شرح فقہ اکبر سے محقق ابن ہمام کا بیان نقل کیا ہے، طوالت سے بچنے کے لئے ہم صرف اس کا اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں:
"ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یزید کی تکفیر میں اختلاف کیا گیا ہے، بعض نے اسے کافر کہا، کیونکہ اس سے وہ چیزیں مروی ہوئیں جو اس کے کفر پر دلالت کرتی ہیں کہ اس نے شراب کو حلال سمجھا اور قتل حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کے قتل کے بعد اس نے منہ سے نکالا کہ میں نے (حسین وغیرہ سے) بدلہ لے لیا ہے، جو انہوں نے میرے بزرگوں اور رئیسوں کے ساتھ بدر میں کیا تھا، یا ایسی ہی اور باتیں، شاید یہی وجہ ہے امام احمد کے اسے کافر کہنے کی کہ اس کے نزدیک یزید کی اس تقریر کی نقل ثابت ہوئی ہو۔" (ایضاً ص: ۱۰۹)
اس بیان کی وضاحتی نوٹ میں حضرت قاری صاحبؒ فرماتے ہیں: "اس سے واضح ہے کہ اختلاف اگر ہے تو یزید کی تکفیر میں ہے، تفسیق میں نہیں اور امام احمد بن حنبل جبکہ یزید کے کفر تک کے بھی قائل ہو گئے، فسق کے تو بطریق اولی قائل تسلیم کئے جائیں گے، اس لئے یزید کے فسق پر اتفاق علماء کے ساتھ ایک امام مجتہد کی مہر بھی لگ جاتی ہے (ایضاً ص: ۱۰۹)۔
ایک بات یہاں نوٹ کرنے کی ہے، اردو متن میں امام احمد بن حنبل

کے حوالے سے جو بات کہی گئی ہے، اس کا ترجمہ تو بالکل صحیح ہے، (" ولعله وجه ما قال الإمام أحمد بتكفيره لما ثبت عنده نقل تقريره ")۔ لیکن جو بات کمزور اسلوب میں کہی گئی ہے، وہ وضاحتی نوٹ میں تاکید کے پیرایہ میں بدل جاتی ہے: ''جبکہ یزید کے کفر تک کے قائل ہوگئے'' اور ''ایک امام مجتہد کی مہر بھی لگ جاتی ہے''۔

حضرت مہتمم صاحب نے یہ بھی رقم فرمایا:

''پس جیسے کفر سرزد ہوجانے پر کوئی نیکی کارآمد نہیں رہتی...... ایسے ہی فسق کی بعض حرکتیں یا بے ادبی اور گستاخی کی بعض نوعیں سرزد ہوجانے پر نہ کوئی نیکی بارآور رہتی ہے، نہ زبانیں اس کا تکلم گوارہ کرتی ہیں اور نہ مقبولیت عنداللہ باقی رہتی ہے'' (ایضاً ص: ۱۱۶)

''اس کے ایک ہی فسق (قتل حسینؓ) نے اس کی ساری خوبیوں کو خاک میں ملا دیا اور کوئی بھی اس جرم کے بعد اس کی کسی بھی بات سننے کا روادار نہ رہا'' (ایضاً ص: ۱۱۶)

پھر آگے حضرت قاری صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''بہر حال یزید کا فسق و فجور اور بری شہرت شروع ہی سے اس درجہ پر تھی کہ اگر کسی واقعہ سے کوئی اس کی مدح کا پہلو تلاش کرکے نکال بھی لیتا تھا تو مبصر علماء فوراً اس کی تردید کے لئے کمربستہ ہوجاتے تھے اور کوئی اس کی واقعی خوبی کو بھی سننے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا'' (ایضاً ص: ۱۱۵)

حضرت محدث جلیلؒ کا متوازن موقف

حضرت محدث اعظمیؒ فرماتے ہیں: ''مہتمم صاحب کا یہ فرمانا کہ ''جن کو اس کے قلبی دواعی اور اندرونی جذبات کھلنے پر اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس پر کفر تک کا حکم لگا دیا'' (ص ۱۲۶) (۲۰۱۰ء کے اڈیشن میں ص: ۱۰۸-۱۰۹)

مہتمم صاحب کا اگر یہ مطلب ہے کہ ''یزید کے قلبی دواعی اور اندرونی جذبات جن پر کھلے، یعنی ان کو کشف کے ذریعہ معلوم ہوگیا، انہوں نے کفر کا حکم لگا دیا'' تو ان کا یہ ارشاد نہایت خطرناک ہے اور یہ کہہ کر وہ تکفیر مسلم کے لئے راستہ ہموار کر رہے ہیں، اس کے علاوہ ان کا یہ ارشاد فقہ اسلامی کی روح سے یکسر خالی ہے، کسی مسلمان کا قول یا فعل کفر پر دلالت کرنے میں بالکل صریح اور ناقابل تاویل نہ ہو اس کی تکفیر جائز نہیں...... نیز فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے کہ کشف پر کسی حکم شرعی کی بنیاد رکھنا جائز نہیں۔

حیرت ہے یہ الفاظ مہتمم صاحب کے قلم سے کیسے نکلے؟ جن کو معمولی فقہی بصیرت رکھنے والا بھی نہیں لکھ سکتا، کیا اس موقع پر مہتمم صاحب کو نحن نحکم بالظاهر والله يتولى السرائر بھی یاد نہیں رہا تھا'' (تبصرہ، ص: ۸۴)

حضرت محدث اعظمیؒ نے طوالت کے اندیشہ سے علماء کی تصریحات نقل کرنے سے گریز کیا اور صرف امام ابوحنیفہؒ کا ایک زریں قول نقل فرمانے پر اکتفا کیا، امام صاحبؒ نے فرمایا:

وإنما كلفنا ربنا أن نسمي الناس مؤمنين ونحبهم ونبغضهم على ما يظهر لنا منهم، والله أعلم بالسرائر، وهكذا أمر الكرام الكاتبين أن يكتبوا ما يظهر لهم من الناس، وليسوا من القلوب بسبيل، لأن ما في القلوب لا يعلمه أحد إلا الله، أو رسول يوحى إليه، فمن ادعى ما في القلوب بغير وحي فقد ادعى علم رب العالمين، ومن زعم أنه يعلم ما في القلوب وغير القلوب ما يعلم رب العالمين، فقد أتى بعظيمة، واستوجب النار والكفر (كتاب العالم والمتعلم ص: ۲۲) (تبصرہ...... ص: ۸۴)

''ہمارے رب نے ہمیں اس بات کا مکلف کیا ہے کہ ہم مسلمانوں کو مسلمان سمجھیں اور جیسا ان کا عمل و کردار سامنے آئے اسی کے مطابق ان سے محبت اور نفرت کا معاملہ کریں، رازہائے سربستہ کو اللہ ہی جانتا ہے، فرشتوں کو بھی یہی حکم ملا ہے کہ وہ لوگوں کے ظاہری اعمال کو ریکارڈ میں لائیں، انہیں دلوں کے بھید تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں دی گئی ہے، اس لئے کہ دلوں کا حال تو اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم، ہاں رسول وحی کے ذریعہ جان سکتا ہے، اب جو کوئی وحی کے بغیر دلوں کی بات جاننے کا دعوی کرے گا، وہ رب العالمین کے علم کا دعویدار ہوگا؟ اگر کسی کو یہ وہم ہوگیا ہو کہ وہ دل کی باتوں کو جانتا ہے جن سے صرف اللہ واقف ہے تو وہ تو وہ سخت گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے کو جہنم اور کفر کا مستحق ٹھہراتا ہے''۔

یزید کا مستحق لعنت ہونا

یزید کے مستحق لعنت ہونے کی بابت حضرت مہتمم صاحبؒ نے فرمایا:

''یزید کا یہی وہ ذاتی، اجتماعی اور مسلمہ کل فسق ہے، جس سے اس کے مستحق لعنت ہونے کا مسئلہ ائمہ کے یہاں زیر بحث آیا اور علماء نے اس پر فقہی حیثیت سے کافی مبسوط اور مفصل کلام کیا'' (شہید کربلا اور یزید، ص: ۱۰۹)

اس کی تائید میں علامہ ابن حجر ہیتمیؒ کا مندرجہ ذیل حوالہ دیا گیا ہے:

" وبعد اتفاقهم على فسقه اختلفوا في جواز لعنه بخصوص اسمه، فأجازه قوم منهم ابن الجوزي ونقله عن أحمد وغيره " (كتاب الصواعق المحرقة ص: ۱۳۲) اور یزید کے فسق پر متفق ہوجانے کے بعد اختلاف ہوا ہے اس پر نام لے کر لعنت کرنے میں، بعض نے اسے جائز رکھا ہے، ان میں ابن جوزی ہیں اور انہوں نے یہ جواز امام احمد سے نقل کیا ہے'' (ایضاً ص: ۱۱۰)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے آگے ابن کثیرؒ کی ایک

عبارت نقل کی ہے جس میں انہوں نے دوسروں کی رائے کو اپنی کتاب میں صرف نقل کی ہے (" واستدل بهذا الحديث من ذهب الى الترخيص في لعنة يزيد بن معاوية . . . ") مگر حکیم الاسلامؒ نے اصل عبارت نقل کرنے سے پہلے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: "اس بارے میں (ابن کثیر) حسب ذیل بیان دے رہے ہیں" (ایضاً ص: ۱۱۰)

آگے صاحب نبراس شارح شرح عقائد کی عبارت نقل کی ہے، جس میں ابن جوزی کا خاص طور سے ذکر ہے جو یزید پر لعنت کا اطلاق ثابت کرتے ہیں (ایضاً ص: ۱۱۱)

جواز لعنت پر علامہ دمیری کی کتاب الحیوان کا بھی حوالہ ہے، جس نے الکیاالھر اسی کا قول نقل کیا ہے (ایضاً ص ۱۱۱-۱۱۲)۔ اس طویل عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے دو قول ہیں، ایک تصریح کے ساتھ ایک تلویح کے ساتھ، پھر یزید کے فاسقانہ گناہوں کا ذکر ہے، مثلاً: وہ چیتوں کے شکار میں رہتا، نرد سے کھیلتا، شراب خواری کرتا وغیرہ، پھر حضرت قاری صاحبؒ فرماتے ہیں:

"اس عبارت سے ائمہ مجتہدین کا مسلک واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سب حضرات یزید کے فسق کے قائل تھے، اس لئے لعنت کا مسئلہ زیر غور آیا حتی کہ امام احمد بن حنبلؒ نے تو قرآن پیش کر کے کہا کہ اللہ نے اپنی کتاب مبین ہی میں لعنت بھیجی ہے" (ایضاً ص: ۱۱۲ - ۱۱۳)

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جوازِ لعنت کے اثبات کے لئے الصواعق المحرقۃ کی عبارت جس میں باپ بیٹے کی گفتگو ہے، جو "شہید کربلا اور یزید" کی زینت ہے:

"صالح نے اپنے والد احمد بن حنبلؒ سے کہا کہ بعض لوگ ہم پر الزام لگاتے ہیں کہ ہم یزید کے حمایتی ہیں، تو امام احمدؒ نے فرمایا: کیا کوئی اللہ پر ایمان لانے والا ایسا بھی ہوگا جو یزید سے دوستی کا دم بھرے؟ اور میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر اللہ نے اپنی کتاب میں لعنت کی ہے؟ میں (صالح) نے عرض کیا: اللہ نے اپنی کتاب میں یزید پر کہاں لعنت کی ہے؟ فرمایا: اس آیت میں: {فهل عسيتم ان توليتم ان تفسدوا في الارض و تقطعوا ارحامكم أولئك الذين لعنهم الله فاصمهم و اعمى ابصارهم} " (ایضاً ص: ۱۱۳)

امام احمد بن حنبلؒ کی جلالت شان کے باوجود کون باور کرے گا کہ اس آیت کے عموم سے یزید کا نام لے کر جواز لعنت کا حکم نکلتا ہے، جبکہ اہل سنت کا معروف عقیدہ سب کو معلوم ہے کہ کسی بھی جابر و ظالم اور بڑے سے بڑا فاسق و فاجر مسلمان پر نام لے کر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے۔

لعنِ یزید پر محدث جلیلؒ کی تحقیقی بحث

(الف) حضرت قاری صاحب کے استناد پر نظر

جواز لعن پہ قاری صاحب کے پیش کردہ دلائل کا سقم واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عینی کو لیجئے ان کی عبارت میں صرف اتنا ہے کہ "یزید کی کون سی منقبت ہے دراں حالیکہ اس کا حال مشہور ہے ......اس لئے نفی منقبت ثبوت فسق کو مستلزم نہیں ہے، چہ جائیکہ ان کی عبارت سے یزید کے فسق پر علماء کا اتفاق ثابت ہو۔

ابن کثیر نے صرف چھ بزرگوں کے نام لئے ہیں کہ وہ لعن یزید کے جواز کے قائل تھے۔ ان میں امام احمد دوسری روایت میں جواز لعن کے قائل نہیں ہیں، لہذا پانچ چھ شخصوں کو جواز لعن کا قائل بتانے والے کی نسبت یہ باور کرانا کہ وہ یزید کے فسق پر علمائے سلف کا اتفاق نقل کرتا ہے اس پر صریح افترا اور بالکل خلاف دیانت بات نہیں ہے؟

اس سے بھی بڑھ کر محل حیرت "حیاۃ الحیوان" کے حوالے سے کیا ہراسی کا کلام نقل کر کے اس کو سند بنانا، جس کا ظاہر البطلان ہونا آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے۔ کیا ہراسی نے اپنے فتوی میں امام ابوحنیفہؒ کی نسبت بھی یہ لکھ دیا ہے کہ جواز لعن یزید کے باب میں ان کے دو قول ہیں ایک تلویح کے ساتھ ایک تصریح کے ساتھ۔ مہتمم صاحب خود حنفی المذہب ہیں، کیا وہ اپنے ادارے کی پوری طاقت یکجا کر کے کہیں سے امام اعظمؒ کے یہ دونوں قول دکھا سکتے ہیں؟ ہراسی کے کلام کے بطلان کی ایک کھلی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ امام شافعیؒ کا مذہب تصریحاً جواز لعن بتاتے ہیں، حالانکہ اگر امام شافعیؒ کا یہ مذہب ہوتا تو غزالی وصاحب انوار، وابن الصلاح، ویافعی، وابن حجر مکی، وغیرھم امام شافعیؒ کی تصریح کے خلاف عدم جوازِ لعن کا فتوی نہ دیتے۔ اور ابن حجر مکی نے صاف صاف یہ لکھ دیا ہے کہ عدم جواز لعن ہی ہمارے ائمہ کے قواعد کے مطابق ہے۔

مزید فائدہ کے لئے اسی مقام پر یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ملا علی قاری کی تصریح کی بنا پر جمہور اہل سنت لعن یزید کو جائز نہیں کہتے (شرح شفا) اور علامہ ابوسعید خادمی کی تصریح کی بنا پر سلف اور جمہور خلف لعنِ یزید کو نا جائز کہتے ہیں۔ ہم نے جن علمائے اہل سنت کا کلام پڑھا ہے، اس میں قاضی ابن العربی مالکیؒ، امام غزالیؒ شافعی اور ابن تیمیہ حنبلیؒ یزید کو فاسق تسلیم نہیں کرتے۔" (تبصرہ، ص: ۸۱ - ۸۳)

(ب) حضرت محدث جلیلؒ کی مزید تحقیق

لعن یزید کے مسئلہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''علمائے اہل سنت کی تصریحات کے مطابق کسی معین شخص کو لعنت کرنا، خواہ وہ فاسق مسلمان ہو یا زندہ کافر، یا مردہ کافر، جس کا کفر پر مرنا معلوم نہ ہو، جائز نہیں ہے، ہاں جس کا فر کا کفر پر مرنا معلوم ہو، جیسے فرعون، یا ابو جہل، وابو لہب، اس پر لعنت جائز ہے۔

اس اصول کے ماتحت یزید پر لعنت کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں نکل سکتی، اس لئے کہ اولاً تو وہ مسلمان تھا، امام غزالیؒ نے فرمایا ہے: صح إسلامه اور ملا علی قاری نے لکھا ہے: إن إيمان يزيد محقق (شرح فقہ اکبر) لہٰذا اب اگر فاسق بھی ہو، تو فاسق پر لعنت جائز نہیں۔ اور اگر بالفرض کفرض المحال وہ کافر ہو، تو چونکہ اس کا کفر پر مرنا معلوم نہیں اس لئے بھی اس پر لعنت جائز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ابن حجر ہیتمیؒ ''صواعق محرقہ'' میں لکھتے ہیں (یہ ایک طویل اقتباس ہے، جس کے چند جملے مع متن ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں):

''إنه لا يجوز أن يلعن شخص بخصوصه إلا أن علم موته على الكفر كأبي جهل وأبي لهب، أما من لم يعلم فيه ذلك فلا يجوز لعنه حتى إن الكافر المعين لا يجوز لعنه لأن اللعن هو الطرد عن رحمة الله المستلزم لليأس منها... کسی متعین شخص پر لعنت جائز نہیں ہے مگر یہ کہ اس کا کفر پر مرنا معلوم ہو، جیسے ابو جہل وابو لہب، لیکن جس کی نسبت یہ معلوم نہ ہو اس پر لعنت جائز نہیں، یہاں تک کہ کسی معین کافر پر بھی لعنت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ لعنت اللہ کی رحمت سے دور کرنے کا نام ہے جو خدا کی رحمت سے ناامیدی کو مستلزم ہے'' (ایضاً ص: ۵۵-۵۶)

اس مسئلہ پر ہم نے ''یزید کی بابت علمائے اہل سنت کے معتدل اقوال'' کے عنوان سے مزید روشنی ڈالی ہے، اس لئے یہاں اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کیا فسقِ یزید ایک منصوص مسئلہ ہے؟

حضرت قاری صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''مذہبی ریسرچ کو ذرا اور آگے بڑھایا جائے تو واضح ہوگا کہ فسق یزید کا مسئلہ کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں جو کہ مسئلہ اور عقیدہ کا درجہ پھر بھی رکھتا تھا، بلکہ ایک منصوص مسئلہ ہے جس کی بنیادیں کتاب وسنت میں موجود ہیں، گو درجۂ اجمال میں ہیں اور علمائے راسخین ومجتہدین کی یہ نقول درحقیقت انہی احادیث کے تفصیلی بیان اور اس کی تشریح وتوضیح کا درجہ رکھتی ہیں۔''

(شہید کربلا و یزید ص: ۱۲۰)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اس ''منصوص مسئلہ'' کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہم کو لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے مگر عوام کو غلط فہمی سے نکالنے اور گمراہی سے بچانے کے لئے اس کو ظاہر کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

کوئی ان سے پوچھے کہ اگر منصوص مسئلہ کی تعریف یہ ہے کہ ''اس کی بنیادیں کتاب وسنت میں موجود ہوں گو درجۂ اجمال میں ہوں''، تو کیا اجتہادی مسئلہ اس کو کہتے ہیں ''جس کی کوئی بنیاد کتاب وسنت میں اجمال کے درجہ میں بھی نہ ہو؟!

اگر اجتہادی مسئلہ کی یہی تعریف ہے تو اجتہادی مسئلہ اور بدعت میں کیا فرق رہ گیا؟

یزید کے فسق کو منصوص بتا کر مہتمم صاحب نے اتنی بڑی غلطی کی ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ صحابہ کے ایک جم غفیر نے ایک منصوص مسئلہ کو ٹھکرا دیا، حضرت معاویہؓ نے اس منصوص فاسق کو ولی عہد بنایا، لوگوں کو ترغیب دے کر اس کی ولی عہدی کی بیعت لی اور تمام صحابہؓ نے حضرت معاویہؓ کے ولی عہد کی حیثیت سے اس منصوص فاسق کی بیعت کرلی۔

اور مہتمم صاحب نے صحابہؓ کا جو یہ عذر بیان کیا ہے کہ ''وہ یزید کے سرمکنون کے ظاہر نہ ہونے کے سبب بالکل حق بجانب تھے۔'' (شہید کربلا ص: ۱۵۹ پہلا اڈیشن)

تو یہ یزید کے فسق کو منصوص کہنے کی صورت میں صرف سخن سازی ہے، جب حدیث نبوی میں یزید کا فاسق ہونا منصوص تھا، اس کے ہاتھوں امت کی اجتماعیت اور خلافت کی بربادی کا حدیث میں اشارہ تھا (ص: ۱۲۱)، اس کی اطاعت میں دین کے ضائع ہونے کی خبر تھی اور اس خبر سے یہ انشا بھی پیدا ہوتی تھی کی ایسی حکومت کا ساتھ ہرگز نہ دینا اور دین کو بچانا، اور حکماً مرفوع حدیث میں سن ۶۰ ھ سے اس کی حکومت شروع ہونے کی خبر موجود تھی اور سن ۶۰ ھ میں یزید نے جو بدترین کارنامے انجام دیئے اس کی طرف بھی حدیث ابوسعید خدریؓ میں اشارہ کردیا گیا تھا، تو کیا یزید کے فسق کے منصوص ہونے اور ان تمام ارشادات نبوی کے باوجود صحابہؓ یزید کو فاسق نہیں سمجھتے تھے؟ کیا العیاذ باللہ ان کو ان ارشادات پر یقین نہیں تھا؟ اس لئے وہ یزید کے سرمکنون کے ظاہر ہونے کا انتظار کررہے تھے؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑی صحابہ کی کوئی توہین نہیں ہوسکتی، اور اگر نہیں تو بتایئے کہ ایسے منصوص فاسق کو حضرت معاویہؓ نے ولی عہد بنانے کا اقدام کیسے کیا؟ اچھا انہوں نے یہ کیا تھا تو سب صحابہؓ نے ولی عہدی کی تحریک کے وقت ہی اس فاسق کا پتہ کیوں نہیں کاٹ دیا؟ سب نے اس کے منصوص فاسق ہونے اور اس کے ہاتھوں خلافت کی بربادی وغیرہ کی حدیثیں حضرت معاویہؓ کے سامنے کیوں نہیں رکھیں؟ حضرت معاویہؓ اولاً تو صحابیٔ رسول تھے، دوسرے وہ بے مثال ولاثانی حلیم وبردبار تھے، حدیث کے آگے وہ یقیناً سر تسلیم خم کردیتے، اور اگر

بفرضِ محال یہ بھی نہ کرتے تو کم از کم ان سے کسی سخت گیری اور فتنہ کا اندیشہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔'' (تبصرہ،ص: ۸۴-۸۶)

مہتمم صاحب نے اس گتھی کو سلجھانے کی بہتیری کوشش کی مگر وہ الجھتی ہی چلی گئی، اس حوالے سے حضرت محدث جلیلؒ نے حضرت قاری صاحب سے متعدد علمی استفسارات کئے، جو اصل کتاب میں دیکھنے کے لائق ہیں، ایک استفسار یہ فرمایا:

''اس کے بعد میں جناب مہتمم صاحب سے یہ استفسار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اسی طرح کی پیشین گوئیوں کی بنا پر جن میں یزید کے نام کی کوئی تصریح نہیں، آپ یہ قرار دے رہے ہیں کہ یزید کا فسق منصوص ہے تو آپ کے اصول سے بارہ خلفاء والی حدیث میں یزید کا خلیفہ برحق ہونا، اپنے مخالفین پر اس کا منصور و مظفر ہونا، اس کے زمانے میں خلافت کا باعزت ہونا، اور دینِ اسلام کا قائم ہونا بھی منصوص ہے۔[بارہ خلفاء والی روایت: **لا یزال الاسلام عزیزا الی اثنا عشر خلیفة... کلهم من قریش** (صحیح مسلم ۲/۱۱۹)۔ایک روایت میں ہے: **لا یزال هذا الدین قائما حتی یکون علیکم اثنا عشر خلیفة ،کلهم تجتمع علیه الأمة**۔فتح الباری ۱۳/ ۱۶۷]

یہ ہم نہیں کہتے، بلکہ آپ کے اصول سے یہ لازم آتا ہے، اور اگر ہم سے پوچھئے تو جس کو ہمارے علماء منصوص نہیں کہتے ہم بھی اس کو منصوص نہیں کہتے اور ہمارے علم میں علماء کسی ایسی چیز کو منصوص نہیں کہتے جو اس طرح ثابت ہوتی ہو کہ اس کا ایک مقدمہ تو حدیث میں مذکور ہو اور دوسرا مقدمہ خارج سے ملایا جائے، بلکہ ایسی چیز کی نسبت علماء صرف اتنا کہتے ہیں کہ ہماری دانست میں فلاں حدیث میں فلاں بات، یا فلاں شخص کی طرف اشارہ ہے۔

مثلاً قبیلۂ ثقیف میں ایک کذاب اور ایک مبیر پیدا ہونے کی پیشین گوئی حدیث میں وارد ہوئی ہے اور عام محدثین یہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مصداق مختار ثقفی اور حجاج ہے، مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ مختار کا کذاب ہونا اور حجاج کا مبیر الامۃ ہونا منصوص ہے، چنانچہ امام ترمذی فرماتے ہیں: **یقال: الکذاب المختار بن أبی عبید، والمبیر الحجاج بن یوسف** (یعنی کہا جاتا ہے کہ کذاب مختار ہے اور مبیر حجاج ہے)۔

مہتمم صاحب ٹھنڈے دل سے یہ بھی ذرا سوچیں کہ اگر یزید کا فسق منصوص ہو تو امام غزالیؒ لعنِ یزید سے منع کرتے ہوئے یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ کسی مسلمان کو بے تحقیق فاسق کہنا جائز نہیں۔ اور ابن العربیؒ جیسا حافظ حدیث یہ کیسے لکھ سکتا تھا کہ اس کا فسق کہاں سے معلوم ہوا؟ اور ابن تیمیہؒ جیسا متبحر محدث یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ جواز لعنِ یزید کے لئے ثبوت فسق کی ضرورت ہے۔'' (تبصرہ،ص:۸۶-۹۰)

غزوۂ قسطنطنیہ اور یزید

حکیم الاسلام حضرت قاری صاحبؒ نے قسطنطنیہ میں یزید کی شرکت اور بشارت والی روایت کی عجیب نکتہ آفرینی فرما کر یزید کو خارج از بشارت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''انہی قلبی کیفیات واحوال اور باطنی نیات وجذبات پر باقی رہیں، جن کے ساتھ اس وقت جہاد کیا تھا، لیکن بعد میں اگر کسی کے قلبی احوال بگڑ جائیں اور تقوی کے وہ مقامات باقی نہ رہیں جو بوقت جہاد تھے تو طبعاً وہ حکمِ مغفرت بھی اس خاص فرد کے حق میں باقی نہ رہے گا۔ پس جب یزید کا اچھا حال تھا بشارت قائم تھی، جب بدل گیا تو بشارت بھی اٹھ گئی'' (ایضاص: ۱۳۴)

اس کتاب میں حضرت قاری صاحبؒ کی یہ کوشش بھی نظر آتی ہے کہ وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ قسطنطنیہ کا یہ غزوہ یزید کی قیادت میں نہیں ہوا تھا، بلکہ صحابہ سفیان بن عوف کے ساتھ تھے۔ فرماتے ہیں: ''یزید کی امارت و قیادت کا دعوی یقینی طور پر ثابت شدہ نہیں............ یزید کی شرکت تو اس غزوہ میں ہوئی مگر قیادت نہیں ہوئی کہ اکابر صحابہ اس کی ماتحتی میں دے دیئے گئے ہوں'' (ایضاً ص: ۱۴۴)۔

یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ ایک غزوہ کی قیادت نہیں دی گئی مگر پورے عالم اسلام کی قیادت سونپ دی گئی اور ساٹھ صحابہ نے اس کے ہاتھ پر بیعت خلافت بھی کر لی؟!!

اور سنئے حضرت مہتمم صاحبؒ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''وہ اس سفر میں بطور سزا کے بھیجا گیا......یعنی اس سفر میں اس کے قدم اٹھوائے گئے، خود نہیں اٹھے اور وہ سزاءً اٹھوائے گئے'' (ایضاً ص: ۱۴۵)۔

حضرت محدث اعظمیؒ کی علمی گرفت

حضرت محدث جلیلؒ نے حضرت قاری صاحبؒ کے مذکورہ بالا خیالات پر نکیر بھی فرمائی ہے اور علمی گرفت بھی، یہ علمی اور تحقیقی گرفت یوں تو ۱۱-۱۲ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، مگر ہم طوالت سے بچتے ہوئے اس کی خاص خاص باتیں ہی اختصار و تلخیص کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

''چونکہ فسق یزید کو اہل سنت کا عقیدہ اور عقیدہ بھی منصوص ثابت کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے، جس کی نہایت کاری ضرب اس عقیدہ پر پڑتی ہے، اس لئے مہتمم صاحب نے اس حدیث کے مفہوم کو مسخ کرنے کے لئے اپنے علم وحکمت کی پوری قوت صرف کردی ہے۔ وہ حدیث صحیح بخاری وغیرہ میں بایں الفاظ مروی ہے:

أول جیش من أمتی یغزون مدینة قیصر مغفور لهم۔ میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) میں جہاد کرے گا، اس کی مغفرت کردی گئی ہے۔

اور تاریخوں سے تحقیقی طور پر ثابت ہے کہ مجاہدین اسلام کا پہلا لشکر جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اس کا سپہ سالار یزید تھا، لہٰذا اس نبوی بشارت کی رو سے وہ بھی مغفور لہ قرار پاتا ہے۔

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ حدیث میں بلا کسی قید وشرط کے مغفور لھم وارد ہوا ہے، مگر مولانا طیب صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بشارتِ مطلق نہیں ہے، بلکہ اس قید کے ساتھ مقید ہے، یا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ جو مجاہدین ''انہی قلبی کیفیات واحوال اور باطنی نیات وجذبات پر باقی رہیں گے، جن کے ساتھ انہوں نے جہاد کیا تھا'' انہی کی مغفرت ہوگی اور چونکہ یزید ان کیفیات واحوال پر باقی نہیں رہا، اس لئے وہ اس بشارت سے محروم ہے، مولانا طیب صاحب نے اپنی طبع زاد شرط کو ''طبعی'' قرار دیا ہے۔

بہر حال ہمارا پہلا اعتراض اس شرط کو ''طبعی'' کہنے پر ہے، مہتمم صاحب وضاحت فرمائیں کہ انھوں نے اس کو ''طبعی'' کس معنی میں کہا ہے؟

دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ انھوں نے قلبی احوال ومقامات تقوی کی تبدیلی کو ارتداد شرعی پر قیاس کیا، حالانکہ نصوص شرعیہ اور تصریحات علماء کی رو سے دونوں کے احکام الگ ہیں۔

تیسرا اعتراض اس پر ہے کہ انھوں نے مذکورہ بالا بشارت کو اپنی طبع زاد شرط کے ساتھ مشروط ہونے کی نسبت یہ دعوی کیا ہے کہ وہ قواعد شرعیہ کے ما تحت ہے، حالانکہ کوئی شرعی قاعدہ اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ مذکورہ بالا بشارت اس طبع زاد شرط کے ساتھ مشروط ہو، جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہو چکا ہے۔

اب رہی اندرونی خرابیوں کی وجہ سے (یزید کی) محرومی تو علماء نے تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ **لا تبطل الحسنات بشؤم المعاصی الا بالکفر** (شرح فقہ اکبر ص: ۱۹۲) گناہوں کی وجہ سے نیکیاں برباد نہیں ہوتیں مگر کفر سے۔ اس تصریح سے صاف ظاہر ہے کہ اندرونی خرابی اگر کفر و نفاق حقیقی (جو کھلے کفر سے بھی بدتر ہے) تو اس سے نہ اس کا جہاد قسطنطنیہ باطل ہوگا اور نہ اس کی بنا پر جو بشارت وارد ہوئی ہے وہ باطل ہوگی۔

مہتمم صاحب نے حدیث کی دوسری تاویل یہ کی ہے کہ: ''مغفور لھم سابقہ سیّئات سے متعلق ہے نہ کہ آئندہ کی سیئات سے''۔ شاید مہتمم صاحب کو ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ احادیث کو حسب تصریح علماء ان کے ظاہر پر رکھنا واجب ہے، تاوقتیکہ ظاہر سے پھیرنے کے لئے کوئی شرعی مجبوری نہ ہو، مثلاً وہ کسی دوسری حدیث کے خلاف، یا کسی مسلمہ عقیدہ واصول شریعت کے منافی معلوم ہوتی ہو، اس وقت تاویل ضروری ہے۔

اب مہتمم صاحب بتائیں کہ مغفور لھم کا لفظ باعتبار دلالت ظاہری اپنے اطلاق وعدم تقیید کی وجہ سے سابق ولاحق دونوں قسم کی سیئات کو شامل ہے تو ایسی کیا مجبوری ہے کہ اس لفظ کو اس کی ظاہری دلالت سے پھیر کر سابقہ سیئات کے ساتھ خاص کیا جائے، کیا شرعی نصوص کی رو سے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی غیر معمولی عمل صالح کی قدردانی وعزت افزائی کی بنا پر حق تعالیٰ اس عمل والے کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردے؟ اگر نصوص کی رو سے شرعاً یہ ممکن ہے تو کیا مغفور لھم کو صرف سیئات سے متعلق قرار دینا بلا ضرورت تاویل کا ارتکاب نہیں ہے؟ کیا یزید کو فاسق ماننے کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ کسی حدیث سے اس کی مغفرت کا امکان پیدا ہوتا ہو، تو بلا ضرورت شرعیہ اس حدیث کی تاویل کر کے اس امکان کا دروازہ بند کردیا جائے؟

اس کے بعد مہتمم صاحب نے یزید کے حق میں اس بشارت کو کمزور کرنے کے لئے ایک نامعتبر قول کو لے کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یزید اس لشکر کا امیر نہیں تھا۔ (دوسرے مورخین کو تو چھوڑئے تنہا) ابن کثیر نے دو مقام پر یزید کے جھنڈے کے نیچے صحابہ کا شریک غزوہ ہونا بیان کیا ہے (دیکھو: ۸/ ۱۲۷۔ ۸/ ۱۳۳) تیسرے مقام پر اس کو امیر الجیش لکھا ہے۔ اسی طرح ۸/ ۳۲ میں بھی یزید کے اس غزوہ اور صحیح بخاری کی حدیث کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یزید کا اس غزوہ میں امیر الجیش ہونا صرف مورخین کا بیان نہیں ہے، بلکہ حدیث کی مستند کتابوں میں بھی یہ مروی ہے: چنانچہ ابن کثیر نے مسند احمد کے حوالے سے نقل کیا ہے: **ان یزید بن معاویة کان أمیرا علی الجیش الذی غزا فیه أبو أیوب (رضی الله عنه)**۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ جس غزوہ میں شریک ہوئے اس کا امیر الجیش یزید تھا۔

پھر مسند احمد ہی کی دوسری روایت نقل کی ہے، جس میں یہ ہے: **غزا أبو أیوب مع یزید بن معاویة** حضرت ابو ایوبؓ نے یزید کے ساتھ غزوہ کیا۔ ابن کثیر ہی نے مسند احمد کے حوالے سے نقل کیا ہے جس میں حضرت ابو ایوبؓ کی وصیت کا ذکر ہے۔ ایک روایت امام بخاری کی تاریخ صغیر ۸/ ۵۹ کے حوالے سے نقل فرمائی ہے۔ ایک روایت استیعاب از حافظ عبد البر کی ہے۔ ایک روایت اصح الکتب بعد کتاب اللہ سے نقل فرمائی ہے، جس میں صحابیٔ رسول حضرت محمود بن الربیع کی شہادت کا ذکر ہے۔ دیکھو: صحیح البخاری بر ہامش فتح الباری ۱۳/ ۴۰)

غزوۂ قسطنطنیہ کی بشارت اور ہمارے معروضات کی تائید مشہور حافظ

حدیث ابن عساکر کے اس بیان سے ہوتی ہے، جسے انہوں نے قاضی بحرین ابو الفضل محمدؒ کی زبان سے سن کر نقل کیا ہے کہ انہوں نے یزید کو خواب میں دیکھا تو اس سے پوچھا کہ تو حضرت حسینؓ کے قتل کا مرتکب ہوا تھا؟ یزید نے کہا: نہیں، پھر انہوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے تیری مغفرت کر دی؟ یزید نے کہا: ہاں! اور مجھے جنت میں بھی داخل کر دیا (تاریخ ابن کثیر ۶ ۲۳۰)۔

اس خواب کو ابن کثیر نے حافظ ابن عساکر کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس کی کوئی تردید نہیں کی ہے، لہٰذا مہتمم صاحب کے اصول سے ابن عساکر و ابن کثیر دونوں اس کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کو قواعد شرعیہ کے خلاف نہیں سمجھتے ''(تبصرہ بر''شہید کربلا و یزید'' ص ۹۳-۱۰۳)۔

حضرت محدث اعظمیؒ کا ایک مکتوب گرامی

علامہ ابن عابدین-شامی- کے بھائی کے پوتے مفتی دمشق شیخ محمد ابو الیسر ابن عابدینؒ نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام "أغاليط المؤرخين" رکھا، وہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ بار بار شائع کیا جائے۔

اس کتاب کے ایک مضمون کا عنوان ہے''**يزيد بن معاويه رحمة الله**''، اس میں سب سے پہلے یہ لکھتے ہیں کہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں یزید کے بہت سے معائب ذکر کئے ہیں، بلکہ اس پر لعنت بھی بھیجی ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مضمون ان کا نہیں ہے، بلکہ کسی نے ان کی کتاب میں تحریف کی ہے، اور یہ عبارتیں داخل کر دی ہیں، یا پھر سیوطی نے بے تحقیق کئے ہوئے دوسرے مورخین کی اندھی تقلید میں یہ باتیں لکھ دی ہیں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: مورخین اہل بیت پر یزید کے مظالم کی جو داستاں بیان کرتے ہیں، وہ سب بے سرو پا افسانے ہیں، اس باب میں حقیقت صرف اتنی ہے کہ یزید کی بیعت پر مسلمانوں کا اجماع ہو چکا تھا، اس کی امارت شرعی طریق پر منعقد ہو چکی تھی، اس لئے اس کی حفاظت میں اس نے تفریق بین المسلمین کے مرتکبین کی سرکوبی کی، اس کی بیعت بیعت شرعیہ تھی اور اس پر خروج بغی تھا، باقی رہے وہ حضرات جن کو اس کی بیعت سے استنکاف و اعراض تھا، وہ صرف اس لئے تھا کہ وہ اپنے کو زیادہ حق دار خلافت سمجھتے تھے اور وہ بلاشبہ یزید سے بہت زیادہ متقی و پرہیزگار تھے، اس لئے ان کا اجتہاد یہ تھا کہ ان کو امام و خلیفہ ہونا چاہئے، لیکن ان کا یہ اقدام انعقادِ بیعت اور شرعی طور پر یزید کے امیر منتخب ہو جانے اور امارت کے تحقق کے بعد تھا، اس لئے اس نے اپنی بیعت سے اسی طرح مدافعت کی جس طرح حضرت علیؓ نے، لیکن اس نے اپنے امراء و عمال کو اہل بیعت کی بے حرمتی اور ان پر ظلم و تعدی کا کبھی حکم نہیں دیا تھا۔

پھر دمیری شافعی کی حیاۃ الحیوان (ص: ۵۱) کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب شمر حضرت حسینؓ کا سر مبارک یزید کے پاس لایا اور اس حادثۂ فاجعہ کی تفصیل سنائی، تو یزید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ان ظالموں سے کہا میں قتل حسین کے بغیر بھی تمہاری اطاعت کا قائل ہو سکتا تھا، خدائے تعالیٰ ابن مرجانہ پر لعنت کرے، اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو حضرت حسینؓ سے درگزر کرتا۔

اس کے بعد تاریخ ابن جریر سے اہل بیت نبوی کے ساتھ اس کے حسن سلوک کے واقعات نقل کئے ہیں، پھر صحیح بخاری کی حدیث: **أول جيش يركبون البحر**۔ اور حدیث :**أول جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر** نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ دونوں وصف یزید کے لئے ثابت ہیں، لہٰذا پہلی حدیث کی بنا پر **قد أوجبوا** کے مصادیق میں اور دوسری حدیث کی بنا پر **مغفور لهم** میں یزید داخل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اور جو یہ کہتا ہے کہ'' وہ امیر کا بیٹا تھا کرسی پر بیٹھا رہا ہو گا'' اس کے منہ میں خاک۔ اس کے منہ سے یہ کیوں نہیں نکلا کہ وہ ایک جلیل القدر فقیہ صحابی اور بارگاہ نبوی کے امین کاتب کا لڑکا تھا، اس کی تعبیر سے حضرت معاویہؓ کے حق میں سوء ادب، بدعقیدگی اور اہانت مترشح ہوتی ہے، یہ فقرہ قائل کی ناواقفیت کی غمازی کرتا ہے، اگر اس کی نظر اصابہ پر بھی ہوتی تو یہ بات منہ سے نہ نکالتا۔ حافظ ابن حجر ناقل ہیں کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ جب جنگ قسطنطنیہ میں مریض ہوئے، تو ان کی وفات سے کچھ پہلے یزید ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کی کیا خواہش ہے؟ انہوں نے فرمایا: میری خواہش یہ ہے کہ جب میں مروں تو مجھ کو کسی سواری پر سوار کر کے دشمن کی سرزمین میں لے چلو اور جہاں تک گھس سکو گھستے چلے جاؤ، جہاں سے آگے بڑھنا ناممکن ہو جائے وہاں مجھ کو دفن کر کے واپس چلے آؤ۔ یزید نے حضرت ابوایوب کی یہ وصیت پوری کی۔ کیا کرسی پر بیٹھنے والا یہ کر سکتا ہے؟

پھر معترضین کو کیا معلوم نہیں کہ راہ جہاد میں کرسی پر بیٹھے رہنے کا بھی اجر ہے، کیا ان کو معلوم نہیں کہ {**ولا يقطعون واديا الا كتب لهم به عمل صالح**} اور کیا ان کی نظر سے أبو الهوٰ ذو الهوٰ والی حدیث نہیں گزری ہے؟

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، مفتی دمشق آگے لکھتے ہیں: شیخ سنان الدین اماسی نے **تبيين المحارم** میں- جو حنفی مذہب کی جلیل القدر کتاب ہے- یزید کا ایک فرمان اہل بصرہ کے نام حدیث نبوی کے حوالے سے مال غنیمت میں خیانت نہ کرنے کے باب میں بھیجا ہے، تو ایسا شخص جو ایسی روایت بیان کرے اور لکھ کر بھیجے وہ ان خبیث حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے؟!

میں کہتا ہوں کہ اور کیا ایسی خبیث حرکتوں کے مرتکب کی روایت اور فرمان کا کسی فقہی مسئلہ کی دلیل کے طور پر پیش کرنا جائز ہے؟

اس کے بعد مناوی کا رد کیا ہے، جنہوں نے یزید کے مغفور لہ ہونے میں شک وشبہ کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح تفتازانی کے کلام کو مردود قرار دیا ہے۔

پھر روح البیان سے حافظ ابن الصلاح کا یہ فتوی نقل کیا ہے کہ جو گروہ یزید پر لعنت نہیں کرتا اور نہ اس کی دوستی کا دم بھرتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بادشاہانِ اسلام کا سا برتاؤ کرتا ہے وہی حق پر ہے، یہی صحیح تاریخ اور قواعد شریعت کے مطابق ہے۔

اس کے بعد شہاب رملی کے فتاوی سے نقل کیا ہے کہ یزید پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے، ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے، ان میں سے صاحب خلاصہ وغیرہ ہیں اور انوار – کتاب کا نام – میں ہے:

لا یجوز لعن یزید ولا تکفیرہ. فانہ من جملۃ المؤمنین. ان شاء رحمہ. وان شاء عذبہ۔

اس کے بعد لکھتے ہیں: اہل سنت وجماعت کا مذہب وہی ہے جو بدء الأمالی میں مذکور ہے، پھر بدء الأمالی کا یہ شعر نقل کیا ہے:

ولم یلعن یزیدا بعد موت
سوی المکثار فی الاغراء غالِ

پھر علامہ علی قاری کے حوالے سے تفتازانی کا رد نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ تفتازانی کا رد محقق ابن الہمام کے شاگرد کمال ابن ابی شریف نے کیا ہے۔ آخر میں لکھا ہے کہ تفتازانی کا قول انتہائی غیر منصفانہ اور جادۂ صواب سے منحرف ہے۔

آخر میں انہوں نے لکھا ہے کہ صحاح کی چار حدیثوں سے یزید کے حسن حال کی شہادت ملتی ہے، وہ چاروں حدیثیں ایسی ہیں کہ یزید کی منقصت کی کوئی دلیل ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور جو کچھ یزید کے بارے میں ان حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے، اس کو حق وانصاف وایمان داری کے ساتھ رد نہیں کیا سکتا، الا یہ ہے کہ بے انصافی، تعصب اور غلط روی اختیار کی جائے۔

ان میں سے پہلی حدیث صحیح بخاری کی ہے، جس میں مذکور ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اپنے صاحب زادوں اور خدم وحشم کو جمع کر کے کہا کہ ارشاد نبوی ہے: بدعہدی کرنے والے کے لئے ایک جھنڈا قیامت کے دن نصب کیا جائے گا، اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے اس شخص (یزید) سے اللہ اور رسول کے نام پر بیعت کی ہے، لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس کی بیعت کو توڑے گا اور کسی دوسرے ہاتھ پر بیعت کرے گا، اس سے میرا تعلق باقی نہ رہے گا۔

یہ ہے **أغالیط المؤرخین** کے (ص: ۱۱۷-۱۳۲) کا خلاصہ، و **فیہ کفایۃ لمن لہ أدنی دینٍ ودیانۃٍ۔**

(مولانا) حبیب الرحمٰن اعظمی

(مقالات ابوالمآثر جلد دوم، ص: ۱۶۳-۱۶۶)

علمی خیانت

☆ جس طرح سے عام لوگ کبھی سہواً، کبھی عمداً گناہ اور غلطیاں کرتے ہیں، اُسی طرح سے بعض اہل علم اور ارباب تحقیق بھی علم وتحقیق کے میدان میں خیانتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور غلطیوں پہ غلطیاں کرتے چلے جاتے ہیں، پہلی غلطی تو یہ کرتے ہیں کہ خالص تحقیقی کاموں میں وہ پہلے سے اپنا ایک ''رجحان اور نقطۂ نظر'' طے کر لیتے ہیں، ظاہر ہے طے شدہ مسئلہ کی تحقیق کیوں کر ہوگی؟ تحقیق کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب کسی امر کی صحت وسقم میں، اس کے جواز وعدم میں، اس کی حلت وحرمت میں شک یا تردد ہو۔ طے شدہ امر کے لئے تو صرف تائید وتوثیق کی ضرورت باقی رہتی ہے، جو ہر مسئلہ میں تاریخ کے وسیع ذخیرہ سے پوری ہو جاتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اچھے اچھوں کے یہاں یہی طرز تحقیق نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ''اپنی رائے وفکر'' کو ثابت کرنے میں ''یکطرفہ دلائل'' پیش کر کے وہ کامیاب تو ہو جاتے ہوں، مگر ضروری نہیں ہے کہ اس طرز تحقیق سے وہ حقیقت کو پا بھی لیں، حقیقت کو نہ پا سکیں گے تو لامحالہ وہ افراط وتفریط کا شکار ہوں گے اور مدتوں غلط زاویۂ نظر میں مبتلا رہیں گے۔

☆ زیر بحث موضوع میں حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے یہاں بھی (کم از کم اس کتاب کی حد تک) یہی انداز بیان نظر آتا ہے، جس کی مثالیں کتاب میں بھری پڑی ہیں، سر دست ایک مثال پر نظر ڈالئے:

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یزید پر جواز لعنت کے اثبات کے لئے الصواعق المحرقۃ (ص: ۱۳۲) سے باپ بیٹے کی گفتگو نقل کی گئی ہے (دیکھیے ''شہید کربلا اور یزید'' ص: ۱۱۳) مگر اسی کتاب کے اسی صفحے پر اس کی تردید بھی ہے جسے نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ ابن حجر مکیؒ فرماتے ہیں:

''امام احمدؒ نے لعن یزید کے جواز پر جو آیت [**اولئک الذین لعنھم اللہ**] سے اور دوسرے بعض علماء نے مسلم کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے، تو یہ دونوں یزید کا نام لے کر لعنت کرنے پر بالکل دلالت نہیں کرتیں۔''

(تبصرہ ص: ۶۵)

اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلیؒ کے قول سے بھی صرف نظر برتا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اولاً تو امام احمد سے تجویز لعنت یزید کی روایت ثابت نہیں ہے، بلکہ ایک منقطع روایت میں ایسا نقل کیا گیا ہے، دوسرے آیت [**اولئک الذین لعنهم الله**] کسی معین لعنت کے جواز پر دلالت نہیں کرتی اور اگر بالفرض دلالت بھی کرتی ہو تو اس سے لعن یزید کا جواز اسی وقت ثابت ہوگا جب یزید سے قطعیۂ رحم ثابت ہو۔ امام احمد سے لعن یزید کے باب میں جو قول ثابت اور متفق ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے لڑکے صالح نے جب لعن یزید کی نسبت سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ تم نے اپنے باپ کو کسی پر لعنت کرتے کب دیکھا ہے؟ (منتقی ص:۲۹۱) (تبصرہ.....ص:۶۵-۶۶)

اسی طرح سے اس کتاب میں ابن حجر ہیثمیؒ کے اس قول کو بھی نا قابل اعتنا سمجھا گیا:

''کہ جس کا کفر پر مرنا معلوم نہ ہو، اس پر لعنت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ لعنت اللہ سے دور کرنے کا نام ہے (الصواعق المحرقۃ ص: ۱۳۳)

(تبصرہ ص:۵۶)

امام ابن تیمیہ حنبلیؒ کا یہ قول بھی نظر انداز کر دیا گیا: ''پس جو شخص یزید اور اس کے امثال پر لعنت کو جائز قرار دے، اس پر لازم ہے کہ پہلے اس کا فسق ثابت کرے، پھر یہ ثابت کرے کہ معین فاسق پر لعنت جائز ہے، پھر یہ ثابت کرے کہ یزید اپنے فسق و فجور سے بے توبہ کئے مرا تھا'' (منتقی ص: ۲۹۰ تبصرہ.....ص: ۶۳)

☆ اس طرز تحقیق کو ایماندارانہ تحقیق کا نام نہیں دیا جا سکتا، ایماندارنہ بحث و تحقیق یہ ہے، موافق و مخالف سارے اقوال سامنے لائے جائیں، پھر ان کو صحت و سقم کے معیار پر تولا جائے اور چھان پھٹک کر پایۂ ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی جائے، پھر اسی پر بس نہ کیا جائے بلکہ اسلامی مزاج اور اسلامی نہج کی روشنی میں ان اقوال کی تطبیق و تفہیم کی جائے، اگر اس کے علاوہ کوئی اور طرز تحقیق اپنایا گیا تو ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلامی نہج اور اصولی جادۂ حق سے دور جا پڑیں گے، نہیں، بلکہ منحرف ہو جائیں گے۔ مثلاً مشاجرات صحابہؓ کے باب میں محض تاریخی واقعات پر اعتماد کر کے اور کسی ایک رجحان کے حق میں اقوال کثیرہ کو بنیاد بنا کر موضوعیت اور علمی تنقید کے دعویٰ کے ساتھ زبان و قلم کا ہنر دکھانا ہی ان کی شان میں گستاخی اور سب و شتم کے گڑھے کے کگار پر کھڑے ہونے کے مرادف ہے، اسی طرح ایک شخص مسلمان ہونے کا دعویدار رہے، خواہ عملی طور پر وہ فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہو، اسے کفر کے ڈانڈے سے ملانا، اسے مستحق لعنت سمجھنا اسلامی منہج و عقیدہ کے خلاف ہوگا۔

☆ ''شہید کربلا اور یزید'' کو ''جماعت دار العلوم دیوبند'' کے متفقہ مسلک حق کی ترجمان' باور کرایا گیا ہے اور اس کتاب کو اس دعوی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ 'یزید کی تردید اور موقف امام حسین رضی اللہ عنہ کی تائید میں علمی، فکری، تحقیقی اور مسلکی لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت سے پیش کی جا رہی ہے''۔ ہماری ناقص عقل تو یہی کہتی اور سمجھتی رہی ہے کہ ''جماعت دار العلوم دیوبند کا متفقہ مسلک حق'' من و عن وہی ہوگا، یا ہونا چاہیے، جو مسلک اہل سنت و الجماعت ہوگا۔ ہم تو آج تک یہی سمجھتے رہے ہیں کہ برصغیر میں دار العلوم دیوبند اہل سنت و الجماعت کا ترجمان ہے اور انشاء اللہ رہے گا، مگر اس کتاب کی حد تک یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ اہل سنت و الجماعت کے معتدل مسلک کی ترجمانی نہیں کرتی۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ ہی نہیں بلکہ جو کوئی بھی تعصب سے پاک ہو کر حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی اس کتاب کا مطالعہ کرے گا، اُسے مسلک اہل حق کے ترجمان کی حیثیت سے قبول کرنے میں سخت تامل ہوگا، پوری کتاب کا انداز بحث یکطرفہ ہے اور ذاتی نقطۂ نظر کو عقیدہ کے خراد پر چڑھایا گیا ہے اور اہل سنت میں سے معتدل علماء کے بیان کردہ ایک سلجھے ہوئے مسلک کو (دفاع کے نیک جذبے سے) الجھا دیا گیا ہے، یا الجھ کر رہ گیا ہے۔

☆ یہ کتاب نو آموز اور کچے ذہن کے طلباء کے لئے نقصان دہ اور خطرناک ہے، اس لئے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی جو ذہن سازی ہو گی، وہ ذہن یزید نامی ایک فاسق مسلمان۔ جس کا فسق بھی محتاج ثبوت ہے۔ کے حق میں بشارتِ نبوی کو ہضم نہ کر سکے گا، دائرۂ فسق سے تو اسے خارج سمجھے گا ہی نہیں، ممکن ہے اسے فاسق کے ساتھ ساتھ، کافر اور ملعون بھی سمجھے۔ اگر یزید کے حق میں دو چار بھی ایجابی صفات معتبر کتابوں میں کہیں وارد ہوئی ہوں، تو یہ کتاب ایجابی انداز سے ان صفات کا کہیں ذکر تک نہیں کرتی۔ سوچا جا سکتا ہے کہ اپنی ذاتی رائے و فکر کو عقیدہ بنا کر بچوں کے ذہن میں اتارنے کا یہ عمل کتنا خطرناک ہے، ہزاروں طلباء نے اس کتاب کو پڑھا ہوگا، اور کتاب کے مکمل مشمولات کو حرف آخر ہی نہیں سمجھا ہوگا، بلکہ حضرت قاری صاحب کے پیش کردہ آراء و اقوال کو 'متفقہ مسلک حق کی ترجمان' جان کر اپنے عقیدہ کے محراب میں سجایا ہوگا!!

اگر اس کا مطالعہ کوئی بالغ نظر اور واقف کار کرے گا، تو چاہے کتاب کا گہرا اثر قبول نہ کرے لیکن اس طرز تحقیق اور علم و حکمت کے اس انداز پیش کش پر حیران ضرور ہوگا۔

☆ یہ کتاب یزید کی مسلمانیت کو تسلیم کرتے ہوئے بے شمار سوالات کھڑی کرتی تب بھی بسا غنیمت تھی، مگر یہ تو ایک صحابی زادہ کو جس کے فسق پر دو انسانوں کی بھی عینی شہادت موجود نہیں ہے، اُسے کفر و استحقاقِ لعنت کی طرف گھسیٹ کر لے جاتی ہے۔ اہل سنت کے پیروکاروں کو تو سمجھنا چاہیے کہ

نواسۂ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جگر خراش شہادت کے بعد یزید اوراس کے کارندوں کے خلاف غم وغصہ کا جو ماحول بنا، وہ ایک فطری بات تھی، اسی ماحول میں وہ مطعون ہوتے ہوتے ملعون بن گیا اور اس موقع سے اہل تشیع نے جی بھر کرآگ پہ تیل ڈالنے کا کام کیا۔

☆ کیا انسانی معاشرہ میں افواہوں کی بنیاد پر غلط اور دشمنانہ فضا بنتے دیر لگتی ہے؟، یہ ایسی بات ہے جس کے لئے مثالوں کی ضرورت نہیں، تاریخ میں ایسے کتنے واقعات ہیں جو افواہوں کے انبار میں دب جاتے ہیں، کیا ٹوین ٹاور (Twin Towers) کے بارے میں آج کے انسان کو اصل حقائق کا علم ہے؟ اس حادثہ کے پیچھے جس انسان کا نام لیا جاتا ہے کیا وہ ایک اٹل سچ ہے؟ کیا یہودیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کی پاکیزہ شخصیت کے خلاف پورا فلسفہ نہیں گڑھا؟ آخر کیا وجہ ہے کہ حضرت عیسیؑ کے دعوی نبوت سے پہلے کسی ایک شخص نے بھی ان کی شان میں گستاخی کا ایک جملہ نہیں کہا، مگر دنیا جانتی ہے کہ دعوئ نبوت کے بعد یہودیوں نے ماں بیٹے کی عزت وناموس پہ کیسے کیسے کیچڑ نہیں اچھالے۔ کیا بابری مسجد میں بت رکھے جانے سے پہلے بھی وہ رام جنم بھومی تھی؟! اب وہ بابری مسمار مسجد کے سینے پر کھڑی ہے؟ کیا قومیں جھوٹی تاریخیں، جھوٹے رسوم ورواج، جھوٹے کردار اور جھوٹی کہانیاں نہیں گڑھتیں؟ کیا بودے خیالات اور خودساختہ نظریات پر قوموں کی زندگیاں استوار نہیں ہوتیں؟!

یزید کی بابت علمائے اہل سنت کے معتدل اقوال

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اکابر علمائے اہل سنت کے زریں اقوال اور قیمتی آراء پیش کردئے جائیں:

★ علامہ ابن حجر ھیتمیؒ

علامہ ابن حجر ہیتمی لکھتے ہیں: اور دوسروں نے کہا کہ یزید پر لعنت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ہمارے نزدیک وہ بات ثابت نہیں جو لعنت کی مقتضی ہو۔ غزالی نے یہی فتوی دیا ہے اوراس مسلک کی حمایت میں لمبا بیان دیا ہے اور یہی ہمارے ائمہ کے قواعد پر اور ان کی اس تصریح پر چسپاں ہے، کہ کسی معین شخص پر لعنت جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ اس کا کفر پر مرنا معلوم ہو، جیسے ابو جہل وابولہب، لیکن جس کی نسبت یہ معلوم نہ ہو اس پر لعنت جائز نہیں یہاں تک کہ کسی معین کافر پر بھی لعنت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ لعنت اللہ کی رحمت سے دور کرنے کا نام ہے جو خدا کی رحمت سے ناامیدی کو مستلزم ہے، اور یہ اسی شخص کے لائق ہے جس کا کفر پر مرنا معلوم ہو، لیکن جس کی نسبت یہ معلوم نہ ہو تو اس کے مناسب یہ نہیں ہے، اگر چہ بحالت ظاہرہ وہ کافر ہو، اس لئے کہ یہ احتمال موجود ہے کہ اس کو حسن خاتمہ نصیب ہو جائے اور اسلام پر اس کی موت ہو۔

ائمہ نے یہ تصریح کی ہے کہ کسی معین مسلمان فاسق پر لعنت جائز نہیں۔ جب تم نے یہ جان لیا کہ ائمہ نے یہ تصریح کی ہے تو تم نے یہ بھی جان لیا کہ ان ائمہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ یزید پر لعنت جائز نہیں ہے، اگر چہ وہ فاسق وخبیث تھا، اور اگر چہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ اس نے حضرت حسینؓ کے قتل کا حکم دیا تھا اور ان کے قتل پر خوش ہوا تھا، اس لئے یہ خباثت تو ہے، مگر حلال سمجھ کر نہیں، یا حلال سمجھ کر ہی تھی، لیکن کسی تاویل سے حلال سمجھتا تھا، اگر چہ وہ تاویل باطل ہو تو یہ فسق ہوا نہ کفر۔ علاوہ بریں یزید کا حضرت حسینؓ کے قتل کا حکم دینا اور اس کا خوش ہونا کسی صحیح طریق سے ثابت نہیں ہے، بلکہ جس طرح یہ نقل کیا گیا ہے، اسی طرح اس کے خلاف بھی نقل کیا گیا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے (تبصرہ ......ص:۵٦-۵۷)۔

★ علامہ حافظ ابن الصلاحؒ

ابن الصلاح جو چند اکابر ائمہ اور فقہاء ومحدثین میں ہیں وہ فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے (ثابت نہیں ہوئی) کہ یزید نے حسینؓ کے قتل کا حکم دیا، (غلطی سے) محفوظ بات یہ ہے کہ حضرت حسینؓ سے لڑنے کا حکم - جو ان کے قتل پر منتج ہوا- ابن زیاد نے دیا تھا، جو اس وقت حاکم عراق تھا۔ اب رہی یزید کے حق میں بدگوئی اور اس پر لعنت تو یہ ایمان والوں کی شان نہیں ہے، اگر چہ یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے قتل کیا، یا قتل کا حکم دیا، اس لئے کہ محفوظ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ مسلمان پر لعنت اس کے قتل کے حکم میں ہے اور حضرت حسینؓ کا قاتل قتل کی وجہ سے کافر نہ ہوگا، بلکہ وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا قتل کے ارتکاب سے تو صرف کسی نبی کا قاتل کافر ہو جاتا ہے۔

یزید کے باب میں لوگ تین فرقوں میں بٹ گئے ہیں؛ ایک فرقہ اس سے محبت ودوستی رکھتا ہے۔ دوسرا اس کی بدگوئی اور اس پر لعنت کرتا ہے اور تیسرا اس کے باب میں معتدل ومتوسط ہے، نہ اس کی دوستی کا دم بھرتا ہے، نہ اس پر لعنت کرتا ہے اور اس کے ساتھ وہ برتاؤ کرتا ہے جو دوسرے بادشاہان اسلام اور خلفائے غیر راشدین کے ساتھ کرتا ہے۔ یہی فرقہ صحیح راستے پر ہے اور اسی کا مذہب ومسلک اس شخص کے لائق ہے جو گزشتہ لوگوں کی روش سے واقف ہے اور شریعت مطہرہ کے قواعد کا عالم ہے" (تبصرہ......ص:۵۸)۔

★ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ

آپ نے اس مسئلہ پر مستقل ایک فتوی تحریر فرمایا ہے اور لعن یزید کی نہایت شدومد سے مخالفت کی ہے، ہم اس جگہ وہ فتوی عارف باللہ امام یافعیؒ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں، امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

''کسی مسلمان پر ہرگز لعنت جائز نہیں ہے اور جو کسی مسلمان پر لعنت کرے وہ خود ملعون ہے، آں حضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان لعنت باز نہیں ہوتا، کسی مسلمان پر لعنت کیوں کر جائز ہوگی، جبکہ جانوروں پر لعنت جائز نہیں ہے اور اس کی ممانعت آئی ہے، اور مسلمان کی حرمت بنص نبوی کعبہ کی حرمت سے بڑی ہے، اور یزید کا مسلمان ہونا صحیح وثابت ہے اور یہ صحیح وثابت نہیں ہے کہ اس نے حضرت حسینؓ کو قتل کیا، یا اس کا حکم دیا، اور جو چیز ثابت نہ ہو اس کو اس کے حق میں گمان کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ مسلمان کے ساتھ بدگمانی حرام ہے۔ خدا نے فرمایا: کہ تم بہت سے گمانوں سے بچتے رہو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور حضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ نے مسلمان کے خون اس کے مال اور اس کی آبرو کو اور اس بات کو کہ اس کے ساتھ کوئی برا گمان کیا جائے حرام قرار دیا ہے، اور جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ یزید نے حضرت حسینؓ کے قتل کا حکم دیا اور اس سے راضی ہوا، تو اس سے اس شخص کی انتہائی حماقت معلوم ہوسکتی ہے، اس لئے کہ خود اس کے زمانے میں جو اکابر اور وزراء وسلاطین قتل ہوئے، اگر کوئی تحقیقی اور قطعی طور پر جاننا چاہے کہ کس نے اس کے قتل کا حکم دیا اور کون راضی ہوا اور کس نے ناپسند کیا، تو اس پر قادر نہیں ہوگا، باوجودیکہ یہ قتل اس کے آس پاس اور اس کے زمانے میں ہوا ہے اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ پھر جس واقعہ کو چار سو برس کے قریب گزر چکے اور وہ بہت دور کا واقعہ ہے، وہ اس کو تحقیقی طور پر کیوں کر جان سکتا ہے، اس کی حقیقت ہرگز معلوم نہیں ہوسکتی اور جب نہیں معلوم ہوسکتی تو ہر مسلمان جس کے ساتھ حسن ظن ممکن ہو اچھا گمان رکھنا واجب ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ قتل کا ارتکاب کفر نہیں ہے، بلکہ معصیت ہے اور بہت ممکن ہے قاتل توبہ کے بعد مرا ہو اور اگر کسی پر لعنت جائز بھی ہو، مگر سکوت اختیار کیا جائے تو ساکت گناہ گار نہیں ہوگا، بلکہ اگر کوئی عمر بھر ابلیس پر لعنت نہ کرے تو قیامت کے دن یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ابلیس پر لعنت کیوں نہیں کی۔

اب رہی یزید کے لئے دعائے رحمت تو وہ جائز ہے بلکہ مستحب ہے، اس لئے کہ [**اللھم اغفر للمؤمنین والمؤمنات**] میں وہ بھی داخل ہے۔ واللہ اعلم'' کتبہ الغزالی'' (تبصرہ......ص: ۵۹-۶۱)۔

٭امام ذہبیؒ کی رائے

''یزید ان لوگوں میں سے ایک ہے جس سے ہم نہ محبت رکھتے ہیں اور نہ اس کو برا بھلا کہتے ہیں، وہ اموی اور عباسی اور مختلف علاقوں کی حکومتوں کے بادشاہوں کی طرح ہے، بلکہ ان میں بعض اس سے بھی بدتر ہیں، اس کا معاملہ اس وجہ سے اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ وہ نبی ﷺ کی وفات کے جلد ہی بعد یعنی صرف انچاس (۴۹) سال کے بعد زمام حکومت سنبھالتا ہے، جبکہ ابھی صحابہ کرامؓ موجود تھے، مثلاً ابن عمرؓ جو اس سے، اس کے والد اور دادا سے زیادہ خلافت کے حق دار تھے (سیر اعلام النبلاء ۴/۳۶)

٭''اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء'' کا فتوی

یزید کے معاملے میں لوگ دو کناروں پہ کھڑے ہیں اور ایک گروہ بیچ میں ہے۔ ان تینوں گروہوں کے اقوال میں مبنی بر اعتدال قول یہ ہے کہ یزید مسلمان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا، اس کے اندر کچھ اچھائیاں بھی تھیں اور کچھ خرابیاں بھی، یہ حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں پیدا ہوا، یہ کافر نہیں تھا، لیکن اس کے سبب حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، پھر حرہ والوں کے ساتھ اس نے جو کیا سو کیا، یہ نہ تو صحابئ رسول تھا، نہ ہی اولیائے صالحین میں سے تھا۔ شیخ لاسلام ابن تیمیہؒ نے فرمایا: یہی بات عام ارباب عقل وخرد، اصحاب علم اور اہل سنت والجماعت نے کہی ہے۔

لعن یزید کے معاملے میں بھی لوگوں کے تین گروہ ہیں: ایک گروہ اس پر لعنت بھیجتا ہے۔ ایک گروہ اس سے محبت کا دم بھرتا ہے۔ ایک گروہ اس کو نہ تو برا بھلا کہتا ہے نہ ہی اس سے محبت رکھتا ہے۔ امام احمد بن حنبل سے یہی تصریح منقول ہے اور آپ کے اصحاب اور دوسرے عام مسلمانوں میں سے اعتدال پسندوں کا یہی مسلک ہے، یہی مبنی بر عدل قول ہے، کیونکہ یزید کا فسق بایں طور ثابت نہیں ہے کہ وہ لعنت کا مستحق ٹھہرے، بنابریں معین فاسق کا نام لے کر لعنت کرنا صحیح نہیں ہے، یا تو اس وجہ سے کہ ایسا کرنا حرام ہے، یا احتیاط متقاضی ہے۔

حضرت عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، اس کا نام عبداللہ اور لقب حمار تھا، وہ آپ ﷺ کو ہنسایا کرتا تھا۔ بار بار شراب پینے کی وجہ سے، آپ ﷺ نے اس کو کوڑے مارے، اس پر ایک صحابی کی زبان سے نکل گیا: **اللھم العنه**۔ اے اللہ! اس پر تیری لعنت ہو۔ آپ ﷺ نے سنا تو ارشاد فرمایا: اس پر لعنت مت بھیجو، کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے (صحیح البخاری) اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''مومن پہ لعنت بھیجنا اس کو قتل کرنے کے مرادف ہے''۔

یہی معاملہ ان وعیدوں کا ہے جو یتیم کے مال کھانے، زنا کرنے اور چوری کرنے کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں، ان گناہوں کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ معین طور سے فلاں ایسا کرنے والا دوزخی ہے، مقتضی کی جانب سے مُقتضٰی کے تخلف کا جواز کی وجہ سے اور گناہوں کو مٹانے والے دیگر اعمال کی وجہ سے۔ یہ باتیں تو وہ ہیں جن کی بنا پر یزید کو سب وشتم کرنا اور اس پر لعنت کرنا ممنوع ہے۔ لیکن جہاں تک اس سے محبت نہ کرنے کا سوال ہے،

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ذات سے وہ اچھے اعمال صادر نہیں ہوئے، جو محبت کا سبب بنتے ہیں، لہٰذا اس کی حیثیت عام ملوک وسلاطین کی سی ہوگی، اس قماش کے لوگوں سے محبت مشروع نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی سیرت اور حضرت حسینؓ اور اہل حرہ کے معاملے میں اس کا کردار اس کے فسق اور ظلم کا متقاضی ہے‘‘ **(اللجنة الدائمة للبحوث العلمية و الا فتاء. فتوی رقم: ۱۴۶۶۔ المملكة العربية السعودية)**

مقالہ نگار نے اس موضوع کا انتخاب کیوں کیا؟

انسان کے لئے ایمان واسلام سے بڑھ کر کوئی دولت اور نعمت نہیں ہو سکتی، یہ ایسی نعمت ہے جو توفیق الٰہی کے بغیر کسی کو نہیں ملتی، ایمان کا سارا معاملہ خدا اور بندے کے درمیان ایک خفیہ معاہدے جیسا ہے، لیکن اس معاہدے کا اظہار زبان سے اور اس کے تقاضوں کا اظہار اعمال وجوارح سے کرنا بھی ضروری ہے۔ حضرت حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کی شہادت کا واقعہ بڑا ہی اندوہناک اور دلفگار تاریخی واقعہ ہے، اس حادثۂ فاجعہ کو انجام دینے والے شرعی طور سے قابل گردن زدنی ہیں، انہیں عبرت ناک سزا ملنی چاہیے تھی، اگر ایسا نہیں ہوا تو اس قتل کی سازش میں ملوث، کمینہ خصلت لوگوں پر آدمی جس قدر چاہے اپنے جذبات محبت کے نتیجے میں غم و غصہ کا اظہار کرے تو ایک فطری بات ہوگی، لیکن کسی بھی کلمہ گو مسلمان کو ایمان ہی سے محروم کر دینے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ایمان والوں کی شان تو یہ بتائی گئی ہے: **{يقولون ربنا اغفر لنا و لاخواننا الذين سبقونا بالايمان. ولا تجعل في قلوبنا غلا للذين آمنوا ربنا انك رءوف رحيم}** **(الحشر: ۱۰)** (وہ اہل ایمان)‘‘ کہتے ہیں: اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے، جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لئے کوئی بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب! تو بڑا مہربان ہے‘‘۔

یوں بھی شریعت کا تقاضا ہے کہ ہمارا دل کینہ کپٹ اور بغض وحسد سے پاک رہے، اس کی شناعت پہ سردست روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ نے ایک روایت مسند احمد سے نقل کی ہے اس کا ذکر کر دیا جانا ضروری ہے، کیونکہ یہ روایت ہمارے مدعا کو واضح کرتی ہے:

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ مسلسل تین دن تک یہ ہوتا رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے کہ عن قریب تمہارے سامنے ایک ایسا شخص آنے والا ہے، جو جنتی ہے اور اور ہر بار وہ آنے والے صاحب انصار میں سے تھے، یہ دیکھ کر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو جستجو ہوئی کہ یہ آخر کیا عمل کرتے ہیں کہ جس کی بنا پر حضور ﷺ نے ان کے بارے میں بار بار بشارت سنائی، چنانچہ وہ ان کے پاس گئے اور کہا: میرے والد سے میری کہا سنی ہوگئی ہے اور میں نے قسم کھالی ہے کہ تین دن تک آپ کے گھر میں نہ آؤں گا، لہٰذا آپ مجھے اپنے یہاں رات گزارنے کی اجازت دے دیں، تاکہ یہ دن گزر جائیں، انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں: انہوں نے تین شب گزارے مگر انہیں ان کے اندر کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی (یعنی نہ قیام اللیل، نہ دیگر عبادات، ہاں کروٹ بدلتے تو زبان میں ذکر الٰہی ہوتا) آخر کار انہوں نے ان سے پوچھ ہی لیا: بھائی آپ کیا عمل ایسا کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے آپ کو ایسی عظیم بشارت سنائی؟ انہوں نے کہا: آپ نے میری عبادت کا حال تو دیکھ ہی لیا ہے، ہاں ایک چیز شاید اس کی موجب بنی ہو اور وہ یہ ہے کہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کینہ کپٹ نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی ایسی بھلائی پر جو اللہ نے اسے عطا فرمائی ہو اس سے حسد کرتا ہوں‘‘۔ **لا أجد في نفسي غلا لأحد من المسلمين و لا أحسده على خير أعطاه الله تعالىٰ اياه ابن كثير** (۴/ ۲۳۱۴)۔

کسی بھی مسلمان کے گفتار وکردار میں غلطی نظر آئے تو اس کو ضرور غلط کہا جائے، کسی ناہنجار مسلمان دین وشرع کے ساتھ کھلواڑ کرے تو اس کے خلاف غم وغصہ کا اظہار ضرور کیا جائے، مگر کسی سے نفرت اور بغض وحسد اس حد تک پہنچ جائے کہ آدمی اُس کو ایمان ہی سے محروم کرنے پر تل جائے تو اس کی اجازت کسی انسان کو نہیں دی جاسکتی، الا یہ کہ وہ اپنے وسیع تر مفہوم میں کفر و ارتداد کا شکار ہو چکا ہو۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے جو رشتہ ہوتا ہے آخر وہ ایمان کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟ لیکن جب ایک مسلمان اپنے دوسرے بھائی کے لئے کینہ، کپٹ اور حسد وجلن کے جذبات اپنے دل میں پاتا ہے تو گویا اُس کے حق میں ایمان کی نفی کرتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں اعتدال پسند اکابر علماء کے جو آراء نقل کئے گئے ہیں، وہی طریق وسط، جادۂ حق اور افراط وتفریط سے پاک پگڈنڈی ہے، وہی میری راہ ہے۔ اس کے بعد یہ عرض ہے کہ اس راہ اعتدال اور مسلک حق کی اس توضیح کے بعد جس کی متوازن ومعتدل ترجمانی حضرت محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے فرمائی ہے مقالہ نگار اس خواہش کا اظہار کرنا چاہے گا کہ حضرت محدث جلیل کے پیش کردہ فکر وخیال کو جو اہل حق علماء کے خیالات سے مزین ہے، ازہر الہند ’’جماعت دارالعلوم دیوبند‘‘ کا مسلک قرار دیا جائے، کیونکہ حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے فکر وخیال کے مقابلے میں یہی اقرب الی الصواب ہے۔ واللہ المستعان۔ □□

سنن سعید بن منصور کی بازیافت اور تحقیق

ڈاکٹر محمد صہیب (الہ آباد)

بیسویں صدی کے جن علما کے کارناموں کو ثبات و دوام حاصل ہوا، ان میں ایک اہم نام محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کا بھی ہے۔ علامہ اعظمی کی عالمانہ شان کے مختلف پہلو ہیں، وہ محدث و محقق بھی ہیں، فقیہ و ناقد بھی ہیں، شاعر و ادیب بھی ہیں، اور ان سب سے ہٹ کر وہ سیاست کے پیچ و خم سے نہ صرف باخبر بلکہ اس کے فعال کردار بھی رہے ہیں، لیکن ان تمام جہتوں سے بالاتر ان کی شخصیت کا وہ پہلو ہے، جس میں وہ بحیثیت محدث جلوہ گر ہیں۔ حدیث کے نادر و کمیاب نسخے جن پر صدیوں کی گرد تھی، علامہ الاعظمی کی تحقیق و تعلیق سے جگمگا اٹھے، جن کا احاطہ مجھ جیسے ہیچ کارہ کے بس کی بات نہیں، لیکن ایک خوشگوار فریضہ سمجھتے ہوئے علامہ اعظمی کی تحقیق سے شائع ہونے والی ''کتاب السنن'' کا ایک سرسری جائزہ پیش خدمت ہے۔

فقہی ترتیب پر کتاب الطہارۃ سے کتاب الوصایا تک مرتب کردہ مجموعۂ احادیث کو ''سنن'' کہا جاتا ہے۔[1] سنن کو پہلے ابواب کہا جاتا تھا، ''الابواب'' مصنفہ امام شعبی (ولادت ۱۹ھ) اس طرز کی پہلی کتاب ہے۔[2] سنن کثرت سے لکھی گئیں، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارقطنی، سنن بیہقی، سنن ابن حبان، سنن ابومسلم الکشی، سنن ابوقرہ، سنن ابوعلی بن السکن، سنن حافظ سعید بن منصور خراسانی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

حافظ سعید بن منصور بن شعبہ خراسانی، ابوعثمان مروزی، طالقانی، ایک بلند پایہ محدث ہیں۔ جوزجان میں پیدا ہوئے، بلخ میں نشو و نما پائی اور حصول علم کی خاطر شہر شہر پھرے، آخر میں مکہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔[3] سن ولادت کے بارے میں اصحاب سیر خاموش ہیں، البتہ ان کی وفات مشہور قول کے مطابق ۲۲۷ ہجری میں ہوئی۔[4]

سعید بن منصور نے جن محدثین عظام سے کسب فیض کیا، ان کی ایک لمبی فہرست ہے، اسی طرح ان سے جن ائمہ حدیث نے روایتیں کی ہیں، ان کی بھی کثیر تعداد ہے۔ مشہور شیوخ میں امام مالک، لیث، فلیح، ابوعوانہ، ابن عیینہ، حماد بن زید وغیرہ ہیں اور روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، امام مسلم، ابوداؤد، ابوثور، ابوبکر الاثرم، الکدیمی، ابوحاتم، ابوزرعہ، وغیرہ ہیں۔[5] امام بخاری نے بھی ایک واسطے سے سعید بن منصور سے روایت کی ہے۔[6]

عیسیٰ بن بشیر کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن عبداللہ بن نمیر سے سعید بن منصور کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ ''ثقہ'' ہیں۔[7] سلمہ بن شبیب فرماتے ہیں: ''ذکرته لأحمد فأحسن الثناء علیه وفخم أمره''[8] (میں نے سعید بن منصور کا ذکر احمد بن حنبل سے کیا تو احمد بن حنبل نے ان کی تعریف کی اور ان کے کام کی عظمت بیان فرمائی۔) حافظہ کا عالم یہ تھا کہ حرب فرماتے ہیں: ''أملی علینا نحواً من عشرة آلاف حدیث من حفظه''[9] (ہم کو انھوں نے تقریباً دس ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں۔)

ابوحاتم کے بیان ''ممن جمع وصنف''[10] (سعید بن منصور احادیث کو جمع کرنے والے اور صاحب تصنیف ائمہ میں سے ہیں۔) اور حاکم کی تصریح ''وله مصنفات''[11] سے پتہ چلتا ہے کہ سعید بن منصور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''کتاب السنن'' بھی سعید بن منصور کی علمی یادگار ہے، یہ حدیث کا ایک عظیم ذخیرہ ہے، جس کو انھوں نے آخری عمر میں مکہ مکرمہ میں مرتب فرمایا تھا۔[12] حرب کے مطابق سعید بن منصور نے ان کو ۲۱۹ ہجری میں حدیثیں املا کرائیں، اور اس کے بعد سعید بن منصور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے، یہ بھی طے ہے کہ مشہور قول کے مطابق ۲۲۷ ہجری یا اس کے آس پاس سعید بن منصور کا انتقال ہوا۔ ظاہر ہے کہ کتاب السنن کی تصنیف عمر کے آخری حصہ میں ہی ہوئی۔

ابن کثیر سعید بن منصور کے تذکرے میں کتاب السنن کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

صاحب السنن المشهورة التي لا یشارکه فیها إلا القلیل[13]

(اس مشہور سنن کے مصنف ہیں جس میں چند ہی لوگ ان کے ہم پلہ ہو سکتے ہیں)

کتاب السنن احکام کے سلسلے میں ایک جلیل القدر کتاب ہے، صحیحین اور سنن اربعہ سے قدیم ترین بھی ہے، اس کتاب میں احادیث و آثار کے علاوہ صحابہ کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات و حادثات، شرعی امور میں صحابہ کے فتاویٰ اور ان کی آرا، گویا اس وقت کے پورے معاشرے کی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح اس دور کی بین الاقوامی پالیسی بالخصوص ایرانیوں اور رومیوں کے ساتھ خلافت راشدہ کے رشتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے، جن کا ذکر بقول ڈاکٹر حمید اللہ تاریخ کی دوسری متداول کتابوں میں نہیں ملتا۔ محمد بن علی بن زید الصائغ اور احمد نجدہ بن عریان نے سعید بن منصور سے کتاب السنن کی روایت کی ہے۔

اگرچہ اس کتاب کا ذکر ابن سعد، امام بخاری، اور رازی نے نہیں کیا

ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کتاب کی شہرت نہ تھی، بہت سے علماے حدیث نے اس کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ چنانچہ قاضی اطہر مبارکپوری تحریر فرماتے ہیں:

ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث حافظ ابوالعباس احمد بن عبداللہ محب الدین، طبری، مکیؒ متوفی ۶۹۴ھ ہجری نے حج ومناسک کی مشہور کتاب ''القریٰ لقاصدام القریٰ'' میں سنن سعید بن منصور سے، بہت زیادہ احادیث وآثار نقل کئے ہیں، اس کا شاید ہی کوئی صفحہ اس کی احادیث وآثار سے خالی ہو۔[۱۴]

احادیث وآثار اور اسلامی تاریخ کا یہ قیمتی خزانہ قریب قریب مفقود ہی تھا، اس کے مخطوطات کے بارے میں محققین کو کوئی علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں، بعض تحقیقی ضروریات کے لئے مشہور محقق ڈاکٹر حمیداللہ کا ۱۳۸۰ ہجری میں استانبول کا سفر ہوا۔[۱۵] وہاں کی ایک بڑی لائبریری ''محمد پاشا کوپریلی لائبریری'' نے مخطوطات کے سمندر میں غوطہ لگانے والے اس نامور محقق سے فائدہ اٹھانا چاہا، چنانچہ اس کتب خانے کی انتظامیہ نے ڈاکٹر حمیداللہ کو مخطوطات کی ترتیب، تہذیب اور تمییز کی ذمہ داری سونپی۔

ڈاکٹر صاحب نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور مخطوطات کی جانچ پھٹک شروع کی، مخطوطات کی تحقیق کے دوران ان کو ایک نسخہ ملا جس کی پیشانی پر ''مصنَّف ابن ابی شیبہ'' لکھا ہوا تھا، لیکن اس کے مشمولات کو دیکھ کر انھیں شک ہوا کہ یہ مصنَّف ابن ابی شیبہ ہے یا کوئی اور کتاب؟ اب ڈاکٹر حمیداللہ نے 'کوپریلی' کے اس نسخے کا مقابلہ مصنَّف کے دوسرے نسخوں سے کرنا شروع کیا، جن دوسرے نسخوں سے ڈاکٹر صاحب نے مقابلہ کیا ان میں ایک 'توپ قاپی' اور دوسرا 'نورعثمانیہ' کا تھا۔ موازنے سے انکشاف ہوا کہ کوپریلی والے نسخے اور ان دونوں نسخوں میں نمایاں فرق ہے اور یہ الگ الگ کتابوں کے مخطوطے ہیں یعنی کوپریلی کا مخطوطہ ایک الگ کتاب ہے اور توپ قاپی اور نورعثمانیہ والے مخطوطے ایک دوسری کتاب کے نسخے ہیں۔ چند ایسے قرائن بھی دیکھنے کو ملے جن سے یہ ثابت ہوگیا کہ زیر بحث قلمی نسخہ ''مصنَّف ابن ابی شیبہ'' کا مخطوطہ نہیں بلکہ 'سنن سعید بن منصور' کا ہے۔

اس مخطوطے میں ایک جگہ آٹھ سطر میں سعید بن منصور کا ترجمہ بھی لکھا ہوا ملا اور تین سطر میں ابواب وکتب کا بھی تذکرہ تھا:

باب الحث علی تعلیم الفرائض، من کتاب الفرائض، کتاب ولایة العصبة، کتاب الوصایا، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب الجهاد۔

مخطوطے کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے:

أخبرنا ... الأنماطي قال أنبأ ... الکرجي رحمه الله، قال أنبأ أبو علي ... بن شاذان قراءة علیه وأنا أسمع قال أنا ... السجستاني أنا محمد بن علي بن الصائغ، قال حدثنا سعید بن منصور[۱۶]

مندرجہ بالا عبارت ملاحظہ ہو، اس میں کہیں بھی ابوبکر بن ابی شیبہ کا ذکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ کی رائے ہے کہ کتاب کے سرورق پر ''مصنَّف ابن ابی شیبہ'' کا ذکر محض کتابت کی غلطی ہے، یا اس مخطوطے کے مالک سے نام لکھنے میں سہو ہوگیا ہے۔

ومن المحتمل أن الذي کتبه التبس عنده ابن شعبة (أبي سعید بن منصور بن شعبة) بابن أبي شیبة۔[۱۷] (شاید کاتب کو ابن شعبہ (سعید بن منصور بن شعبہ) اور ابن شیبہ میں اشتباہ ہوگیا۔)

فاضل محقق ڈاکٹر حمیداللہ اندرونی اندراجات اور پختہ شہادتوں کی بنیاد پر اسی نتیجے پر پہنچے کہ یہ مخطوطہ سعید بن منصور کی سنن کا ہے۔ دمشق کے ایک گاؤں ''عبادیہ'' میں لکھا گیا، ۷۲۵ ہجری میں اس کی کتابت پوری ہوئی۔ اس کے کاتب محمد بن احمد بن علی خطیب ہیں۔

''کتاب السنن'' کی بازیافت تو ہوئی، مگر تیسری جلد کی شکل میں! اس ضخیم کتاب کے بقیہ حصے دسترس سے باہر ہی رہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ کو ''ما لا یدرک کله لا یترک کله'' کے پیشِ نظر اس نسخے کی حفاظت کی فکر ہوئی، یہ بھی معلوم تھا کہ اس کتاب کو محفوظ کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کی اشاعت کی تدبیر نکل آئے، چنانچہ ڈاکٹر حمیداللہ نے علم دوست شخصیت مولانا محمد میاں سملکی (بانی مجلس علمی) سے رابطہ کیا اور ان کے پاس اس نسخے کو بھیج دیا۔

مولانا محمد میاں سملکی نے اس ذخیرۂ حدیث کی قدر و قیمت اور قدامت کو دیکھتے ہوئے اس کی طباعت واشاعت کا فیصلہ کیا، اور علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی سے اس نسخے کی تصحیح وتحقیق کی درخواست کی، جسے علامہ نے منظور کرلیا۔

سنن سعید بن منصور کی تحقیق آسان نہ تھی، اس لیے کہ صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہوسکا تھا، اور کسی نسخے کی تحقیق خود اسی نسخے سے کیسے ممکن تھی؟ لیکن اس کام کے سپرد کرنے والوں کی نظر بھی خوب تھی! انھیں یقین کی حد تک اعتماد تھا کہ مولانا الاعظمی بحرِ تحقیق میں غواصی کر کے موتی چن لائیں گے اور ''عقد فرید'' تیار ہوجائے گا۔ علامہ اعظمی سنن سعید ابن منصور کے سلسلے میں اپنی جد وجہد کے بارے میں خود لکھتے ہیں کہ:

إنا تجشمنا في تحقیق الکتاب وتصحیح نصوصه عناء کثیرا لأن النسخة کانت وحیدة فلم نجد بدا من أن نتصفح ألوف الصفحات ونفتش عن أحادیث هذا الکتاب في غیره من جوامع الحدیث۔[۱۸]

(اس کتاب کی تحقیق اور نصوص کی تصحیح میں ہم نے بہت مشقتیں برداشت کیں، اس لیے کہ نسخہ ایک ہی تھا، چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ہم ہزاروں صفحات کی چھان بین کریں اور اس کتاب کی احادیث کو دوسرے

مجموعہائے حدیث میں تلاش کریں۔)

کتاب السنن کے سلسلے میں علامہ اعظمی کی جاں سوزی کا اندازہ اس وقت کے محققین کو بھی تھا۔ صحرائے تحقیق کے شہسوار اور مخطوطات کے ایک عظیم سراغ رساں مولانا ابوالوفا افغانی کو جب معلوم ہوا کہ علامہ اعظمی سنن کی تحقیق کر رہے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، اس نادر نسخے کی کیفیت کے سلسلے میں ان کو تجسس ہوا، ساتھ ہی اس کی تحقیق کے دوران علامہ اعظمی کو درپیش مسائل ومشکلات کا بھی انھیں شدت سے احساس تھا۔ مولانا اعظمی کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۲۴ شوال ۱۳۸۶ ہجری میں وہ لکھتے ہیں:

سعید بن منصور کی سنن کا کیا اندازہ ہے، ایک جز ہوگا یا زائد، غالباً یہ جز رابع ہے، کہاں سے شروع ہوتی اور کن مباحث پر مشتمل ہے، ایک ہی نسخہ ہے غالباً تصحیح میں مشکلات بہت پیش آئے ہوں گے، کیا اس پر بھی آپ کی تعلیق ہے۔[19]

سنن سعید بن منصور کے سلسلے میں علامہ الاعظمی نے مندرجہ ذیل خدمات انجام دیں:

۱-احادیث کی تخریج:

حدیث جب دوسرے ماخذ میں ہو اور اسلوب مختلف ہو تو حدیث کے معنی ومفہوم تک رسائی کے لئے تخریج سے مدد ملتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس دوسرے ماخذ میں تشریح وتعلیق بھی ہوتی ہے، جس سے اس کتاب کے مطالعے کے وقت پیش آنے والے اشکالات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

۲-احادیث کے مبہم اور غریب الفاظ کی تشریح وتوضیح

۳-بہت سے مقامات پر حنفی مسلک کی وضاحت۔

حدیث کے دوسرے مجموعوں کے بہ نسبت ''سنن'' کی تعلیق وتحقیق میں علامہ اعظمی فقہ حنفی کے شارح کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ علامہ اعظمی کے اس طرز نو کے سلسلے میں ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی نے ایک اہم نکتے کی طرف متوجہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

علامہ اعظمی پہلی دفعہ اپنی تعلیقات کے دوران حنفی فقیہ نظر آتے ہیں اور مسلک حنفیہ کا دفاع کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جب کہ مسند حمیدی میں بھی فقہی مقامات آئے تھے، لیکن اس میں کہیں بھی کسی فقہی بحث سے کوئی تعرض نہیں کیا، اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مسند حمیدی مرفوع احادیث کا مجموعہ ہے، اور اس کے مصنف کا مقصد فقہی نقطۂ نظر سے حدیثوں کو جمع کرنا نہیں تھا، لہٰذا علامہ اعظمی نے بھی یہ موزوں اور مناسب نہیں سمجھا کہ اس کتاب پر فقہا کے اقوال اور فقہی مباحث سے حاشیہ آرائی کریں۔ رہا سنن سعید بن منصور کا معاملہ تو اس کی تصنیف کا مقصد ہی اسلامی قانون وشریعت کے مراجع کی جمع وترتیب ہے، اس لیے یہاں علامہ اعظمی کو میدان کھلا ہوا اور وسیع نظر آیا، اور اس نقطۂ نظر سے آپ نے اس کی تحقیق اور اس پر تعلیق وتحشیہ کی خدمت انجام دیں، هذا ما عندي والله أعلم بالصواب۔[20]

۴-صاحب مخطوطہ سے مصنف تک کے رواۃ کے تراجم۔

۵۔غیر معروف جگہوں کا مختصر تعارف۔

۶۔مسائل میں مذاہب اربعہ کی وضاحت۔

علامہ نے ''کلمۃ المحقق''میں مصنف تک اپنی سند بھی بیان کی ہے۔

مناسب ہے کہ اس موقع پر علامہ اعظمی کی تعلیقات کی چند مثالیں بھی درج کردی جائیں۔

۱-ج ۱ ص ۸۱ ح ۳۱۰- سعيد قال: نا هشيم عن يونس عن الحسن قال: ميراث المرتد لورثته۔

اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ علامہ اعظمی سنن کی تعلیق کے دوران اہم مسائل پر فقہا اور ائمہ کی رائے اور ان کا مسلک بھی اختصار کے ساتھ بیان کرتے چلتے ہیں، اب اس موقع پر اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

جب کوئی مرتد حالت ارتداد میں مرجائے، یا قتل کردیا گیا ہو یا دارالحرب چلا گیا ہو اور قاضی نے بھی اس کے دارالحرب جا ملنے کا فیصلہ کردیا ہو تو ایسی صورت میں اس کے مال کا وارث کون ہوگا؟ مولانا اعظمی نے اس روایت کے ذیل میں مرتد کی میراث سے متعلق فقہا کے مذاہب بیان کئے ہیں، فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو مال اس شخص نے حالت اسلام میں کمایا ہے اس کے وارث مسلم ورثا ہوں گے اور جو مال حالت ارتداد میں کمایا ہے اس کو بیت المال میں ڈال دیا جائے گا۔ امام ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک اس کی پوری کمائی کے مالک اس کے مسلم ورثا ہوں گے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک اسلام وارتداد دونوں حالتوں میں کمائے ہوئے مال کو بیت المال میں ڈال دیا جائے گا۔ مولانا الاعظمی ''سراجیہ'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جو مال مرتد نے دارالحرب کوچ کر جانے کے بعد کمایا ہے، اس مال کی حیثیت بالاجماع ''فئ'' کی ہوگی۔

۲-ج: ۱ ص ۲۸۲ ح: ۱۱۷۶- حدثنا سعيد قال: نا هشيم قال: أنا يونس عن الحسن ... قال: انطلق الى نوى، أو أراد أو أراد ... الخ۔

''أو أراد أو أراد'' پر علامہ اعظمی حاشیہ لکھتے ہیں:

أرى أن الناسخ أعاد سهوا أو أراد، يدل عليه ما في عب، وقد أخرجه بهذا الإسناد سواء (۱۵۶/۳)

یعنی میرا خیال ہے کہ کاتب نے بھول سے ''أو أراد'' دومرتبہ لکھ دیا ہے، مصنَّف عبدالرزاق کی حدیث اس کی دلیل ہے، عبدالرزاق نے اس روایت کو بعینہٖ اسی سند سے نقل کیا ہے۔ (۱۵۶/۳)

۳- ج: ۲ ص ۲۷۸ ح: ۲۶۹۲- حدثنا سعید قال: نا أبو الأحوص عن الأسود بن قیس عن شبر بن علقمۃ الخ۔

اصل نسخے میں ''بشر'' تھا، علامہ اعظمی فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے، صحیح ''شبر بن علقمۃ'' ہے جیسا کہ متن میں مذکور ہے، علامہ نے دلیل دی کہ شبر بن علقمہ کا تذکرہ ''الجرح والتعدیل'' میں موجود ہے۔ علامہ ابن شاکر مصری نے بھی اپنی تصنیف ''المحلّی'' (۷/ ۳۳۶) میں بشر بن علقمہ ہی لکھا ہے۔ لیکن علامہ الاعظمی نے ابن شاکر پر بھی نقد کیا: ''ولم یتنبہ أنہ خطأ'' یعنی ابن شاکر کو تنبہ نہ ہوا اور وہ بشر بن علقمہ لکھ گئے، جو کہ غلط ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کتاب پر ایک وقیع مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں انھوں نے سعید بن منصور کے تذکرے اور کتاب کی اہمیت وافادیت کے ساتھ مخطوطے کے انکشاف پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دو جلدوں میں یہ کتاب ۱۳۸۷ ہجری/ ۱۹۶۷ اور ۱۳۸۸ ہجری/ ۱۹۶۸ میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

سنن سعید بن منصور کی تحقیق میں علامہ الاعظمی کی کوششوں کو دیکھ کر ڈاکٹر حمید اللہ نے مولانا ابراہیم کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

مولانا الاعظمی سنن سعید بن منصور کی تحقیق کیا کر رہے ہیں، کتاب کو چار چاند لگا رہے ہیں۔[۲۱]

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جب کتاب السنن دیکھی تو علامہ اعظمی کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں انھوں نے علامہ کی اس عظیم خدمت کا اعتراف اس انداز میں کیا:

پرسوں کتاب السنن لسعید بن منصور کا ایک نسخہ ملا، اور کل کسی طرح وقت نکال کر بہت کچھ پڑھ گیا، سبحان اللہ، صلِّ علی، آپ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کیا عجیب وغریب کارنامہ انجام دیا ہے، دنیائے علم وتحقیق آپ دونوں حضرات کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے اور احسان مند ہو، کم ہے آپ نے ادھر چند سالوں میں کیا کچھ کر دکھایا، جب اس کا خیال کرتا ہوں تو ہر بن مو سے آپ کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔[۲۲]

مولانا عبد الماجد دریابادی نے ''کتاب السنن'' پر تبصرہ لکھا ہے۔ کتاب کے اسلوب اور طرز تحقیق کو دیکھ کر انھیں حیرت بھی ہوئی اور رشک بھی آیا، اور علامہ اعظمی کی اس خدمت کو والہانہ انداز میں سراہا:

کتاب کی تہذیب وتدوین اور تحشیہ وغیرہ کا کام مولانا اعظمی کا کیا ہوا ہے، اور حیرت ہوتی ہے ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے ہوئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہوگئی ہے۔[۲۳]

مولانا شاہ معین الدین ندوی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''سنن سعید بن منصور المتوفی ۲۲۷ ہجری مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اسکوایڈٹ کیا ہے، ان کا نام تصحیح وتحشیہ اور ترتیب وتہذیب وغیرہ کی صحت وخوبی کی پوری ضمانت ہے......ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوا جس کے لئے فاضل مرتب اور مجلس علمی دونوں اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔''[۲۴]

سنن سعید بن منصور کی پوری تحقیق کا محور علامہ اعظمی کی یادداشت اور وسعت مطالعہ ہے۔ کتاب السنن علامہ کی عظمت اور تحقیق وتدوین میں ان کی نگاہِ دوررس کا ایک اور ثبوت ہے، جس کو انھوں نے خون جگر میں قلم ڈبو کر تیار کیا اور وقف عام کر دیا۔ یہ کتاب حدیث کے میدان میں ہی نہیں بلکہ دیگر علوم کے طرز تحقیق کے لیے بھی مشعل راہ اور نقش لازوال ہے۔ □□

حواشی:

۱- ابوداؤد ا: ۳
۲- حجیت حدیث ص ۱۴۶ مولانا محمد تقی عثمانی
۳- تہذیب التہذیب ۴: ۷۹
۴- ایضاً ص ۸۰
۵- طبقات الحفاظ ص ۱۸۲ جلال الدین سیوطی
۶- شذرات الذہب ۲: ۱۶۲ ابن عماد حنبلی
۷- الجرح والتعدیل ج: ۲ قسم: ا ص ۶۸
۸- تہذیب التہذیب ۴: ۸۰
۹- ایضاً
۱۰- طبقات الحفاظ ص ۱۸۲
۱۱- تہذیب التہذیب ۴: ۸۰
۱۲- الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۷
۱۳- البدایہ والنہایہ ۱۰: ۲۱۵ ابن کثیر
۱۴- مآثر ومعارف ص ۲۱۹ قاضی اطہر مبارکپوری
۱۵- ڈاکٹر حمید اللہ مولانا الاعظمی کے نام ۸ ر رمضان ۱۳۹۰ ہجری کے ایک مکتوب میں ترکی کے مخطوطات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''ترکی میں تقریباً دس لاکھ قلمی کتابیں سرکاری کتب خانہ میں ہیں، صرف استانبول ہی میں کچھ نہیں تو ڈھائی لاکھ مخطوطے ہوں گے اور الحمد للہ اچھی حالت میں ہیں۔'' (المآثر ج ۱۲ ش ۲ ص ۸۶)
۱۶- کتاب السنن ص ۶
۱۷- ایضاً
۱۸- کتاب السنن۔ کلمۃ المحقق
۱۹- المآثر، اپریل تا جون ۲۰۰۹ء ص ۶۵
۲۰- حیات ابوالمآثر ج ۲ ص ۵۸۱-۵۸۲
۲۱- حیات ابوالمآثر ص ۳۰۹
۲۲- حیات ابوالمآثر ج ۲ ص ۵۸۰
۲۳- صدق جدید ۲ ر اگست ۱۹۶۸ء
۲۴- معارف ج: ۱۰۲ ش: ا ص ۴

محدث اعظمیؒ اور علامہ ناصر الدین البانیؒ "الألباني شذوذه وأخطاؤه" کے تناظر میں

مولانا اشرف عباس قاسمی (دار العلوم دیوبند)

محدث کبیر، امیر الہند، ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، برصغیر میں خدمت حدیث کی تابناک روایات کے امین تھے، عالم اسلام کے مایۂ ناز محدث، عربی زبان وادب کے ماہر اور وسیع النظر عالم دین تھے، آپ نے زبان وقلم کے ذریعے علم حدیث کی جو وقیع نادر خدمات انجام دی ہیں، ان سے علماء سلف کی یاد تازہ ہوگئی، ہندوستان کی تاریخ میں ایسی بارعب اور پرجلال شخصیت بہت کم گزری ہے، جس کے آگے جبین عقیدت خم کرنے اور جس کے علم وفضل سے استفادے کے لیے دنیائے اسلام کی عظیم شخصیات اس نیازمندی کے ساتھ صف بہ صف کھڑی ہوکر اس کی عظمت کو سلام کررہی ہوں، اس لیے شیخ الازہر، شیخ عبدالحلیم محمود نے "أكبر علماء العالم الاسلامي" (دنیا کے سب سے بڑے عالم) کا جب آپ کو خطاب دیا تو اہل علم کو لگا کہ شیخ ازہر کی طرف سے یہ حقیقت سے قریب تر خطاب ہے۔

ابو المآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ

مولانا اعظمیؒ کی ولادت ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء میں مئو میں ہوئی، والد محترم جناب مولانا صابر صاحبؒ، جو حضرت تھانویؒ کے مسترشد تھے، انھوں نے خالص دینی خطوط پر آپ کی تربیت کی، ابتدائی تعلیم مئو، گورکھپور اور بنارس وغیرہ میں حاصل کرنے بعد دار العلوم دیوبند کا رخ کیا، جہاں اس وقت اساطین علم وفن کی کہکشاں موجود تھی، آپ دومرتبہ داخل ہوئے، لیکن دونوں ہی مرتبہ ناسازئ طبع کی بناپر درمیان سال میں ہی گھر کی راہ لینی پڑی، اور شہر کے قدیم مدرسہ دار العلوم مئو سے ہی ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۲ء میں رسمی فراغت ہوئی۔

عربی زبان وادب میں مہارت کے علاوہ علم حدیث آپ کا خاص موضوع رہا ہے، آپ نے درجنوں قیمتی مخطوطات اور اسفار علمیہ کی تحقیق کرکے انھیں قابل اشاعت بنایا، دنیا کے بڑے محدثین نے آپ کے استدراکات واصلاحات دیکھ کر آپ کی مہارت فی الحدیث کے گن گائے، اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت کے لیے بھی آپ کا اشہب قلم ہمیشہ رواں رہا، متجددین اور سلف سے ہٹ کر الگ راہ بنانے والوں سے آپ کو سخت اذیت ہوتی تھی۔ علامہ البانی کے خلاف بھی اسی طرح کی صورت حال کی وجہ سے آپ کو قلم اٹھانا پڑا۔

علامہ ناصر الدین البانیؒ

شیخ محمد ناصر الدین البانی، نامور محدث ہیں، جنھوں نے علم حدیث کے حوالے سے کئی نمایاں خدمات انجام دی ہیں، شیخ کی پیدائش البانیہ کی راجدھانی اشقورہ میں ۱۹۱۴ء میں ہوئی، آپ کے والد علاقے کے متدین حنفی عالم تھے جو اپنے وقت میں مرجع الخلائق تھے۔ لیکن احمد زوغو نے البانیہ کا اقتدار سنبھالنے کے بعد جب الحاد ولادینیت کی تبلیغ وتنفیذ شروع کردی تو والد گرامی نے شام کے مخصوص فضائل کے سبب دمشق کی طرف ہجرت کرلی، اس وقت شیخ البانی کی عمر ۹ سال تھی۔

دمشق آکر پرائمری کی تعلیم مکمل کی، اور عربی زبان سیکھی۔ اسکول کے بعد گزر اوقات کے لیے بڑھئی اور گھڑی سازی کا کام شروع کیا، اس کے علاوہ والد صاحب سے ہی صرف اور فقہ حنفی کی تحصیل کی، وقت نکال کر جامع اموی جانے لگے، وہیں ایک دن علامہ رشید رضا مصری کے مجلہ "المنار" میں، امام غزالیؒ کی احیاء علوم الدین کی احادیث سے متعلق ایک مضمون نے آپ کو علم حدیث، اور رجال واسناد کی طرف متوجہ کردیا، اس کے بعد ہی فکری اور عملی اعتبار سے آزاد ہوتے گئے، اور باقاعدہ حدیث وفقہ کا درس بھی شروع کردیا، مکتبہ ظاہریہ کے مخطوطات اور کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا، اور اپنی تحقیقات کو آگے بڑھاتے رہے، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بھی تین سال حدیث اور علم حدیث کے استاذ رہے۔ تصنیفات کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔

شیخ البانی کا منہج

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ شیخ البانی نے حدیث وتحقیق کے میدان میں بڑا نام کمایا، اور دنیاء علم کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، لیکن انھوں نے عمل بالضعیف کی مطلقا ممانعت اور تمییز صحیح من الضعیف کے وجوب کا قول کرکے لوگوں

کے سامنے ''فقہ مصفی'' کی تقدیم کا جو بیڑا اٹھایا۔[1]

اس سے فائدے سے زیادہ نقصان ہوگیا، ان کے منہج تحقیق نے ان کی شخصیت کو مقتدائیت عطا کر کے بہت سے ائمہ فن کی تجہیل کردی، جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جس کی طرف شیخ محمود سعید ممدوح نے اشارہ کیا ہے: **فیکون الشیخ محمد ناصر الدین الألباني قد نقل الناس من العالي إلی النازل، ومن اتباع الأئمة المجتهدین والحفاظ إلی تقلیده وحده**''۔[2]

البانی کی مخالفت اور رد کا پس منظر

البانی اپنی تحقیق میں اس قدر اعتماد زائد کے شکار ہوئے کہ بعض روایات مقبولہ پر منفی کلام کرڈالا، اور نئی تحقیق کے ذریعے نئی بحث چھیڑ دی، یہ دور عالم عرب میں سلفیت کے زور اور شباب کا تھا، اور ان کی تحقیق سے سلفیت کو بھرپور غذا نصیب ہوئی، جس مین حنفیت کی تضحیک اور ائمہ فن کی تغلیط شامل تھی، اس لیے سلفیت کے زیر اثر عرب ممالک نے البانی کو آنکھوں پر بٹھایا، اور ان کی تحقیق کو ہی حرف آخر سمجھا جانے لگا۔ ذہبی، ابن عبدالبر، ابن حجر اور عینی کو البانی کی ہمالیائی شخصیت کے آگے ہیچ خیال کیا جانے لگا۔ ظاہر ہے یہ صورت حال معتدل اور منصف اہل علم کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور تشویشناک تھی، اس لیے البانی، ان کی تحقیق، ادعاء علم اور اوہام کے خلاف آہستہ آہستہ آواز اٹھنے لگی۔ ان میں ابتدائی اور مضبوط آواز محدث الہند الکبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی تھی۔

البانی کے رد میں لکھی گئی کتابوں پر ایک نظر

جوں جوں البانی کی تحقیقات سامنے آتی گئیں، اہل علم و ماہرین حدیث کی تشویشات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ البانی کی جدت طرازیوں اور خود ساختہ نظریات کے منفی اثرات کے سد باب کے لیے علم حدیث کے خدام کی ایک ٹیم میدان عمل میں آئی، اور انھوں نے حدیث کی تحقیق میں صحیح متوارث منہج کی بالادستی اور قدیم محدثین پر اعتماد بحال رکھنے کے لیے اپنے قلم کا سہارا لیا، اور صحیح صورت حال کی ترجمانی کی۔ اس طرح درجنوں کتابیں علامہ البانی کے رد میں وجود میں آئیں۔ جن میں سید حسن بن علی السقاف کی ''**تناقضات الألباني الواضحات**''، عادل کاظم عبداللہ کی ''**المضحک المبکي من فتاوی الالباني**''، اسعد سالم کی ''**بیان أوهام الالباني**''، عبداللہ غماری مغربی کی ''**الرد علی الباني**''، حسان عبدالمنان کی ''**حوار مع الشیخ الالباني**''، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی ''**کلمات في کشف اباطیل وافتراءات**'' اور حسن سقاف کی ''**قاموس شتائم الألباني**'' قابل ذکر ہیں۔

البتہ ہمارے محدود علم کے مطابق اب تک کا سب سے جامع، علمی اور مکمل رد شیخ محمود سعید ممدوح کے قلم سے ہے، حکومت دبی کی طرف سے ''**التعریف بأوهام من قسم السنن إلی صحیح وضعیف**'' کے نام سے چھ ضخیم جلدوں میں جس کی طباعت عمل میں آئی ہے، اہل علم کے لیے خاصے کام کی چیز ہے۔ دیوبند میں دارالعلوم کے شعبہ تخصص کے موقر استاذ مولانا عبداللہ معروفی صاحب کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے، جسے ان کے ایک شاگرد نے مصر سے عکس لے کر بھیجا ہے، اسی سے بندے کو استفادے کا موقع نصیب ہوا۔ اور اطلاع یہ ہے کہ سلفیوں اور البانی حامیوں کے سخت دباؤ کی وجہ سے حکومت دبی نے اس کتاب کی اشاعت اور تقسیم روک دی ہے۔

بہ ہر حال البانی پر رد کے سلسلے کی ابتدائی اور اہم کتابوں میں محدث اعظمی کی کتاب ''الالبانی شذوذہ واخطاؤہ'' بھی ہے۔ جو اس وقت ہماری بحث کا موضوع ہے۔

محدث اعظمیؒ تک البانی کی کتابیں کیسے پہنچیں؟

محدث اعظمیؒ کے نبیرہ، اور آپ کے علوم کے محافظ و ناشر ڈاکٹر مسعود اعظمی صاحب کے بہ قول: محدث اعظمیؒ جب مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے سلسلے میں بیروت تشریف لے گئے تھے، تو شروع میں آپ کا قیام ایک ہوٹل میں رہا، لیکن ہوٹل کے ماحول سے ہم آہنگ نہ ہونے کے سبب وہاں کے ایک صاحب علم شخص زہیر شاویش صاحب کا ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا، یہ شاویش صاحب علامہ البانیؒ کے خاص معتمد اور ان کی کتابوں کے ناشر تھے، اس طرح البانی کی بھی وہاں آمد و رفت رہتی تھی، اسی دوران علامہ البانی نے محدث اعظمی سے بھی ملاقات کی، اور زہیر شاویش سے اپنی تصنیفات محدث اعظمی کی خدمت میں پیش کرنے کو کہا۔

الالبانی شذوذہ واخطاؤہ کی وجہ تالیف

بیروت کے قیام کے دوران ان کتابوں کو دیکھنے کا موقع نہیں تھا، اس لیے شاویش نے جب یہ کتابیں مئو بھجوادیں؛ تب آپ نے بہ نظر غائر ان کتابوں کا مطالعہ کیا، جس سے محسوس ہوا کہ البانی اپنی کتابوں میں تحقیق کے زعم میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو محدثین کے معروف اور معتمد طریقے سے میل نہیں کھاتی ہیں، اور البانی نے فکر و نظر کی ایک ایسی دنیا آباد کرلی ہے جس سے امت میں انتشار، شر اور بداعتمادی ہی بڑھے گی، کیوں کہ ان میں علم حدیث کے قواعد و اصول کی دھجیاں بکھیر دی گئی

ہیں، چنانچہ علمی دنیا کو مغالطے میں رکھنے کے بہ جائے حقائق سے نقاب کشائی کے لیے ”الألباني: شذوذه وأخطاؤه“ املا کرائی۔

کتاب کا تعارف اور مشمولات

محدث اعظمیؒ کی یہ کتاب ۲۷۰ صفحات پر مشتمل چار اجزاء میں چھپی ہے، جس میں مولانا نے حدیث کی تحقیق وتخریج میں البانی کی جدت طرازیوں اور غلطیوں کی واضح نشان دہی فرمائی ہے، البانی کے اقوال میں اضطراب واختلاف ذکر کر کے انھی کے وضع کردہ اصول وضوابط سے ان پر زبردست نقد کیا ہے۔ رسالے میں مولانا نے مندرجہ ذیل عناوین کے تحت البانی پر اعتراضات واستدراکات لکھے ہیں:

(۱)مبلغ علم الألباني (۲)ولوع الألباني بنقض كلام ابن تيمية (۳)مناقضات (٤)تحريم الصورة التي توطأ (٥)هل خاتم الذهب محرم على النساء (٦)خرق الإجماع (۷)اختلاف العلماء (۸) ستر المرأة (۹)السفر لزيارة القبر النبوي ﷺ (۱۰)تطبيق الألباني ذم المعتزلة على ذم اتباع الأئمة (۱۱)انقراض الاجتهاد۔

کتاب کا آغاز مبلغ علم الالبانی کے عنوان کے تحت اس طرح کیا گیا ہے:

الشيخ ناصر الدين الألباني شديد الولوع بتخطئة الحذاق من كبار علماء الإسلام، ولا يحابي في ذلك كائنا من كان، فتراه يوهم البخاري ومسلما، ومن دونهما، ويغلط ابن عبد البر وابن حزم وابن تيمية والذهبي وابن القيم وابن حجر والصنعاني والشوكاني، ويكثر من ذلك حتى يظن الجهلة والسذج من العلماء أن الألباني نبغ في هذا العصر نبوغا يندر مثله.

”شیخ ناصرالدین البانی کو علماء اسلام میں سے ماہرین کو غلط قرار دینے سے خوب دل چسپی ہے، اس میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، چنانچہ وہ بخاری ومسلم اور بعد والوں کی فروگزاشتیں دکھاتے ہیں، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابن تیمیہ، ذہبی، ابن قیم، ابن حجر، صنعانی، اور شوکانی کو غلط ٹھہراتے ہیں، اور یہ کام اس کثرت سے کرتے ہیں کہ سادہ لوح اور علم سے ناآشنا افراد یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ البانی کو اس فن میں وہ کمال حاصل ہے جس کی نظیر مشکل ہے“۔

اس کتاب کا اسلوب جو کسی قدر سخت نظر آرہا ہے، وہ ذاتی عداوت اور معاصرانہ چشمک کا نتیجہ نہیں؛ بلکہ البانی صاحب نے اپنے پیش رو کبار محدثین کی جس طرح تغلیط کی ہے، حتی کہ بخاری اور مسلم اور ان کی روایات کا جس طرح تعاقب کیا ہے، اور جس بے باکی ساتھ احادیث پر حکم لگایا ہے، اور مذہب احناف اور اہم شخصیات کو جس طرح تنقید وتشنیع کا نشانہ بنایا ہے؛ اس کی وجہ سے جواب میں بھی تیزی محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ مسند احمد اور تحفۃ الاحوذی جیسی دوسری کئی کتابوں پر آپ کے استدراکات وتعقیبات ہیں، اور ہر جگہ اسلوب میں خاص متانت اور آہستگی ہے۔

کتاب کی اشاعت اور مقبولیت

یہ کتاب اس وقت منظرعام پر آئی جب عالم عرب میں شیخ البانی علم وتحقیق کے افق پر طلوع ہوکر بہت حد تک طالبان علوم کو مرعوب کرنے میں کام یاب ہو چکے تھے، ان کے نہج اور اسلوب وتحقیق کو کئی نقائص کے باوجود حرف آخر سمجھا جانے لگا تھا، اس صورت حال سے دنیا بھر کے محدثین اور ائمہ کے متبعین سخت اذیت محسوس کر رہے تھے، ایسے وقت میں اس کتاب کی اشاعت سے ان کی دلی آرزو برآئی اور انھوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، بڑے پیمانے پر اس کی اشاعت عمل میں آئی، اور بہت سے ناشرین نے اسے ایک دینی ضرورت خیال کرتے ہوئے مفت میں تقسیم کیا، پھر دارالعروبۃ للنشر والتوزیع سے اشاعت کے بعد تو یہ کتاب دنیا کے دور دراز خطوں تک بھی پہنچ گئی۔

مولانا بدرالحسن قاسمی نے ۱۳/ ۳/ ۱۹۸۵ء کو تحریر کردہ اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

”یہاں دار العروبة للنشر والتوزیع نے ”الألباني شذوذه وأخطاؤه“ کو بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، اور معرض الکتاب العربي میں بہت فروخت ہوئی“۔[۳]

خود اس کتاب کا رد لکھنے والے دونوں مصنّفین نے اس کتاب کی پانچ طبعات اور بڑے پیمانے پر عالم عرب میں اس کی تقسیم واشاعت کا ذکر کیا ہے۔

رد کے چند نمونے

البانی اپنی کتاب الاحادیث الصحیحۃ ۲:۱۶۱ میں ”تصدق بأتوار من الأقط“ میں اتوار کی تشریح فرماتے ہیں کہ یہ تور کی جمع ہے، جس کے معنی پیتل کے برتن کے ہیں۔

محدث اعظمیؒ فرماتے ہیں: درست بأثوار من الأقط ہے۔ اثوار، ثور کی جمع ہے، جس کے معنی پنیر کے ٹکڑے کے ہیں، چنانچہ حدیث کا مطلب ہوگا پنیر کے چند ٹکڑے صدقہ کیے۔

البانی اپنی صحیحہ ۳:۱۸۸ میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ”هذا تحقيق استفدناه من تحقيقات الأئمة“ یعنی ہماری یہ تحقیق بہ راہ راست ائمہ کی تحقیق سے مستفاد ہے۔ محدث اعظمیؒ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ایسا ہی کہ سکتا ہے جس کا دائرۂ علم محدود ہوگا، کیوں کہ ان سے پہلے یہ تحقیق شیخ نیمویؒ اپنی کتاب ''التعلیق الحسن'' میں أبواب المیاہ حدیث وقوع الزنجي فیزمزم کے تحت پیش کر چکے ہیں۔

البانی فرماتے ہیں کہ حدیث اگر ''ذُوِی'' یا ''یُروی'' یا ''یُذکر'' مجہول کے صیغے سے روایت کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حدیث یقینا ضعیف ہے۔

محدث اعظمی، البانی کے اس قاعدہ کلیہ کے بارے میں فرماتے ہیں: وهل هذا الا زعم فاسد واعتقاد ظاهر البطلان'' کتنی حدیث یا کتنے ایسے قول ہیں جہاں یہ صیغے استعمال ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حدیث صحیح اور قوی ہے، اس میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں ہے، اس کے بعد مولانا نے ۲۳ شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ محض مجہول کے صیغے سے کوئی حدیث ضعیف نہیں ہوتی ہے۔[۴]

علامہ البانی جیسے شخص کے قلم سے امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان کی شخصیت بھلا کیسے محفوظ رہ جاتی، چنانچہ البانی نے بھی دادِ تحقیق دیتے ہوئے امام متبوع پر خوب بھڑاس نکالی ہے، لہٰذا علامہ اعظمیؒ نے بیسیوں صفحات امام صاحبؒ کے دفاع کی نذر کیے ہیں، البانی نے سوءِ حفظ کا الزام عائد کرکے امامؒ کو ضعیف اور ناقابل استدلال قرار دیا ہے، محدث اعظمی نے ایسے درجنوں رواۃ کے نام ذکر کیے ہیں جن پر ابوحنیفہؒ سے سخت جرحیں ہیں، پھر بھی البانی ان کی حدیث کی تصحیح کرتے ہیں، چنانچہ عاصم بن بہدلہ کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وحسن اسناد عاصم بن بهدلة، وقد أجمعوا على سوء حفظه، فيا للدين ويا للعلم أن يكون حديث أبي حنيفة لسوء حفظه ضعيفاً، وحديث عاصم مع الإجماع على سوء حفظه حسناً.[۵]

اس بحث کے اخیر میں علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں:

انما فصلت القول في هذا المبحث، ليحيى من حيي عن بينة، ويهلك من هلك عن بينة، فكم من أغمار أغرفهم يؤمنون بالألباني كأنه معصوم، أعاذنا الله من هذه العصبية الجاهلية وعمى البصيرة''[۶]

کتاب کی طباعت پر البانی کا ردعمل

ابتدا میں علامہ البانی بھی محدث اعظمیؒ کے قائل اور قدر دانوں میں شامل تھے، کیوں کہ وہ بھی آپ کی تحقیقات علمیہ سے واقف اور فائدہ اٹھانے والوں میں تھے، چنانچہ کئی مقامات پر البانی نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے، جیسے کہ وہ صحیح الترغیب الترھیب کے مقدمے میں فرماتے ہیں:

''واعلم أن مما شجعني على نشرهما... العالم الشهير الجليل الشيخ حبيب الرحمن الاعظمي''۔

نیز اسی میں فرماتے ہیں:

ومما زادني رغبة في الإقبال عليه، أن محققه الفاضل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي.[۷]

لیکن محدث اعظمی نے جب البانی کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان پر استدراکات لکھے، اور البانی کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی، تو البانی جنھوں نے ابن حبان، مزی، منذری، اور ابن حجر جیسے محدثین کو نہیں بخشا؛ محدث اعظمی کو کیسے برداشت کرلیتے، لہٰذا جارحیت پر اتر آئے اور رکیک حملے شروع کردیے، چنانچہ آداب الزفاف کے نئے مقدمے میں ص ۸ پر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکے اور یہاں تک کہہ ڈالا:

''واستعان الانصاري بآخر وسأله بأحد أعداء السنة وأهل الحديث ودعاة التوحيد المشهورين بذلك، ألا وهو الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، لجبنه وفقدانه الشجاعة العلمية والأدبية.

الرد العلمی پر ایک نظر

محدث اعظمیؒ کے استدراکات وتعقیبات کو انصاف پسند حلقوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا، علامہ البانی اس کی اشاعت کے بعد زندگی بھر مولانا اعظمی کو کوستے اور اپنے غیظ وغضب کا اظہار کرتے رہے، لیکن انھوں نے نہ تو وسعت ظرفی کے ساتھ اسے قبول کیا اور نہ ہی سنجیدہ علمی انداز میں اس کا جواب دیا، البتہ کافی عرصے کے بعد ان کے دو شاگردوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، اور دو جلدوں میں انھوں نے محدث اعظمی کا رد لکھا، اس کا نام انھوں نے رکھا: الرد العلمي على حبيب الرحمن الأعظمي۔ یہ البانی کے دو شاگرد سلیم الھلالی اور علی حسن علی عبدالحمید کے قلم سے ہے، یہ کتاب پہلی بار ۱۴۰۴ھ میں المکتبۃ الاسلامیۃ عمان اردن سے چھپی ہے، دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد ۸۸ صفحات پر اور دوسری ۱۷۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بھی نقد کا وہی جارحانہ اسلوب ہے، جس کے لیے البانی یا ان کے شاگرد معروف ہیں۔ البانی کے شاگردوں نے اس کا بھی انکشاف کیا ہے کہ خود البانی نے محدث اعظمی کا رد لکھا تھا؛ لیکن وہ بعض وجوہ کے سبب شائع نہیں کر سکے

تھے، شاگردوں کے بہ قول البانی نے انھیں یہ دے دیے تھے، جس سے انھوں نے استفادہ کیا ہے۔[٨]

مؤلفین نے محدث اعظمی پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ البانی ایک بار خود اپنی گاڑی سے مولانا اعظمی کو دمشق سے حلب لے کر گئے تھے، اور اس دوران البانی کے دو شاگردوں نے چاہا تھا کہ مولانا سے اس مسئلے پر بات کریں، لیکن مولانا جب اس موضوع کے قریب پہنچے، تو اس موضوع پر بات کرنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا: إني لم آت إلى هنا للبحث والمناقشة۔[٩]

لیکن خود مؤلفین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس وقت مولانا پر ضعف اور تعب کے آثار نمایاں تھے، اور سفر کی مشقت مستزاد تھی، اس لیے مولانا نے اس وقت کی صورت حال کے پیش نظر اگر بحث ومباحثہ سے معذرت کی، تو مولانا کے اس عمل پر انھیں ہدف تنقید بنانا مناسب نہیں ہے، یا تو کسی اور موقع سے بات کر لی جاتی، یا کم از کم البانی نے رد کا جو جواب لکھا تھا، وہ اسی تحریر کو مولانا کے پاس بھجوا دیتے، مولانا اس پر غور کر لیتے۔

البانی کے دونوں شاگرد مؤلف کو یہ بھی اشکال ہے کہ یہ کتاب ارشد سلفی کے نام سے شائع کر کے مولانا نے تدلیس سے کام لیا ہے۔

حالاں کہ کتاب کے ناشر نے وضاحت کر رکھی ہے کہ مولانا نے یہ کتاب ارشد سلفی کو املا کرائی تھی، اور کسی مصلحت سے شروع میں یہ کتاب انہی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ لیکن ایک عرصے کے بعد محدث اعظمی نے اپنے نام کی تصریح کی اجازت دے دی؛ تو پھر خود آپ کے نام سے یہ شائع ہونے لگی، جس سے کتاب کی وقعت اور استناد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور اس وقت یہ تدلیس ممنوع قرار پاتی، جب کہ کوئی گم نام یا کم رتبہ شخص اپنے کو پردۂ خفا میں رکھتے ہوئے کسی بھاری بھرکم متعارف شخصیت کے نام سے کتاب شائع کرتا، جب کہ یہاں معاملہ ایسا نہیں، بلکہ اس کے برعکس ہے۔

اس طرح اس کتاب میں مجموعی اعتبار سے مولانا اعظمی کی تغلیط وتضحیک کر کے البانی صاحب کو اصلاح کی دعوت دینے کے بہ جائے ان کے شذوذ وتفردات پر پردہ ڈالنے بلکہ انھیں بہتر قالب اور سانچے میں پیش کرنے کوشش کی گئی ہے۔ لیکن علامہ سقاف نے اپنے اس مختصر تبصرے سے اس کی پوری حقیقت واشگاف کر دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"والرد عليه الذي أملاه الشيخ المتناقض على غلامه الحلبي وقرينه الهلالي رد فارغ إنشائي غير علمي"۔[١٠]

"مولانا اعظمیؒ کا جو رد تضاد کے شکار شیخ البانی نے اپنے خادم حلبی اور اپنے مصاحب ہلالی کو املا کرایا ہے؛ وہ غیر علمی، خالی خولی انشاء پردازی ہے"۔

آخری بات

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ ناصر الدین البانی کی علم حدیث کے حوالے سے خدمت واعتراف کے باوجود ان کے منہج کے نقائص اور جدت طرازیوں کا پردہ فاش اور اصول وقواعد حدیث سے تلاعب کی حوصلہ شکنی کر کے محدث اعظمیؒ نے پوری علمی دنیا کی طرف سے فرض کفایہ کا خوش گوار فریضہ انجام دیا ہے، آپ کا منہج خدمت حدیث کے متوارث طریقے سے قریب تر ہے، آپ کی اس تحریر کے ذریعے عالم عرب کو ایک نئی راہ ملی، غلط فہمی کے شکار نو واردان فن کو راہ راست نصیب ہوئی، اگرچہ البانی اور ان کے غالی متبعین نے حدیث وسنت کے اس خادم کی کوششوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا، اصلاح کے بہ جائے سب وشتم اور معارضہ وگستاخی پر اتر آئے، اور اس طرح البانی کی جدت طرازی سے اس وقت عالم اسلام کا ایک طبقہ ایسا مفتون اور خود فریبی کا شکار ہے کہ اس پر صرف البانی کی تصحیح وتضعیف کا جادو چلتا ہے، اور کبار محدثین بالکل بودے اور بے حیثیت نظر آتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف دلائل وبراہین کے ساتھ امت کے سامنے محدث اعظمی اور ہمارے سلف واکابر کی راہ موجود ہے، امید ہے کہ یہ فتنے جیسا کہ ان کی تاریخ رہی ہے؛ اپنی سحر انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کے باوجود اپنا اثر آہستہ آہستہ کھوئیں گے۔ اور ظلمت کے بہ جائے ہر طرف روشنی کا دور دورہ ہوگا۔

اللہ پاک علم حدیث اور ملک وملت کے حوالے سے محدث اعظمی کی خدمات جلیلہ کو شرف قبول عطا فرمائیں اور اعلی علیین میں مقام بلند نصیب کریں، اور ہم چھوٹوں کو اپنے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی میراث کو اپنے سینے سے لگائے رکھنے، ان کی حفاظت، اشاعت، قابل قدر اضافے اور چراغ سے چراغ جلاتے رہنے کی توفیق وہمت سے نوازیں، تاکہ علم وتحقیق کا کارواں اپنی منزل کی جانب رواں رہے۔ ○○

حواشی

١- دیکھئے: مقدمۃ صحیح الادب المفرد، ص ٣٢
٢- التعریف باوھام من قسم السنن، ص ١٤
٣- حیات ابوالمآثر ص: ٧، ٣٣
٤- الالبانی شذوذہ واخطاؤہ ١: ٦
٥- الألبانی شذوذہ واخطاؤہ، ص: ١٣٨
٦- ایضاً ص: ١٤٤)
٧- مقدمۃ صحیح الترغیب والترھیب، ص: ٦٣
٨- الرد العلمی ٢/
٩- الرد العلمی ١/١١،
١٠- قاموس شتائم الالبانی ص: ٣٣

فخرِ ہندوستان
مُحدّثِ جَلیل حضرَت مَولانا اعظمیؒ

جناب غلام محمد پرے عطار (سری نگر، کشمیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آسمان علم وتحقیق پر جو انفاس قدسیہ آفتاب وماہتاب بن کر ضوفشاں ہوئے، اُن کی تعداد حد شمار سے باہر ہے اور تاریخ کے صفحات میں اُن کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔

خاکسار نے اپنی طالب علمی میں ایک عربی مقولہ سنا ہے: ''القرآن نزل في الحجاز وقرئ في مصر وفهم في الهند''۔ قدیم ہندوستان- جسے آج برصغیر پاک وہند کے نام سے جانا جاتا ہے- کے اہل علم کا شہرہ چہار دانگ عالم میں ہے۔ اوران کی علمی خدمات کا لوہا آج بھی منوایا جا رہا ہے۔

سرزمین ہند میں ایسی نادرۂ روزگار اور عبقری شخصیات پیدا ہوئی ہیں، جو اگر چہ اپنے وقت پر اس دنیا سے رحلت فرما گئیں؛ لیکن ان کی علمی تحقیقات نے انھیں تا قیام قیامت بقا اور دوام سے سرفراز کیا ہے۔

ان ہی عظیم المرتبت اور درر بے بہا شخصیات میں ایک نام نامی محدث کبیر محقق جلیل ابوالمآثر علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی کا ہے۔

۱۹۸۱ء کے اپریل- مئی کے مہینے میں خاکسار اپنے ایک محب اور دوست مالک کتب خانہ ''مکتبہ علم وادب'' قاری محمد اشرف صاحب کے پاس کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ ''معارف الحدیث'' نظر نواز ہو گئی۔ سرورق پر مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا اسم گرامی مرقوم تھا۔ جلد اول کے ابتدائی صفحات میں ''حدیث وسنت کا مقام'' کے عنوان سے مولانا مرحوم نے چند اہم سطور سپرد قلم کی ہیں۔ جن کے آخر میں علامہ اعظمیؒ کا تذکرہ علمی محسن اور استاذ کے طور پر کیا گیا ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ سے خاکسار کسی قدر مانوس تھا، اس طرح علامہ اعظمیؒ کے مقدس اسم گرامی سے آشنا ہوا۔

نعمان بن ثابت اور امام اعظمؒ کے عظیم الفاظ سے ناچیز متعارف تھا، تو نعمانی اور اعظمی الفاظ میں بڑی حلاوت محسوس ہوئی تھی، ورق پلٹنے پر علامہ اعظمیؒ کا مقدمہ نظر نواز ہوا۔ اس مقدمے کا مطالعہ کرکے ناچیز ایک الگ دنیا میں پہنچ گیا اور پہلی بار علم کے مقام رفیع سے شناسائی ہوئی۔ علم کے ساتھ گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ حدیث وسنت کے حقیقی مقام اور اہمیت سے شناسائی ہو گئی۔ یہ مقالہ حجیت حدیث کے سلسلے میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے، لیکن مقدمہ کا مطالعہ میرے لئے حدیث وسنت کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی تحریک ثابت ہوا۔ ''مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ اور ان کی علمی خدمات'' نام کی کتاب اشاعت پذیر ہوئی تو خوش قسمتی سے میرے ہاتھ آئی اور علامہ اعظمیؒ کی علمی تحقیقات کے لامتناہی سلسلے سے واقفیت ہوئی، ''حیات ابوالمآثر'' مجھے بعد میں دستیاب ہوئی۔ اگر چہ اس نام کی عظمت میرے دل میں پہلے سے ہی راسخ وپیوستہ تھی، لیکن ڈاکٹر صہیب الہ آبادی کے اس phd مقالے سے میری دلی آرزو پوری ہو گئی۔

ضلع اعظم گڈھ ایک مردم خیز ضلع رہا ہے اور اس ضلع سے بے شمار نابغۂ روزگار شخصیات پیدا ہوئی ہیں۔ علامہ شبلیؒ، مولانا فاروق چریا کوٹیؒ، مولانا اطہر مبارکپوریؒ، علامہ اقبال سہیلؒ اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ وغیرہ عبقریات سے میں واقف تھا ہی، لیکن اعظم گڈھ کی جس مبارک ومعظم علمی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا اور جن کا علمی تفوق مسلم ہے، وہ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کی عظیم المرتبت شخصیت ہے۔

عرب محدثین کو بھی علامہ اعظمیؒ کی تحقیقات علمیہ نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ مولانا غلام محمد وستانوی صاحب ''کشف الاستار'' کے تازہ ایڈیشن میں ''کلمۃ الناشر'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں، اور بجا لکھتے ہیں کہ ''وله براعة تامة ومهارة كاملة في علم الحديث حتى شهد له بذالك من أهل العلم والفضل من العرب والعجم على حد سواء''۔

عرب کی معروف علمی شخصیات ابن بازؒ، احمد محمد شاکرؒ، شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ، علامہ زاہد الکوثریؒ، ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ شیخ الازہر، شیخ البانیؒ، ڈاکٹر شعیب الارنووطؒ اور شیخ محمد عوامہ جیسے ارکان علم ومحققین علوم اسلامی نے علامہ اعظمیؒ کی خدمات کو تہ دل سے سراہا ہے۔

ترمذی اور مسند احمد کے محقق شیخ محمد احمدؒ شاکر نے ''محدث اعظمیؒ'' کے علمی استدراکات کو بسر وچشم اور من وعن قبول کرکے شکریہ کے ساتھ شائع کیا، اور شکریہ کا ایک خط لکھ کر اس میں ان کا تذکرہ علامۃ الکبیر اور محقق الاستاذ جیسے القابات کے ساتھ کیا۔

شیخ ناصر الدین البانیؒ شام کی ایک معروف علمی شخصیت ہیں اور دو تین

دہائیوں میں عرب دنیا میں چھائے رہے، لیکن علامہ اعظمیؒ نے ان کی تحقیقی نقائص کی نشاندہی کی اور ''الالبانی شذوذہ وأخطاؤہ'' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب سپرد قلم کی فلیراجع۔

صحیح الترغیب والترہیب میں شیخ موصوف نے علامہ اعظمیؒ کا ذکر استاذ المحقق جیسے شاندار الفاظ میں کیا ہے اور اس تحقیق کو محدث اعظمیؒ کی تحریک قرار دیا ہے۔

علامہ زاہد الحسن الکوثریؒ ترکی ومصر کی ایک مایۂ ناز شخصیت ہیں۔ علماء ہندوپاک کے ساتھ جو تعلقات ان کو تھے، وہ ایک کھلی کتاب ہے اور دفاع حنفیت کے سلسلے میں جو موافقت انھیں علماء دیوبند وفرنگی محل کے ساتھ تھی وہ ایک تفصیل طلب تاریخ ہے۔ علامہ کشمیریؒ جو محدث اعظمیؒ کے استاذ جلیل ہیں۔ علامہ کوثریؒ کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے۔ شیخ البانی نے شرح عقیدۃ الطحاویہ کے مقدمہ میں علامہ کوثری کے ساتھ اختلاف کے باوجود ان کے متعلق لکھا ہے: **والحق انه عالم جليل وله حظ وافير في علم الحديث والرجال۔**

''**منية الالمعي في ما فات من الزيلعي في نصب الراية**'' کی تحقیق کے دوران علامہ اعظمیؒ سے انھوں نے استفادہ کیا۔ اور محدث اعظمیؒ کی علمی عظمت کا اظہار انتہائی عقیدت کے ساتھ کیا۔ جو مذکورہ کتاب میں مندرج ہے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ علماء ہندوپاک کے تذکرہ پر اشکبار ہوتے تھے، وہ گویا ان کے فریفتہ تھے، بے حد مداح اور گرویدہ تھے۔ ''**فقه اهل العراق وحديثهم**'' نام کی کتاب میں محدث اعظمیؒ کو ''**العلامة المحدث البارع الفقيه**'' جیسے عالی القابات سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ شیخ الازہر لکھتے ہیں کہ: ''**اني اشهد انه اذا كان في العالم كله من يستحق أن يلقب بالمحدث الاعظم لهذا هو**''۔

گزشتہ سطور میں جن معاصر عبقری شخصیات کا تذکرہ آگیا اور صفحات کی تنگ دامنی سے جن نوابغ کا تذکرہ رہ گیا، ان سب حضرات نے علامہ اعظمیؒ کے علمی تفوق اور تحقیقات حدیث اور نکتہ رسی کا اعتراف کیا ہے۔

شیخ علوی مالکی، ڈاکٹر محمود طحان، خیر رمضان یوسف اور ڈاکٹر یوسف القرضاوی جیسی مشہور عالم شخصیات نے علامہ اعظمی کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی جو ابھی بقید حیات ہیں، جب دار المصنفین اعظم گڈھ کی مستشرقین کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان آئے تو محدث اعظمی سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔

برصغیر پاک وہند کا جغرافیہ علم وآگہی کا لہلہاتا گلستان ہے۔ حضرت تھانوی، علامہ کشمیری، علامہ عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا بنوری اور محقق جلیل مولانا ابوالوفا افغانی رحمھم اللہ اجمعین۔ ان سب قدسی نفوس کے علم وتقویٰ کا لوہا پورے عالم میں منوایا جارہا ہے۔ محدث اعظمیؒ کے لیے ان حضرات نے کمال کے تعریفی کلمات لکھے ہیں اور فرمائے ہیں۔

مولانا افغانیؒ جنھوں نے قدیم کتابوں اور نادر مخطوطات کی اشاعت کے لیے ''**لجنة المعارف النعمانية**'' حیدرآباد میں قائم کیا، محدث اعظمیؒ کی تحقیقات علمیہ وتدقیقات کے بہت معترف اور قدردان تھے۔

مشہور عالم محققین میں ایک نام ڈاکٹر حمیداللہؒ حیدرآبادی ثم فرانسوی کا بھی ہے، جو مخطوطات کے بڑے ماہر تھے۔ محدث اعظمی کو انھوں نے مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے سلسلے میں مساعی دیکھ کر'' شاہ ولی اللہ ثانی'' قرار دیا۔

بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ مصنّف علم کا خزانہ ہے، لیکن عوام تو درکنار علماء بھی اس سے متعارف نہیں تھے اور یہ کتاب لوگوں کی دسترس میں بھی نہیں تھی۔ یہ علامہ اعظمیؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سے اس سلسلے میں خط وکتابت ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے محدث اعظمی کی علمی گہرائی وگیرائی کا تہ دل سے اعتراف کیا۔

مولانا سید علی میاں ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسی علمی اور قدآور شخصیات نے محدث اعظمیؒ کی خدمات علمیہ اور تحقیقات حدیثیہ کے سلسلے میں ان کی مساعی جمیلہ کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی جیسے دائرۃ المعارف اپنی بعض تحریروں کو محدث اعظمیؒ کے پاس ارسال کرتے تھے، اور ان کی نظر ثانی کے بعد ردوبدل بھی کردیتے تھے۔

بقول مولانا اکبرآبادی:

''محدث اعظمیؒ اگرچہ اپنے وطن میں ''غریب شہر'' ہیں، لیکن عرب ممالک میں ان کے علم وفضل اور شہرت وعظمت کا طوطی بولتا ہے''۔

محدث اعظمیؒ کی جو تحقیقات حدیث اور علمی فن پارے دنیائے علم کے سامنے ہیں، ان سے ابتدائی زمانے کے محدثین کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت اعظمیؒ اِس دور کے نہیں؛ بلکہ دور محدثین سابقہ سے ان کا تعلق ہے، اور ان کا یہ کام کسی اکیڈمی سے تکمیل پانا مشکل ہے۔

جن کتابوں کے نام صرف تاریخ تذکرہ میں موجود تھے، محدث اعظمیؒ کی سعی وکوشش سے وہ کتابیں منصۂ شہود پر آگئیں۔ مخطوطات کی تحقیق وموازنہ ایک دقت طلب کام ہے، لیکن الحمد للہ اس مشن میں محدث اعظمیؒ دیگر محققین سے آگے ہیں۔

مصنّف عبدالرزاق علم کا ایک خزانہ ہے، اور آثار صحابہؓ کا بہت بڑا ماخذ

ہے، حدیث وآثار کی معتبر کتاب ہے۔ عبد الرزاق امام بخاری کے استاذ اساتذہ ہیں، ان کی مرتب کردہ یہ کتاب ہے۔ اس کتاب کو طباعت کی منزل سے گذارنے اور اشاعت پذیر کرنے میں محدث اعظمیؒ کا ہی کردار کارفرما ہے۔

اسی طرح مصنف ابن ابی شیبہ جو احادیث آثار کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، محدث اعظمیؒ کی کاوشوں سے طباعت پذیر ہوئی۔

عربی مقولہ ہے کہ لا یرمی شجر إلا ذو ثمر، مولانا اعظمیؒ کو اس سلسلے میں کچھ معاندین کی تنقید کا نشانہ بننا پڑا؛ لیکن حق یہ ہے کہ وہ علامہ اعظمیؒ کی علمی عظمت وفضل سے ناخوش بھی تھے اور خوف زدہ بھی۔ علامہ شوق نیمویؒ، ملا ھاشم ٹھٹھوی سندیؒ اور جدید دور کے دو محققین مصنف ابن ابی شیبہؒ، حمد بن عبداللہ الجمعۃ اور محمد بن ابراھیم اللحید ان نے اپنی اپنی محقّق مصنف میں ''تحت السرۃ'' کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اپنے دیکھے ہوئے مخطوطات سے نقل کیا ہے۔ فللّٰہ الحمد۔ غرض علمی دنیا کو مصنّف سے آشنا کرنے والے سب سے پہلے محدث اعظمیؒ تھے۔

''مسند الحمیدی'' جو امام بخاریؒ کے استاذ عبداللہ بن زبیر الحمیدیؒ کی مرتب کردہ ہے اور جو امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں۔ اس کتاب کو پہلی مرتبہ محدث اعظمیؒ نے ایڈٹ کیا۔ یار لوگوں نے یہاں بھی محدث اعظمی کو ہدف تنقید بنایا۔ ابن عمرؓ کے عدم رفع عند الرکوع ورفع الراس منہ کی روایت میں تحریف کا الزام عائد کیا۔ اللہ کا فضل شامل حال تھا کہ مسند ابی عوانہؒ میں بھی یہی روایت اسی طرح درج ہے۔ اور محدث اعظمیؒ کی دیانت وامانت کی تائید اللہ نے دوسری کتاب سے کروادی۔ فللّٰہ الحمد۔

یہ مقالہ محدث اعظمی کے تمام تر علمی کارناموں اور تحقیقات حدیث پر تبصرہ کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ تحقیقات ایک بحر زخار ہیں، جس کی گیرائی اور گہرائی کا احاطہ کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔

علامہ نور الدین ہیثمیؒ نے علم حدیث کے حوالے سے بڑا کام کیا ہے۔ ''مجمع الزوائد''، ''موارد الظمآن''، ''بغیۃ الباحث'' کے علاوہ علامہ نے جو بڑا کام کیا ہے، وہ ایک عظیم محدث عبدالخالق البزار کی کتاب ''البحر الزخار'' کے زوائد کا ہے، جس کا نام انھوں نے ''کشف الاستار'' رکھا ہے۔ یہ کتاب بھی مخطوط کی شکل میں موجود تھی۔ محدث اعظمیؒ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی تحقیق کرکے اس کو طباعت سے آشنا کیا۔

ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی اور مولانا غلام محمد وستانوی صاحبان تبریک وتحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کو دوسری بار بطرز بیروت بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جزاھم اللہ خیراً۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ بعض چیزیں اس میں بڑی نادر ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے یہ حدیث حیاتی خیر لکم ووفاتی خیر لکم الحدیث، خاکسار نے کئی علماء سے سنی تھی، لیکن مطالعۂ کتاب کے دوران حدیث نمبر ۸۴۷ نظر نواز ہوکر بڑی مسرت ہوئی۔ فللّٰہ الحمد۔

امام طحاویؒ کو احناف کا بیرسٹر کہا جاتا ہے۔ طحاوی شریف یعنی معانی الآثار اور مشکل الآثار ان کی دو کتابیں ہیں جن سے علمی دنیا مستغنی نہیں ہوسکتی۔ ان دونوں کتابوں کے رجال پر محدث اعظمیؒ نے کتاب لکھ کر شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔

کتاب الزہد والرقائق، سنن سعید بن منصور، المطالب العالیہ، فتح المغیث، مجمع بحار الانوار وغیرہ نادر کتابوں کو مخطوطات سے نکال کر اور کھنگال کر مطبوعات میں لا نا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

علامہ اعظمیؒ درحقیقت ایک نادرۂ روزگار عالم تھے، جن کے علم کے ڈنکے عرب وعجم میں بج رہے ہیں۔

علامہ عثمانی سے کسی نے علامہ کشمیریؒ کے علم کے متعلق پوچھا، تو انھوں نے برجستہ فرمایا، ہاں میں نے انور شاہؒ کی صورت میں ابن حجر عسقلانیؒ اور ابن دقیق العیدؒ کو دیکھا ہے۔

ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ امام العصرؒ کا حافظہ اور حدیث ورجال سے آگہی اگر کسی اعجاز سے کم نہیں، تو محدث اعظمیؒ کا حفظ واستحضار حدیث ورجال سے واقفیت حیرت انگیز ہے۔

سرزمین ہند کے علامہ علی متقی برہان پوری صاحب کنز العمال، علامہ محمد طاہر فتنی صاحب مجمع بحار الانوار اور عرب دنیا کے علامہ قاسم بن قطلو بغاؒ جیسے حدیث وسنت کے ماہرین کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، اور ہندوستان کے لیے یہ باعث فخر ہے کہ اس کی سرزمین پر محدث کبیر علامہ اعظمیؒ جیسا دیدہ ور محقق اور نابغۂ روزگار محدث پیدا ہوا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

حضرت مولانا رشید احمد اعظمی صاحب اور ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی صاحب مبارک بادی کے مستحق ہیں کہ وہ علامہ اعظمیؒ کے علوم کے وارث وامین ہوکر ان کو عام کرنے کی سعی وجہد میں مصروف ہیں۔ وفقہما اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو ان یادگار علمی خدمات کو جاری رکھنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ ایں دعا از من از جملہ جہاں آمین باد۔

حبیب الرحمٰنؒ واقعی حبیب الرحمٰنؒ ہیں
علوم نبویہ کے وہ ہند میں پاسبان ہیں

□□

علامہ اعظمیؒ بحیثیت ایک عظیم نقّاد

امداداللہ امیر الدین مئوی قاسمی

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين، وعلى آله وأصحابه أجمعين، أما بعد!

نقد کی تعریف

نقد عربی زبان کا لفظ ہے: نقد الشيءَ نقدًا: نقره ليختبره، أو ليميز جيده من رديئه، نقد الدراهم والدنانير: ميز جيدها من رديئها، يقال: نقد النثر، ونقد الشعرَ: أظهر ما فيها من عيب أو حسن.[1]

اس کے معنی: کھرے کھوٹے کی پہچان کرنا، اور کسی چیز کی اچھائی و برائی کو پرکھنا ہے، یعنی نقد وتنقید صحیح وضعیف کی تمیز کا نام ہے، اسی کے ہم معنی لفظ "تنقید" باب تفعیل سے ہے، اور اردو میں مستعمل ہے۔ تنقید ایک اصطلاح ہے جس میں کسی شخصیت یا فن پارے کے منفی اور مثبت پہلو شمار کرائے جاتے ہیں، بلفظ دیگر کسی چیز کے تجزیاتی مطالعہ کے علاوہ اس کی تشریح، اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا، اور پسندیدگی و ناپسندیدگی کا اظہار نقد کہلاتا ہے۔ عموماً تنقید کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک یہ کہ تنقید برائے اصلاح ہو، وہ تنقید کے لائق ہو، اور اس میں اخلاص ہو، تو جس پر تنقید کی گئی ہے اس کو فائدہ ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ تنقید کی ضرورت ہی نہیں تھی، یا تھی مگر تنقید اصلاح کی غرض سے نہیں کی گئی، تو اس سے دل شکنی ہوتی ہے، اور یہ تنقید، تنقیص بن جاتی ہے۔

ایک نقاد چونکہ فن کی ترقی کا خواہاں ہوتا ہے، اس لئے اس کی تنقید کا مقصد ہمیشہ مثبت اور تعمیری ہوتا ہے، وہ مصنف کی تضحیک نہیں کرتا، اور نہ اس کی تصنیف کی بے قدری کرتا ہے، بلکہ اسے فنکار سے یک گونہ ہمدردی ہوتی ہے، وہ اس کی تخلیق کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے محاسن و معائب کی نشاندہی کرتا ہے، اس سے اس کا مقصد فنکار کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتا، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی، رہنمائی اور اصلاح پیش نظر ہوتی ہے، اس طرح کسی فن پارے کے تجزیہ سے حاصل شدہ تاثرات و تجربات سے صاحبان ذوق کو لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شرائطِ نقد

تنقید کا مقصد فن پاروں کی تشریح وتوضیح کرنا ہے۔ نقاد نقد وجرح کرتے وقت صرف کسی فن پارے کے محاسن و معائب ہی بیان نہیں کرتا بلکہ اس کی معنویت کو بھی اس طرح عیاں اور واضح کر دیتا ہے کہ اس کی تفہیم میں قاری کو بڑی مدد ملتی ہے، اور وہ اس کی اثر انگیزی سے بڑا متاثر ہوتا ہے، اور یہی وہ فنی تاثر ہے جو نقاد کی کوشش کے بغیر ممکن نہیں۔ ناقد کے لیے ایک اہم شرط یہ ہے کہ وہ نقد کی اہلیت رکھتا ہو، اہلیت سے مراد یہ ہے کہ جس فن یا رجال فن پر کوئی شخص نقد کرنا چاہتا ہے تو اسے اس فن میں مہارت اور رسوخ حاصل ہونا چاہیے، کسی فن سے متعلق بات کرنے کے لیے تو شاید اس فن میں مہارت تامہ یا رسوخ کی ضرورت نہ ہو، لیکن نقد وتنقید ایک اعلیٰ ترین علمی کام ہے جس کے لیے از بس ضروری ہے کہ ناقد کا علم متعلقہ فن کے صرف مبتدیات تک محدود نہ ہو۔

ان تمام باتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناقد کا فرض ہے کہ اس کا علم وسیع اور ذہن تیز ہو، عدل سے کام لے، تعصب اور جانبداری نہ برتے، جذبات سے بالاتر ہو کر بے لاگ تجزیہ کے بعد کسی فن پارے پر اپنی رائے کا اظہار کرے، تاکہ رائے متوازن، معیاری اور صحت مند سمجھی جائے، وہ اپنے ان فرائض کو مکمل دیانت داری سے بجالائے تاکہ فن کا معیار بلند ہو، ادیب و قاری کے ذوق سلیم میں اضافہ ہو، وہ ذاتیات اور پسند و ناپسند کا غلام نہ بنے، نیز اسے مصنف کے احساسات اور جذبات سے آشنا ہونا چاہیے تاکہ وہ فن پارے کا صحیح طریق سے جائزہ لے سکے، ورنہ اس کے تاثرات بے ربط اور بے معنی ہوں گے۔

فنون اسلامیہ میں نقد کی اہمیت

اسلامی فنون میں فن نقد کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ مکمل دین ہم تک نقل کے ذریعہ پہنچا ہے، اور نقول واخبار کی صداقت واعتبار ناقلین کی ثقاہت واعتماد پر منحصر ہے، اس اعتبار کو جانچنے اور پرکھنے، نیز دین کو افتراء وتحریف سے محفوظ رکھنے کے لیے فن اسماء الرجال اور جرح وتعدیل وجود میں آیا، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ (ت:۱۸۱ھ) فرماتے ہیں: الإسناد عندي من الدين، ولولا الإسناد لقال من شاء ما شاء۔[2] یہ فن جرح وتعدیل، نقد ہی سے عبارت ہے، اور قرون أولیٰ مشہود لہا بالخیر سے ہی جاری وساری ہے، اسلامی تاریخ اپنے دامن میں بہت سی ایسی شخصیات کو سموئے ہوئے ہے جو فن نقد میں امامت کے درجے پر فائز ہیں، جن میں امام شعبہؒ (ت:۱۶۰ھ)، امام یحییٰ القطانؒ (ت:۱۹۸ھ)، امام یحییٰ بن معینؒ (ت:۲۳۳ھ)، حافظ علی بن المدینیؒ (ت:۲۳۴ھ)، امام بخاریؒ (ت:۲۵۶ھ)، حافظ ابوزرعہ رازیؒ (ت:۲۶۴ھ)، حافظ ابن ابی حاتم بستیؒ (ت:۳۲۷ھ)، حافظ مزّیؒ (ت:۷۴۲ھ)، حافظ ذہبیؒ (ت:۷۴۸ھ)، اور حافظ ابن حجرؒ (ت:۸۵۲ھ) نمایاں ہیں۔

علامہ اعظمیؒ بحیثیت عظیم نقاد

امیر الہند اول محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ (۱۳۱۹ھ-۱۴۱۲ھ) اسلامی علوم وفنون میں یکتائے زمانہ اور یگانۂ روزگار تھے، تفسیر وحدیث، فقہ وتاریخ، لغت وادب، اور تراجم وتذکرہ ہوں، یا منطق وفلسفہ، اور علم کلام یا فن شاعری، ہر ایک میں آپ کو نمایاں مقام اور عبقری حیثیت حاصل ہے، آپ کی علمی گہرائی وگیرائی اور دقت نظری، اور اس پر بلا کا حافظہ علماء ہند وبیرون ہند سب کے نزدیک مسلّم ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کے علمی شاہ کاروں میں نہ صرف محدثانہ، بلکہ ناقدانہ رنگ پوری طرح نمایاں ہے، آپ کی تحریریں آپ کی شخصیت کو ایک محدث ہی نہیں، بلکہ صاحب بصیرت اور نکتہ رس نقاد کی صورت میں بھی آشکارا کرتی ہیں۔

ایک حقیقی نقاد کے لیے جو اوصاف اور شرائط ہونی چاہئیں، اللہ تعالیٰ نے وہ تمام علامہ اعظمیؒ میں بدرجۂ اتم ودیعت کر رکھی تھیں، سچ یہ ہے کہ دقت نظری اور حق شناسی علامہ اعظمیؒ کا ایک خاص وصف ہے، جس میں نہ صرف آپ اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں، بلکہ گذشتہ کئی صدیوں میں بھی آپ کی نظیر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، آپ کا یہ وصف حدیث اور علوم حدیث کے ساتھ ساتھ دیگر فنون: فقہ، تاریخ، ادب وغیرہ میں بھی جلوہ نما ہے، بلکہ یہ وصف آپ کی پہچان اور تعارف کی حیثیت رکھتا ہے، علامہ اعظمیؒ کے ایک سچے قدرداں اور جاں نثار حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ (ت:۱۴۱۷ھ) ایک موقعہ پر لکھتے ہیں: العلامۃ الکبیر المحقق المحدث مولانا الشیخ حبیب الرحمٰن الأعظمي، الذي عرفه علماء بلاد الشام ومصر والمغرب وغيرها، من تحقيقاته واستدراكاته النادرة الغالية على العلامة الشيخ أحمد محمد شاكر رحمه الله تعالى في تحقيقه لكتاب "مسند أحمد"۳ (علامۂ کبیر، محقق، محدث، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی، جن سے شام، اور مصر ومغرب وغیرہ ممالک کے علماء "مسند احمد" پر علامہ شیخ احمد محمد شاکرؒ کی تحقیق پر آپ کی نادر اور بیش قیمت تحقیقات واستدراکات کے ذریعہ متعارف ہوئے ہیں)۔ نیز دارالمصنفین کے باوقار مجلہ "معارف" جس میں علامہ اعظمیؒ کے بہت سارے مضامین شائع ہوئے ہیں، اس کے ایڈیٹر جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب (ت:۱۴۲۹ھ) لکھتے ہیں: مولانا سلیس، شگفتہ، پُرمغز اور حشو و زوائد سے پاک اردو لکھتے تھے، جو ما قلّ وما دلّ کا نمونہ ہوتی تھی، مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے معارف اور برہان میں متعدد محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں، ان میں سے اکثر میں کسی مصنف یا مقالہ نگار کی فروگذاشتوں کی نشان دہی کی گئی ہے، اور یہ بڑے بیش قیمت ہیں، جن سے علمی وتحقیقی کام کرنے والے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔۴

مزید برآں یہ کہ نقد کرتے ہوئے آپ کا شہاب قلم ادب کی حلاوت اور مخالف کے مقام ومرتبہ سے صرف نظر نہیں کرتا، بلکہ حسن اخلاق کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء

آپ کی خدمات علمیہ کو تمام تر علمائے راسخین نے سراہا ہے، اور آپ کی شان میں مدح سرائی کی ہے، جن کی کچھ تفصیل علامہ اعظمیؒ کی بے نظیر سوانح 'حیات ابوالمآثر' جلد اول، صفحہ ۵۳۳ تا ۵۹۶ پر دیکھی جا سکتی ہے، سطور ذیل میں ہم چند ایسی تحریریں نقل کر رہے ہیں، جو آپ کی دقتِ نظر اور کمالِ نقد کے اعتراف سے تعلق رکھتی ہیں:

خواجہ عبدالحئی پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کی کتاب 'التفسیر الحدیث' پر علامہ اعظمیؒ کی ناقدانہ تحریر 'التنقید السدید علی التفسیر الحدید' شائع ہوئی، تو اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (ت:۱۳۶۲ھ) نے ۲۴؍صفر ۱۳۴۹ھ، کو علامہ اعظمیؒ کے نام خط لکھا: "احقر اشرف علی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا، اور اس حدیث کا مصداق پایا: قال رسول الله: يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين، وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين.۵ ماشاء اللہ قوت استدلال، حسن ادا، دفع شبہات، لین کلام، غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بارك الله تعالى في إفادات المصنف وإفاضاته"۶

وسیع النظر فقیہ ومحقق علامہ زاہد الکوثریؒ (ت:۱۳۷۱ھ)، علامہ اعظمیؒ کو اپنے خطوط میں جن القابات سے نوازتے ہیں، وہ آپ کی فن نقد میں مہارت کے اعتراف سے عبارت ہیں، کبھی "حضرة مولانا العلامة الأوحد والنحرير المفرد" سے خطاب کرتے ہیں، تو کہیں "الجهبذ الفريد" اور "العلامة النحرير الأستاذ الكبير" جیسے القابات، جو خالصتاً فن نقد میں مہارت تامہ پر دلالت کرتے ہیں، سے آپ کی پذیرائی کرتے ہیں۔

حافظ زیلعیؒ (ت:۷۶۲ھ) کی معرکۃ الآراء تالیف "نصب الرایۃ" کی چوتھی جلد کے شروع میں علامہ زاہد الکوثریؒ نے علامہ قاسم بن قطلو بغاؒ کی تخریج ہدایہ "منية الألمعي" کا اضافہ فرمایا ہے، اس موقعہ پر علامہ اعظمیؒ نے حافظ ابن حجرؒ کی تصنیف 'الدرایۃ' پر علامہ قاسم بن قطلو بغاؒ کے استدراکات ایک قلمی نسخے سے نقل کر کے مئو سے شیخ کوثریؒ کی خدمت میں بھیجا، جسے شیخ نے نعمت بیش بہا سمجھا، اور اپنے مقدمے میں علامہ اعظمیؒ کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا ہے: هذا وإني أشكر مولانا العلامة النحرير والجهبذ الخبير أبا

المآثر حبيب الرحمن الأعظمي، السالف الذكر، على تفضله بكتابة التعليقات بخطه يده المباركة، ومبادرته بإرسالها إلى هذا العاجز، مع ماله من الأشغال الكثيرة، فإنه هو السبب الأوحد لنشر الاثنين معا۔ (علامہ، ماہر نقّاد، وسیع العلم محقق ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، جن کا اوپر تذکرہ گذرا ہے، میں ان کی اِس کرم فرمائی پر ان کا شکرگذار ہوں کہ کثرت اشتغال کے باوجود ان تعلیقات کو اپنے ہاتھوں تحریر کرکے اس عاجز کے پاس بھیجا، دراصل دونوں کی ایک ساتھ اشاعت کا وہ تنہا ذریعہ بنے ہیں۔[7]

معروف محقق ونقّاد شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے مستور کی تعدیل اور قبولِ روایت کے موضوع پر اپنی ایک اہم تحقیق علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں پیش کی تھی، جس کو حضرتؒ نے پسند فرمایا، اس کی تصویب کی، اور اس پر اپنے تأثرات شیخ کو ارسال کیے تھے، اس کا تذکرہ شیخ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وأرسلت أيضا صورة عن هذا البحث إلى شيخنا العلامة المحدث الحافظ الفقيه والناقد البارع المحقق الضليع المفيد: فضيلة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي في أعظم كره بالهند، حفظه الله تعالى وأمتع به المسلمين، الخ۔ (میں نے اس بحث کی ایک کاپی اپنے شیخ، علامہ، محدث، حافظ، فقیہ، ماہر نقّاد اور بلند پایہ محقق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کی خدمت میں اعظم گڈھ، ہندوستان روانہ کی تھی)۔[8]

علامہ زاہد الکوثریؒ (ت:۱۳۷۱ھ) کی مشہور تصنیف 'فقہ أہل العراق وحدیثہم' میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے بطور تکملہ وتذییل، ہندوپاک کے ۴۰ علماء ومحدثین کا ذکر کیا ہے، جن میں سے ۳۳ علامہ بنوریؒ (ت: ۱۳۹۷ھ) کے مرتب کردہ، اور آخر کے سات شیخ کے قلم سے ہیں، اس تکملے میں نمبر (۳۹) پر حضرت شیخ علامہ اعظمیؒ کے تعارف میں یوں رطب اللسان ہیں:

العلامة، المحدث البارع، الفقيه، الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، صاحب التعليقات البديعة، والتحقيقات النادرة، العالم بالرجال والعلل، وتعليقاته وتحقيقاته السنية، على "سنن سعيد بن منصور"، و"الزهد" لابن المبارك، و"مسند الحميدي"، واستدراكاته على الشيخ أحمد شاكر في تعليقه على "مسند أحمد"، ثم تعليقاته الحافلة على "مصنف عبد الرزاق" الذي يطبع الآن بعون الله، كلها تنطق بسمو فضله وبسطة يديه في هذا العلم الشريف، وقد قارب السبعين أو جاوزها، أمد الله في عمره ونفع به.[9]

(علامہ، ماہر فن محدث، فقیہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ، انوکھی تعلیقات اور نادر تحقیقات کے حامل، علم رجال اور علل کے شناور، جن کی بیش بہا تعلیقات وتحقیقات سے سنن سعید بن منصور، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی کتاب الزہد، اور مسند حمیدی مزین ہیں، مسند احمد کی شیخ احمد شاکرؒ کی تحقیق پر آپ کے استدراکات ہیں، نیز حال ہی میں زیورطبع سے آراستہ ہونے والی مصنف عبد الرزاق پر آپ کی جامع تعلیقات ہیں، یہ سارے کارنامے آپ کی رفعتِ شان، اور حدیث پاک کے تعلق سے آپ کی وسعت علمی کے غمّاز ہیں، آپ کی عمر تقریباً ستّر سال یا اس سے زائد ہوچکی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کا نفع جاری رکھے، آمین۔) واضح رہے کہ حضرت شیخ کی یہ تحریر ۱۳۹۰ھ کی ہے۔

اسی کتاب کے مقدمے کے دوران حاشیے میں مصنف عبدالرزاق کے تعلق سے برسبیل تذکرہ حضرت شیخ، علامہ اعظمیؒ کا ذکر خیر اِن الفاظ میں کرتے ہیں: بتحقيق العلامة المحدث المحقق الجليل، المشهود له بالبراعة في هذا الفن من أهله، الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي -حفظه الله ورعاه-[10] (علامہ، محدث، عظیم محقق مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کی تحقیق سے آراستہ ہے، جن کی اس فن میں مہارت اہل فن کے نزدیک مسلّم ہے)۔

نیز مشہور محقق علامہ شعیب ارنؤوط (ت:۱۴۳۸ھ) امام بخاریؒ (ت:۲۵۶ھ) کے قول "فیہ نظر" کے تعلق سے علامہ اعظمیؒ کے استدراک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وهذه فائدة نفيسة تنبئ عن إمامة هذا الشيخ -حفظه الله ونفع به- بعلم الجرح والتعديل، ودرايته الواسعة بقضاياه. (یہ ایک عمدہ نکتہ ہے، جس سے فن جرح وتعدیل میں حضرت شیخ اعظمی کی شانِ امامت اور اس کے مسائل پر آپ کی علمی وسعت جھلکتی ہے۔[11]

علامہ اعظمیؒ کی تصانیف واستدراکات علمیہ کا شمار کراتے ہوئے استاذ محترم مولانا مسعود احمد صاحب الاعظمی رقم طراز ہیں: آپ کے اردو مضامین کی تعداد تقریبا ایک سوبیس ہے، جبکہ عربی مضامین دس ہیں، آپ کی مکمل نامکمل کتابیں اور رسالے اردو میں چالیس اور عربی میں سات ہیں، نیز بیس سے زائد کتابیں آپ کی تحقیق سے آراستہ ہوئی ہیں، ان عظیم علمی خدات کے ساتھ ساتھ علامہ اعظمیؒ کے بیش قیمت مفید استدراکات اور فی البدیہہ دقیق تعقبات بھی ہیں، جو آپ کی مطالعہ کردہ کتب کے حواشی پر جابجا بکھرے ہوئے ہیں، میرا خیال ہے کہ علامہ اعظمیؒ کے یہ استدراکات آپ کی مہارت، علمی گہرائی وگیرائی، برجستگی، اور دورانِ مطالعہ آپ کے استحضار کی ایک بڑی دلیل اور گواہ ہیں، جو اتنے وافر مقدار میں ہیں کہ اگر ان کو جمع ومرتب کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آجائے گی۔[12]

حضرت محدث کبیر علیہ الرحمہ کے انتقادات واستدراکات مختلف علوم وفنون سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی تفصیلات کا نہ یہ مقالہ متحمل ہے، نہ مقالہ نگار کے بس کی بات ہے۔ استاذ مکرم حضرت مولانا مسعود احمد صاحب الاعظمی نے

علامہ اعظمیؒ کے ان شہ پاروں کو بہت عمدگی اور سلیقہ کے ساتھ زریں لڑی میں پرویا ہے، چنانچہ"مقالات ابوالمآثر"کی تین جلدیں، اور"حیات ابوالمآثر"کی دو جلدیں اس کی گواہ ہیں، بالخصوص مقالات کی تیسری جلد تقریباً پوری کی پوری آپ کے تنقیدی مقالات ومضامین پر مشتمل ہے، اسی طرح مجلہ"المآثر"کے شماروں میں بھی یہ علمی شذرات جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

ذیل میں ہم مشتے نمونہ ازخروارے چند اہم استدراکات اور انتقادات ذکر کرتے ہیں:

شیخ احمد محمد شاکرؒ کی 'مسند الإمام أحمد' کی تحقیق پر علامہ اعظمیؒ کے انتقادات

علامہ اعظمیؒ کے کلک گہر بار سے جن کتابوں پر قیمتی استدراکات منصۂ شہود پر آئے ہیں، ان میں بہت زیادہ شہرت کے حامل، علامہ شیخ احمد محمد شاکرؒ (ت: ۱۳۷۷ھ) کی"مسند احمد"کی تحقیق پر آپ کے استدراکات ہیں، جن کو فاضل محققؒ نے مسند کی پندرہویں جلد میں بڑے اہتمام اور شکریہ کے ساتھ طبع کیا ہے، ان کے منظر عام پر آنے کے بعد آپ کی شہرت ونا موری اور علم حدیث میں آپ کے تبحّر کا اثر چہار دانگ عالم میں چھا گیا، اور خود شیخ احمد محمد شاکرؒ آپ کے شیفتہ وگرویدہ ہوگئے۔

چنانچہ شیخ احمد محمد شاکرؒ نے علامہ اعظمیؒ کے استدراکات کو بسر وچشم قبول کرتے ہوئے اظہار تشکر اور علمی عظمت ورفعت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا: "لقد جاءني كتابكم الأول النفيس.... أما استدراكاتكم فكانت نفيسة غالية، ولا أقول هذا مجاملة.... وأشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة، وأرجو أن تزيدوني من إشاراتكم وإرشاداتكم، خدمة السنة النبوية المطهرة، وأنتم، كما رأيت من عملكم، من أعظم العلماء بها في هذا العصر، فالحمد لله على توفيقكم.... ثم أكرر الرجاء أن لا تحرموني من آرائكم النيرة وتحقيقاتكم النفيسة"[۱۳] (آپ کا والا نامہ موصول ہوا۔ جہاں تک آپ کے استدراکات کا سوال ہے تو سب کے سب عمدہ اور بیش قیمت ہیں، اور میں یہ بات بطور خوشامد نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس عظیم توجہ فرمائی پر آپ کا خلوص دل سے شکر گزار ہوں، اور امید رکھتا ہوں کہ حدیث پاک کی خدمت کے جذبے سے مجھے مزید مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازیں گے، آپ کے اس عظیم عمل کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ آپ اس زمانہ میں سنت نبویہ کے ایک عظیم ترین عالم ہیں۔ فالحمد لله على ذلك، آخر میں پھر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنی قیمتی آراء اور تحقیقات سے محروم نہ رکھئے گا۔ اھ)۔

شیخ احمد محمد شاکرؒ کی تحقیق پر علامہ اعظمیؒ کے انتقادات اور استدراکات بہت ہیں، ان کا ایک حصہ تو مسند احمد کی سولہویں جلد میں شیخؒ نے شامل اشاعت کیا ہے، اور دوسرا حصہ بھی علامہ اعظمیؒ نے شیخ کی خدمت میں بھیجا تھا، مگر ان تک یہ حصہ پہنچنے سے پہلے پیام اجل پہنچ گیا، رحمه الله رحمة واسعة۔ یہ حصہ اور آگے کے بہت سارے استدراکات مجلہ"البعث الاسلامی"(ج ۴، ش ۱)، مجلہ"ترجمان الاسلام" بنارس، (علامہ اعظمیؒ پر خصوصی اشاعت)، اور مجلہ"المآثر"(ج ۱، ش ۴، اور ج ۲، ش ۱) کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں۔

ذیل میں علامہ اعظمیؒ کے انتقادات کے کچھ نمونے پیش ہیں:

مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۲۸۰، حدیث نمبر ۱۱۸۷ میں ایک جملہ آیا ہے: اخطأت استك الحفرة، اس پر علامہ اعظمیؒ نے لکھا کہ یہ جملہ اس طرح نہیں ہے، بلکہ درست: أخطأتْ استُك الحفرة ہے، چنانچہ کنز العمال اور مجمع الزوائد میں اسی طرح ہے۔

مسند احمد جلد ۴ صفحہ ۳۲۲، حدیث نمبر ۲۹۰۰ میں علقمہ بن وعلہ کا نام آیا ہے، اس پر شیخ محقق لکھتے ہیں: علقمہ بن وعلہ کا میں نے نہ کہیں تذکرہ پڑھا، نہ اس کے علاوہ کہیں ان کا ذکر دیکھا، مجھے نہیں معلوم کہ یہ کون ہیں؟ شاید عبدالرحمٰن بن وعلہ کے بھائی ہوں۔ اھ اس پر علامہ اعظمیؒ نے استدراک کیا کہ علقمہ بن وعلہ کا تذکرہ ابن یونس کی تاریخ مصر میں، سمعانی کی کتاب الانساب میں، اور ابن اثیر کی لباب میں ہے، اور یہ واقعۃً عبدالرحمٰن بن وعلہ کے بھائی ہیں۔

مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۹۴، پر شیخ محقق نے لفظ"دربان"کی تشریح ایک قسم کے کپڑے سے کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے ان پر نقد کرتے ہوئے لکھا کہ دربان فارسی زبان کا لفظ ہے، اس کے عربی معنی حاجب اور بوّاب کے ہیں، پھر مولانا نے حدیث میں وارد اس پورے جملے کی تشریح بھی کی ہے، جس سے آپ کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

علامہ اعظمیؒ کے نقد کا ایک شاہکار:"الألباني شذوذه وأخطاؤه"

علامہ اعظمیؒ کی علمی ودینی غیرت وحمیت کا شاہ کار یہ علمی سرمایہ چار حصوں میں (۱۷۲) صفحات پر اشاعت پذیر ہوا تھا، اس میں عرب دنیا کی ایک مشہور اور نامور شخصیت شیخ ناصر الدین البانی (ت: ۱۴۲۰ھ) پر عالمانہ نقد کیا گیا ہے۔ شیخ البانی اپنی علمی ناپختگی، فطری حدّت، اور کسی بڑے کی رہنمائی سے محرومی کے باعث مزاج میں ضرورت سے زیادہ شدت، نیز حد اعتدال سے بڑھے ہوئے بے باکانہ انداز اور دائرۂ ادب سے متجاوز اسلوب بیان کی وجہ سے بے شمار تسامحات وتناقضات کے شکار ہوئے ہیں، یہی نہیں بلکہ ان کی جرأت وبیباکی نے وہ گل کھلائے کہ نئی نسل کا مزاج بدل کر رکھ دیا، احادیث ضعیفہ کو موضوعہ کے ساتھ شامل کر کے، اور سنن اربعہ ودیگر کتب حدیث کی صحیح وضعیف

میں تقسیم کر کے ایسا ذہن بنا دیا کہ احادیث ضعیفہ سے اعتماد ختم ہو گیا، صرف اصطلاحی صحیح احادیث پر انحصار کا مزاج بن گیا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ دین کی صحیح شکل بناہر قسم کی صحیح، حسن، ضعیف احادیث کے امتزاج کے ممکن نہیں ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہر قسم کی احادیث کو اس کے صحیح محمل پر رکھا جائے۔

عرب نسلِ نو جو تساہل پسندی اور تن آسانی کی خوگر ہو چکی ہے، اس نے شیخ البانی کے افکار کو بسر وچشم قبول کیا، اور انھیں اس قدر بڑھاوا دیا کہ ان کا نام بطور استناد استعمال کرنے لگے، اور اس فکر نے ایسا نقصان پہونچایا جس کی تلافی کے لیے شاید صدیاں درکار ہوں، غالباً یہی وجہ ہے کہ شیخ البانی پر نقد کرتے وقت علامہ اعظمیؒ کا شہاب قلم عادت کے خلاف صفت جلالیہ کا پرتو نظر آتا ہے، یہ وہ دور تھا جب شیخ البانی کے خلاف لب کشائی کی کوئی ہمت نہیں کر پا رہا تھا، ایسے میں علامہ اعظمیؒ کے شہاب قلم سے یہ شاہکار وجود میں آیا، جس نے شیخ کے مبلغ علم اور ان کے تناقضات کو اس طرح مدلل وآشکارا کیا کہ علمی دنیا میں دھوم مچ گئی، اور علمائے کرام جو پہلے ہی سے شیخ کی مچائی تباہی سے نالاں تھے، انھیں یہ جوہر بیش بہا ہاتھ لگ گیا، اور پھر شیخ کے افکار وخیالات پر قدغن لگانے اور امت کو ان کے پھیلائے غلط افکار سے بچانے کے لیے کئی تصانیف وجود میں آئیں، چنانچہ شیخ حسن سقاف کی "تناقضات الألباني الواضحات" اور شیخ محمود سعید ممدوح کی بہترین تصنیف "التعریف بأوهام من قسم السنن إلی صحیح وضعیف" وغیرہ کتابیں علامہ اعظمیؒ کی رہنمائی کی مرہون منت ہیں، ولکن الفضل للمتقدم

شیخ البانی کے بارے میں خود علامہ اعظمیؒ لکھتے ہیں: "الشیخ ناصر الدین الألباني شدید الولوع بتخطئة الحذاق من کبار علماء الإسلام، ولایحابي في ذلك أحدا، کائنا ما کان، فترا هو یخطّئ البخاريّ ومسلما، ومن دونهما، ویغلط ابن عبد البر وابن حزم وابن تیمیة والذهبي وابن القیم وابن حجر والصنعاني والشوکاني، ویکثر من ذلك حتی یظن الجهلة والسذّج من العلماء أن الألباني نبغ في هذا العصر نبوغاً یندر مثله". (شیخ ناصر الدین البانی واکابر علمائے اسلام کے ماہرین کو غلط ٹھہرانے کا بہت شوق ہے، اس سلسلے میں وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے، چنانچہ وہ بخاری، اور مسلم وغیرہ کی فروگزاشتیں دکھاتے ہیں، اور ابن عبد البر، ابن حزم، ابن تیمیہ، ذہبی، ابن قیم، ابن حجر، صنعانی، اور شوکانی وغیرہ کی غلطیاں نکالتے ہیں، اور یہ کام اس کثرت سے کرتے ہیں کہ علم سے ناآشنا اور سادہ لوح علماء یہ گمان کرنے لگے کہ البانی کو اس فن میں وہ کمال حاصل ہے جس کی نظیر مشکل ہے۔[14]

علامہ اعظمیؒ نے اس کتاب میں شیخ البانی کی کتب سے ایسے نمونے پیش کیے ہیں جن میں شیخ اپنی تحقیقات کو نادر، انوکھی اور اچھوتی، نئی اور بے مثل تحقیق وغیرہ الفاظ سے موسوم کیا ہے، حالانکہ وہ تحقیقات یا تو متقدمین سے ماخوذ ہیں یا لایعبأ بہ ہیں، اور چونکہ شیخ البانی نے اساتذہ اور اہل علم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا ہے، جو کہ رسوخ فی العلم اور فکری اعتدال کے لیے ضروری ہے، بلکہ گھڑی سازی کے پیشے کے ساتھ ساتھ کتابوں کا مطالعہ کرتے کرتے مقام اجتہاد تک پہونچے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے فہم وتحقیق میں ایسی ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کا مبتدی طلبہ سے بھی صدور نہیں ہوتا۔

علامہ اعظمیؒ نے شیخ البانی پر استدراکات اور انتقادات کو مندرجہ ذیل عنوانات پر منقسم کیا ہے:

۱- مبلغ علم الألباني ۲- ولوع الألباني بنقض کلام ابن تیمیة ۳-مناقضات ۴-تحریم الصورة التي توطأ ۵-هل خاتم الذهب محرم علی النساء؟ ۶-خرق الإجماع ۷-اختلاف العلماء ۸-ستر المرأة ۹-السفر لزیارة القبر النبوي ۱۰-تطبیق الألباني ذم المعتزلة علی ذم أتباع الأئمة ۱۱-انقراض الاجتهاد۔ ان کے علاوہ ذیلی عناوین بھی قائم کیے ہیں۔

ان میں سے بعض عنوانات پر کسی قدر مفصل گفتگو مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ (ت: ۱۴۳۴ھ) کے قلم سے مجلہ"المآثر" کے ابتدائی شماروں میں آچکی ہے، نیز حیات ابوالمآثر کے اندر بھی اس کی تفصیلات موجود ہیں، اور خود عربی میں یہ فن پارہ بھی مطبوع اور متداول ہے، اس لیے مقالے کی طوالت کے خوف سے ہم ان انتقادات کی مثالوں سے صرف نظر کرتے ہیں۔

امام بیہقیؒ کی 'السنن الکبریٰ' پر علامہ اعظمیؒ کے استدراکات

پانچویں صدی ہجری کے نصف اول کے عظیم المرتبت اور بلند پایہ محدث ومصنف امام بیہقی (ت: ۴۵۸ھ) محتاج تعارف نہیں ہیں، آپ کی بے شمار تصانیف میں سب سے مشہور تصنیف "السنن الکبری" ہے، اس اہم کتاب کے متعدد مقامات پر حضرت محدث کبیر علامہ اعظمیؒ کے بیش بہا استدراکات موجود ہیں، جو استاذ محترم حضرت مولانا دکتور مسعود احمد صاحب الاعظمی دامت برکاتہم کے قلم گہر بار سے مزین ہو کر مجلہ"المآثر" (جلد ۱۸ شمارہ ۴، ج ۱۹ ش ۱، ج ۱۹ ش ۳، ج ۲۰ ش ۲، ج ۲۱ ش ۱) میں پانچ قسطوں میں شائع ہوئے ہیں، جن کی تعداد تقریباً ستاون (۵۷) ہے، ہم ان میں سے کچھ نمونے ذیل میں نقل کرتے ہیں، جو علامہ اعظمیؒ کی وسعت علم اور دقت نظر کے غماز ہیں:

جلد ۱، صفحہ ۹۰ پر ایک روایت ہے، جس میں یہ الفاظ ہیں: من أفتاك بهذا والسماء؟، علامہ اعظمیؒ نے اس پر علامت لگا کر تحریر کیا ہے کہ: من أفتاك

بهذا؟ أمسيلمة؟ وقد كان السائل مع مسيلمة مرة، راجع "المصنف لابن أبي شيبة" و"عبد الرزاق" و"تاريخ البخاري"۔ یعنی اس روایت میں من أفتاك بهذه المسألة کے بجائے من أفتاك بهذا؟ أمسيلمة؟ صحیح معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ سائل ایک دفعہ مسیلمہ کے ساتھ تھا، مصنَف ابن ابی شیبہ وعبدالرزاق، اور تاریخ بخاری کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔اھ

چنانچہ مصنف ابن أبی شبیہ (۱/ ۱۷۵)، مصنف عبدالرزاق (۱/ ۳۳۹) اور تاریخ بخاری (جلد ۱، قسم ۱، صفحہ ۴۳۷، و۴۳۹) میں ایسے متعدد شواہد ہیں جو علامہ اعظمیؒ کے احتمال کو درست اور ثابت قرار دیتے ہیں۔

جلد ۱، صفحہ ۱۲۴ پر امام بیہقیؒ نے مسّ مرأۃ سے وضو ٹوٹنے کو حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول قرار دیا ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس پر استدراک کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: العجب من البيهقي أن لا يتكلم في هذه الرواية، وقد علم أنه من رواية الدراوردي عن الدياج، وقد خالفه عبيد الله بن عمر عند ابن أبي شيبة (۱/۷۸) وتابعه مالك عند المصنف، فوقفاه على ابن عمر، وهكذا رواه العمري عن نافع، وقد ذكر هذه الروايات كلها الدارقطني في سننه، وزاد أنه صحيح حديث الدراوردي عن الدياج، وروى عبد الرزاق أن عمر بن الخطاب خرج إلى الصلاة فقبلته امرأته، فصلى ولم يتوضأ.

اس استدراک کا حاصل یہ ہے کہ مسّ مرأۃ سے وضو کے وجوب کا قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب کرنے کی دلیل وہ روایت ہے جسے عبدالعزیز دراوردی نے محمد بن عبداللہ دیباج عن الزہری کی سند سے نقل کیا ہے، اس میں یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے، جبکہ امام زہریؒ کے دوسرے دو شاگرد عبیداللہ بن عمر، اور امام مالک، جو انفراداً بھی دیباج سے بدرجہا اعلی مرتبہ رکھتے ہیں، وہ دونوں متفق ہوکر اس کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول بتارہے ہیں، مزید برآں عبیداللہ اوران کے بھائی عبداللہ نے حضرت نافع کی روایت میں بھی اس کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول بتلایا ہے، تو اس قول کا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہونا راجح ہونا چاہیے، مگر ان سب کے باوجود امام بیہقیؒ کا کچھ کلام نہ کرنا باعثِ تعجب ہے۔ مزید یہ کہ مصنف عبدالرزاق (۱/ ۱۳۵) میں صراحت ہے کہ حضرت عمرؓ مسّ مرأۃ یا قبلہ کے موجبِ وضو ہونے کے قائل نہیں تھے۔

جلد ۲، صفحہ ۴۶ پر امام بیہقیؒ نے نماز میں جہراً بسم اللہ پڑھنے سے متعلق باب قائم کرکے تقریباً بیس روایتیں نقل کی ہیں، پھر آگے صفحہ ۵۰ پر عدم جہر کا باب قائم کیا ہے، اور اس میں آٹھ روایات ذکر کی ہیں، وہیں ایک روایت ذکر کرکے امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: كذا كان في كتابي "عن أبيه عن ابن عباس" وهو منقطع، یعنی میرے نوشتے میں یہ روایت اسی طرح عن أبیہ عن ابن عباس ہے، اور یہ سند منقطع ہے۔ علامہ اعظمیؒ امام بیہقیؒ کے لفظ "منقطع" پر علامت لگاکر حاشیہ میں زبردست نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں: لا أعتقد أن البيهقي لا يدري أنه صح عن ابن عباس أنه قال: الجهر ببسم الله الرحمن الرحيم قراءة الأعراب، أخرجه ابن أبي شيبة وعبد الرزاق، وروينا الإسرار بها أو تركها رأسا عن علي وابن مسعود وعمار وأنس وابن الزبير، كما روينا ذلك عن الخلفاء الثلاثة وعن الحسن وابن سيرين وقتادة وعمر بن عبد العزيز وأبي وائل وإبراهيم النخعي وعروة والحكم وحماد وأبي إسحاق، ولكن المصنف لم يذكر شيئا من ذلك في باب من قال لا يجهر بها، إلا الأقل من القليل. (یعنی مجھے یقین نہیں آتا کہ امام بیہقیؒ کو یہ معلوم نہ ہو کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح ثابت ہے کہ بآواز بلند بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا اعراب کی قراءت ہے، ابن عباسؓ کے اس قول کو ابن أبی شبیۃ (۲/ ۳۸۴) اور عبدالرزاق (۲/ ۸۹) نے روایت کیا ہے، بسم اللہ کو آہستہ پڑھنے یا سرے سے نہ پڑھنے کی روایتیں حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عمار، حضرت انس، اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ہمیں پہونچی ہیں، نیز حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ، قتادہؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، ابووائلؒ، ابراہیم نخعیؒ، عروہؒ، حکمؒ، حمادؒ، اور ابواسحاقؒ وغیرہم سے اسی قسم کی روایتیں ہم تک پہونچی ہیں، لیکن امام بیہقیؒ نے "من قال لا يجهر بها" کے باب میں ان میں سے کم سے کم روایتیں ذکر کی ہیں)۔

"تحفة الأحوذي شرح جامع الترمذي" پر علامہ اعظمیؒ کے استدراکات

ترمذی شریف جس کا شیخ ابوغدہؒ کی تحقیق کے مطابق مکمل نام "الجامع المختصر من السنن عن رسول الله ﷺ ومعرفة الصحيح والمعلول وما عليه العمل" ہے، متونِ حدیث میں ایک اہم مقام رکھتی ہے، اور بقول شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ (ت: ۱۲۳۹ھ): تصانیف بسیار دریں فن شریف از وے یادگار است، وایں جامع بہترین آں کتب است، و بلکہ بعضے وجوہ وحیثیات از جمیع کتب حدیث خوب تر واقع شدہ۔ (اس فن شریف میں امام ترمذیؒ (ت: ۲۷۹ھ) کی بہت سی کتابیں یادگار ہیں، اور ان کی کتاب جامع ان کتابوں میں سب سے بہتر ہے، بلکہ بعض وجوہ اور حیثیتوں سے حدیث کی تمام کتابوں سے زیادہ بھلی ہے۔)[۱۵]

اس اہمیت کے پیش نظر حضرات محدثین وعلمائے کرام نے اس کی متعدد

شرحیں لکھی ہیں، عربی زبان میں اس کی ایک مکمل اور اچھی شرح معروف غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوریؒ (ت: ۱۳۵۳ھ) کی "تحفۃ الاحوذی" ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شرح وبسط کے اعتبار سے بہترین شرح ہے، مگر اس پر مخالفتِ حنفیت کا رنگ غالب اور نمایاں ہے، اس شرح کے فقہی اعتراضات اور مغالطات کا محاکمہ اور مسکت جواب صاحب "معارف السنن" نے بہت حد تک دے رکھا ہے، البتہ وہ مکمل نہ ہوسکا تھا، اس کی تکمیل کا کارواں اس وقت بنام "هدية الأحوذي" مولانا ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی میں دیوبند میں رواں دواں ہے، اللہ کرے منزل مقصود تک بعافیت پہنچ جائے۔

علامہ اعظمیؒ نے اس شرح پر جو استدراکات زیب قرطاس کیے ہیں، ان میں اکثر فقہی مباحث سے صرف نظر کرتے ہوئے محدثانہ انداز اختیار کیا ہے، ان میں آپ کا حدیثی عکس نظر آتا ہے۔ یہ استدراکات مجلہ "المآثر" کے (جلد ۱۰، شمارہ ۱، تا جلد ۱۸، شمارہ ۳) بائیس قسطوں[۱۶] میں شائع ہوئے ہیں، جن کی تعداد تقریباً ایک سواسی ہے (۱۸۰)،[۱۸] یہ استدراکات علامہ اعظمیؒ کی دقت نظر اور وسعت علم کے غماز ہیں، جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، ذیل میں کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

جامع ترمذی میں پہلا باب ہے: باب ما جاء لا تقبل صلاة بغير طهور، اس میں مولانا مبارک پوریؒ نے ما فی الباب کی تخریج کرکے کچھ اور احادیث کا حوالہ دیا ہے کہ یہ احادیث بھی باب سے متعلق ہیں، جو علامہ ہیثمیؒ (ت: ۸۰۷ھ) کی "مجمع الزوائد" میں مذکور ہیں، ان میں ایک روایت رباح بن عبدالرحمٰن بن حویطب کی ہے، جسے وہ اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں، علامہ اعظمیؒ نے اس پر استدراک کرتے ہوئے فرمایا کہ: حديثها عند الترمذي وابن ماجه، كما في تهذيب التهذيب، (ترجمة رباح) وإنما اختصر حديثه الترمذي، فلم يذكر إلا الشطر الذي فيه ذكر التسمية، انظر ص ۳۸، وخفي هذا على الشارح فلم يعزه إليه۔ (رباح بن عبدالرحمٰن عن جدتہ والی حدیث ترمذی اور ابن ماجہ میں بھی ہے، جیسا کہ تہذیب التہذیب میں رباح کے ترجمے میں مذکور ہے، البتہ اتنی بات ہے کہ امام ترمذی نے اس کا اختصار کرتے ہوئے صرف وہی ٹکڑا نقل کیا ہے جو وضوء کے وقت بسم اللہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، اور یہ حدیث صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے، لیکن یہ بات شارح کی نگاہ سے پوشیدہ رہ گئی، اور انھوں نے اس کے لیے ترمذی کا حوالہ نہیں دیا)۔[۱۸]

صفحہ ۴۰ پر باب ما جاء في المضمضة والاستنشاق میں بطور استدراک مولانا مبارک پوریؒ لکھتے ہیں: وفي الباب أحاديث أخرى، منها حديث أبي هريرة۔ (اس باب میں (امام ترمذیؒ کی ذکر کردہ فی الباب کی احادیث کے علاوہ) دوسری احادیث بھی ہیں، جن میں حدیث ابوہریرہ ﷺ بھی ہے،) علامہ اعظمیؒ نے أبي هريرة پر علامت لگا کر لکھا ہے: سبحان الله! أليس الترمذي ذكر حديث أبي هريرة فتستدركه، یعنی جب امام ترمذیؒ نے خود ہی اس باب میں حدیث ابوہریرہ ﷺ ہونے کا ذکر کردیا ہے، جیسا کہ ان کی عبارت ہے: وفي الباب عن عثمان .... وأبي هريرة اب اس کے بعد مولانا مبارک پوریؒ کا حدیث ابوہریرہ ﷺ کا استدراک چہ معنی دارد؟ ([۱۹]

صفحہ ۵۶ پر امام ترمذیؒ نے باب في إسباغ الوضوء میں فی الباب کے تحت متعدد صحابہ کی احادیث کا ذکر کیا ہے، مولانا مبارک پوریؒ نے اپنی عادت کے مطابق ہر ہر حدیث کا مخرج ذکر کیا ہے، مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے، علامہ اعظمیؒ نے استدراک کیا کہ: أما حديث عائشة فأخرجه إسحاق في مسنده (یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی تخریج امام اسحاقؒ نے اپنی مسند میں کی ہے۔)[۲۰]

یہاں یہ ذکر مناسب ہوگا کہ مولانا مبارک پوریؒ نے فی الباب کی احادیث کی تخریج میں عموماً علامہ شوکانیؒ (ت: ۱۲۵۰ھ) کی "نیل الاوطار" پر اعتماد کیا ہے، جس کے نتیجے میں بہت ساری احادیث کے مخارج، خواہ وہ صحیحین ہی کیوں نہ ہوں، ان پر مخفی رہ گئے ہیں، علامہ اعظمیؒ نے ان پر جابجا استدراک کیا ہے، جو مجلہ "المآثر" میں بالترتیب ان نمبرات پر نقل کیے گئے ہیں:

۱۱، ۱۶، ۱۷، ۲۱، ۲۵، ۲۶، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۴، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۰، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۴، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۹، ۸۲، ۸۸، ۹۱، ۹۲، ۹۴، ۹۵، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۷۲، ۱۷۴، یہ کل اکیانوے (۹۱) مقامات ہیں۔

علامہ اعظمیؒ کے بعض استدراکات بہت طویل ہیں، مثلاً استدراک نمبر (۱۵۰)، جن کے ضمن میں بہت سی مفید باتیں اور متعدد انتقادات آگئے ہیں، یہ سارے کے سارے استدراکات یقیناً آپ کے علمی درک ورسوخ، وسعت مطالعہ اور نقادطبع پر مہر ثبت کرتے ہیں۔

اصطلاحات جرح وتعدیل کے تعلق سے

علامہ اعظمیؒ کے انتقاد کی ایک جھلک:

حدیث شریف کی حفاظت وصیانت کے لیے حضرات محدثین نے بہت سارے اصول وضع کیے ہیں، ان ہی میں سے الفاظِ جرح وتعدیل بھی ہیں، جو راویٔ حدیث کا درجہ اور اس کے اعتبار سے اس کی حدیث کا رتبہ طے کرتے ہیں، ان الفاظ میں سے کچھ عام معنی میں ہوتے ہیں کہ ہر محدث ان سے ایک ہی مفہوم اخذ کرتا ہے، اور کچھ خاص اصطلاحیں ہیں، جن کے معانی ومفاہیم سب کے نزدیک یکساں نہیں ہوتے، اب اگر ان خاص اصطلاحات کے ایجادکاروں نے ان کے معانی بیان کردیئے ہوں تو فبہا، ورنہ ان معانی کی تعیین میں متاخرین میں بڑا اختلاف ہوتا ہے، ہر محدث اپنی معلومات کی روشنی میں ان الفاظ کا محمل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ کوشش کبھی توبار آور ہوتی ہے، اور کبھی درستگی کو نہیں پہونچتی، اور دیگر علماء کو نقد واستدراک کا موقعہ فراہم کرتی ہے۔

چنانچہ امام بخاریؒ کی ایک اصطلاح "فيه نظر" بھی ان ہی اصطلاحات کے قبیل سے ہے جس کی مراد حضرت امامؒ نے واضح نہیں کی ہے، حافظ ذہبی (ت:۷۴۸ھ) اور حافظ عراقیؒ (ت:۸۰۶ھ) نے اس کا ایک محمل متعین کیا، جس پر علامہ اعظمیؒ کی دقت نظری اور وسعت علمی نے سوالیہ نشان لگادیا ہے، علامہ اعظمیؒ کے نقد کا تذکرہ شیخ ابوغدہؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''وقد انتقد أستاذنا العلامة المحدث المحقق النبيل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي كلام الحافظ الذهبي وكلام الحافظ العراقي: فلان فيه نظر، يقوله البخاري فيمن تركوا حديثه، فكتب إلي، سلمه الله تعالى، من الهند يقول: لا ينقضي عجبي حين أقرأ كلام العراقي هذا، وكلام الذهبي أن البخاري لا يقول: "فيه نظر" إلا فيمن يتهمه غالبا، ثم أرى أئمة هذا الشأن لا يعبأون بهذا، فيوثقون من قال فيه البخاري: "فيه نظر"، أو يدخلونه في الصحيح، ثم ذكر أمثلة لذلك، وبعد ذلك يقول: والصواب عندي أن ما قاله العراقي ليس بمطرد ولا صحيح على إطلاقه، بل كثيرا ما يقوله البخاري ولا يوافقه عليه الجهابذة. وكثيرا ما يقول ويريد به إسنادا خاصا، وكثيرا ما يقوله ولا يعني الراوي، بل حديث الراوي، فعليك بالتثبت والتأني. انتهى كلام شيخنا حبيب الرحمن. وقد أيقظ، حفظه الله وأمتع به، إلى موضوع من العلم هام جدا، كان مأخوذا بالتسليم والمتابعة من العلماء، فجزاه الله تعالى خيرا عن السنة وعلومها''۔[۲۱]

(حافظ ذہبیؒ اور حافظ عراقیؒ کے کلام: امام بخاریؒ "فلان فیہ نظر" ایسے راوی کے بارے میں کہتے ہیں جس کی روایت علماء کے نزدیک متروک ہو، اس پر ہمارے استاذ علامہ محدث عظیم محقق مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے نقد کرتے ہوئے ہندوستان سے مجھے لکھا ہے کہ: جس وقت میں حافظ عراقیؒ اور حافظ ذہبیؒ کی یہ بات پڑھتا ہوں تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ امام بخاریؒ 'فیہ نظر' اکثر وبیشتر اسی شخص کے بارے میں استعمال کرتے ہیں، جو ان کے نزدیک متہم ہوتا ہے۔ پھر میں اس فن کے ائمہ کو دیکھتا ہوں کہ اس جرح کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایسے راویوں کی توثیق کرتے ہیں، جن کی نسبت امام بخاریؒ نے "فیہ نظر" کہا ہے، یا اس کی روایت کردہ حدیث کو صحیح میں جگہ دیتے ہیں۔

پھر حضرت نے اس کی مثال میں گیارہ (بارہ) راویوں کے نام اور ان کے تعلق سے علمائے جرح وتعدیل کے اقوال نقل کیے ہیں، آگے فرماتے ہیں: میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حافظ عراقیؒ نے جو بات کہی ہے، وہ نہ تو قاعدہ کلیہ ہے، اور نہ علی الاطلاق درست ہے، بلکہ بسا اوقات امام بخاریؒ یہ کلمات صادر فرماتے ہیں، اور ان سے دوسرے ماہرین فن اتفاق نہیں کرتے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ ان الفاظ سے کوئی خاص سند مراد لیتے ہیں، اور بہت سی جگہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی مراد راوی نہیں بلکہ اس کی حدیث ہوتی ہے، لہٰذا اس مسئلے میں بہت غور وفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

آگے شیخ ابوغدہؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ حضرت کی حفاظت فرمائے، انھوں نے علم حدیث کی ایک اہم بحث کی طرف توجہ دلائی ہے، جو اَب تک اہل علم کے نزدیک مسلّم اور معمول بہ رہی ہے، اللہ جل شانہ مولانا کو حدیث اور علوم حدیث کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ اھ)۔

علامہ اعظمیؒ کی یہ نادر تحقیق جب دنیائے علم میں جلوہ افروز ہوئی تو ارباب فن نے اس کی پذیرائی کی، اور اسے تحسین وآفرین سے نوازا، وہیں اس زریں نقد پر کچھ کج فہموں نے خامہ فرسائی بھی کی، جس کا مدلل اور جامع جواب حضرت استاذ مولانا مسعود احمد صاحب کے قلم گہر بار سے تین قسطوں میں مجلہ "المآثر" (جلد ۱۵، شمارہ ۲، ج ۱۵، ش ۴، ج ۱۶، ش ۱) کی زینت بن چکا ہے، اور بعد میں رسالے کی شکل میں الگ سے اشاعت پذیر بھی ہوگیا ہے۔ جزاه الله عنا أحسن الجزاء

حافظ مزیؒ کی "تحفة الأشراف" کے تعلق سے علامہ کمال الدین دمیریؒ پر ایک اہم استدراک

حافظ جمال الدين أبو الحجاج يوسف بن عبد الرحمٰن المزي (ت: ۷۴۲ھ) کی معرکۃ الآراء تصنیف "تحفة الأشراف بمعرفة الأطراف" ایک محدود دائرے میں مختلف اسانید وطرق کے علم کا عمدہ اور آسان ذریعہ ہے،

اس میں حافظؒ نے کتب ستہ اور ان کے مؤلفین کی دیگر کتابوں کی احادیث مع اسانید ذکر کی ہیں، جسے دیکھ کر باحث کو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ حدیث کن کن کتابوں میں کن کن سندوں سے منقول ہے، کتاب کو صحابہ کرام ؓ کی مسانید پر مرتب کیا ہے، ایک صحابی کی جملہ مرویات ان کی سندوں کے ساتھ لاتے ہیں، اور جن کتابوں میں وہ احادیث مذکور ہیں، ان کا حوالہ بطور رمز دیتے ہیں، ان رموز کی وجہ سے بعض مرتبہ محققین کو اشتباہ ہوجاتا ہے، اور "تحفۃ الاشراف" میں انفرادی رمز دیکھ کر حدیث پر انفراد کا حکم لگادیتے ہیں، جبکہ وہ حدیث دیگر کتب میں بھی مذکور ہوتی ہے، ابن ماجہ شریف کے شارح علامہ کمال الدین دمیریؒ (ت: ۸۰۰ھ) کو بھی متعدد مقامات پر اس طرح کے مغالطے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ابن ماجہ شریف کی پہلی حدیث "ما آتاکم الرسول فخذوہ الحدیث" پر "انفرد بہ ابن ماجہ" کا حکم لگایا ہے، کیوں کہ حافظ مزیؒ نے اس حدیث پر تنہا ابن ماجہ کا رمز "ق" نقل کیا ہے (تحفۃ الاشراف: ۱۲۳۹۲)، حالانکہ یہ حدیث مسلم شریف (۷/۹۱) اور ترمذی شریف (۲۶۷۹) میں بھی مذکور ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اعمشؒ سے نقل کرنے والے متعدد ہیں، اور ابن ماجہ ان میں سے ایک طریق میں منفرد ہیں، حضرت محدث کبیر علامہ اعظمیؒ کا اس موضوع پر ایک اہم استدراک مولانا لطیف الرحمٰن صاحب بہرائچی دامت برکاتہم نے اپنی "الدیباجہ شرحِ ابن ماجہ" میں بسط وتفصیل سے ذکر کیا ہے، فجزاہما اللہ خیرا، لکھتے ہیں: قال الشارح کمال الدین الدمیري في "الدیباجہ": هذا مما انفرد به المصنف. قال شیخنا حبیب الرحمن الأعظمي حفظه الله ورعاه: فیه نظر، فإن الحدیث رواه أصحاب الستة وغیرهم بطرق عدیدة، فکیف یصح أن یقال في مثل هذا أنه مما انفرد به المصنف، اللهم إلا أن یقال: إنه عنی طریق جریر عن الأعمش، فإن کان هذا مراده فلزمه أن یقید بهذا القید کما فعل المزي، فإنه إذا رمز لهذا الحدیث بـ"ق" وحدها، قال: ق في السنة عن محمد بن الصباح عنه یعني عن جریر عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هریرة ؓ ۲۲، ۱۰

واقعہ یہ ہے کہ صاحب "تحفۃ الاشراف" حافظ مزیؒ نے تحفہ میں رموز کے تعلق سے اپنا منہج اور طریقۂ کار صراحتاً ذکر نہیں کیا ہے، کہ وہ احادیث اور اسانید پر یہ انفراد واشتراک کے رموز کس اصول کے تحت لاتے ہیں، مگر ان کی کتاب اور اس پر محقق کے مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کتب ستہ کی احادیث کو صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اور کہیں کہیں اتباع تابعین کے ناموں پر اس طرح مرتب کیا ہے کہ بسہولت مختلف سندیں ایک ساتھ ایک جگہ معلوم ہوجائیں، چنانچہ وہ کسی صحابی کی حدیث کا ایک ٹکڑا شروع میں نقل کرتے ہیں، پھر کتب ستہ وغیرہ میں موجود اس کی سندیں ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد ہر کتاب کی سند پر اس کا رمز لگاتے ہیں۔

مثلاً کتب ستہ کے لیے "ع"، تنہا بخاری شریف کے لیے "خ"، تنہا مسلم شریف کے لیے "م"، تنہا ترمذی شریف کے لیے "ت"، تنہا ابوداود شریف کے لیے "د"، تنہا نسائی شریف کے لیے "س"، اور تنہا ابن ماجہ شریف کے لیے "ق" کا رمز اختیار کرتے ہیں، اب کسی حدیث پر ان انفرادی رموز کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مذکورہ حدیث صرف اسی کتاب میں ہے، بلکہ حدیث کی سندیں جمع کرتے ہوئے اس طرح کا انفرادی رمز مختلف مقاصد سے ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر حافظ مزیؒ ایک حدیث کا ابتدائی حصہ کسی صحابی کے ترجمہ میں نقل کریں، اور وہیں صحابی کے شاگرد (دوسرا طبقہ) اور شاگرد کے شاگرد (تیسرا طبقہ) کا بھی ترجمہ قائم کیا ہو، اور جن کتابوں میں وہ حدیث ہے ان کی سندیں صحابی اور صحابی کے شاگرد تک ایک ہوں، لیکن شاگرد کے شاگرد میں کسی مؤلف کی سند الگ ہو، تو حافظ مزی رحمہ اللہ وہاں انفراد کا رمز استعمال کرتے ہیں، مثلاً اگر حضرت ابوہریرہ ؓ سے ان کے شاگرد ذکوان روایت کریں، اور ذکوان سے زید بن اسلم روایت کریں، تو انفرادی اور اشتراکی رمز کے لیے زید بن اسلم (تیسرے طبقے) کا اعتبار کرتے ہیں، اسی کو مدار رمز قرار دیتے ہیں، اگر سارے مصنفین ذکوان میں متفق ہوں، اور امام ابن ماجہ زید بن اسلم میں منفرد ہوں تو اس پر انفرادی رمز "ق" لگاتے ہیں۔

اسی طرح اگر شاگرد کے شاگرد کا شاگرد (چوتھا طبقہ) بھی ترجمے کا حصہ بنا ہو تو یہی چوتھا انفراد واشتراک کا سبب قرار پائے گا، اب اگر کوئی حدیث بہت سی کتابوں میں ہو، اور تیسرے طبقے تک سب مشترک ہوں، مگر چوتھے طبقے میں امام ابن ماجہ کی سند الگ ہوجائے، تو وہاں انفراد کا رمز ق ذکر کرتے ہیں، مثلاً حضرت ابوہریرہ ؓ سے ذکوان روایت کریں، ذکوان سے اعمش، اور اعمش سے جریر بن عبدالحمید روایت کریں تو مدارِ رمز جریر قرار پائیں گے۔

اس کے برعکس کبھی کبھی صحابی کے ساتھ صرف ان کے شاگرد کا ترجمہ قائم کرتے ہیں، تو مدارِ رمز وہی شاگرد قرار پائیں گے، جن جن کتابوں میں وہی شاگرد ہوں گے، ان پر اشتراک کا رمز، اور جن میں صحابی کے دوسرے شاگرد ہوں گے وہاں انفراد کا رمز استعمال کرتے ہیں۔

حاصل یہ کہ ان تینوں شکلوں میں انفراد کا رمز خاص سند کے اعتبار سے لگایا جاتا ہے، مطلقاً حدیث کے اعتبار سے نہیں۔ لہٰذا جہاں پر حافظ مزیؒ کسی حدیث پر انفراد کا رمز لگائیں، اور وہ حدیث صرف اسی ایک کتاب میں ہو،

دوسری کتابوں میں نہ ان صحابی سے ہو نہ کسی اور صحابی سے، تو وہاں انفراد کا رمز حدیث پر کہلائے گا۔ اور اگر دوسری کتاب میں دوسرے صحابی سے منقول ہو تو اس پر انفراد و اشتراک کے فیصلے کے لیے دیگر کتب زوائد وغیرہ کی مراجعت کرنی ہوگی، صرف تحفۃ الاشراف کو دیکھ کر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ مرتضی زبیدیؒ کی وطنیت کے تعلق سے
'تاج العروس' کے مقدمہ نگار پر انتقاد

عربی زبان کا مشہور اور معرکۃ الآراء لغت ''تاج العروس'' محتاج تعارف نہیں، یہ علامہ سید ابوالفیض محب الدین محمد مرتضی زَبیدی بلگرامی (ت: ۱۲۰۵ھ) کی تصنیف ہے، جس میں فاضل مصنف نے علامہ مجد الدین فیروزآبادی (ت: ۸۱۷ھ) کی مقبول اور جامع کتاب ''القاموس المحیط'' کی جامع شرح کی ہے، جو لغوی تحقیقات سے بھرپور، مقبولِ خاص وعام ہے، یہ کتاب ۱۳۸۵ھ میں شیخ عبد الستار احمد فراج کی تحقیق کے ساتھ حکومت کویت نے شائع کی تھی، اس طبع کے آغاز میں محقق نے ایک مقدمہ شامل کیا ہے، جس میں مصنفِ کتاب کے ہندوستانی ہونے کی بحث چھیڑی ہے، اور تقریباً تین صفحات میں ان کے ہندوستانی ہونے کو مشکوک و مستبعد قرار دینے کی کوشش کی ہے، علامہ اعظمیؒ نے ان کی رگ تشکیک کاٹنے اور مسئلۂ زیر بحث کی تحقیق کے تناظر میں سات صفحات پر مشتمل ایک وقیع مضمون بعنوان ''السید مرتضى هندي لا يحوم حوله شك'' زیب قرطاس کیا، جو مجلہ ''البعث الاسلامی'' (ج۲۰ ش۸، ص۵۷ - ۶۳) میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

اس مضمون میں علامہ اعظمیؒ نے نہایت مستحکم تاریخی دلائل کے ساتھ ان کی بحث کا جواب دیتے ہوئے علامہ مرتضی زبیدی کے ہندیّ الاصل ہونے کا اٹل اور ٹھوس ثبوت فراہم کیا ہے، چنانچہ آغازِ مضمون میں لکھتے ہیں: من الموسف جداً أن السيد عبد السلام أحمد فراج في مقدمته التي قدمها كمحقق لـ "تاج العروس" - من الآثار الخالدة للعلامة السيد مرتضى الهندي الزبيدي ثم المصري - قد أثار بحثاً لا مسوغ له، وهو أن السيد المذكور هندي أم لا؟ ومآل البحث استبعاد هنديته والتشكيك فيها دون الاعتماد على دليل وبرهان، وكان من الواجب إذ لم تتوفر عند المحقق الفاضل مصادر ترجمته أن يسأل الذين يعرفونه عن كثب، ويراجعهم في ذلك، قبل أن ينتهي إلى نتيجة، فسبب بإهمال هذا الواجب اغترار الكثيرين من قارئيه بما كتبه، وتقليدهم له في هذا الخطأ الفاضح.

(یعنی بڑے افسوس کی بات ہے کہ علامہ سید مرتضی زبیدیؒ کے زندہ جاوید شاہکار ''تاج العروس'' کے محقق سید عبدالسلام (غالباً عبدالستار) احمد فراج نے اپنے مقدمے میں ایک فضول بحث یہ چھیڑی ہے کہ علامہ زبیدی ہندوستانی ہیں یا نہیں؟ اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے بنا کسی دلیل کے علامہ زبیدی کے ہندی الاصل ہونے کو مستبعد ومشکوک قرار دیا ہے، حالانکہ مصنف کے حالاتِ زندگی سے متعلق مصادر و مراجع تک عدم رسائی کی صورت میں فاضل محقق کی ذمہ داری تھی کہ کوئی حتمی نتیجہ اخذ کرنے سے قبل واقف کاروں سے معلوم کرتے، ان سے مراجعت کرتے، اس ذمہ داری سے صرف نظر کرنے کی بناء پر ان کی یہ تحریر بہت سے قارئین کے لیے حقیقت سے نا آشنائی، اور اس صریح غلطی میں پڑنے کا ذریعہ بن گئی ہے)۔

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے بڑے مستحکم اور جرأت مندانہ انداز میں اپنا دعوی ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں: والحقيقة التي لا يحوم حول ثبوتها وجلائها شك، أن السيد مرتضى هندي، استوطن عشيرته "بلجرام" الهند، منذ قرابة خمسة قرون، وإن الذين ترجموا له من أهل الهند فيهم من رأى آباءه وصحب جده وهو نسيبه وبلديه، وفيهم من عاصره.

(یعنی یہ حقیقت ہے، جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، کہ سید مرتضی ہندوستانی ہیں، ہندوستان کا بلگرام شہر تقریباً پانچ سو سال سے ان کے خاندان کا وطن رہا ہے، اور جن ہندوستانی مؤرخین نے ان کا تذکرہ کیا ہے، ان میں کچھ تو ایسے ہیں جنھوں نے ان کے والد کو دیکھا ہے، ان کے دادا کے شاگرد اور ان کے ہم نسب و ہم وطن رہے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو ان کے ہم عصر ہیں)۔

چنانچہ علامہ اعظمیؒ نے علامہ زبیدیؒ کے دادا سید قادری کے شاگرد اور ہم نسب و ہم وطن سید غلام علی بلگرامیؒ، علامہ زبیدیؒ کے معاصر اور ''بحر ذخار'' کے مؤلف شیخ وجیہ الدینؒ کی تصریحات، اور نواب صدیق حسن خاںؒ وصاحب ''نزہۃ الخواطر'' مولانا عبد الحی صاحب لکھنویؒ کی نقول، اور خود علامہ زبیدیؒ کے ایک علمی برنامج کے قلمی نسخے سے ثابت کیا ہے کہ وہ ہندوستانی ہیں۔

تمام دلائل وشواہد ذکر کرنے کے بعد علامہ اعظمیؒ اپنا فیصلہ رقم کرتے ہیں: فعلم بهذا كله أن الزبيدي هندي الأصل، تولد من أبوين هنديين، وأن إنكار هذه الحقيقة سفسطة، والشك فيها ارتياب في رؤية الشمس في وضح النهار.

(ان تفصیلات سے معلوم ہوگیا کہ علامہ زبیدی اصلاً ہندوستانی ہیں، ان کے والدین ہندوستانی ہیں، اس حقیقت کا انکار یقیناً سطحیت ہے، اور ان کے ہندیّ الاصل ہونے میں شک کرنا روز روشن میں سورج کے وجود میں

شک کرنے کے مرادف ہے۔)

استاذ محترم مولانا ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے (حیات ابوالمآثر: ج ۲، ص ۵۰۸-۵۰۹) میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

فن شاعری کی صنف 'بحر سریع اور بحر رمل' کے تعلق سے علامہ اعظمیؒ کا نقد

ابتدا میں یہ بات گذری کہ علامہ اعظمیؒ کی شخصیت ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے، آپ کے انتقادات بھی متعدد علوم وفنون سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ شاعری جو ایک الگ اور مختلف فن ہے، عام طور پر علمائے کرام کی دسترس سے باہر رہتی ہے، مگر علامہ اعظمیؒ کی عبقری شخصیت نے اس میدان میں بھی اپنا جلوہ دکھایا ہے، جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، اور بقول مولانا مسعود احمد صاحب: جسے دیکھ کر یہ باور کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ اسی خامۂ گہربار کی کرشمہ سازی ہے جو علم حدیث کے سمندر میں غوطہ خوری، حدیث پاک کے مخطوطات میں غوّاصی، اور مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی، سنن سعید بن منصور کی تحقیق، اور الحاوی جیسی کتاب کی تصنیف کے لیے وقف رہا ہے۔ اھ۔[۲۳]

فن عروض کو شاعری میں اہم مقام حاصل ہے، جو دراصل شعر کی موزونیت کو پرکھنے کا معیار ہے، علامہ اعظمیؒ نے اس استدراک کے اندر اس فن میں جس درجہ کے درک اور رسوخ کا مظاہرہ کیا ہے، وہ ایک ماہر فن ہی کے بس کی بات ہے، اس بحث کا پس منظر یہ ہے کہ سید سلیمان ندویؒ (ت: ۱۳۷۳ھ) کی وفات پر علامہ اعظمیؒ نے ایک نظم لکھ کر قاضی اطہر مبارک پوریؒ (ت: ۱۴۱۷ھ) کے پاس روزنامہ "انقلاب" میں اشاعت کے لیے ممبئی بھیجا تھا، قاضی صاحبؒ نے اس کے بعض اشعار کو وزن سے ساقط خیال کرکے ان میں کچھ تبدیلی کردی تھی، مثلاً آخری شعر جس سے سن وفات نکلتا ہے، یوں تھا:

فقرۂ تاریخ کا جویا تھا میں
دل نے کہا فاضل یکتا گیا

قاضی صاحبؒ نے اسے تبدیل کرکے:

فقرۂ تاریخ کا جویا تھا میں
بول اٹھا دل فاضل یکتا گیا

کردیا تھا، نظم شائع ہونے کے بعد جب علامہ اعظمیؒ نے یہ تبدیلیاں دیکھیں، تو قاضی صاحب کے نام وہ مکتوب لکھا جس نے علامہ اعظمیؒ کی شخصیت کے ایک نئے اور انوکھے پہلو سے پردہ اٹھادیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنے مکتوب میں لکھا تھا: آپ کے تصرفات کی نسبت گزارش ہے کہ اصلاح اگر موجّہ ہوتو میں صرف خوش نہیں بلکہ شکرگذار بھی ہوتا ہوں، مگر آپ نے اپنے تصرفات کی کوئی وجہ نہیں لکھی، میں نے یہ وجہ سمجھی ہے کہ آپ نے اس نظم کو مثنوی مولانا رومؒ (ت: ۶۷۲ھ) کے وزن پر بحرِ رمل مسدس محذوف میں خیال کیا ہے، اس لیے جو مصرعے وزن سے گرتے تھے آپ نے اس وزن پر بنا ڈالا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، میری نظم "قران السعدین"، "مخزن اسرار"، "مطلع الانوار"، اور "سبحۃ الابرار" کے وزن پر بحرِ سریع مطوی موقوف سے ہے، جس کا عروض وضرب مختلف یعنی ایک مطوی مکسوف (فاعلن) اور دوسرا مطوی موقوف (فاعلان) ہوسکتا ہے، اس بحر میں یہ بات ہوئی ہے، اس کے بعض شعر یا مصرعے بحرِ رمل میں بھی پڑھے جاسکتے ہیں، جیسے مولانا جامیؒ (ت: ۸۹۸ھ) کے یہ اشعار:

رفتن او جستن تیر از کماں — جستن او جحت طے مکان
توبہ دہ از سرکشی ایام را — بازخر از ما خوشی اسلام را

اس مکتوب کو قاضی صاحبؒ نے یکم جنوری ۱۹۵۴ء کے "انقلاب" میں ایک عمدہ نوٹ کے ساتھ یہ عنوان لگا کر شائع کیا: "ایک علمی اور ادبی مکتوب گرامی، بحرِ سریع اور بحرِ رمل کی ناقدانہ تشریح"، اور اخیر میں علامہ اعظمیؒ کی نظم من وعن شامل اشاعت کی، اس نوٹ میں قاضی صاحب لکھتے ہیں: ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ چند دنوں پہلے انقلاب میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے متعلق آپ (علامہ اعظمیؒ) کے تأثرات اور اشعار درج ہوئے تھے، چونکہ آپ کے بعض اشعار باوجود بحور وقوافی پر پورے اترنے کے بظاہر وزن سے باہر معلوم ہوتے تھے، اور ناواقفوں کے لیے غلط فہمی کا باعث بن سکتے تھے، اس لیے نہایت عزت واحترام سے ہم نے ان میں تصرفات کردیئے تھے، اس کا مقصد بالکل نیک تھا، اور علم وفن کے پہاڑوں کے سامنے اپنی بلندی دکھانی نہیں تھی۔ حضرت مولانا نے کمال شفقت کے ساتھ ان اشعار کے متعلق توضیح فرمادی ہے، اور شعر وادب کے بعض مخفی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے، نیز ہماری عربی نظم پر بھی استاذانہ نظر فرمائی ہے، اس لیے ہم نہایت فخر ومسرت کے ساتھ یہ گرامی نامہ شائع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں، ساتھ ہی آخر میں آپ کی نظم من وعن شائع کرتے ہیں۔ ھکذا اُمِرنا اَن نفعل بکبراءنا۔

روزنامہ انقلاب میں جب علامہ اعظمیؒ کا مکتوب شائع ہوا تو شرف زیدی نام کے ایک صاحب نے آپ کے مکتوب کے جواب میں مضمون لکھا، جو روزنامہ "جمہوریت" میں شائع ہوا، مولانا مسعود صاحب لکھتے ہیں: کہ اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے وہ مضمون سپردِ قلم فرمایا جو بغیر عنوان کے آپ کے مسودات میں محفوظ ہے، یہ ایک مراسلے کی شکل میں ہے، جو غازی صاحب

(غالباً مولانا حامد الانصاری غازی) کے نام مکتوب ہے۔اھ

علامہ اعظمیؒ کا یہ مراسلہ بہت سی علمی ابحاث کو سمیٹے ہوئے ہے، فن شاعری سے متعلق نقد کے ساتھ ساتھ اس میں بہترین اسلوب اور حسین پیرایۂ بیان نمایاں ہے، نیز جواب دیتے ہوئے آپ کا ظریفانہ انداز جھلکتا ہے، مثلاً زیدی صاحب نے آپ پر اشکال کیا تھا کہ فقرۂ تاریخ والے شعر کو اگر بحرِ رمل پر تقطیع کریں گے تو فاضل کے لام کے پیٹ سے ایک ی نکال کر "فاضلے یک" کہنا پڑے گا، اور اگر ایسا کرتے ہیں تو تاریخ کے عدد بجائے (۱۳۷۳) کے، (۱۳۸۳) ہوجائیں گے، اور اس وزن کو برابر کرنے میں علامہ ندوی بھی دس سال بعد مرحوم ہوں گے اھ، علامہ اعظمیؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ: ہرچند کہ میں اس تصرف کو جو میری نظم میں ہوا ہے بےضرورت سمجھتا ہوں، تاہم اس تصرف کے بعد بھی فقرۂ تاریخ بالکل صحیح ہے، اور اس کے عدد اس (ی) کی وجہ سے جو بضرورتِ تقطیع زیادہ کی جاتی ہے، تاریخ کے عدد نہیں بڑھ سکتے، تاریخ میں صرف مکتوبی حروف کے عدد لیے جاتے ہیں۔اس کے بعد علامہ اعظمیؒ نے بطور مثال حضرت امیر خسرو دہلویؒ (ت: ۷۲۵ھ) کی تاریخ وفات سے متعلق ایک شعر نقل کیا ہے، اس میں حضرت امیر کی تاریخ وفات "طوطی شکر مقال" (۷۲۵) ہے، یہاں بھی طوطی کی یاء کے پیٹ سے ایک یاء نکال کر "طوطیے" پڑھنا وزن کی درستگی کے لیے ناگزیر ہے، علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں: بااین ہمہ تاریخ کا عدد نہیں بڑھا، اور حضرت امیر خسروؒ دس سال بعد مرحوم نہیں ہوئے، اسی طرح علامہ ندویؒ بھی بحرِ رمل میں میرے مصرع کی تقطیع کی وجہ سے دس سال بعد مرحوم نہ ہوں گے، جس کا مجھے دلی افسوس ہے! کاش میری تاریخ، تقطیع کی وجہ سے غلط ہوجاتی اور اس کے عوض علامہ ندویؒ دس سال بعد مرحوم ہوتے تو مجھے بہزار دل وجان قبول ہوتا۔اھ

یہ مکمل بحث مجلہ 'المآثر' (جلد ۲۰ شمارہ ۱، صفحہ ۳۹ تا ۵۲) میں بحوالہ 'حیات ابو المآثر' (جلد دوم صفحہ ۵۴۳-۵۴۸) مفصل موجود اور اصحاب ذوق کو سامان تسکین مہیا کر رہی ہے۔

ہدیۂ تشکر:

آخر میں ہم علامہ اعظمیؒ کے سوانح نگار، آپ کی علمی میراث امت تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ، اور اس عظیم سیمینار کے کنوینر، استاذ محترم مولانا ڈاکٹر مسعود احمد صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں، جنھوں نے ہمارے لیے یہ بہترین سرمایہ میسر کردیئے ہیں، جن کی روشنی میں یہ چند سطریں صفحۂ قرطاس پر بکھر سکی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ پر کسی تحریر یا تحقیق کی تخلیق آپ کی مرتب کردہ بےنظیر سوانح اور مقالات ومضامین سے مستغنی نہیں ہوسکتی۔فجزاہ اللہ عنا أحسن الجزاء ◻◻

حواشی وتعلیق:

۱- المعجم الوسیط، ۹۴۴

۲- ترمذی: ۴۰۵۳

۳- مجلہ المجمع العلمي العربي: اکتوبر ۱۹۶۳ء

۴- ماہنامہ معارف: اپریل ۱۹۹۲ء

۵- ترجمہ: اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ یہ علم دین ہر نسل کے عادلین حاصل کرتے رہیں گے، جو اسے غلو کرنے والوں کی تحریفات، باطل پرستوں کے افتراء، اور جاہلوں کی تاویلات سے پاک کریں گے۔ (مشکاۃ: باب العلم: رقم ۲۴۸، بحوالہ سنن کبری للبیہقی: رقم ۲۰۹۹۱)

۶- حیات ابوالمآثر: ج ۱ ص ۵۳۵۔

۷- [illegible]: ص ۸، مطبوعہ "مجلس علمی ڈابھیل"۔مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: حیات ابو المآثر: ج ۱، ص ۵۷۱-۵۷۲

۸- حاشیہ الرفع والتکمیل في الجرح والتعدیل: ص ۲۴۸

۹- [illegible] ص ۸۲۔

۱۰- حوالۂ بالا: ص ۴

۱۱- حاشیہ صحیح ابن حبان بترتیب احسان: ۴/ ۳۹۲

۱۲- ملحق ب "محدث الهند الكبير" للدكتور مسعود أحمد الأعظمي: الفصل الثاني۔

۱۳- محدث الهند الكبير: ص [illegible]۔

۱۴- حیات ابوالمآثر: ج ۲ ص ۴۸۴

۱۵- بستان المحدثین۔

۱۶- ان استدراکات کی دسویں قسط کتابت کی غلطی سے مکرر ہوگئی ہے، اس لیے آگے کے نمبرات میں فرق ہوگیا ہے، درست تعداد وہی ہے جو ہم نے لکھی ہے۔تفصیل یہ ہے: (ج ۱۰ ش ۴، ج ۱۱ ش ۱، ج ۱۱ ش ۲، ج ۱۱ ش ۳، ج ۱۱ ش ۴، ج ۱۲ ش ۱، ج ۱۲ ش ۲، ج ۱۲ ش ۳، ج ۱۳ ش ۱، ج ۱۳ ش ۲، ج ۱۳ ش ۳، ج ۱۴ ش ۱، ج ۱۴ ش ۲، ج ۱۴ ش ۴، ج ۱۵ ش ۱، ج ۱۵ ش ۳، ج ۱۶ ش ۲، ج ۱۶ ش ۳و۴، ج ۱۷ ش ۱، ج ۱۸ ش ۱، ج ۱۸ ش ۲، ج ۱۸ ش ۳)۔

۱۷- ان استدراکات کے نمبرات میں بھی دوجگہ سہو ہوا ہے، ۱۰۳ نمبر مکرر ہے، اور ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸ بھی مکرر ہیں۔

۱۸- مجلہ المآثر: ج ۱۰، شمارہ ۴، استدراک نمبر ۵

۱۹- ایضاً: ج ۱۰، شمارہ ۴، استدراک نمبر ۸

۲۰- ایضاً: ج ۱۱، شمارہ ۱، استدراک نمبر ۱۱

۲۱- حاشیہ الرفع والتکمیل: ص ۳۸۹-۳۹۱)

۲۲- الدیباجۃ علمیۃ ابن ماجۃ: ج ۱/ ص ۵۶، طبع اول، مطبوعہ مولانا ابوالکلام آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک، راجستھان

۲۳- حیات ابوالمآثر: ج ۲، ص ۵۳۷

حضرت محدث الاعظمیؒ کے

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور جمعیۃ علماء ہند سے تعلقات

ترتیب: **مسعود احمد الاعظمی**

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں عالم اسلام پر تاتاریوں کا وہ وحشیانہ حملہ ہوا جس نے اسلامی حکومت کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے، خلافت عباسیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور عالم اسلام کے بڑے بڑے علمی مراکز جہاں علم وفن کا چرچا رہتا تھا اور صبح وشام درس وتدریس کے زمزمے گونجتے تھے، ان کے ظلم وتعدی اور قہر وعدوان سے وحشت خیز اور ویران ہو گئے۔ مسلمانوں کے خون سے روئے زمین سرخ ہو گئی اور ان کی مظلومیت ومقہوریت کے وحشت ناک منظر کو دیکھ کر زمین وآسمان کی روح کانپ اٹھی۔ خدا جانے کتنے کتب خانے نذر آب کر دیے گئے جن کی روشنائی سے دجلہ وفرات کا پانی سیاہ ہو گیا، بڑی تعداد میں اہل علم وکمال شہید کر دیے گئے جن کی وفات سے علوم اسلامیہ ماتم زدہ اور سوگوار ہو گئے، لیکن قدرت کی عجیب حکمت کہ اس قتل وغارت کے بعد اس نے ایک سے بڑھ کر ایک علماء وفقہاء پیدا کیے، جن کے وجود سے مردہ زمینوں میں دوبارہ جان پڑ گئی اور علم وفن کی اجڑی ہوئی کھیتیاں ایک بار پھر لہلہا اٹھیں۔ چنانچہ آٹھویں صدی کے اوائل میں دیکھیے تو علامہ ابن تیمیہ، حافظ ذہبی، علامہ مزی اور تاج الدین سبکی جیسے اصحاب فضل وکمال اسلامی علوم وفنون کے بکھرے ہوئے اوراق کی از سر نو شیرازہ بندی میں مصروف نظر آتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد سرزمین ہند اپنی تمام تر وسعت کے باوجود مسلمانوں کے اوپر تنگ ہو گئی، بے شمار مسلمان انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار ہوئے، عوام وخواص کو بے دریغ تہ تیغ کیا گیا، لیکن ان کا ہدف خاص طور پر مسلم علماء کو بننا پڑا جن کے خون سے ہندوستان کی زمین سرخ وشوخ ہو گئی۔ لیکن خدا کے فضل سے اس کے بعد جو اہل فضل وکمال اٹھے ان میں ایک سے بڑھ کر ایک آفتاب وماہتاب نکلے، چنانچہ صرف علماء دیوبند میں دیکھیے تو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے اساطین علم وفن نظر آئیں گے۔

یہ وہ حالات تھے جن میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پیدا ہوئے، آپ کا سال پیدائش ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء ہے، ابتدائی تعلیم کے بعد دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے، اور وہاں سات سال رہ کر درس نظامی کی تکمیل کی اور ۱۳۱۵ھ میں فراغت پائی، قیام دار العلوم کے زمانہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی آپ کے اوپر خصوصی عنایت رہی۔ تحصیل علم کے بعد اپنے والد ماجد (سید حبیب اللہ) کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، وہاں مسجد نبوی میں تقریباً دس برس حدیث کا درس دیا، آپ کے درس حدیث کو بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اور مختلف ممالک کے طالبان علم نے آپ کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر فیض اٹھایا، ۱۳۳۵ھ میں حجاز میں انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کے ہمراہ جزیرۂ مالٹا میں نظر بند کیے گئے، تقریباً تین سال بعد جب رہا ہو کر ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس لوٹے تو اس وقت تحریکِ خلافت زوروں پر تھی، آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کی معیت میں ملکی سیاست میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہو گئے، اور جب ۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کی وفات واقع ہوئی تو ان کے جانشین بنے۔ پوری سرگرمی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینے کے باوجود درس وتدریس کی طرف سے کبھی توجہ نہیں ہٹائی، کئی سال تک سلہٹ (آسام) میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے، ۱۳۴۶ھ (غالباً ۱۹۲۷ء) میں دار العلوم دیوبند کی مسند صدارت سنبھالی اور تادم آخر اس کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ العلماء کے صدر نشیں رہے۔ حضرت گنگوہیؒ سے شرف بیعت حاصل تھا۔

مولانا مدنیؒ کی ذات بے شمار اوصاف وخصوصیات کا مجموعہ تھی، علم وفضل، طہارت وتقوی، زہد وورع، عفو ودرگذر، شجاعت وبہادری، اور حق گوئی وبے باکی میں ان کے ہم عصروں میں بہت کم لوگ ان کے پایہ کو پہنچ سکے، تصلب فی الدین اور اتباع سنت میں آپ کا مقام نہایت بلند تھا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ سے حضرت محدث الاعظمیؒ کے تعلقات:

حضرت مولانا مدنیؒ اور علامہ اعظمیؒ میں بڑے گہرے اور مضبوط روابط تھے، علامہ اعظمیؒ حضرت مدنیؒ کے بہت عقیدت مند اور حضرت مدنیؒ علامہ اعظمیؒ کے بڑے قدرداں تھے اور ان کے علم پر بہت اعتماد کرتے تھے، چنانچہ آپ کو دار العلوم دیوبند لے جانے کے لیے حضرت مولانا قاری طیب

صاحبؒ کے ہمراہ ایک دفعہ خود مئو تشریف لائے، اور ایک موقع پر یہ تجویز پاس کی کہ جمعیۃ علماء کی کوئی بھی فقہی قرارداد علامہ اعظمی سے استصواب کیے بغیر پاس نہ کی جائے۔ اور علامہ اعظمی کی مولانا مدنی کے ساتھ عقیدت و محبت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک موقع پر آپ نے لکھا ہے: ''وھو رحمہ اللہ وإن لم یکن من مشایخي کنت أجلہ إجلالھم'' (مرحوم اگرچہ میرے استاذ نہیں تھے لیکن میں ان کی اپنے استاذ ہی کی طرح عزت کرتا تھا)۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کا مقام حضرت محدث الاعظمیؒ کی نظر میں:

حضرت محدث الاعظمیؒ کی نظر میں حضرت شیخ الاسلام کا کیا مقام تھا، اس کا اندازہ اس مضمون سے ہوتا ہے، جسے آپ نے ان کے انتقال کے بعد سپرد قلم فرمایا تھا، جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''مشاہیر اسلام میں کسی کو ''بدیع الزماں'' کے لقب سے پکارا گیا ہے اور کسی کو مورخین ''نادرۃ العصر'' لکھتے ہیں۔ جن مشاہیر کو ان الفاظ سے یاد کیا گیا ہے ان کے کسی ایک کمال کے لحاظ سے یہ القاب حقیقت پر مبنی ہوں تو ہوں، مگر ان کے تمام اوصاف کے لحاظ سے خالی از مبالغہ نہیں؛ لیکن شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنے جملہ اوصاف کے لحاظ سے بدیع الزماں، نادرۃ العصر اور یکتائے روزگار تھے۔ وہ اپنے متنوع علمی کمالات و باطنی مقامات، بے شمار محاسن اعمال اور بے انتہا بلند اخلاق و کردار کے لحاظ سے بالکل منفرد اور بے مثال تھے''۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کے انتقال پر حضرت محدث الاعظمیؒ کے تاثرات:

آپ کے تعلق خاطر کا اندازہ اس سے بھی لگانا چاہیے کہ ۱۳ ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ کو جب مولانا مدنیؒ کی وفات ہوئی تو اس کے چند روز کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے رنج و غم کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا:

''مکرم جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آہ! وہ فاجعۂ کبریٰ جس کے اندیشہ سے دل لرز رہا تھا، پیش آ ہی گیا، حضرت شیخ کی خبر وفات نے خرمن صبر و قرار پر بجلی گرادی، آج اس سانحہ کو پانچ دن ہو گئے مگر قلب کے اضطراب میں کوئی کمی نہیں ہے، غم و الم اور فکر و اندوہ کا بادل چھٹتا ہی نظر نہیں آتا، سوچتا ہوں کہ درس حدیث کی جو مسند وہ کس طرح پر ہوگی، ارشاد و تسلیک کا جو سلسلہ منقطع ہو گیا ہے وہ پھر کیونکر قائم ہوگا، جمعیۃ علماء ہند کو ایسا جامع اوصاف اور متفق علیہ صدر کہاں سے نصیب ہوگا، ایسے ربانی عالم کا ایسا متین و پرشکوہ اور نورانی چہرہ پھر کہاں دیکھنے کو ملے گا؛ وہ بزرگانہ شفقت، وہ مہر و کرم، اور وہ ذرہ نوازیاں اب ہم کہاں ڈھونڈھیں!!

أیتھا النفس أجملي جزعا ... إن الذي تحذرین قد وقعا

إن الذي جمع السماحۃ والنجـــــــدۃ والبر والتقی جمعا

أودی فلا تنفع الإشاحۃ من ... أمر لمن قد یحاول البدعا

(أوس بن حجر)

اس پریشانی و اضطراب میں خیال آیا کہ آپ کو اپنا درد دل سناؤں اور درخواست کروں کہ میرے حق میں دعا فرمائیں، میں بھی اپنے اور تمام عقیدتمندوں کے حق میں دعا کرتا ہوں اللّٰھم أجرنا في مصیبتنا واخلف لنا خیرا منھا۔''

اس سلسلے میں سب سے اہم اور خاص بات وہ مادۂ تاریخ ہے جس کا حضرت شیخ الاسلامؒ کی وفات کے بعد آپ نے استخراج کیا تھا، اس سے جہاں حضرت محدث الاعظمیؒ کی نظر میں حضرت مدنی کے مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں آپ کی ذہانت و فطانت اور سرعت ادراک کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حضرت مدنی پر آپ کے مضمون کی آخری چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''اب صرف ایک بات عرض کر کے اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں، آج فجر کی نماز کے بعد تلاوت کر رہا تھا، جب {فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَھُمْ فِیْ رَوْضَۃٍ یُّحْبَرُوْنَ} پر پہنچا، تو یک بیک دل میں آیا کہ شاید {فِیْ رَوْضَۃٍ یُّحْبَرُوْنَ} سے سال وفات کے اعداد برآمد ہوں، اس خیال کے آتے ہی رکا اور رک کر حروف کے اعداد پر غور کیا تو ٹھیک ۱۳۷۷ھ برآمد ہوئے۔ فالحمد للّٰہ علی ذلک۔''

اس تاریخ وفات کو نقل کرتے ہوئے ''چراغ محمد'' کے مصنف مولانا قاضی محمد زاہد الحسینیؒ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: ''حضرت مدنی کی تاریخ وفات کئی علماء کرام نے آیاتِ قرآنِ عزیز اور احادیثِ مبارکہ سے اقتباس کی ہے۔ شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ کا استخراج سب سے زیادہ عظمت اور برکت کا حامل ہے۔'' (چراغ محمد، ص:۲۷۶)

حضرت شیخ الاسلامؒ کے مکاتیب بنام حضرت محدث الاعظمی:

حضرت محدث الاعظمیؒ کے نام مولانا مدنیؒ کے معدودے چند خطوط ہی دستیاب ہوسکے، وہ ہدیۂ ناظرین ہیں:

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

والانامہ باعث سرفرازی ہوا۔ رسالہ بحمد اللہ نہایت عمدہ ہے، اس کی

قیمت سے مطلع فرمایئے تا کہ لوگوں کو اس سے استفادہ کا موقع ملے۔ اگر چہ میں ابھی تک تمام رسالہ نہیں دیکھ سکا ہوں مگر جتنا بھی دیکھا ہے، مفید پاتا ہوں اور قوی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

ممکن ہے اس مہینہ کی آخری تاریخوں میں بہار کا سفر واقع ہو۔ بوقت واپسی انشاء اللہ مئو میں حاضر ہونے کا ارادہ کروں گا۔ ابھی تک مولانا محمد صاحب ناظم دارالعلوم اور ان کی جماعت کی طرف سے کوئی اطلاع یا خواہش حاضری وتصفیہ کا اظہار نہیں ہوا۔ حضرت مولوی عباد اللہ صاحب کا والا نامہ آیا تھا والد ماجد صاحب اور دوسرے واقفین پرسان حال سے سلام مسنون عرض کردیں۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد مدنی غفرلہ

---

۸ ربیع الاول ۵۳ھ

ترمیم وقف بل جمعیۃ العلماء کے متعلق جلسہ کرنا اور یوپی گورنمنٹ کو صرف اس کی منظوری کی اطلاع دینا ضروری ہے۔ والسلام

محترم المقام زید مجدکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مزاج مبارک۔ اگر خدا کو منظور ہے تو بروز دوشنبہ ۹ ر جولائی کو میں شبلی منزل اعظم گڈھ پہنچوں گا وہاں ایک ٹرین قیام کر کے مئو حاضر ہوں گا۔ تمام دن منگل وہاں ہی قیام کروں گا، دارالعلوم میں ٹھہروں گا۔

میں صرف آپ حضرات کی قدم بوسی کے لیے ہی حاضر نہیں ہو رہا ہوں بلکہ امیدوار ہوں کہ آپس کے اتحاد میں آپ حضرات میری امداد واعانت فرما کر مجھ کو ہمیشہ کے لیے شکرگذار بنا دیں۔

جناب والد صاحب اور دیگر اراکین ومدرسین کرام کی خدمت میں بعد از سلام مسنون میری اس عرض کو پہنچا دیں۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد مدنی

۲۲ ر ربیع الاوّل ۵۳ ۱۳ھ

محترم المقام زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والا نامہ باعث عزت افزائی ہوا، یاد فرمانے کا شکریہ ادا کرتا ہوں، والد صاحب مرحوم مغفور کے انتقال سے صدمہ ہوا، دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور آپ سب صاحبوں کو صبر کی توفیق بخشے آمین، جہاں تک ہوسکے مرحوم کے لیے ایصال ثواب کریں، دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں، والسلام

مولانا حسین احمد بقلم اصغر علی غفرلہ از دارالعلوم دیوبند

۲۸ ر ذی الحجہ ۶۵ھ

سیدنا المحترم زید مجدکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک۔ والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ حسب ارشاد دفتر جمعیۃ کو لکھ دیا گیا۔ امید وار ہوں کہ دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں گے۔ واقفین وپرسان حال کی خدمت میں سلام مسنون عرض کردیں۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

از قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد، ۱۶ ر رمضان المبارک ۶۹ھ

محترم المقام۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والا نامہ باعث عزت افزائی ہوا، یاد فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، بوقت تشریف آوری مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند سب کے سامنے اس مقصد کا اظہار فرمائیں جو طریقہ اس مقصد میں کامیابی کے واسطے مناسب ہوگا کہ وہ سب حضرات کی موجودگی میں طے ہو جائے گا، دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام

مولانا حسین احمد بقلم اصغر علی غفرلہ

از دیوبند، ۱۰ محرم الحرام ۷۳ھ

جمعیۃ علماء ہند کے دیگر ذمہ دار حضرات کے چند مکاتیب:

۱۱ ر اگست ۵۳ء

مکرم ومحترم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک! بڑی مسرت کے ساتھ یہ اطلاع آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ صدر محترم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی نے مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کی چند خالی شدہ نشستوں میں سے ایک نشست پر آپ کو بحیثیت رکن نامزد فرمایا ہے۔

امید کہ آپ اس نامزدگی کو قبول فرمائیں گے اور بواپسی اپنی منظوری سے مجھے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ والسلام

آپ کا مخلص محمد حفظ الرحمان

بخدمت اقدس حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

شیخ الحدیث، مفتاح العلوم، مئو، ضلع اعظم گڈھ

۲۳ محرم الحرام ۷۳ھ ۳ / ۱۰ اکتوبر ۵۳ء

محترم ومکرم دام ظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! آج کی ڈاک میں بذریعہ رجسٹری شدہ پیکٹ مندرجہ ذیل مطبوعات ارسال ہیں، استدعا ہے کہ ان کو ملاحظہ فرما کر رائے عالی سے مشرف فرمایا جائے۔ نوازش ہوگی۔

فہرست

(۱) دینیات کا نصاب (۲) سائیکل اسٹائل سے چھپا ہوا خط۔

(۳) عربی اردو قاعدہ (۴) دینی تعلیم کا پہلا رسالہ

(۵) دینی تعلیم کا دوسرا رسالہ حصہ اول (۶) حصہ دوم

(۷) دینی تعلیم کا تیسرا رسالہ (۸) دینی تعلیم کا چوتھا رسالہ

(۹) طریقہ تعلیم کل ۹ عدد والسلام

نیاز مند محمد میاں

ناظم جمعیۃ علماء ہند

---

۳ / رجمادی الثانیہ ۷۷ھ - ۲۵ / دسمبر ۵۷ء

حضرت مولانا دام ظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! ایک تکلیف دے رہا ہوں، مہربانی فرما کر شیخ الاسلام

(خط میں یہاں ایک لفظ مٹا ہوا ہے۔)

ایک مضمون تحریر فرما دیجیے۔ بیشک جناب جیسا متبحر جب کسی متبحر اعظم کے لیے کچھ لکھنے بیٹھے، تو ہجوم مضامین وسعت وقت کو ختم کر دیتا ہے، مگر بہر حال اس دشواری پر قابو پاتا ہے۔ اور ایک مضمون لکھتا ہے۔

یہ گستاخانہ درخواست اس یقین کے ساتھ ہے کہ ۷ / جنوری تک شرف منظوری حاصل کرے گی۔ بہتر ہو کہ جواب سے مشرف فرمایا جائے، والسلام

نیاز مند محمد میاں

---

۴ / ربیع الثانی ۷۸ھ = ۱۸ / اکتوبر ۵۸ء

حضرت مولانا دام ظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! گرامی نامہ سے مشرف ہوا، جناب کی رائے بالکل صحیح ہے، احقر نے خود مولانا نعمانی صاحب سے بھی یہ بات واضح کر دی ہے، مولانا عبدالمجید صاحب الحریری نے بھی اسی مصنف کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا ہے، اس قباحت کی طرف ان کو بھی توجہ دلائی کہ یہ حضرت شیعہ ہیں، چنانچہ غالباً مولانا حریری نے اس کی اشاعت کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

البتہ احقر اس سلسلہ میں ابتلا میں پڑ گیا، صورت یہ ہوئی کہ جس سال جناب سے مالیگاؤں میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ مولانا نعمانی نے احقر سے تبصرہ کے لیے فرمایا اور یہ کہ الجمعیۃ بکڈ پو اشاعت کی کوشش کرے۔

اصل عربی کتاب احقر نے نہیں دیکھی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے دیکھی تھی، وہ بے حد مداح تھے (غالباً صرف ابتدائی اجزاء دیکھے تھے)۔ احقر نے اسی تاثر کی بنا پر تبصرہ وتقریظ کا بھی وعدہ کرلیا اور الجمعیۃ بکڈ پو کے لیے بھی پچیس نسخے لیتا آیا۔ راستہ میں کتاب دیکھی اور پھر کچھ...... احساس ہوا تو پوری کتاب حرف حرف دیکھی۔ اب تبصرہ اور تقریظ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا اشتہار کا مسئلہ بھی غور طلب ہو گیا۔ بہر حال اشتہار تو دیا جاتا ہے جو آپ کی دعا سے ناکام ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا صرف چار پانچ نسخے فروخت ہوئے ہیں (قیمت ادا کی جا چکی ہے) تقریظ وتبصرہ سے مولانا فارقلیط صاحب نے دامن بچایا۔ اور اچھا کیا۔ بہر حال دعاؤں کا محتاج ہوں۔ والسلام

نیاز مند حقیر محمد میاں

مرادآباد

۵ / رجب ۸۱ھ، ۴ / دسمبر ۶۱ء

حضرت علامہ دامت برکاتکم

لسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! پرسوں ۲ / رجب کو کسیا سے مبارک پور آتے ہوئے مئو اسٹیشن سے گذر ہوا، مگر چونکہ یہ پروگرام دفعۃً بن گیا تھا اس لیے ایسا موقع نہ مل سکا کہ جناب سے ملاقات کا وقت بھی نکل آتا، افسوس رہا۔

باعث تحریر یہ ہے کہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کا سالانہ جلسہ ۱۸ / ۱۹ / شعبان کو طے کیا جا رہا ہے۔ ارباب وخدام مدرسہ کی استدعا ہے کہ جناب سے شرکت کی درخواست کی جائے، ایسے موقع پر طلبہ کی سعادت اور مدرسہ کی شہرت وعظمت اور کامیابی اس پر ہے کہ دستار بندی ایسے باکمال حضرات کے ہاتھوں سے ہو، جو در بار علم کے شناور مانے جاتے ہیں، اسی مقصد سے جناب سے شرکت کی استدعا ہے۔ ۲۸ / ۲۹ طلبہ کی دستار بندی ہوگی، اگر یہ

درخواست قبول ہوتو زہے عزوشرف۔

اپنی تہی دامنی کے پیش نظر یہ عرض کرتے ہوئے ندامت ہوتی ہے کہ کچھ عرصہ سے اہتمام مدرسہ کی ذمہ داری اسی حقیر ناتواں کے مونڈھوں پر ہے، اسی تعلق کی بنا پر احقر حضرات ارباب حل وعقد کی ترجمانی کررہا ہے۔ مگر یہ ترجمانی خود اپنے جذبات سے بھی ہم آہنگ ہے۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہوں، حاضرین مجلس سے سلام فرمائیے۔

نیازمند محتاج دعا:

محمد میاں

۲۷/ جمادی الثانیہ ۸۱ھ ۶/ دسمبر ۱۹۶۱ء

مکرمی دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسجد عبدالنبی اور اس سے متعلق آراضی جو جمعیۃ علماء ہند کے حق میں محکمۂ آثار قدیمہ سے واگذار کی جارہی ہے، اور اس سلسلہ میں ایک لفظ کی ترمیم واصلاح کا معاملہ اس وقت پیش ہے اور ممکن ہے ایسے معاملات اور بھی پیش آئیں، لہٰذا محکمہ کے ذمہ دار افسر کے مشورہ سے یہ تحریر ارسال کی جارہی ہے، جس میں جناب کی طرف سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو جنرل سیکریٹری جمعیۃ علماء ہند کی حیثیت سے دستخط کرنے کا اختیار دیا گیا ہے مہربانی فرماکر جہاں پنسل کا نشان ہے وہاں دستخط فرماکر آج ہی واپس فرمادیں۔

نیازمند محمد میاں

ناظم جمعیۃ علماء ہند

مخدوم ومکرم حضرت مولانا! مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج گرامی! بہار امدادی فنڈ کے سلسلہ میں گرانقدر عطیہ موصول ہوا، جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ حلقۂ اثر میں سعی فرمائیں کہ اس سلسلہ میں جس قدر بھی امداد ممکن ہوسکے جلد از جلد پہنچ کر مصیبت زدگان کی مزید اعانت کا سامان بہم پہنچائیں۔ مہتمم صاحب اور مولانا عبداللطیف صاحب کی خدمت میں سلام مسنون رسید نمبر ۷۳۸ ارسال خدمت ہے۔

آپ کا مخلص محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ

۱۳/ محرم الحرام ۶۶ھ

۶۸/۳/۴

حضرت مولانا دامت برکاتکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! عرصہ سے خیریت نہیں معلوم ہوئی سنا تھا آپ حیدرآباد یا میسور تشریف لے گئے ہیں، امید ہے کہ اب بخیریت واپس ۔۔۔۔۔ اور احقر جلد ہی جواب عریضہ سے مستفیض ہوسکے گا۔

(۱) مصنف کی تعریف کیا ہے جن کتابوں تک احقر کی دسترس ہوسکی ان سے تقریباً ۲۷ اصطلاحات کا علم ہوسکا۔ مگر "مصنف" کا علم نہ ہوسکا۔ جناب نے غالباً مصنف عبدالرزاق کی تصحیح وترتیب فرمائی ہے امید ہے کہ جناب کا چشمہ فیض لب تشنہ کو سیراب کرسکے گا شفاء العی السوال

(۲) نزہۃ الخواطر کی جلد ۷ سنا ہے طبع ہوچکی ہے کیا یہ صحیح ہے اگر صحیح ہے تو کہاں سے مل سکتی ہے، لکھنؤ سے احقر کو جواب ملا کہ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے مل سکتی ہے، احقر کو دائرہ کا پتہ یاد نہیں رہا۔ اگر جناب کو معلوم ہوتو مطلع فرمائیں اور اگر کہیں اور سے مل سکتی ہوتو وہ پتہ تحریر فرمادیں صاحبزادہ محترم اور حاضرین مجلس کی خدمات عالیہ میں سلام عرض ہے، والسلام

نیازمند محتاج دعا:

محمد میاں

۷۵/۱۱/۲۴

مکرمی ومحترمی حضرت مولانا صاحب زیدت فیوضکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! امید کہ آپ سفر سے واپس تشریف لے آئے ہوں گے۔ براہ کرم ادارہ مباحث فقہیہ دلی کے لیے کسی ایسے عالم کا انتظام فرمادیں جو ادارہ کی ضروریات کو حسن خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں، اور مناسب مشاہرہ پر یہاں قیام کرنے پر راضی ہوجائیں۔

نیز اس سلسلہ میں اپنے مفید مشوروں سے اطلاع بخشیں، تاکہ ادارہ کا کام اعلی درجہ پر چل سکے اور قوم کی خدمت ہوسکے۔

اس سلسلہ میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، والسلام مع الاکرام

سجاد حسین

مدیر ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ بلڈنگ دلی، ۶

۱۲/ دسمبر ۷۵ء

مکرمی ومحترمی مولانا صاحب زیدت فیوضکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! ایک عریضہ اس سے قبل ارسال خدمت کیا تھا، ملاحظہ سے گزرا ہوگا، یہ خط بطور یاددہانی تحریر ہے۔

آپ ادارہ مباحث فقہیہ دلی کے لیے ایک ایسے عالم کا انتظام فرمادیں، جو ادارہ کی ضروریات کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اور مناسب مشاہرہ پر یہاں قیام فرمانے پر راضی ہوجائیں۔

نیز اس سلسلہ میں اپنے مفید مشوروں سے اطلاع بخشیں۔ تاکہ ادارہ کا کام اعلیٰ درجہ پر چل سکے اور قوم کی خدمت ہوسکے۔ والسلام

مولانا قاضی سجاد حسین صاحب

سکریٹری ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ بلڈنگ دلی۔ ٦

۱۲/ دسمبر ۱۹۷٦ء

مکرمی محترمی مولانا صاحب زیدت فیوضکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

۲۴/ نومبر ۷۵ء کو ایک عریضہ ارسال خدمت کیا گیا تھا کہ ادارہ مباحث فقہیہ دہلی کے لیے آپ ایک ایسے عالم کا انتظام فرمادیں جو ادارہ کی ضروریات کو بحسن خوبی انجام دے سکیں اور مناسب مشاہرہ پر دلی میں قیام فرماسکیں۔

اس کے بعد ۱۲/ دسمبر ۷۵ء کو یاددہانی کرائی گئی، لیکن آپ کی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا کیا آپ کو خط نہیں ملے؟

یہاں ابھی تک کسی عالم کا تقرر نہیں کیا گیا۔ آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے، نیز ۲٦/ نومبر ۷۵ء کو ایک استفتا پیش خدمت کیا گیا ہے، اس کے جواب کا بھی انتظار ہے، والسلام

سجاد حسین

(مولانا قاضی سجاد حسین صاحب مدظلہ)

سکریٹری ادارہ مباحث فقہیہ دلی

۴/ ۱۲/ ۷٦

مخدومی زید مجدہ!

جناب کا گرامی نامہ مورخہ ۱۸/ ۱۱/ ۷٦ کو دفتر والوں نے میرے پاس بھیجا ہے اس سے قبل جناب کا کوئی گرامہ نامہ مجھے ایسا نہیں ملا جس کا جواب میں نے نہ دیا ہو، خدا کرے اس اجتماع میں جناب شرکت فرماسکیں میں حکیم صاحب سے کہوں گا کہ تشریف آوری کے وقت وہ مخطوطات کی فہرست کے سلسلہ میں جناب سے رجوع کریں۔ ۱۴/ دسمبر سے قونیہ میں مولانا روم پر ایک سیمینار ہے جس کی شرکت کے لیے میں ۱۰/ دسمبر کو دہلی سے روانہ ہورہا ہوں اس سفر میں قونیہ استنبول کے علاوہ تہران، قاہرہ اور سعودیہ عربیہ جانا بھی طے کرلیا ہے، میری واپسی انشاء اللہ شروع جنوری تک ضرور ہوجائے گی، دعا کا طالب ہوں، اور دست بدعا ہوں کہ جناب والا بصحت وعافیت تادیر زندہ وسلامت رہیں۔

سجاد حسین

مجریہ ۷/ اگست ۷۵ء مطابق ۲۸/ رجب ۹۵ھ

مجلس عاملہ مرکزی دینی تعلیمی بورڈ کے ارکان کے نام، مدعو خصوصی

مکرم ومحترم زید عنایتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مرکزی دینی تعلیمی بورڈ کی مجلس عاملہ کا ایک ضروری اور اہم اجلاس مورخہ ۲۲/ اگست ۷۵ء مطابق ۱۳/ شعبان ۹۵ھ بروز جمعہ دفتر جمعیۃ علماء ہند مسجد عبدالنبی نمبر ۱ بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی میں ۳ بجے شام کو ہونا طے پایا ہے جس میں جناب والا کی شرکت بہت ضروری ہے، امید کہ اپنے تمام مشاغل پر شرکت کو ترجیح دے کر ممنون فرمائیں گے۔

براہ کرم اپنی آمد سے مندرجہ ذیل پتہ پر مطلع فرمائیں۔ والسلام

ایجنڈہ

(۱) کارروائی اجلاس سابق کی خواندگی۔

(۲) دستور کی دفعہ ۴، ۱۰، ۱٦ کے مطابق بورڈ کی تشکیل جدید، مجلس عاملہ اور عہدیداران کا انتخاب۔

(۳) دستور کی دفعہ ۵ کے مطابق صوبائی بورڈ اتر پردیش، بہار، بنگال، پنجاب وہریانہ کی تصدیق۔

(۴) مرکزی بورڈ کے کاموں کے نقشہ اور پروگرام پر غور۔

(۵) مرکزی بورڈ کے گوشوارہ حسابات اور بجٹ کی منظوری۔

(٦) بورڈ کے مالی وسائل و ذرائع پر غور۔

(۷) دیگر امور باجازت صدر۔

پتہ:- حماد الاعظمی القاسمی مرکزی دینی تعلیمی بورڈ

مسجد عبدالنبی نمبر ۱: بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دلی

آزاد ہندوستان کے پہلے امیر الہند: محدّث اعظمی

مولانا مفتی عطاء اللہ صاحب قاسمی کوپاگنجی ★

محدث کبیر، فقیہ جلیل، آزاد ہندوستان کے پہلے امیر، ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نور اللہ مرقدہ کے انتقال پر ۲۷ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، حضرت فرشتہ نہیں انسان تھے اس لئے گذر گئے۔ انسانوں میں بھی انسان کامل و عالم ربانی تھے، اس لئے گئے تو ہندوستان کے شہر مئو سے، لیکن ہندوستان و پاکستان سے لے کر مصر و شام تک سناٹا چھا گیا، پورے عالم اسلام میں صدمات کی لہر دوڑ گئی، اس طرح جانے والے کی آفاقی شہرت نمایاں اور عالمی مقبولیت آشکارا ہوگئی، ایسا اس لئے ہوا کہ دونوں جہاں کے سردارؐ کی متعدد احادیث کی یہ شہادت ہے :

موت العالم موت العالم

یعنی عالم ربّانی کے مرنے سے ایک دنیا اجڑ جاتی ہے۔ محدث کبیر کی وفات سے احقاق حق کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں، دفاع حق کا ایک مضبوط حصار ٹوٹ گیا، علم و تحقیق کی وادی سونی ہوگئی اور اصحاب علم و تحقیق یتیم ہو گئے۔

انسان کامل کے خدوخال

محدث اعظمی ایک ایسی عظیم عبقری شخصیت کا نام تھا جس کا علم راسخ بھی تھا اور وسیع بھی، جس کی نظر ثاقب گہری بھی تھی اور ہمہ گیر بھی، جس میں محدثین کی جانکاہی بھی تھی اور اولوالعزمی بھی، جس میں صوفیا کا مجاہدہ بھی تھا اور سوز و گداز بھی، جو علم کا طالب صادق بھی تھا اور علماء کا استاذ بھی، اس کو دیکھ کر محدثین کے حیرت انگیز حافظے کی تصدیق ہوتی تھی۔ ائمہ اجتہاد کی ذہانت وفطانت پر یقین پختہ ہوتا تھا، وہ غیرت وحیاء کا پتلا تھا، اور اخلاص وللّٰہیت کا پیکر بھی، اس کا زہد واستغنا ناقابل عبور بھی تھا اور سبق آموز بھی، اس کی ژرف نگاہی کے سامنے عقلیں ششدر و حیران رہ جاتی تھیں اور مطمئن بھی۔

وہ سفالہ پوش نیم تاریک مکان کے مکین تھے، دلق پوش اور بوریہ نشین تھے، لیکن مبدأ فیاض نے انھیں علم و تحقیق کا سرور تاجدار بنایا تھا، اسی طرح ملت اسلامیہ ہند کی شیرازہ بندی، تنظیم واجتماعیت کی امارت کا حق دار بھی، چنانچہ چوٹی کے علماء ومشائخ اور ممتاز افراد امت نے جب مسلمانان ہند کی تنظیم واجتماعیت بنانے کے لئے سر جوڑ کر پوری دیانت داری کے ساتھ غور وخوض کیا تو اس کی سربراہی وامارت کے لئے نظر انتخاب بجا طور محدث اعظمی کی شخصیت پر پڑی، اور آپ کی عدم موجودگی میں منصب امارت آپ کے سپرد کر دیا گیا، حق بحق دار رسید۔

امارت کی شرعی اہمیت اور اس کی ضرورت

مسلمان دنیا کے جس خطے میں آباد ہوں وہ بہرحال اسلامی زندگی گذارنے کے مکلف ہیں، اسلامی زندگی جماعتی زندگی کا دوسرا نام ہے، وہ زندگی جو شارع علیہ السلام کی مطلوب ومقصود ہے، وہ ایسی جماعتی زندگی ہے جس کا امیر وامام ہو اور مسلمان اس کے مطیع وفرمانبردار رہوں۔ قرآن کریم میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (سورہ نساء: ۵۹)

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو اور تم میں سے جو لوگ صاحب اختیار ہوں، اُن کی بھی۔“

اس آیت میں تین اطاعتیں واجب قرار دی گئیں: اللہ کی اطاعت، رسول کی اطاعت، اور امیر کی اطاعت۔ اللہ و رسول تو مستقلاً واجب الاطاعت ہیں اور اولوالامر رسول کے نائب ہونے کی حیثیت سے مطاع ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی۔

(رواہ الشیخان)

”جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔“

اسلامی زندگی کا نظام یہ ہے کہ اس میں ایک امیر ہوگا، مسلمان اس کے مطیع وفرمانبردار ہوں گے۔ یہ ایسا نظام ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اہمیت دی ہے کہ اس نظام سے خروج کو معصیت اور جاہلیت قرار دیا۔ ارشاد ہے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ ﷺ من خرج عن الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات مات میتۃ جاہلیۃ۔ (رواہ مسلم)

★ استاذ مدرسہ ضیاء العلوم پورہ معروف، ضلع مئو۔ (یوپی)

''جوشخص اطاعت امیر کو چھوڑ دے اور جماعت سے الگ ہوا، وہ جاہلیت جیسی موت مرا۔''

اسلام کا مطمح نظر یہ ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی رہیں باہم متحد اور منظم رہیں۔حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

''اور سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑلو اور آپس میں متفرق نہ رہو۔''

محقق عمادالدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

أمرهم بالجماعة ونهاهم عن التفرقة وقد وردت الأحاديث المتعددة بالنهي عن التفرق والأمر بالاجتماع والائتلاف. (ابن کثیر ص ۳۸۹)

حق تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کو اجتماعیت کا حکم دیا اور انتشار سے منع فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں افتراق سے منع فرمایا اور اتحاد واجتماعیت کا حکم دیا ہے۔

قرآن کریم میں جس طرح اجتماعی زندگی کا حکم دیا ہے، اسی طرح اس کو باقی رکھنے کی سبیل بھی بیان کی ہے۔چنانچہ آگے کی آیت میں فرمایا گیا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آل عمران: ۱۰۴)

''اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں وہی لوگ کامیاب ہیں۔''

اس آیت کے ذریعے دعوت الی الخیر کا نظام قائم کر کے اجتماعیت کے بقا اور استحکام کی صورت پیدا کی گئی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

لا إسلام إلا بجماعة ولا جماعة إلا بإمارة ولا إمارة إلا بطاعة.

(جامع ابن عبدالبر ص ۶۲)

''اسلامی زندگی نہیں ہوسکتی بغیر جماعتی زندگی کے، اور جماعتی زندگی نہیں ہوسکتی بغیر امارت کے، اور امارت کا مدار اطاعت امیر پر ہے۔''

اسلام میں اجتماعیت لازمی طور پر مطلوب ہے، حتیٰ کہ عبادات میں بھی اجتماعیت کی شان پیدا کی گئی، نماز فرض ہوئی تو جماعت کے ساتھ ایک امام کی اقتدا میں ادائیگی کا حکم ہے، اور اس کے لئے بہتر سے بہتر امام منتخب کرنے کا حکم ہے لیکن بہتر امام کے انتخاب کے مقابلے میں اتحاد واتفاق اور اجتماعیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، جزئی اور فروعی باتوں کو اس مقصد کے لئے نظر انداز کردینا شریعت کا مزاج ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صَلُّوْا خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ ''ہر امام کے پیچھے نماز ہوجائے گی چاہے وہ برا ہو یا نیک''

(ہدایہ ص ۱/ ۱۲۲)

تمہید اور مقصد میں فرق لازمی ہے

یہ امر واقعہ ہے کہ ملت اسلام کی عظمت وشوکت وابستہ ہے خلافت وحکومت سے اور دین وملت کی شیرازہ بندی اور قوت وابستہ ہے تنظیم امارت سے۔تنظیم اصل ہے اور حکومت وخلافت اس کی فرع ہے، تنظیم امارت تمہید ہے اور خلافت وحکومت مقصد ہے۔علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''امامت کیا ہے؟ کسی ایک لائق شخص کی سرداری میں افراد امت کی ایسی شیرازہ بندی کہ ان پر جماعت کا اطلاق ہوسکے، احکام شرعی کا نفاذ واجرا بقدر امکان انتظام پاسکے، جمعہ وجماعت اور نکاح وطلاق اور میراث وغیرہ کے احکام کی تنفیذ ہوسکے اور اگر اس سے زیادہ قوت ہوتو استخلاف اور تمکین فی الارض کا وہ فرض بھی ادا ہوسکے جس کی بشارت قرآن کریم نے دی ہے۔''

(ہندوستان اور مسئلہ امارت ص ۹)

آگے لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ مکی امارت کی تمہید کے بغیر مدنی امارت کا مقصد جلوہ پیرا نہیں ہوسکتا۔غار حرا کے سکون سے پہلے غزوۂ بدر کا شور پیدا نہیں ہوسکتا۔''

(حوالۂ بالا)

مکی دور میں سب سے پہلے اجتماعیت وقیادت کا ظہور ہوا تو اسلام ناموافق حالات کے باوجود ترقی کے منازل طے کرتا رہا، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ کمزور اجتماعیت وقیادت ایک مضبوط حکومت اور مرکزیت سے ہم کنار ہوئی، جب کبھی حکومت کے زعم میں اجتماعیت اور تنظیم سے اغماض برتا گیا تو اس کا نتیجہ بہت خوفناک سامنے آیا، اندلس میں حکومت کے خاتمے کے بعد اجتماعیت وتنظیم کا فقدان تھا، اس لئے وہاں سے ملت کا نام ونشان مٹ گیا جب کہ ہندوستان میں حکومت کو ختم ہوئے پونے دوسو سال ہونے والے ہیں، لیکن چوں کہ اجتماعیت وقیادت کسی نہ کسی حد تک اور کسی نہ کسی صورت میں قائم رہی اس لئے ہندوستان میں اسلام اور مسلمان بڑی حد تک محفوظ اور مضبوط ہیں، اسی کمزور اجتماعیت کو مضبوط اور فعال بنانے کی جدوجہد جاری ہے، خدا اسے کامیابی سے ہمکنار فرمائیں۔

موجودہ ہندوستان میں اس امر میں قطعاً دو رائے نہیں ہے کہ مسلمانوں کو حکومت حاصل نہیں ہے اور نہ امارت کاملہ کے امکانات ہیں، مگر ملت کی بقا

واستحکام کے لئے اگر اجتماعیت وقیادت کی تشکیل کی جائے تو یہ دینی فریضہ ہے۔(مفتی سعید صاحب پالن پوری: مقدمہ امامت وامارت کا تصور ص ۶)

قابل افسوس پہلو

ہندوستان میں مسلمانوں کی پراگندگی، زبوں حالی، انارکی اور انتشار کی جو کیفیت ہے اس پر ہر حساس مسلمان کی آنکھیں اشک بار اور ہر دل دردمند ہے لیکن کسی مریض کی حالت زار پر تیمارداروں کے آنسو خواہ کتنے ہی دردمندانہ اور مخلصانہ ہوں شفا کا سبب نہیں بن سکتے۔شفا کے لئے تو طبیب کی تلاش دوا دارو کا انتظام اور مریض کو دوا کھلانے کی جدوجہد ہی کام آئے گی۔ ملت اسلامیہ کے اطباء یعنی علماء حق نے اس کے لئے ملی دور کا وہی نسخہ یعنی اجتماعیت وقیادت کو ہی تجویز فرمایا اور اس کے لئے جدوجہد شروع کردی، لیکن اس نسخہ کے نفع وضرر سے ہٹ کر اس کے جواز اور عدم جواز پر بحث شروع کردی گئی، یہ آج تک جاری ہے۔ بحث ومباحثہ میں ایک دفتر تیار ہوگیا، حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمہید اور مقصد کے فرق کو سمجھا جائے اور حسب استطاعت ایک نظم امارت کے جھنڈے تلے مسلمانوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور ملت کی شیرازہ بندی زور پکڑے اور کمزور امارت مضبوط اور تناور درخت بن سکے تاکہ مسلمانوں کو اس کے سائے میں عزت کی زندگی نصیب ہوسکے۔

تنظیم امارت عہد بہ عہد

ہندوستان میں ہمارے اسلاف کرام نے احیائے دین اور اعلاء کلمۃ اللہ، کائنات میں خالق کائنات کے احکامات کے نفاذ اور اجرا کے لئے تنظیم جماعت کی اہمیت اور ضرورت کبھی فراموش نہیں کیا، حالات نے جب بھی اجازت دی حسب استطاعت اس اہم ترین ذمہ داری کو پوری کرنے کی مخلصانہ جدوجہد کی ہے اور احوال وظروف کے مطابق مکی اور مدنی دونوں عہد کی سنتوں کو زندہ کردکھایا۔

۱۸۰۶ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد جب انگریزوں نے بساط سیاست پر شاہ عالم کو ایک تاجدار کی حیثیت سے نمایاں کیا اور مملکت وحکومت میں ایک عجیب وغریب تقسیم قائم کرکے اعلان کیا کہ ”ملک بادشاہ کا اور حکم انگریز بہادر کا“ تو اسی وقت ہندوستان میں مسلم حکومت کا ستارہ گردش میں آگیا تھا۔ اور انگریز اپنی عیارانہ اور شاطرانہ چالوں سے تجارت کی منڈیوں سے نکل کر حکومت کے تاج وتخت سے کھیلنے لگے تھے تو خاندان ولی اللّٰہی کا ایک دردمند اور بالغ نظر مرد کار شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی نظر دوراندیش نے سمجھ لیا تھا کہ اب یہاں کے مسلمانوں کا سیاسی زوال ہونا ہی چاہتا ہے، اس لئے اب عملی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے جو کام کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے دینی اقدار کی حفاظت کے لئے حکومت کے کاموں میں دخل انداز ہوئے بغیر امارت اور اس کے تحت قضا کا شرعی نظام قائم کرلیں، چنانچہ انھوں پوری جرأت ایمانی کے ساتھ قیام امارت کا فتویٰ دیا۔

تنظیم امارت کی پہلی کوشش

قیام امارت کے اس فتوے کو غیر منقسم ہندوستان میں پہلی بار جس جماعت نے عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا وہ حضرت شاہ صاحب کے ساختہ و پرداختہ لوگ تھے، یعنی حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقائے کار۔ سید صاحب جب علاقہ سرحد تشریف لائے تو آپ یہ سمجھتے تھے کہ اہل سرحد مسلمانان ہند کی بہ نسبت شرع کی پابندی میں فائق ہوں گے لیکن دوسال تک ہر طبقہ کے حالات ومراسم دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اہل سرحد کی زندگی جاہلیت کا نمونہ ہے، اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ اقامت جہاد سے پہلے اطاعت شریعت کی بیعت لی جائے۔ چنانچہ پنج تار کے علاقہ میں یکم شعبان ۱۲۴۴ھ میں مطابق ۱۸۲۹ء جمعہ کا دن تجویز ہوا۔خوانین واکابر کا دو ہزار کا مجمع تھا۔سید صاحب نے تقریر فرمائی، اخیر میں فرمایا: ”میں خدائے عزوجل کا ایک عاجز بندہ ہوں، میری آرزو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سب لوگ احکام الٰہی کے فرمانبردار بن جائیں۔“ اس کے بعد سید صاحب مجمع سے چلے گئے۔ علمائے کرام مشورہ کرتے رہے اور یہ فیصلہ ہوا کہ نظام شرعی کا قیام ضروری ہے۔ چنانچہ نماز جمعہ کے بعد تمام حضرات نے سید صاحب کے ہاتھ پر اقامت شریعت کی بیعت کی۔ سید صاحب کی شہادت ۲۴/ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء کے بعد ۱۲۵۶ھ تک امارت قائم رہی لیکن امام شہیدؒ کے عظیم مقصد کو بروئے کار لانے میں کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔

دوسری کوشش

بالآخر ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۴ھ میں جب کہ برطانوی سامراج کے ظلم وتشدد کے خلاف برسوں کی سلگتی آگ لاوا بن کر پھوٹ پڑی تو قافلہ ولی اللّٰہی کے مسافر جو سالوں سے سامان سفر تیار کررہے تھے، تھانہ بھون کی ایک مسجد میں بیٹھ کر یہ طے کیا کہ پوری جرأت کے ساتھ یہ اعلان کردیا جائے کہ ”زمین اللہ کی حکومت اللہ کی اور حکم اللہ کا چلے گا۔“ چنانچہ ان حضرات نے بحث

ومباحثہ اورغور وخوض کے بعد حاجی امداداللہ صاحب کی امارت پر بیعت کرلی۔ حاجی صاحب امام، مولانا قاسم نانوتوی سپہ سالار افواج اور مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی اور مولانا منیر نانوتوی فوج کے میمنہ افسر اور مولانا الحافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ فوج کے میسرہ کے افسر مقرر کئے گئے۔

ان حضرات کا علم وتقویٰ مشہور تھا، ان کے اخلاص وللّٰہیت سے زمانہ متاثر تھا، اس لئے دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں سربکف مجاہدین ان کے گرد جمع ہوگئے، تھانہ بھون اوراس کے اطراف میں اسلامی حکومت قائم کردی گئی اور انگریزی حکام باہر کردیئے گئے، نتیجہ ظاہر تھا، انگریزوں سے جنگ ہوئی، مجاہدین حریت ناکام ہوگئے، اس کے بعد اس نظام امارت کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔

علمائے حق ہار ماننے والے نہیں

اس ناکامی کے بعد ۱۸۵۷ء کی تحریک کا ردعمل اتنا سنگین تھا کہ اس دور میں دین ومذہب کے نام پر کسی تنظیم کی تشکیل تو دور کی بات ہے نام لینا بھی جرم عظیم تھا، یہ ایسا شرانگیز اور ہنگامہ خیز دور شروع ہوا کہ ایسا دور قوموں کی زندگی میں نہیں آیا ہوگا۔ انگریزوں سے آزادی کی تحریک چل رہی تھی اور انگریز ہماری اجتماعیت کو تہس نہس کرنے اور ہماری قیادت کو ملیامیٹ کرنے کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک بم ہماری صفوں پر برسا رہے تھے، حکومت کے بل بوتے پر عیسائیت کی جارحانہ تبلیغ، مرزا قادیانی کا دعوائے نبوت، سرسید احمد خاں کا ضروریات دین سے انکار، علمائے امت کا خاکہ اڑانا، ان پر پھبتیاں کسنا اور مسلمانوں کو یورپین کلچر میں ضم کرنے کی کوشش، احمد رضا خاں کی تکفیری مہم، آریہ سماج کا قیام، شدھی سنگٹھن کی تحریک، مسلم لیگ کی جارح فرقہ پرستی، علمائے امت کی توہین اوران کی کردارکشی، فتنۂ انکارحدیث، فرقہ اہل حدیث کا آمین اور رفع یدین کے معمولی مسئلے پر مساجد کو میدان جنگ بنادینا، شیعوں کی دل آزار تبرابازی۔

غرضے کہ وہ کون سا حربہ تھا جس کو انگریزوں نے ہماری اجتماعیت کو توڑنے، ہمارے دین ومذہب کو مٹانے اور ہماری قیادت کو سپوتاژ کرنے کے لئے استعمال نہ کیا ہو،لیکن حق تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے علماء کو جنھوں نے اعصاب شکن روح فرسا حالات میں بھی ہمت نہیں ہاری، ہر چیلنج کو قبول کیا، ہر محاذ پر جم پر مقابلہ کیا، اپنی جانیں لڑادیں، اور دشمن کو شکست دے کر ملت کی کشتی کو بچانے میں کامیابی حاصل کی، ان روح فرسا اور ہنگامہ خیز حالات میں بھی یہ حضرات قیام امارت سے غافل نہیں رہے بلکہ ان حالات نے تو امارت کی ضرورت واہمیت کو شدت سے ابھار دیا چنانچہ انھوں نے اس کی طرف بھرپور توجہ دی۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ جو صف علماء کے ایک فرد تھے، ان کا وہ خطبۂ صدارت جسے انھوں نے جمعیۃ علماء کے ۱۹۲۱ء کے اجلاس میں پیش کیا، بڑا چشم کشا اور اہم ہے۔ لکھتے ہیں:

’’حضرات! ۱۹۱۴ء کے لیل ونہار قریب الاختتام تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی اور مجھے یقین ہوگیا کہ جب تک یہ عقدہ یعنی نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کا حل نہیں ہوگا ہماری کوئی سعی وجستجو کامیاب نہ ہوگی۔ چنانچہ اسی وقت میں سرگرم سعی وتدبیر ہوگیا۔ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات بھی دراصل اسی سعی وطلب کا نتیجہ تھی، انھوں نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق کرلیا تھا اور یہ معاملہ بالکل صاف ہوگیا تھا کہ وہ اس منصب کو قبول کرلیں گے اور ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کردیا جائے گا، مگر افسوس کہ بعض زود رائے اشخاص کے مشورے سے مولانا نے اچانک سفر حجاز کا ارادہ کرلیا اور میری کوئی منت سماجت بھی انھیں سفر حجاز سے باز نہ رکھ سکی۔‘‘

(امامت وامارت کا تصور ۴۵، ۴۶)

تاریخ امارت ص ۵۳ میں لکھا ہے کہ جمعیۃ کے ۱۹۲۰ء کے اجلاس کے موقع پر حضرت شیخ الہند کا اصرار تھا کہ اس نمائندہ اجتماع میں جب کہ تمام اسلامی ہند کے ذمہ دار اور ارباب حل وعقد جمع ہیں، امیر الہند کا انتخاب کرلیا جائے، میں پہلا شخص ہوں گا جو اس امیر کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔

صوبائی امارت قائم ہورہی ہے

لیکن یہ اہم ترین تجویز اور شیخ الہند کی دیرینہ خواہش بعض علماء کے اختلاف کے باعث پوری نہ ہوسکی تو مولانا آزاد اور ان کے رفیق کار مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وقت بھانپ لیا کہ ملکی پیمانے پر امارت ہند کا مسئلہ جلد طے ہونے والا نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے صوبائی سطح پر نظام امارت قائم کرنے کی کوشش بلاتاخیر شروع کردی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں دربھنگہ کے اندر جمعیۃ علماء کے صوبائی اجلاس میں یہ تجویز پاس کرائی کہ انتخاب امیر کے لئے ایک خاص اجلاس علماء بہار کا بمقام پٹنہ وسط شوال میں بلایا جائے۔

تجویز کے مطابق ۲۵، ۲۷؍جون ۱۹۲۱ء کو یہ اجلاس پتھر کی مسجد پٹنہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت منعقد ہوا، جس میں مولانا آزاد سبحانی اور مولانا سبحان اللہ خان کے علاوہ ۱۰۰ سے زیادہ علماء صوبہ بہار کے شریک تھے۔ اس اجلاس کی دوسری نشست میں بالاتفاق مولانا شاہ بدرالدین

پھلواریؒ کو امیر شریعت صوبہ بہار اور مولانا ابوالمحاسن سجاد کو نائب امیر شریعت منتخب کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا مبارک دن تھا جس میں باقاعدہ امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، جس کا سلسلہ بحمد اللہ آج تک جاری ہے اور یہ سب انتخاب جمعیۃ علماء ہند کی نگرانی ہی میں ہوا ہے۔

ایک اور صوبہ میں امارت قائم ہورہی ہے

صوبہ بہار میں انتخاب امیر اور نظام امارت کے قیام کے بعد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی انجمن خدام الدین کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۲۶ء کے موقع پر جس میں علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے علاوہ پانچ سو سے زائد علماء شریک تھے۔ محدث کشمیری کی تحریک پر سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت منتخب کیا گیا اور پہلی بیعت خود علامہ انور شاہ کشمیری نے کی تھی اس کے بعد بیعت عامہ ہوئی۔

منزل قریب آگئی تھی

نومبر ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند کی شدید خواہش کے باوجود ملکی سطح پر نظام امارت قائم نہ ہوسکا تو صوبائی سطح کی امارتیں قائم کردی گئیں اور ملکی سطح کی امارت کے لئے کوششیں جاری رہیں۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۵ء تک ۲۵ سالوں کی جمعیۃ علماء کی مجالس عاملہ کی تجاویز اور اجلاس کے خطبات اس بات کے شاہد عدل ہیں کہ اس کے لئے سنجیدہ کوشش سرگرمی سے جاری رہی۔

یہاں ۱۹۴۵ء کی ایک روداد پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ مسئلہ امارت سے متعلق علمی اشکالات اور مباحث کی نوعیت کیا تھی؟ یہ بھی معلوم ہوگا کہ محدث اعظمی اس مسئلے کی گتھیاں سلجھانے میں اور اسے بروئے کار لانے میں برابر کے شریک وسہیم ہیں۔ یہ روداد یہ بھی بتاتی ہے کہ منزل کتنی قریب آچکی تھی اور کن اسباب و وجوہات سے پھر دور ہوگئی۔ مولانا افضال الحق قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے یہ داستان سننے کے لائق ہے۔

۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کے بعد اور ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی کے پہلے ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء کا سہارن پور میں اجلاس ہوا۔ اجلاس کا موضوع تھا امارت شرعیہ اور مقصد تھا جمعیۃ علمائے ہند کی طرف امیر الہند کا انتخاب واعلان، اس اجلاس کے لئے جو ایجنڈا تھا اس کو داعیان اجلاس نے مظاہر علوم سہارن پور اور تھانہ بھون کو بھی بھیج دیا تھا، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اس وقت دارالعلوم کے مفتی اعظم تھے اور حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم۔ دونوں تھانہ بھون کے بہترین ترجمان تھے۔

شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم مظاہر علوم کے ذمہ داروں نے اس پر بحث کی اور ایک تحریر لکھ کر ہم نے وفد کی شکل میں جاکر جمعیۃ علماء کے ذمہ داروں کو خود دی مجلس عاملہ میں جو تجویز زیر بحث تھی اس کا مقصد تھا کہ ہندوستان کا امیر الہند منتخب کر کے اعلان کردیا جائے۔ اور مظاہر علوم کی تحریر کا خلاصہ یہ تھا کہ امیر الہند کا انتخاب موجودہ غلامی کے ماحول میں جائز نہیں جب کہ ہم کسی معنی میں بااقتدار نہیں ہیں۔ امارت کے لئے اقتدار شرط اول ہے، پھر اس پر قرآن وحدیث اور الاحکام السلطانیہ جیسی کتابوں کے حوالے تھے، اس پر اکابرین کے دستخط تھے جو تھانہ بھون اور مظاہر علوم سے متعلق تھے۔''

تحریر اجلاس میں پڑھی گئی اور ذمہ داروں کی موجودگی میں ان ذمہ داروں نے پڑھ کر سنائی۔ اس پر مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے برافروختہ ہوکر فرمایا کہ اب تک یہ حضرات کہاں تھے؟ جب ہم بحث کرتے کرتے آخری منزل پر ہیں تو ان حضرات نے الگ سے ایک رائے کا اظہار فرمایا۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسا بزرگ مجاہد عالم اور فیصلہ کن شخص مجلس عاملہ کی صدارت کررہا تھا۔ یہ مجلس اکابر کا نازک مرحلہ تھا۔ دونوں کے دلائل سن کر فیصلہ فرمایا کہ علماء مظاہر علوم نے ایک عالمانہ اختلاف رائے کیا ہے اور آپ اس وقت اس کا جواب نہیں دے سکتے، اس لئے اجلاس ملتوی کیجئے اور اس بحث کو کسی نتیجہ تک پہنچانے کے لئے ایک کمیٹی بنادیجئے جس میں آپ کے منتخب افراد ہوں جو ان حضرات سے بحث کر کے کوئی آخری شرعی حل تجویز کریں، اس مجاہدانہ فیصلے پر اجلاس عام کو بالآخر مجاہد ملتؒ نے ملتوی کردیا اور جن حضرات کی کمیٹی بنائی گئی اور متفقہ طور پر اعلان کیا گیا ان کے نام تھے مولانا عبدالحلیم صدیقی لکھنوی، حضرت مولانا ابوالوفاء شاہ جہاں پوری اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی جب کہ مولانا اعظمی اس اجلاس میں شریک بھی نہیں ہوسکے تھے مگر ایسے سنگین مسئلہ پر فقہی نقطہ نظر کو علمی انداز سے حل کرنے کے لئے حضرت مولانا کی تلاش لازم تھی، اسی لئے تلاش کر کے آپ کا نام شامل کیا گیا۔ کیوں کہ حضرت مولانا کی علمیت، ذہانت اور تفقہ پر پوری جماعت کو اعتماد تھا۔ (ترجمان اسلام محدث اعظمی نمبر ص ۱۷۵،۷۵)

آزادی کے بعد نظام امارت کی تشکیل

۱۹۴۵ء کے اجلاس کی اس روداد نے یہ بات بالکل صاف کردی کہ مسلمانان ہند کی زبوں حالی، پراگندگی کو ختم کر کے باعزت زندگی کے لئے جو

نسخہ علماءوقت نے تجویز کیا تھا اس کے نفع وضرر سے ہٹ کر اس کے جواز اور عدم جواز کی بحث شروع کردی گئی، تمہید اور مقصد کے فرق کو نظرانداز کردیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ مسلمانان ہند انتشار و پراگندگی کے میدان تیہہ میں سرگرداں ہی رہ گئے اور منزل مقصود دور سے دور ہی ہوتی رہی۔ اسی عالم میں ملک کے سیاسی افق سے آزادی کا سورج طلوع ہوگیا، جس نے اس منتشر اور پراگندہ قوم کی راہ حیات کو مزید تنگ وتاریک بنادیا، اس تاریکی میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ پہلے اگر جان ومال کو تاراج کیا جاتا تھا تو آج دین ومذہب پر ڈاکے ڈالے جارہے ہیں۔ اسلامی شعار داڑھی وغیرہ پر قدغن لگائی جارہی ہے۔ خدا کے آخری صحیفہ ہدایت کی تعلیم واشاعت پر پابندی عائد کرانے کے لئے قانونی بہانے تلاش کئے جارہے ہیں۔ اسلامی عبادت گاہوں کو توڑنے اور اس پر جارحانہ قبضہ کی اسکیمیں بروئے کار لانے کا عمل جاری ہے۔

ان سنگینی حالات میں اس جمعیۃ علماء ہند کے لئے خاموش بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا جسے سلسلہ ولی اللّٰہی کی وارث وجانشین مانا جاتا ہے، جس کے اسلاف نے نہ صرف نظام امارت قائم کرنے کا فتویٰ دیا بلکہ اپنے اپنے عہد میں بقائے اسلام اور نفاذ شریعت کے لئے اس نظام کو جاری کرنے میں اپنی زندگی داؤ پر لگادی، حقیقت تو یہ ہے کہ اس نظام کا بیڑا اٹھا کر جمعیت نے اپنا فرض منصبی ادا کیا ہے اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کی دعوت عام دے کر ملت اسلامیہ کو باعزت زندگی کے حصول کا ایک شرعی راستہ دکھادیا ہے کیوں کہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس طوفان نے سر اٹھایا ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اجتماعی قوت وطاقت کی ضرورت ہے جو صرف نظام امارت سے حاصل ہوسکتی ہے۔

ملکی سطح پر نظام امارت پہلی بار قائم ہورہا ہے

جمعیۃ علماء کے ارکان کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ یہ ایک خالص دینی اور شرعی تنظیم ہے، اس کے کچھ مخصوص شرعی تقاضے ہیں جن کی تکمیل کئے بغیر یہ نظام اپنی اصلی شکل پر قائم نہیں ہوسکتا، اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ ارکان جمعیۃ کے علاوہ دیگر حضرات علمائے کرام سے بھی اس مسئلے میں مشورہ لے کر انھیں ہموار کیا جائے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۸۶ء کو دفتر جمعیۃ علماء ہند میں علمائے کرام کا ایک مخصوص اجتماع ہوا، جس میں تقریباً تین گھنٹے کی بحث وتمحیص اور غور وفکر کے بعد تین حضرات کے علاوہ سب کی رائے یہی تھی کہ موجودہ حالات میں نظام امارت کا قیام ضروری ہے۔

مزید اطمینان کے لئے جمعیۃ کے ناظم عمومی مولانا اسرار الحق قاسمی صاحب نے ملک کے سات صوبوں کا دورہ کرکے وہاں کے اہم علماء اور مقتدر اصحاب رائے سے تبادلۂ خیالات کیا جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ عام طور پر مسلمانوں کا دیندار طبقہ اس کی ضرورت کو محسوس کررہا ہے۔ اس صلاح ومشورہ کے بعد کل ہند سطح پر امیر شریعت کے انتخاب کا دعوت نامہ جاری کیا گیا، یہ دعوت نامہ ملک کے اہم علماء اور دانشوروں کے علاوہ علوم اسلامیہ کے مراکز تمام مسلم جماعتوں کو بھیجا گیا، چنانچہ دعوت نامہ کے مطابق ۲؍نومبر ۱۹۸۶ء کو بوقت ۹؍بجے مدنی ہال بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی میں یہ اجتماع منعقد ہوا۔ جس میں دلّی، بہار، آسام، وغیرہ چودہ صوبوں کے تین ہزار سے زائد نمائندے شریک ہوئے جس میں علماء مفتیان، مصنّفین، عصری درسگاہوں کے لکچرار، پروفیسر، اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبران، ڈاکٹر اور وکلاء غرضے کہ ہر طبقے کے نمائندے شامل ہوئے۔

ارباب حل وعقد کا اجتماع اور پہلے امیر الہند کا انتخاب

اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا اسعد مدنی صاحبؒ نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان درپیش خطرات کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے شرعی امور کی تکمیل کے لئے ایک شرعی تنظیم ہو اور شرعی قوانین واحکام مسلمانوں کی زندگی میں جاری کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ نظام قائم کیا جائے۔ میں اس سلسلے میں ایک تجویز آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں۔ آپ اس کے الفاظ کو غور سے سماعت فرمائیے اور غور وفکر کرکے اپنی رائے دیں۔ تجویز حسب ذیل ہے:

(الف) ہندوستان کے موجودہ حالات میں جب کہ مسلمان بہت سے احکام ضروریہ پر عمل نہیں کرسکتے، اس لئے بہ حکم خداوندی: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا اور بہ حسب تصریح فقہائے اسلام مسلمانان ہند پر شرعاً واجب ہے کہ اس انتشار اور پراگندگی کے بجائے اپنے اندر شرعی اجتماعیت پیدا کرنے کے لئے اپنا ایک امیر منتخب کرلیں۔ ہندوستان کے اکابر علماء مثلاً محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالمحاسن سجاد، وغیرہ نے اپنے خطبات میں اس وجوب شرعی کی ادائیگی پر بہت زور دیا ہے۔ اس لئے مسلمانان ہند کا یہ نمائندہ اجتماع جو جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر یہاں جمع ہوا ہے، ضروری سمجھتا ہے کہ پورے ملک کے لئے ایک امیر الہند کا انتخاب کرلیا جائے۔

(ب) اورامیر کے اختیارات وفرائض کے تعین اور تنظیم امارت شرعیہ کے قواعد وضوابط کا مسودہ تیار کرنے کے لئے پانچ ارکان پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی مقرر کرلی جائے۔

پورے نمائندہ اجتماع نے اس کی بھرپور تائید کی، عام شرکائے اجلاس کے علاوہ حسب ذیل حضرات نے بطور خاص تجویز کی تائید کی۔

(۱) مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

(۲) مولانا شاہ عون احمد قادری، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ

(۳) محمود پاشا قادری، تخت نشین درگاہ میراں حبیب اللہ قادری حیدرآباد

(۴) جناب محمد حنیف صاحب دائمہ کمار ایڈوکیٹ گجرات

(۵) مولانا معین الدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ امدادیہ مرادآباد

(۶) مولانا احمد علی شیخ الحدیث دارالعلوم بانس کنڈی، آسام

(۷) مولانا محمد یوسف صاحب مغربی بنگال

(۸) مولانا سراج الساجدین صاحب اڑیسہ

(۹) حافظ محمد صدیق ایم پی، مرادآباد

(۱۰) مولانا عبدالعلیم فاروقی، دارالمبلغین لکھنؤ

(۱۱) مولانا مسعود احمد صاحب، اجین

(۱۲) جناب عزیز الرحمٰن صاحب ایم، ایل، اے (سابق وزیر یوپی)

(۱۳) مولانا ہاشم صاحب قاضی شہر کوئمبٹور

(۱۴) مولانا مستقیم صاحب بمبئی

تجویز کی تائید کے بعد حضرت مولانا سید اسعد مدنی نے امیر الہند کے منصب کے لئے محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم کا نام نامی پیش کیا اور پورے اجتماع نے باتفاق رائے انھیں امیر الہند منتخب کرلیا، بعد ازاں مولانا شاہ عون احمد قادری نے نائب امیر الہند کے لئے مولانا سید اسعد مدنی کا نام پیش کیا، جسے تمام شرکاء نے منظور کرتے ہوئے نائب امیر الہند منتخب کرلیا۔ اس کے بعد امیر کے ہاتھوں پر سمع وطاعت کے لئے بیعت کا مرحلہ آیا، چونکہ اس اجتماع کے موقع پر حضرت محدث اعظمی علیل تھے، اس لئے شریک اجلاس نہ ہوسکے تو نائب امیر الہند کے دست مبارک پر بیعت عام کی گئی اور شرعی امور میں سمع وطاعت کا عہد کیا گیا، اس طرح ۱۸۰۶ء میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فتوے کی شکل میں جس قافلے کو ہری جھنڈی دکھا کر سرگرم سفر کیا تھا وہ ۱۹۸۶ء میں محدث اعظمی کے دست حق پرست پر بیعت عام پر اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

محدث اعظمیؒ آزاد ہندوستان کے پہلے امیر الہند

یہ ۱۸۲۹ء سے ۱۹۸۶ء تک تقریباً ڈیڑھ صدی سے زائد کی نظام امارت کی ایمان افروز داستان اور مختصر تاریخ ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظام امارت کتنی اہم اور ضروری چیز ہے، چوٹی کے علماء ومشائخ نے اس کے لئے کتنی قربانیاں دی ہیں۔ یہ ساری تاریخ محدث اعظمی کے مدنظر تھیں۔ آپ خود بھی اسی جماعت کے ایک فرد فرید تھے۔ ملت اسلامیہ ہند کی آبرومندانہ زندگی آپ کی بھی دلی تمنا اور خواہش تھی، اس لئے آپ نے منصب امارت کو بخوشی منظور فرمایا۔

۲/نومبر ۱۹۸۶ء کو آپ امیر الہند منتخب ہوئے اور ۱۶/مارچ ۱۹۹۲ء کو آپ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اس طرح آپ کی مدت امارت کل پانچ سال چار مہینہ چودہ دن قائم رہی۔ یہ آپ کی زندگی کا آخری مرحلہ تھا، آپ بوڑھاپے کے ساتھ ساتھ مختلف اعذار وامراض کی گرفت میں تھے۔ پھر بھی آپ نے ملک کے اہم صوبوں کا دورہ فرمایا، صوبائی امارتیں قائم کیں، محاکم شرعیہ کی داغ بیل ڈالی گئی اور جہاں پہلے سے محاکم شرعیہ قائم تھے اُن کو منظم کرکے امارت کے تحت لانے کی کوشش کی گئی۔ بیت المال کا نظم قائم ہوا، اور اس سے یتیموں اور بیواؤں کے لئے وظائف کا انتظام کیا گیا۔ بعد میں تعلیمی وظائف بھی جاری کئے گئے۔ غرضے کہ پیرانہ سالی اور ضعف ونقاہت کے باوجود امارت کے ادارے کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کے لئے اپنی طاقت صرف کردی اور اس کو منظم اور مضبوط ادارہ بنادیا۔

ایک آخری گذارش

ہم سب حضرت محدث اعظمی کی عقیدت ومحبت میں ان کی خدمات کو اجاگر کرنے اور دوسروں کو اس سے روشناس کرانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ عقیدت کے الفاظ اور تقریریں ہوا میں اڑ جانے والے ہیں، صرف اسی سے حق عقیدت ادا نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ حضرت نے امارت کی شکل میں جو ادارہ قائم فرمایا اور اپنی بوڑھی ہڈیاں گلا کر جلا بخشا، اسے تحریر، تقریر اور عملی اقدامات سے سینچا جائے تاکہ وہ تناور درخت بنے اور اس کے سائے میں ہمیں عزت واطمینان کی زندگی نصیب ہو۔ حق تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

ایں دعا از من واز جہاں آمین باد □□

مولانا کی خدمتِ حدیث کا عہد زرّیں

مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

خطیب بغدادی نے ایک عالم کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کی بستی کے فلاں عالم شہرت وناموری اور دینی وعلمی خدمات میں آپ سے بہت آگے ہیں، حالانکہ آپ علم وفضل میں ان سے بہت آگے ہیں؟ اس کے جواب میں اس عالم نے کہا کہ بات یہ ہے کہ وہ اپنی بستی سے نکل کر شہر میں چلے گئے، جہاں ان کو خدمت کے مواقع ملے اور میں اپنی بستی ہی میں پڑا رہا، اور میرا حلقہ بہت محدود رہا۔ یہ بات صرف علم ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر بڑے کام کے لیے باہر سے تعلق پیدا کرنا ضروری ہے۔

اسلامی تاریخ ایسے ائمۂ علم وفضل سے بھری پڑی ہے، جو دورافتادہ کوردہ اور گمنام قریات ودیہات میں پیدا ہوئے اور مختلف ملکوں اور شہروں میں جا کر اپنے کاموں اور کارناموں کی وجہ سے امامت وشہرت کے مالک ہوئے، اور ان میں کچھ ایسے اہل علم بھی گزرے ہیں جو علمیت وقابلیت میں بہت آگے ہونے کے باوجود اپنے محدود ماحول میں رہ جانے کی وجہ سے نہ ان کا فیض عام ہوسکا اور نہ ان کو شہرت وناموری حاصل ہوسکی۔

ہماں بہتر کہ لیلی در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگنائے شہر تاب حسنِ صحرائی

ہم اپنے مخدوم ومحترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کی آخری تیس سالہ زندگی کی علمی ودینی خدمات کو دیکھتے ہیں، تو ان کی پچھلی زندگی گمنامی کی زندگی معلوم ہوتی ہے، جو مئو اور اس کے اطراف میں گذری ہے، اس دور میں مقامی مدارس میں اونچی تعلیم اور مختلف فیہ موضوعات پر بلند پایہ تصانیف ضرور ہیں، مگر ان کی افادیت واہمیت کو وہ عموم حاصل نہ ہوسکا جو مولانا کے بلند علمی مقام کے شایان شان ہو، البتہ خاص خاص علمی ودینی حلقے اور اہل علم مولانا کے مقام ومرتبہ کے معترف تھے، جن میں ملک اور بیرون ملک کے علماء کی اچھی خاصی تعداد ہے، ان میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی، مولانا ابوالوفا صاحب صدر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد، علامہ شیخ محمد زاہد کوثری قاہرہ، شیخ احمد محمد شاکر قاہرہ جیسے اساطین علم اور مشاہیر امت کے نام ملتے ہیں۔ اس دور کی تصانیف میں الاعلام المرفوعہ، نصرۃ الحدیث اور رکعات تراویح مولانا کے حدیث وفقہ میں تبحر کی دلیل ہیں، اس کے باوجود یہ دینی وعلمی خدمات دوسرے دور کی شاندار اور تابناک خدمات کی تمہید معلوم ہوتی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم کا یہ چشمہ آہستہ بہتے بہتے سیل بے کراں بن کر پھوٹ پڑا۔ اس طرح مولانا مرحوم کی علمی زندگی قریٰ کی اور بلاد کی ناموری کا مجموعہ تھی۔

مولانا نازک مزاج، ذکی الحس، لطیف الطبع اور دوراندیش انسان تھے، ۱۹۶۰ء میں جب کہ ان کی علمی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا، ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی، طرح طرح کے عوارض واسقام لاحق ہوگئے تھے، قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوگیا، اس دور کے اکثر خطوط میں بخار، ضعف بصارت، دوران سر اور دوسرے امراض کا ذکر کیا کرتے تھے، مگر اللہ کی شان کہ اس دور میں ان کو علم حدیث کی عظیم الشان خدمت کی توفیق ملی اور بڑھاپے میں امراض واسقام کے ہجوم کے باوجود وہ کام کیا جو جوانی میں کرنے کا تھا وہ جو کسی نے کہا ہے کہ:

بڑھاپے میں جوانی سے بھی زیادہ جوش ہوتا ہے

اور کسی پر صادق آئے یا نہ آئے مولانا پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث کے خدمت گاروں کے حق میں دعا فرمائی ہے:

نضّر اللّٰہ امرأً سمع مقالتی فوعاها ثم بلغها الخ

یعنی اللہ تعالی ایسے شخص کو تروتازہ اور سرسبز وشاداب اور ہرا بھرا رکھے جو میری بات سن کر دوسرے کو پہنچائے، اس نبوی دعا کا ظہور مولانا مرحوم کی آخری زندگی میں یوں ہوا کہ مادی اور جسمانی عوارض وامراض کے باوجود علم حدیث کی خدمت کے لئے بے پناہ قوت وہمت عطا ہوئی اور اس حال میں پورے نشاط وانبساط کے ساتھ مولانا نے وہ دینی وعلمی کارنامے انجام دیئے جو جوانی اور صحت کے زمانہ میں کیے جاتے ہیں، یہ بات بھی مولانا کی زندگی کے امتیازات میں سے ہے کہ بڑھاپے میں انھوں نے جوانی سے زیادہ کام کیا، اس علمی ودینی خدمات کے شاندار دور کی داستان ذرا تفصیل طلب ہے۔ میں ۱۹۵۰ء میں بمبئی گیا، اس کے بعد مولانا محمد اسحاق صاحب بنارسی مرحوم بھی بسلسلۂ تجارت بمبئی پہنچے، مولانا سے ہم دونوں کے علمی ودینی تعلقات بہت پہلے سے تھے، اور دونوں ہی مولانا کے بے تکلف معتقدین وخدام میں تھے، مولانا بنارسی تو مولانا کے تلمیذ عزیز ہی تھے، راقم زمانۂ طالب علمی سے مولانا

کے معتقدین میں تھا۔ مولانا بنارسی صابو صدیق مسافر خانہ کے پاس الکریم منزل میں مقیم تھے اور عربوں کے ساتھ بنارسی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے، اور میں اسی کے قریب جنجیکر اسٹریٹ میں رہتا تھا، اور روزنامہ ''انقلاب'' اور ماہنامہ ''البلاغ'' سے متعلق رہ کر لکھنے پڑھنے میں مصروف تھا۔

ان ہی ایام میں مولانا حبیب الرحمن صاحب اور مولانا محمد ایوب صاحب مدرسہ مفتاح العلوم مئو کے چندہ کے سلسلہ میں مالیگاؤں سے بمبئی آئے، ہم دونوں کی وجہ سے دونوں بڑے انشراح کے ساتھ کئی دن بمبئی میں مقیم رہے۔ یہیں سے مولانا کے علمی خدمات کے دوسرے دور کی ابتدا ہوئی اس کے بعد مولانا سفر حج اور دوسرے مواقع سے بمبئی تشریف لاکر ہفتوں ہفتوں قیام فرماتے رہے، ویسے بمبئی میں مولانا کے قدیم معتقد وخادم شیخ انجینئرؒ مرحوم تھے، جن کے یہاں مولانا قیام کیا کرتے تھے، مگر اب ان کا زیادہ وقت ہم لوگوں کے یہاں گذرنے لگا تھا، اسی دوران میرے چھوٹے بھائی قاضی حیات النبی مرحوم اور دوسرے چند لوگ بمبئی آگئے اور اچھا خاصا حلقہ بن گیا، جس میں بمبئی کے متعدد قدرداں بھی شامل تھے، ہم لوگ چونکہ مولانا کے بے تکلف مزاج شناس تھے، اور مولانا بھی ہم لوگوں سے مانوس اور افتادِ طبع سے واقف تھے اس لیے کسی قسم کا ذہنی وفکری انقباض محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ ہر وقت خوش وخرم اور پوربی زبان کے محاورہ میں ''بحال'' رہا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں خیال ہوا کہ بمبئی یا مئو میں ایک علمی ادارہ قائم کیا جائے، جس میں تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کا کام ہو اور اس کے امکانات پر غور کیا جانے لگا، اسی سلسلہ میں مولانا نے میرے نام ۲۲؍اکتوبر ۱۹۶۰ء کو لکھا کہ:

''مالیگاؤں میں ۹ دن لگ گئے، اس کے بعد بمبئی آنے کا موقع معلوم نہیں ہوا، نیز بڑا محرک آنے کا یہ خیال تھا کہ آپ سے یحییٰ زبیر سے بمبئی میں کسی ادارہ کے لیے بات ہوئی ہوگی، جب معلوم ہوگیا کہ یہ بات نہیں ہے تو کوئی خاص محرک نہیں رہا، اپنے (قرب) وجوار میں اب بھی میرا خیال ہے کہ جیسا ادارہ آپ چاہتے ہیں قائم ہونا مشکل ہے، اسی طرف (بمبئی) ایسے ادارے قائم ہوسکتے ہیں اور چل بھی سکتے ہیں، اس طرف (اپنے قرب وجوار میں) بخل، حسد، اور بے ذوقی نے راستے بند کر رکھے ہیں، لیکن اُدھر (بمبئی) جو خرابیاں ہیں ان کا انکار بھی ممکن نہیں، آپ دور رہتے ہیں اس لیے قرب مطلوب ہے، مگر مستقل قرب حاصل ہوجائے تو یقین ہے کہ یہاں کے حالات چند ہی دنوں میں کو مرغوب ومطلوب بنادیں گے، میں آج کل کھانسی سے بہت پریشان ہوں، آج خصوصیت سے زیادہ مضمحل ہوں، بہت جبر کرکے یہ خط لکھ رہا ہوں۔''

میں ادارہ کے قیام کے سلسلہ میں متعدد بار مولانا کی خدمت میں مئو گیا اور وہیں ادارہ کے قیام کی کوشش کی، مولانا کے رفیق خاص مولانا عبداللطیف صاحب مرحوم جو اس وقت مئو میونسپلٹی کے چیرمین تھے، انھوں نے اس رائے سے بالکلیہ اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے لیے زمین اور عمارت کا ذمہ لیتا ہوں، تصنیف وتالیف آپ لوگوں کا کام ہے، اس کے باوجود مولانا مرحوم کی شدت احتیاط اور اس وقت کی صورتحال کی وجہ سے ادارہ مئو میں قائم نہ ہوسکا، اور مالیگاؤں میں مجلس احیاء المعارف کے نام سے احادیث کے مخطوطات کی نشر واشاعت کے لیے ایک ادارہ عمل میں آیا۔

اس کی صورت یہ ہوئی کہ مالیگاؤں کے مولانا عبدالحمید نعمانی مرحوم جن کا آبائی وطن مبارکپور ہے، مولانا کی علمی شہرت سن چکے تھے، انھوں نے مالیگاؤں میں ''معہد ملت'' کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی، اس کے افتتاحی جلسہ میں میری کوشش سے بمبئی میں دولت کویت کے مدرسہ کویتیہ کے استاد مدحت اسماعیل میرے ساتھ شریک ہوئے، اور تدریسی خدمت کے لیے مولانا بشیر احمد مبارکپوری مرحوم، مولانا محمد عثمان صاحب مبارک پوری اور مولانا حبیب الرحمن صاحب خیرآبادی بلائے گئے، اس کے بعد مولانا نعمانی اپنی بعض تالیفات وتراجم کی کتابت کے لیے بمبئی آتے جاتے رہے اور ہم لوگوں سے ملتے جلتے رہے، انھوں نے چاہا کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب کسی صورت سے سال میں چند ماہ ''معہد ملت'' میں قیام کریں اور ان سے علمی استفادہ کیا جائے، مولانا مرحوم اس کے لیے تیار نہ تھے، تو مولانا نعمانی نے یہ تجویز رکھی کہ مالیگاؤں میں ایک نشریاتی ادارہ قائم کیا جائے، جس میں حدیث کی نادر ونایاب کتابوں کی تصحیح وتعلیق مولانا کی نگرانی میں ہو اور وہیں سے ان کو شائع کیا جائے۔ یہ تجویز مولانا کے لیے بڑی پُرکشش تھی، گویا ان کی دیرینہ دلی مراد پوری ہورہی تھی، مگر جیسا کہ مولانا نے اپنے خط میں لکھا ہے بمبئی اور اطراف بمبئی کے ذہن ومزاج اور حالات سے مطمئن نہیں تھے، جب مولانا نعمانی کا تقاضا زیادہ ہوا تو مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ نعمانی بار بار تقاضا کرتے ہیں، مالیگاؤں چلو اور ادارہ کے قیام کے لیے فضا سازگار کی جائے، چنانچہ بمبئی سے مولانا، میں اور حاجی یحییٰ زبیر صاحب مالیگاؤں گئے اور وہاں کے اہل علم میں سے مولانا عبدالقادر صاحب، مولانا محمد عثمان صاحب اور دیگر علماء کے ساتھ معہد ملت کے مذکورہ بالا اساتذہ کی جد وجہد سے مجلس احیاء المعارف کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا اور ایک ہفتہ وہاں رہ کر اس کے لیے جملہ انتظامات کیے گئے، جس سے اسی سال ۱۹۶۰ء میں پہلی کتاب ''انتقاء الترغیب والترہیب'' شائع ہوئی، امام ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی شامی مصری متوفی ۶۵۶ھ کی حدیث کی مشہور کتاب الترغیب والترہیب کا انتقاء واختصار حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے کیا ہے، مولانا حبیب الرحمن

صاحب کو اس کا پہلا قلمی نسخہ شاہ نعیم اللہ بہرائچی ؒ کے کتب خانہ میں ملا، اس کے بعد دوسرا قلمی مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں دستیاب ہوا، تیسرا نسخہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں تھا، مولانا فرماتے ہیں کہ بہرائچ والے نسخہ کی طباعت واشاعت کے لیے میں بے تاب تھا کہ احیاء المعارف مالیگاؤں کا قیام ہوا اور اس کی اشاعت ہوگئی، ادارہ کی پہلی یہ کتاب ۱۳۸۰ھ=۱۹۶۰ء میں ۲۲۵ صفحات میں چھپ کر شائع ہوئی، مولانا نے اس کتاب کے تینوں مخطوطات کا مقابلہ کر کے حاشیہ میں اختلاف نسخ کو بیان کیا ہے، اغلاط کی تصحیح کی ہے اور امام منذری کی اصل کتاب الترغیب والترہیب کو بھی سامنے رکھ کر تعلیق وتصحیح فرمائی ہے، اس کام میں مولانا کے شریک کار بعض اہل علم بھی رہے ہیں، مولانا نے ۲۲/اکتوبر ۱۹۶۰ء کے خط میں مجھ کو لکھا کہ:

''الترغیب والترہیب ۱۶۱ یا ۲۰۰ صفحات باقی تھے، اب وہ بھی چھپ گئے، تصحیح اغلاط وغیرہ کی طباعت ہورہی ہے، آئندہ کیا ہوگا؟ کچھ معلوم نہیں، نہ میں نے کوئی بات کی''۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''پرسوں سے مولانا وصی اللہ صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، آپ کی کتابیں پیش کردی گئیں، بڑی مسرت سے قبول کیا، الترغیب والترہیب کے صرف ۱۵۰ نسخے باقی ہیں، سب فروخت ہوگئے، دوسرے کام کا ابھی تک کوئی بندوبست نہیں ہے، آپ کو تو زبانی ہی حالات زیادہ معلوم ہوں گے۔ الحمدللہ آج کل میری صحت اچھی ہے''۔

اس خط میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جس کی وجہ سے ''احیاء المعارف'' پر بھی اثر پڑا اور مولانا کا اندیشہ صحیح ہونے لگا، مجلس احیاء المعارف سے دوسری کتاب ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۶ء) میں حضرت امام عبداللہ بن مبارک متوفی ۱۸۱ھ کی کتاب الزہد والرقائق شائع ہوئی، جو اپنے موضوع پر ایک عظیم کتاب ہے اور علماء اسلام کے قدیم ترین دور تصنیف سے تعلق رکھتی ہے، اس نادر وعظیم کتاب کا قلمی نسخہ مکتبہ ولی الدین جار اللہ استنبول میں تھا، جس کا عکسی فوٹو حاکم قطر شیخ علی بن عبداللہ نے اپنے مکتبہ کے لیے نادر مخطوط کتابوں کے فوٹو جمع کرتے تھے، اور چونکہ یہ کام حاکم قطر کی اجازت ومرضی سے ہوا تھا، اس لیے مولانا نے مقدمہ میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے، نیز قاہرہ کے معہد مخطوطات سے اس کتاب کے تین فوٹو مجلس احیاء المعارف کے ذریعہ آئے، ان سب سے مولانا نے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے۔

کتاب الزہد کے دو نسخے تھے، ایک ابوعبداللہ حسین بن حسن بن حرب مروزی نزیل مکہ متوفی ۲۴۶ھ کا جو ۵۶۴ صفحات میں ہے، دوسرا نسخہ ابوعبداللہ نعیم بن حماد مروزی مصری متوفی ۲۲۸ھ کا جو درحقیقت مروزی کے نسخہ پر زیادات ہے، یہ ۱۳۲ صفحات میں ہے، مولانا نے اس کی تعلیق وتصحیح میں بڑے ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا ہے، اور اس میں ان کے روحانی اور احسانی ذوق کی پوری جھلک موجود ہے، زہد کے موضوع پر نہایت وقیع معلومات جمع کی ہیں، امام عبداللہ بن مبارک کے حالات نہایت تفصیل سے درج کیے ہیں، کتاب الزہد کے راویوں کے تراجم کی تحقیق کی ہے، کتاب کے موضوعات، اس کی مسند ومرفوع احادیث، موقوفات صحابہ، موقوفات تابعین وتبع تابعین، حضرات انبیاء اور ان کی احادیث کی علیٰحدہ علیٰحدہ مفصل فہرست مرتب کی ہے، جو بجائے خود نہایت دقت اور محنت طلب کام ہے، آخر میں استدراکات وتعقبات ۱۵ صفحات میں دیئے ہیں جن میں نہایت نادر ونایاب معلومات ہیں، اس کتاب کی تحقیق وتعلیق میں پچاس کتابوں کی فہرست بھی دیدی ہے، الغرض یہ کتاب مولانا کے علم وتحقیق اور حدیث وفقہ اور رجال میں تبحر کا مظہر بن گئی ہے، اور اس آئینہ میں ان کے علمی کمالات کی پوری عکاسی ہے، تعلیقات میں احادیث کی تخریج کر کے بتایا ہے کہ مشہور ومتداول احادیث کی کتابوں میں یہ حدیثیں کن کن کتابوں میں ہیں۔ مشکل الفاظ کی شرح کی ہے، سند کے رجال پر روشنی ڈالی ہے، نسخوں کے اختلافات درج کیے ہیں۔

۱۱/فروری ۱۹۶۶ء کے خط میں کہتے ہیں:

''کتاب الزہد پوری چھپ گئی، صرف فہرستیں باقی ہیں، پورا ایک مہینہ گذر گیا اور اب تک نہیں چھپیں، اب میں عنقریب مالیگاؤں آرہا ہوں، امید یہی ہے کہ ۲۰/فروری سے پہلے انشاء اللہ پہنچ جاؤں گا اور اپنے سامنے چھپوا کر آپ کو جتنے نسخے مطلوب ہوں گے آپ کو اور کچھ کچھ نسخے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ مولانا افغانی کے یہاں کتاب الزہد مطبوعہ فرمے بھجوادیئے تھے کہ مختصر سی تقریظ لکھ دیجئے تو لکھا کہ فرصت نکال کر لکھ دوں گا، مگر غالباً اب تک لکھ کر بھیج نہیں سکے، خیال تھا کہ رمضان کے آخر میں کتاب پریس سے نکل آتی تو حجاج کے ہاتھ حرمین روانہ ہوسکتی تھی''۔

کتاب الزہد والرقائق کی اشاعت سے پہلے ہی مولانا کی علمی مشغولیت کا شہرہ ملک کے خاص خاص علمی واشاعتی اداروں تک پہنچ گیا اور وہ مولانا کی علمی خدمت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگے، چنانچہ مجلس علمی ڈابھیل (سورت) کے ارکان نے مصنف عبدالرزاق صنعانیؒ کی تعلیق وتصحیح کا کام بہت

پہلے مولانا کے سپرد کر دیا، جو آپ کی دلی خواہش کے عین مطابق تھا۔ کتاب الزہد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

وما كنت لأتمكن من اختلاس الفرصة لذلك، لانصراف همتي بالكلية إلى تحقيق المصنف للإمام عبدالرزاق بن همام الصنعاني منذ أعوام الخ۔

اس زمانہ میں ہندوستان کے مشہور علمی ادارہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے مولانا سے مدد چاہی، بلکہ مستقل طور سے حیدرآباد میں قیام کی دعوت دی، مولانا نے ۱۴/ رمضان ۱۳۸۶ھ کے خط میں لکھا کہ، حیدرآباد کے متعلق آپ نے جو سنا ہے صحیح ہے۔ ان کے کئی خطوط آئے تو میں نے اتنا لکھ دیا کہ میں جو کام (مصنف عبدالرزاق کا) کر رہا ہوں اس کو مؤخر نہیں کر سکتا، بس اس میں ہی سے یہ وقت نکال کر یا اس سے فاضل وقت میں اکمال (الاکمال لابن ماکولا) وانساب (کتاب الانساب سمعانی) کا کام کروں گا، پھر دوسرے خط میں انھوں نے خواہش کی کہ حیدرآباد ہی آ جایئے، میں نے لکھا، یہ کیونکر ممکن ہے، وہاں آ کر میں مصنف کا کام نہیں کر سکتا، حق المحنۃ کے باب میں وہ یہ نہیں بتاتے کہ معلمی صاحب (شیخ عبدالرحمن معلمی یمانی مصحح دائرۃ المعارف) کو کیا دیتے تھے، ان حالات میں کیا امید ہے کہ میں اکمال وانساب کا کام کر سکوں گا۔

اس کے بعد مولانا نے مجلس علمی ڈابھیل کے علمی کام میں تعاون کو مستقل طور سے پسند فرمایا اور احادیث کی متعدد قدیم و نادر کتابوں کی تصحیح و تعلیق کر کے عالم اسلام کو ممنون فرمایا، اور مصنف عبدالرزاق کے ساتھ مسند حمیدی کو ایڈٹ کیا، جو دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

امام ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی مکی متوفی ۲۱۹ھ ، امام سفیان ابن عیینہ کے شاگرد اور امام بخاری کے استاد ہیں، ان کی مسند ابتدائی مسانید میں شمار ہوتی ہے، اس کے چار قلمی نسخے مولانا کو ملے، ایک دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ سے، دوسرا کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد سے، تیسرا کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے اور چوتھا نسخہ اثنائے طباعت میں کتب خانہ ظاہریہ دمشق سے عکسی فوٹو کے ذریعہ، یہ تمام نسخے مولانا نے ذاتی طور سے حاصل کیے اور مجلس علمی ڈابھیل کے اراکین نے اس کو شائع کیا۔

مسند حمیدی کے بارے میں ۳۰/ جنوری ۱۹۶۲ء کے خط میں مولانا کہتے ہیں کہ:

’’مصنف عبدالرزاق کی تحقیق کا کام میں نے شروع کر دیا ہے، حمیدی کا جزء اول عنقریب شائع ہوگا۔‘‘

مصنف عبدالرزاق جیسی عظیم و ضخیم کتاب کی تحقیق کے ساتھ مولانا نے مسند حمیدی کے بعد سنن سعید بن منصور خراسانی مکی متوفی ۲۲۷ھ کی تحقیق و تعلیق کی خدمت بھی انجام دی، جو ۱۳۸۷ھ (۱۹۶۷ء) میں مجلس علمی کی طرف سے شائع ہوئی، حدیث کی اس قدیم و نادر کتاب کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآبادی مقیم پیرس نے دریافت کیا اور ترکی کے کتب خانہ محمد پاشا کوپریلی سے ان کو اس کا ناقص نسخہ ملا، جو القسم الاول من المجلد الثالث کے عنوان سے شائع ہوا، اس کا مقدمہ بھی ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اور تصحیح و تعلیق کا سارا کام مولانا مرحوم نے انجام دیا ہے، سنن سعید بن منصور کے اس حصہ میں فرائض، وصایا، نکاح، طلاق اور جہاد کے ابواب پر احادیث ہیں۔ مولانا ۲۴/ مارچ ۱۹۶۴ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ ’’سنن سعید بن منصور کا کام ختم ہو گیا، والحمدللہ‘‘۔ پر مغز مقدمہ، فہرست مضامین اور اغلاط نامہ کے علاوہ یہ کتاب ۴۱۰ صفحات میں چھپی ہے، اس کی طباعت میں مشکلات درپیش تھیں، مولانا ۲۴/ رمضان ۱۳۸۷ھ کے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:

’’سنن سعید کی طباعت بالکل بند ہے، دونوں کمپوزیٹر گھر چلے گئے، وکیل صاحب زبردستی اپنے لڑکے سے کام لے رہے ہیں، جو مجھے پسند نہیں ہے، مالیگاؤں کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہ عید سے پہلے بالکل مکمل کر دیں گے۔‘‘

مسند حمیدی اور سنن سعید بن منصور پر میرے مفصل مضامین ’معارف‘ اعظم گڈھ میں اسی زمانہ میں شائع ہوئے تھے اور میری کتاب ’مآثر و معارف‘ میں شامل ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہوا کتاب الزہد والرقائق کی تحقیق کے دور ہی میں مولانا نے مصنف عبدالرزاق صنعانی کی تحقیق شروع فرما دی تھی، اس وقت لکھا کہ اس کے لیے اہل علم کی ایک جماعت ہوتی تو کام بہت آسان ہو جاتا، مگر مولانا نے بڑھاپے اور امراض کے باوجود اپنے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب کو لے کر اتنا عظیم کام انجام دیا ہے جو ایک اکیڈمی کے کرنے کا ہے، یہ کتاب محتاج تعارف نہیں ہے، گیارہ جلدوں میں بیروت سے شاندار طباعت میں مجلس علمی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے، اور اس ٹکر کا دوسرا علمی کارنامہ مصنف ابن ابی شیبہ متوفی ۲۶۲ھ کا ہے، جس کو مولانا نے اپنی حیات کے آخری ایام میں انجام دیا ہے اور ان کی زندگی میں تین یا چار جلدیں مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ سے شائع ہو سکیں، اللہ تعالیٰ بقیہ جلدوں کا جلد انتظام فرمائے۔

یہ کتابیں احادیث کے قدیم ترین ذخیرے ہیں، جو اب تک دست برد

زمانہ سے محفوظ رہ کر مختلف کتب خانوں میں پائی جاتی تھیں اور ان کے نام کتابوں میں دیکھے جاتے تھے، یہ کتابیں درحقیقت بعد کے ائمۂ حدیث اور صحابہ وتابعین اور تبع تابعین کے درمیان ''واسطۃ العقد'' کی حیثیت رکھتی ہیں، اور یہود ونصاریٰ کے اس مزعومہ کا جواب ہیں کہ بعد کے علمائے اسلام نے احادیث اور ان کی سندوں کو وضع کیا ہے، ان سے پہلے احادیث کتابی شکل میں نہیں تھیں، مذکورہ بالا کتابوں کی اشاعت کے بعد ان ہفوات کی کوئی حقیقت نہیں رہ گئی، نیز مولانا مرحوم نے ان احادیث کی تخریج کر کے بتادیا کہ بعد کی کتب احادیث میں یہ حدیثیں کن کن مقامات میں ہیں اور ان کے دوسرے طرق واسناد بھی ہیں، اور ان مذکورہ بالا کتابوں کے مصنفین نے بہت سے مقامات میں احادیث کے متن اور سند اور ان کے مفاہیم ومعانی سے بحث کی ہے، جو بعد کی کتابوں میں نہیں ہیں، ان کے ذریعہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے بہت سے آثار واقوال محفوظ ہو گئے ہیں۔

ان قدیم ترین اور بنیادی کتب احادیث کے علاوہ اس دور میں مولانا نے کئی نادر ونایاب کتب احادیث کی تحقیق فرمائی، جو مختلف اداروں سے شائع ہوئی ہیں، ان میں حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ کی ''المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ'' چار ضخیم جلدوں میں ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں دولت کویت کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ کی طرف سے نہایت شاندار طباعت کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس کتاب کا نصف حصہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں تھا، اور دو مکمل نسخے شیخ محمد سلطان نمنکانی، صاحب المکتبۃ العلمیۃ مدینہ منورہ سے ملے، ان میں ایک سند کے ساتھ تھا، اور دوسرا سند سے خالی تھا، دونوں نسخے ترکی سے حاصل کئے گئے تھے، مولانا نے نسخہ مجردہ عن السند کی تحقیق فرمائی ہے۔

نیز اسی دوران کشف الاستار عن زوائد مسند البزار، ہیثمی ؒ کی تحقیق وتعلیق کی اور ۱۳۹۹ھ میں چار جلدوں میں دمشق سے شائع ہوئی، اسی طرح محدث محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ کی تلخیص خواتم جامع الاصول آپ کی تحقیق سے ۱۳۹۵ھ میں شائع ہوئی۔ ان ہی ایام میں محمد بن طاہر گجراتی پٹنی ؒ کی مجمع بحار الانوار جو حدیث کی لغت کی مشہور وعظیم کتاب ہے، اس کی تحقیق مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مصنف مصباح اللغاتؒ نے مولانا کی زیر نگرانی کی اور مولانا نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کام کو انجام دیا، کہنا چاہئے کہ اس عظیم لغت حدیث کی تحقیق بھی مولانا ہی نے کی ہے، اس دور میں مولانا کے علمی کارناموں میں امام ابن شاہین بغدادی متوفی ۳۸۵ھ کی کتاب الثقات کی تحقیق وتعلیق بھی ہے، اس کتاب کا نادر مخطوطہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں تھا، مولانا کے حکم سے میں نے پوری کتاب نقل کی اور میں نے اور مولانا محمد عثمان صاحبؒ نے مل کر اس کا مقابلہ کیا، اسی زمانہ میں مولانا نے اس کی تحقیق مکمل کر لی تھی، جب شیخ عبدالفتاح ابوغدہ مولانا کے پاس مئو تشریف لائے تو میں نے اس کا تذکرہ کیا اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اصرار کیا کہ میں اس کو ساتھ لے جارہا ہوں تاکہ جلد شائع ہوجائے، مگر مولانا نے کہا کہ کچھ کام باقی ہے، میں بعد میں بھیج دوں گا، افسوس کہ یہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوسکی، مولانا کی ابتدائی دور کی تصانیف میں ''الحاوی لرجال الطحاوی'' بہت مشہور کتاب ہے، جس کے بارے میں ہم لوگ زمانۂ طالب علمی میں سنا کرتے تھے، مگر افسوس کہ یہ کتاب بھی اب تک طبع نہیں ہوسکی ہے، حالانکہ اس کے مواقع فراہم تھے۔

اگر احادیث کی مذکورہ نادر ونایاب اور عظیم کتابوں کا تعارف اور ان کی اشاعت میں حضرت مولانا کی خدمات کا تذکرہ تفصیل سے کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہوجائے گا، اس لیے نہایت اختصار سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ احادیث رسول کے ان نادر ونایاب اور قدیم وعظیم ذخیروں کی اشاعت کے بعد ان میں سے کئی ایک فوٹو کے ذریعہ بیروت میں شائع ہوئے اور پورے عالم عرب اور عالم اسلام کے اہل علم کو ان سے استفادہ کا موقع ملا اور وہ حضرات مولانا کی علم حدیث میں عبقریت سے واقف ہوئے، جس کی وجہ سے مولانا کی شخصیت علم حدیث میں مرجع بن گئی، اور ہندوستان وپاکستان کے اہل علم سے زیادہ ان حضرات نے ان کتابوں اور مولانا کی ذات سے علمی ودینی فائدہ اٹھایا، ہم نے متعدد بار یہ منظر دیکھا کہ مولانا ایام حج میں حرم شریف کے سامنے مدرسہ فخریہ کے چھوٹے سے دفتر میں تشریف رکھتے تھے اور مصر وشام، حجاز اور افریقہ وغیرہ کے اہل علم مولانا کی خدمت میں نیاز مندانہ انداز میں حاضر ہوکر استفادہ کرتے تھے اور قدما کے طریقہ پر ان سے حدیث کی روایت کی سند لیتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ہندوستان میں علم حدیث کے آخری سالارِ قافلہ تھے۔ □□

حواشی:

(۱) مولانا عبدالحفیظ بلیاوی علیہ الرحمہ نے اس کے نقل ومقابلہ کا کام کیا تھا، تعلیقات وحواشی اور تحقیق کی خدمت حضرت محدث الاعظمی ؒ کے ہاتھوں ہی انجام پذیر ہوئی ہے (مسعود الاعظمی)

(۲) مولانا محمد عثمان صاحب ساحرؔ مبارکپوری مراد ہیں۔

حضرت محدّث اعظمیؒ: ایک نادرۂ روزگار شخصیت

عبداللہ عدنان قاسمی خیر آبادی★

محدث جلیل، ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ان نوابغ عصر اور نادرہ روزگار افراد میں سے تھے جن کے وجود سے تنہا کوئی علاقہ یا ملک ہی نہیں، پوری علمی دنیا بلکہ سارا عالم اسلام مستفید ہونے کی وجہ سے ان کے بقا کے لئے دعا گو اور خواہشمند رہا۔ حضرت محدث اعظمیؒ کی ذات والا صفات اسلامی علوم و فنون کی جامع تھی۔ قرآن، تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ غرضیکہ قرآن و حدیث کے تمام متعلقہ علوم وفنون اور اصول ومبادی پر آپ کو گہری اور عمیق بصیرت حاصل تھی۔ آپ کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ علم وعمل، زہد وتقوی اور شریعت وطریقت کے مجمع البحرین تھے۔ علم ومتانت، صورت وسیرت میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ حضرت محدث اعظمیؒ نے ہمہ گیر علمی و تحقیقی، سیاسی وسماجی خدمات انجام دیں۔ ایک طرف علمی، تصنیفی اور مطالعاتی اشغال تھے، تو دوسری طرف وقت کی سیاست وقیادت میں عملی شرکت، ایک طرف اکابر امت، علماء وفضلاء کے ساتھ علمی مشاورت تھی، تو دوسری جانب زمانہ شناس اور نبض آشنائے سیاست کے ساتھ مل کر مقتضائے حال کے مطابق لائحہ عمل کی ترتیب وتہذیب کی فکر تھی، ظاہر ہے جس کا میدان عمل اتنا وسیع ہو، جس کے کام کی جہتیں متنوع ہوں، اس کے متعلقین واحباب، مداح وشیدا بھی بے شمار ہوں گے، حضرت محدث اعظمی کا شہرہ دور طالب علمی سے ہی ہونے لگا تھا، خواہ اس شہرت کی وجہ ان کی قوت حافظہ ہو یا علمی لیاقت و استعداد، مولانا جب مسند درس پر بیٹھے تو ان کے درس کی بھی شہرت ہونے لگی، جب قلم سنبھالا تو قلم گہر بار سے ایسی تصنیفات، تحقیقات وتعلیقات معرض وجود میں آئیں کہ عالم اسلام کے ممتاز محدثین اور محققین حضرت محدث اعظمیؒ کو اجلال واکرام کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

ذہانت وفطانت:

اللہ تبارک وتعالی نے جن بے حساب نعمتوں سے نوازا تھا انھیں میں ذہانت و فطانت تھی۔ حضرت محدث اعظمیؒ کا حافظہ مشہور تھا، اللہ تعالی نے کمال کی یادداشت عطا کی تھی۔ جس کی وجہ سے اپنے معاصرین واقران میں ممتاز خیال کئے جاتے تھے۔ مشکل سے مشکل مسئلہ جس کو ذہین سے ذہین افراد حل کرنے سے قاصر رہتے آپ اپنی ذہانت سے بہت سہل بنا دیتے تھے۔ جامعہ مفتاح العلوم کی مدرسی کے زمانے میں امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کے برادر خورد مولانا عبدالرحیم فاروقیؒ بکثرت مفتاح العلوم مئو آیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ بہت ذہین وفطین تھے، منطق وفلسفہ میں بھی کامل مہارت تھی وہ جب آتے تو طلبہ سے سوالات کرتے، ایک مرتبہ علامہ اعظمیؒ نے (از راہ تلطف) کہا کہ آپ لڑکوں کو پریشان کررہے ہیں؟ مجھ سے پوچھئے۔ انہوں نے کہا کہ بہت اچھا، ایک کتاب ان کے سامنے رکھی اور مشکل مقام نکال کر حضرت محدث اعظمیؒ کے سامنے پڑھا اور کہا کہ آپ اس کی وضاحت اور تشریح کیجئے۔ آپ نے بہت عمدہ وضاحت فرمائی۔ تو مولانا فاروقیؒ نے کہا کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس مقام کی اس سے بہتر تشریح نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد محدث اعظمیؒ کا جواب سنئے۔ انہوں نے کہا میں بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس مقام کو آج تک میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔

اس واقعہ سے حضرت محدث اعظمیؒ کی ذہانت وفطانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بغیر دیکھے ہوئے اس مقام کی بہترین وضاحت اور تشریح فرمائی۔[1]

اسی طرح ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ریڈر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ حضرت محدث اعظمیؒ کے قوت حافظہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ محدث جلیل کا ایک امتیاز یہ بھی تھا وہ نہایت وسیع المطالعہ تھے، مختلف علوم و فنون کی امہات کتب کے علاوہ نوادر مخطوطات سے بھی ان کی واقفیت بے پناہ تھی، ہند و بیرون ہند کے معروف کتب خانوں کے علاوہ مختلف علمی خانوادوں کے ذاتی ذخیروں کی بھی خبر رکھتے تھے، مطبوعات کی طرح اہم مخطوطات کا مطالعہ بھی بالاستیعاب کرتے تھے۔ وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ قدرت نے اس نابغہ روزگار محدث کو متقدمین سا حافظہ ارزانی فرمایا تھا کہ جس فن کی جو تحریر ایک بار نگاہ سے گذر جاتی نقش کالحجر ہوجاتی تھی، قریب رہنے والوں کا مشاہدہ ہے کہ سائلین دیار وامصار سے آتے، اپنی مشکلات و معضلات پیش کرتے، محدث جلیل کسی توقف یا مراجعت کتب کے بغیر فی البدیہہ جواب شافی سے نوازتے، مصنفین اور کتابوں کے نام ہی نہیں، ان

★ خادم التدریس مدرسہ عربیہ بحر العلوم نذیریہ قصبہ منیر ضلع بلیا (یوپی)

کے سنین وفات، سنین اشاعت اور مطابع کے نام بھی بلا مبالغہ ہزارہا کی تعداد میں انھیں محفوظ تھے۔ [۲]

حضرت محدث اعظمیؒ کی ذہانت وفطانت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے جو حضرت مدنیؒ کی وفات پر آپ نے تاریخ وفات نکالی ہے، کسی بات کی طرف ذہن کس تیزی سے منعطف ہوتا تھا، اس کی دلیل کے لئے خود آپ کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں:

آج فجر کی نماز کے بعد تلاوت کر رہا تھا جب فاما الذین آمنوا وعملوا الصلحت فھم فی روضۃ یحبرون پر پہنچا تو یک بیک دل میں آیا کہ شاید فی روضۃ یحبرون سے سال وفات کے اعداد برآمد ہوں، اس خیال کے آتے ہی رکا اور رک کر حروف کے اعداد پر غور کیا تو ٹھیک ۱۳۷۷ھ برآمد ہوئے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ [۳]

استغناء وبے نیازی

حضرت محدث اعظمیؒ میں ایک وصف خاص استغناء و بے نیازی تھا، کبھی بھی آپ نے دنیا اور حطام دنیا کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا آپ اس سے ہمیشہ اعراض کرتے رہے جب کہ آپ اقتصادی اور معاشی طور پر بالکل کمزور تھے۔ مفتاح العلوم کے زمانہ تدریس میں صرف ۴۵ / روپیہ ماہانہ تنخواہ پر اپنا گزربسر کر لیتے تھے جب کہ ملک اور بیرون ملک کے اداروں کی طرف سے بڑی بڑی رقمیں پیش کی گئیں لیکن آپ نے ان کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔

استغناء اور بے نیازی سے متعلق حضرت مولانا افضال الحق صاحب جوہرؔ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ: حضرت مولانا کا اپنے کچے مکان میں بیٹھ کر کام کرنا یقیناً ایک مجبوری تھی کہ وہاں آبائی مکان تھا۔ لیکن ایک دوسری مجبوری اور تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی محل میں جانے کے لئے قطعی طور سے تیار نہیں تھے۔ ایک مرتبہ مدینہ یونیورسٹی میں صدر کا عہدہ خالی ہوا تو جامعہ کی کمیٹی نے متفقہ طور پر طے کیا کہ مولانا اعظمی کو جامعہ کی صدارت کے لئے لایا جائے اور انہیں بیس ہزار ریال مع لوازم رہائش پیش کیا جائے۔ عربوں نے تجویز بڑے شوق سے پاس کی اور حضرت مولانا کی منظوری کے لئے بڑے اہتمام سے بھیجا۔ مگر ان کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ حضرت مولانا نے شکریہ کے ساتھ وہ تجویز واپس کردی اور لکھ دیا کہ مجھے یہیں بیٹھ کر یہ خدمت انجام دینے دیجئے۔ غالباً اس کی اطلاع ان کے گھر والوں کو بھی نہیں ہوئی مگر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے انتہائی حیرت ومسرت سے اور سر بلند کر کے یہ بات مولانا منظور نعمانی کو بتائی اور انھوں نے مجھے یہ کہہ کر اطلاع دی کہ ہندوستان میں ایسے علم کے خادم اور دنیا سے بے تعلق حضرات موجود ہیں اس لئے علم کا بھرم قائم ہے۔ یہ تھی وہ مجبوری جس کی وجہ سے حضرت مولانا نے ساری عمر اپنے گوشہ عافیت میں گذاردی اور بڑے بڑے آدمی کی آمد پر کبھی معذرت نہیں فرمائی کیونکہ اس مرد درویش نے ایسے اہم کام کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ قدس اللہ سرہ العزیز۔ [۴]

حضرت محدث اعظمیؒ نے عظیم الشان علمی کارنامے جس بے نیازی و استغناء اور جذبہ خلوص کے ساتھ انجام دئے وہ بہت ہی تعجب خیز ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک خط کا ٹکڑا پڑھ لیجئے جو حیات ابوالمآثر میں درج ہے:

یہ خط ۲۱ / ستمبر ۱۹۶۷ء مطابق ۱۵ / جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ کو مولانا ابراہیم میاں افریقی کے نام لکھا گیا ہے۔

''آپ نے اپنے عنایت نامہ میں میری مشکلات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مشکلات کی تفصیل لکھنا علم کے نام کو بٹہ لگانا ہے''۔ [۵]

پھر آگے اس خط کی وضاحت میں اور حضرت محدث اعظمیؒ کی بے نیازی اور دنیا سے اعراض کے سلسلے میں ہے کہ یہ واقعات قرون اولی کے محدثین وحفاظ کی یاد تازہ کردیتے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ آپ کا شمار ان نفوس قدسیہ میں کیا جائے گا جن کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ

یہ دونوں واقعہ حضرت محدث اعظمیؒ کے استغناء وبے نیازی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور بھی اس قسم کے واقعات ہیں جو حیات ابوالمآثر میں تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔ فمن شاء فلیرجع [۶]

وعظ وتقریر:

حضرت محدث اعظمیؒ جس طرح درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تحقیق و تعلیق میں غیر معمولی ید طولی رکھتے تھے اسی طرح قدرت نے وعظ وتقریر کا بھی ملکہ ودیعت کیا تھا، آپ کا ہر وعظ جامع اور مؤثر ہوا کرتا تھا۔ آپ کی تقریروں میں شعلہ بیانی نہیں ہوتی تھی۔ آپ کا وعظ نہایت سادہ، سہل، عام فہم اور تاثیر سے بھرپور ہوا کرتا تھا۔ آپ کے وعظ کو سننے کے لئے لوگ دور دراز سے آیا کرتے تھے اور سن کر ان پر عجیب سی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر آپ کا خاص وصف تھا جس طرح آپ عبادات، فرائض و واجبات اور احکام شریعت پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے تھے، اسی طرح منکرات، بدعات وغیرہ پر بلا جھجک نکیر کرتے تھے۔ خلاف

شریعت امور پر نا گواری اور نکیر کی ایک مثال بیان کر دینا کافی ہے۔مولانا محمد عثمان معروفیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

صحن احیاء العلوم میں اجلاس تھا،اسٹیج کے پیچھے دیوار پر دو خوبصورت بنارسی ساڑیاں لگی ہوئی تھیں حضرت نے ابتدا میں اس پر نکیر کی اور فرمایا کہ یہ زیبائش وآرائش کیا اسراف میں داخل نہیں ہے؟ ۷

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر حضرت نے زندگی بھر بے جھجک اور بےلوث عمل کیا۔خلاف شرع امور کو بالکل برداشت نہیں کیا۔معاشرے کے اندر کسی غیر شرعی کام اور رسم ورواج کو دیکھ کر یا سن کر خاموش رہنا آپ کے لئے گوارہ نہیں تھا۔حضرت محدث اعظمیؒ کے بیانات حشو وزوائد سے پاک، خالص قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی تشریحات اور امت کے عملی، اخلاقی اور روحانی امراض کی تشخیص اور ان کے علاج پر مشتمل ہوتے تھے۔ستائش اور صلہ سے بے نیاز ہو کر حق بات کہتے تھے۔ایک وعظ کے اختتام پر خود فرماتے ہیں کہ:

''مجھ کو ایسا وعظ کہنا نہیں آتا کہ میں وعظ کہوں،لوگ کہیں کہ بہت اچھی تقریر کی،خوب دلچسپ وعظ کہا، مجھ کو دلچسپ وعظ نہیں کہنا ہے، مجھ کو تو وہ وعظ کہنا ہے جس سے ہماری تمھاری زندگی بنے، اور آخرت میں پوری پوری نجات ہم کو مل جائے،اللہ رب العزت راضی ہو جائے، چاہے میرا وعظ تم کو پسند ہو یا ناپسند ہو،اس کی پرواہ نہیں،مگر میں تم کو اس راہ پر لے چلنا چاہتا ہوں جس راہ میں سلامتی ہو،عذاب الٰہی سے بچاؤ ہو،جس میں اللہ رب العزت کی خوشنودی ہو،اس طریقہ کے او پر روزہ رکھو، اس طریقہ پر نماز پڑھو اور اس طریقہ پر ہمارے تمھارے معاملات ہوں، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے''۔ آمین۔ ۸

حضرت محدث اعظمیؒ کی تقریریں عالمانہ،محققانہ اور سادگی سے مزین ہوا کرتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں ان کے مواعظ سننے کے لئے آیا کرتے تھے اور مستفید ہوا کرتے تھے۔

حضرت محدث اعظمیؒ کے خطبات جو میسر ہوئے اس کو حضرتؒ کے نواسے مولانا ڈاکٹر مسعود صاحب اعظمی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے مرتب کیا اور ''خطبات ابوالمآثر'' کے نام سے طبع کرا کر شائع کیا اور عوام وخواص تک پہونچایا، یہ ایک بہت ہی مبارک اور قابل قدر کوشش ہے، یہ حضرت محدث اعظمیؒ کے علوم ومعارف کے احیاء اور نشر واشاعت کا ایک اہم کارنامہ ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ اس عظیم کاوش کو قبول فرمائے، آمین۔

عظمت شان

حضرت محدث اعظمیؒ ان ہستیوں میں سے تھے جو آسمان علم کا بدر کامل بن کر چمکے،ان کی عظمت سب کے قلوب پر چھائی رہی۔ہر ایک کو ان کے علم کی بلندی کا اعتراف رہا،وہ کم گو ضرور تھے لیکن ان کا شہرہ اور چرچا شہر در شہر تھا،وہ اپنے کو ہمیشہ چھپا کر رہے مگر خدا نے ان کو ظاہر کر دیا۔ان کو بیشتر علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل تھی،لیکن خصوصیت سے علم حدیث اور فن اسماء الرجال،اس میں اللہ نے ایسی مہارت عطا فرمائی تھی کہ دور حاضر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔لیکن ان کی سادگی اور خلوت گزینی کی وجہ سے انہیں دیکھ کر پہچاننا مشکل تھا کہ یہی دنیا کا عظیم محدث ہے۔حضرت مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمیؒ ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ:

''مکہ مکرمہ کا نوخیز عالم دہلی میں مجھ سے ملا اور حضرت مولانا کے بارے میں پوچھنے لگا،تو میں نے ان سے پوچھا کہ وہ تو اعظم گڈھ کے ہیں (اس وقت اعظم گڈھ ضلع تھا بعد میں مئو ضلع بنا)تم مکہ کے لوگ انہیں کیسے جانتے ہو،اس مکی عالم نے کہا کہ ہم ان کو اس طرح جانتے ہیں جیسے اپنے باپ اور دادا کو جانتے ہیں، پھر اس نے کہا کہ میں مئو جا کر حضرت علامہ اعظمی سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں،ضرور جاؤں گا۔

اسی طرح حضرت مولانا ایک مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے،فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد صاحبؒ بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے شیخ عرب علامہ ابن باز کی زیارت کا وقت مانگا اور وہ مقرر ہو گیا،جانے لگے تو حضرت مولانا کے پاس آئے اور علامہ(ابن باز) کے پاس چلنے کے لئے کہا، حضرت مولانا تیار ہو گئے، وہاں پہنچے تو حسب معمول ہر شخص نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا کیونکہ ابن باز نابینا محدث تھے ان کے یہاں ہر شخص کو اپنا نام اور مختصر تعارف کرانا ہوتا ہے، جب کئی آدمی اپنا اپنا تعارف کرا چکے تو آخری نمبر حضرت مولانا کا تھا،مولانا نے فرمایا انا حبیب الرحمٰن الاعظمی من الهند تو شیخ عرب اٹھ کھڑے ہو گئے حضرت مولانا سے معانقہ فرمایا اور معذرت کی کہ آپ نے یہاں آ کر مجھے شرمندہ کیا مجھے معلوم ہوتا تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا،پھر اپنی مسند پر مولانا کو بٹھا کر انہوں نے سکون پایا۔ ۹

یہ تھی حضرت محدث اعظمیؒ کی عظمت کہ اپنے وقت کا عظیم محدث نام سنتے ہی کھڑا ہو گیا اور اپنی مسند پر بیٹھایا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ حضرت محدث اعظمیؒ کی وفات پر

فرماتے ہیں کہ علامہ کی وفات سے جو عظیم علمی خسارہ ہوا ہے اور خلا پیدا ہوا ہے اس کا احساس بہت سے لوگوں سے زیادہ اس عاجز کو ہے ۔مولانا مزید فرماتے ہیں کہ اس علمی تفرد وامتیاز کے علاوہ مولانا کے اخلاق، فہم وفراست ،ملت کے مسائل و مفادات سے واقفیت وفکر مزید برآں ہے، اس لئے نہ صرف علمی حلقہ میں ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے ، بلکہ ملت کے صف قیادت میں بھی ایک بڑی جگہ خالی ہوگئی ہے جس کا پر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے (۱۰) ۔[۱۰]

اسی طرح علمی ودینی حلقے اور اہل علم حضرت محدث اعظمیؒ کے مقام و مرتبہ اور عظمت شان کے معترف تھے جن میں ملک اور بیرون ملک کے علماء کی اچھی خاصی تعداد ہے، ان میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ،علامہ سید سلیمان ندویؒ ،مولانا عبدالشکور فاروقیؒ ، مولانا ابوالوفا صاحب ،علامہ شیخ محمد زاہد کوثری قاہرہ، شیخ احمد شاکر قاہرہ جیسے اساطین علم اور مشاہیر امت کے نام ملتے ہیں۔

گوشہ نشینی:

حضرت محدث اعظمیؒ خلوت گزینی اور گوشہ نشینی پسند کرتے تھے اور اسی گوشہ نشینی میں تحقیق وتعلیق کا ایسا شاہکار کارنامہ انجام دیا کہ دنیا صدیوں حیرت کریگی ،اور ایسی نظیر پیش کرنا اس عہد میں بہت مشکل ہے ۔حضرت مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمیؒ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اور حیرت اس وجہ سے اور بڑھتی جائے گی کہ یہ کارنامہ کسی جامعہ، کسی دارالعلوم یا کسی عالمی لائبریری میں بیٹھ کر نہیں انجام دیا ہے بلکہ ایک غیر معروف قصبے میں ایک ایسے کمرے میں بیٹھ کر انجام دیا ہے جس پر آج بھی کھپریل پڑا ہوا ہے، جہاں سے آج بھی موٹر نہیں گذر سکتا مگر وہاں ہوائی جہاز سے آنے والے پہنچے اور دیکھا کہ ایک معمولی جثہ کا انسان بیٹھا ہوا ہے جس کے اردگرد فن حدیث ،فن رجال، فن لغت اور ادب کی سیکڑوں کتابوں کا ہجوم ہے اور وہ اس میں اس قدر گم ہے کہ بڑا سے بڑا شخص آجائے تو اسے سر اٹھانے کی مہلت نہیں ہے۔ اس کی دولت اس کا قلم ہے ،اس کا آرام اس کا فن ہے ، اس کی شخصیت اس کے وہ مسودات ہیں جو بیروت ، بغداد ،دمشق ، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پہنچ گئے تو لوگوں نے قلم چوم لئے یا دم بخود رہ گئے ۔ اس لئے کہ حضرت مولانا نے ایک عظیم مقصد کو اپنا موضوع زندگی بنایا پھر اس کے حاصل کرنے کے لئے موزوں مقام گوشہ تنہائی کو قرار دے کر اس میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے اور دور ونزدیک کسی لالچ، تمنا اور جاہ طلبی کو پھٹکنے نہیں دیا اور یہی ان کے اخلاص، حسن نیت اور بلندی کردار کی سب سے بڑی دلیل ہے جس نے ان کی شخصیت کے چند پتھروں کو تراش کر تاج محل کھڑا کر دیا۔[۱۱]

حضرت مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ حضرت محدث اعظمیؒ نے لوگوں سے ملنے جلنے کے لئے کچھ مخصوص اوقات متعین کئے تھے ،اس لئے کہ آدمیوں کی آمدورفت ، بات چیت اور گفتگو ذہنی انتشار کا سبب تھی اس لئے مولانا موصوف سے ہمہ وقت ملاقات مشکل تھی ۔ اسی یکسوئی اور گوشہ تنہائی کا یہ فیض ہے کہ گیارہ ضخیم جلدوں کی مصنف عبدالرزاق کے علاوہ اکثر چار جلدوں اور دو جلدوں پر مشتمل قدیم ترین مصنفین کی کتابیں تحقیق وتعلیق کے بعد شائع ہوئیں، ان میں سے بعض کتابوں پر کئی کئی سال مسلسل صرف ہوئے ، بالخصوص مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ برسہا برس کی شبانہ روز کی دماغ سوزی کے بعد علمی دنیا کے سامنے آئیں اور ان سے دوسروں کے لئے استفادہ کی راہیں کھلیں اگر ان مصروفیتوں میں کوئی دخل انداز ہوتا تو آپ اس سے سخت کبیدگی محسوس فرماتے ، کبھی کبھی آپ کا رویہ بھی سخت ہوجاتا لیکن تضیع اوقات منظور نہیں تھی۔[۱۲]

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ علم کی جس رفعت و بلندی تک پہنچے اس میں زیادہ حصہ ان کی ذاتی کوششوں ،شبانہ روز محنتوں کا تھا، دنیا اور متاع دنیا نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا،لیکن وہ اس سے اعراض کرتے رہے اور بالکل یکسوئی اور تنہائی اختیار کرتے رہے ، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے ، جن کو ایک اکیڈمی بھی اپنے وسائل وذرائع کے باوجود بمشکل انجام دے سکتی ہے۔

دنیا نے سبز باغ دکھائے بہت مگر
وہ اپنی راہ پر ہی سدا گامزن رہا

طرز تدریس

حضرت محدث اعظمیؒ کو جب ۱۳۴۰ھ میں باقاعدہ فراغت حاصل ہوئی تو آپ نے درس وتدریس کا آغاز کیا اور اخیر عمر تک تدریس سے رشتہ نہیں توڑا۔ ۱۳۴۰ھ سے ۱۴۱۲ھ تک تقریبا ستر سال آپ مسند درس پر متمکن رہے اور اس درمیان بڑی تعداد نے حضرت محدث اعظمیؒ سے استفادہ کیا جن کا احاطہ ناممکن ہے ۔ آپ کا طریقہ درس نرالہ اور جداگانہ تھا ،عبارت اور ترجمہ طلبہ خود حل کرتے اور حضرت اس عبارت کی وضاحت فرماتے ۔ ایک ایک حرف، ایک ایک حرکت کے صحیح تلفظ کی ادائیگی پر دھیان دیتے گویا کہ عبارت پڑھنے والا ہر ایک چیز پر نظر رکھ کر عبارت پڑھتا اس لئے کہ اعراب

اور ترجمہ کی غلطی بالکل برداشت نہیں کرتے تھے۔ حیات ابوالمآثر جلد اول صفحہ ۴۹۰/۴۹۱ پر حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ عبارت خوانی ان کے درس میں لوہے کا چنا چبانے سے کم نہیں، کیا مجال کہ کوئی طالب علم ایک زیر زبر کی غلطی کر کے نکل جائے۔ اسی طرح ترجمہ میں بھی غلطی برداشت نہیں کرتے تھے، جہاں غلطی ہوئی مولانا کی طرف سے ہوں کی آواز آئی، اگر عبارت ٹھیک ہوگئی تو کچھ نہیں فرماتے، مگر ہوں کے بعد بھی غلطی ٹھیک نہیں ہوئی تو مولانا کی چھڑی اٹھ جاتی اور ساتھ ساتھ نحوی وصرفی ترکیب کے سوالات شروع ہوجاتے، طالب علم پر کپکپی طاری ہوجاتی، اسی وجہ سے جس کو عبارت پڑھنا ہوتا وہ دو چار کتابوں کی مدد سے سارے مسائل حل کر کے جاتا تھا۔

افراد سازی اور رجال سازی

حضرت محدث اعظمیؒ افراد کو بنانے اور ان میں نکھار پیدا فرمانے کا بڑا خیال فرماتے تھے جس میں جو صلاحیت اور ذوق دیکھتے اس میں نکھار پیدا فرماتے اور مہمیز لگاتے رہتے اور ان کے اندر خود اعتمادی کی روح پھونکتے، خصوصاً اپنے طلبہ بڑی محنت فرماتے اور اس کوشش میں لگے رہتے کہ یہ رجال کار بن جائیں۔ اسی طرح نظام تعلیم اور طریقہ تدریس پر بھی خوب توجہ فرماتے اور دوسرے حضرات کو بھی مفید مشورہ سے نوازتے رہتے اور دعائیں دیتے رہتے۔ ایک خط میں اپنے شاگرد مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ کو ۲۸/جنوری ۱۹۴۶ء مطابق ۲۳/محرم ۱۳۶۵ھ میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم یکسوئی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہو، محنت کا یہی وقت ہے اور اس وقت کی محنت بہت کام آئے گی''۔[۱۳]

ایک اور خط ۱۳/صفر ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۴/نومبر ۱۹۵۱ء میں لکھتے ہیں کہ:

''میرے خیال میں آج کل ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے جس سے عربی خواں طلبہ میں دینی جوش، اور علم وتحقیق کا ولولہ پیدا ہو، کچھ نہیں تو عربی زبان میں مہارت اور اس پر قدرت حاصل کرنے کا جذبہ ابھرے، غور سے دیکھو کہ ہمارے مدارس کی پیداوار اب کیا اور کتنی رہ گئی ہے''۔[۱۴]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں جو یکم محرم ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۳/اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لکھا ہے کہ:

''دارالعلوم میں تمہارا مضمون پڑھا جی خوش ہوا، زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہو، کام میں لگے رہنا ان شاء اللہ رائیگاں نہیں جائے گا''۔[۱۵]

یہ چند مثالیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محدث اعظمیؒ کو کس قدر فکر رہا کرتی تھی کہ وہ اپنے شاگردوں کو ہونہار اور با استعداد طالب علم دیکھیں اور ان میں علم وتحقیق کا ولولہ پیدا ہو۔

بحیثیت محدث

حضرت محدث اعظمیؒ کے حدیث سے شغف اور رجال ورواۃ سے دلچسپی بلکہ اس راہ میں عظیم خدمات نے اسلاف کے تابناک دور کی یاد تازہ کر دی ہے کہ عرب وعجم سب ان کی علمی، دینی، تعلیمی، تحقیقی اور رجال حدیث کی خدمات پر سرنگوں اور معترف ہیں۔ حضرت مولانا حنیف صاحب ملی رقمطراز ہیں کہ:

''دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا ظہیر الدین شوق نیموی کے بعد مولانا نے اس بساط جرح و تعدیل اور تحقیق وجستجو کو اپنی فراست سے اس سلیقہ سے آراستہ کیا ہے کہ جس پر دارالعلوم دیوبند ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔ ہندوستان اگرچہ حدیث کی خدمت میں بغداد وعراق کے علمی سقوط کے بعد سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے تاہم جن بزرگوں نے خون جگر دے کر اسے سینچا اور اس مقدس علم کو آسمان ہفتم تک پہنچایا، ان میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا نام سرفہرست ہے۔ اس فکر ونظر اور تحقیق وجستجو کے کاوش طلب میدان میں مولانا نے اس بے سروسامانی کے باوجود ملت کو جو عظیم سرمایہ عطا کیا اسے جانبداری کی حد بندیوں سے بالاتر ہوکر تسلیم کر لینا اور مولانا کے حدیثی تبرکات کو عملاً اپنانا ہی ان کی عظیم خدمات کا سب سے زیادہ مؤثر اور انمول اعتراف ہوگا۔[۱۶]

حضرت محدث اعظمیؒ کو عشق رسول کی شوریدگی اور مستی نے وہ جلا اور روحانی بالیدگی عطا کی کہ آپ کے زندگی کی ایک ایک ساعت اور ایک ایک لمحہ احادیث رسول کی تحقیق وتفتیش سے اس طرح مربوط نظر آتا ہے کہ: ع

سانسوں کی آمد وشد وقف حدیث پاک تھی

اسی طرح سابق شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، جن کے علم کی بلندی اور فضل وکمال سے جہان علم وفن بخوبی واقف ہے، مصر کے علماء میں ان کو امتیازی شان حاصل تھی، ان کے یہاں شریعت وطریقت کا حسین امتزاج دکھتا ہے، شیخ الازہر کے عظیم منصب پر بھی فائز رہے۔ مولانا اعظمیؒ کے علم کے معترف اور مداح تھے۔

حج کا موسم تھا، شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور عالم اسلام سے بہت سے علماء حج اور زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ مصر، سعودیہ، ہندو پاک کے علماء کے ایک مجمع میں جس میں علامہ محمود حسنین مخلوف، علامہ اعظمی، علامہ

سید ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا منظور نعمانی بھی موجود تھے شیخ الازہر نے علماء کے اس مجمع میں حدیث شریف اور فن رجال میں مولانا اعظمی کے مقام بلند کا تذکر وکرتے ہوئے مولانا کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

انی اشھد انه اذا کان فی العالم کله من یستحق ان یلقب بالمحدث الاعظم فھذا ھو

میں شہادت دیتا ہوں کہ پوری دنیا میں محدث اعظم کے لقب کا اگر کوئی مستحق ہے تو یہ شخص ہے۔

اسی طرح شیخ حسنین ذہبی وزیر اوقاف مصر نے ڈابھیل کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا اعظمی کے بارے میں کہا۔

اعتقد انه لیس لهمثیل فی علم الحدیث فی کافة الھند

میرا خیال ہے کہ علم حدیث میں پورے ہندوستان میں ان کی کوئی نظیر نہیں۔

شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اس مجلس میں موجود تھے، فوراً ٹوکتے ہوئے اضافہ فرمایا: **بل فی الدنیا کلھا فیما نعلم** (بلکہ ہمارے علم کے مطابق پوری دنیا میں ان کی کوئی مثال نہیں ہے۔[۱۷]

اسی طرح شیخ محمود شاکر، شیخ ناصر الدین البانی، شیخ علوی بن عباس مالکی، شیخ عبداللہ زمزمی مالکی، شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، شیخ سید یوسف ہاشم الرفاعی، شیخ شعیب الارناؤوط، شیخ عابد الفاسی الفہری، ڈاکٹر محمود طحان، شیخ محمد عوامہ، خیر رمضان یوسف، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالغفار عراقی مئوی، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، شیخ الاسلا مولانا حسین احمد مدنی، مولانا یوسف بنوری، مولانا ابوالوفاء افغانی، مولانا عبدالشکور فاروقی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی، قاضی اطہر مبارکپوری اور ان کے علاوہ ارباب نظر اور اصحاب فضل نے حضرت محدث اعظمیؒ کے علمی کارنامے اور حدیثی خدمات کے معترف اور مداح تھے۔

دیگر کمالات

حضرت محدث اعظمیؒ بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم مناظر بھی تھے، رضاخانی اور غیر مقلد علماء سے بارہا مناظرے کی نوبت آئی مگر آپ ہی فاتح اور کامیاب ہوئے۔ آپ ایک جلیل القدر، مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، مناظر، مبلغ، خطیب، محقق، مؤلف اور مصنف تھے۔ تدریس کی زمانے میں اور بعد میں بھی برابر تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے، علمی خدمات پر آپ کو حکومت ہند نے ایوارڈ اور اعزازی انعام دیا۔

حرف آخر

حضرت محدث اعظمیؒ کو اللہ تبارک وتعالی نے بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا جن کے بارے میں لکھنے والوں نے اپنی تحریروں میں اس کا اعتراف کیا اور بیان کرنے والوں نے تعزیتی جلسوں اور پیغاموں میں کہا اور آئندہ بھی ان کا ذکر خیر چھیڑ کر خوشبو پھیلائیں گے۔ درحقیقت آپ نے اپنی زندگی کو دین کی سربلندی، علم دین کی نشر واشاعت، مختلف شعبہائے دین کے رجال کار تیار کرنے کے لئے وقف کردی تھی۔ خدمت دین کے ہر شعبہ اور میدان میں لاکھوں نہیں، بلکہ کروڑہا متوالے ان کی تصنیفات اور تحقیقات وتعلیقات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔

حواشی

(۱) حیات ابوالمآثر ج۱ ص۴۷۸
(۲) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور ان کی علمی خدمات: ص۳۹/۴۰
(۳) حیات ابوالمآثر ج۱ ص۴۷۹
(۴) بزم کہن، ص ۱۳۳-۱۳۴
(۵) ایضاً، ص: ۴۶۷
(۶) خطبات ابوالمآثر ص۹۶
(۷) ص: ۴۶۷
(۸) ترجمان دارالعلوم ص ۲۰، ۱۹۹۶ء حیات ابوالمآثر ج ۱ ص ۷۹۴ بحوالہ خطبات ابوالمآثر ص ۱۸
(۹) خطبات ابوالمآثر ص: ۹۶
(۱۰) بزم کہن، ص: ۱۳۲
(۱۱) ترجمان الاسلام ۱۹۹۲ء ص ۲۰
(۱۲) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ۱۹۹۲ء ص ۱۶۷، (۱۲) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ۱۹۹۲ھ ص ۱۰
(۱۳) مشاہیر علمائے ہند کے علمی مراسلے ص ۱۴۸
(۱۴) مشاہیر علمائے ہند کے علمی مراسلے ص: ۱۵۰
(۱۵) ایضاً، ص ۱۵۰
(۱۶) ایضا، (۱۷) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ۱۹۹۲ھ ص ۲۱۶
(۱۸) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور ان کی علمی خدمات، ص: ۴۷۳۔

□□

منظوم خراجِ عقیدت

بہ یادِ عالم بے بدل، محدث جلیل
علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہٗ

پروفیسر حفیظؔ بنارسی

میں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز مئو ناتھ بھنجن سے کیا تھا اور عمر عزیز کا ایک قیمتی سال ۷ رجولائی ۱۹۵۶ء تا ۳۱ر اگست ۱۹۵۷ء وہیں گذارا ہے، کئی مواقع ایسے آئے کہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف ملا، ان کی دی ہوئی سند توصیف ابھی میرے پاس محفوظ ہے، علم کا بحر زخار تھے، ان کے اندر سمندر کی گہرائی تھی، کم گو، وضع قطع فقیرانہ، تاجدار علم وفن ایسے ہی ہوتے ہیں:

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

علم حدیث پاک کا دیوانہ چل بسا
جس کا ہر اک سخن تھا حکیمانہ چل بسا

محفل میں اب وہ گرمیٔ محفل نہیں رہی
نازاں تھی جس پہ شمع وہ پروانہ چل بسا

دشتِ عجم سے تا بہ عرب جس کی دھوم تھی
وہ اعتبارِ گلشن و ویرانہ چل بسا

عرفان وآگہی کا پیامی نہیں رہا
رقصاں تھا جس سے علم کا پیمانہ چل بسا

جس کی ہر اک نظر میں بھری تھی مئے طہور
واحسرتا، وہ پیرِ قدح خانہ چل بسا

شاہنشہِ علوم، فقیہ گہر فشاں
دنیا کی انجمن سے فقیرانہ چل بسا

ساغر اُداس اُداس ہیں، پیمانے سرنگوں
وجہِ فروغِ محفلِ رندانہ چل بسا

تھا افتخارِ عالمِ اسلام جو حفیظؔ
سوئے جناں وہ دین کا دیوانہ چل بسا

سرشکِ غم

بیادِ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نور اللہ مرقدہ

مولانا مجیب الغفار اسعدؔ اعظمی

بزمِ آثار وسنن کے آہ وہ صدر الصدور! — حضرتِ اقدس، محدث، صاحب طبعِ غیور

آہ استاذی حبیب الاعظمی بالغ نظر — بوالمآثر وہ امامِ ناقدانِ ذی شعور

ان کی رحلت سے ہوئے ہیں سب یتیم بے نوا — ہے سبھی کا شیشۂ دل صدمۂ فرقت سے چور

صدمۂ جانکاہ سے ہے سارا عالم سوگوار — مکتبے گریاں، کتابیں، حاشیے، بین السطور

غم کی تاریکی میں ہے سارا جہاں ڈوبا ہوا — ہر نظر کے سامنے ہے ظلمتِ غم کا وفور

ماہرِ علمِ حدیثِ مصطفیٰ رخصت ہوئے — تشنگانِ علم جائیں یا خدا کس کے حضور

یوں ہزاروں میکدے ہیں پر کہاں پائیں گے ہم — ساقیا تیری شرابِ کہنہ کا کیف و سرور

مل سکا ان کا کوئی ثانی نہ شانِ علم میں — لوگ دوڑاتے رہے اپنی نگاہیں دور دور

وہ بخاریٔ زمن تھے وقت کے ابن حجر — فنِ اسماء پر انھیں لاریب تھا کامل عبور

اللہ ان کے رخ کی تازگی مرنے کے بعد — زندگی سے بھی فزوں تھا ان کی پیشانی کا نور

زندۂ جاوید ہیں وہ اپنی تصنیفات میں — گرچہ ظاہر میں ہوئے ہیں آج مِن اہل القبور

اے خدا ٹھنڈی رہے تربت ہمارے شیخ کی — جنت الفردوس میں ان کو ملیں حور و قصور

عمر اقدس ہے ''محامد'' اسعدؔ محزون لکھ
ابتدا ''اختر حسن'' ہے خاتمہ ''وصل غفور''

□□

اِک آسمان تھا کہ جسے کھا گئی زمیں

امیرؔ الاعظمی

وہ امیرِ ہند، علمِ دین کا روشن منار وہ چراغِ راہ ہستی، وہ فقیہِ روزگار
کشورِ دانش، دیارِ آگہی کا شہر یار وہ خطیبِ عصر، اقلیمِ سخن کا تاجدار
قبر کی آغوش میں وہ کون محوِ خواب ہے
آسمانِ علم کا اک مہرِ عالم تاب ہے

اس کے قدموں پر نچھاور وقت کے شاہوں کا تاج اس نے پایا دشمنوں سے بھی عقیدت کا خراج
شان وشوکت کا ہے اس کی معترف سارا جہاں کیا مسلماں اور ہندو، رو کے سب کہتے ہیں آج
تاجدارِ علم وفن بے سیم وزر رخصت ہوا
آہ وہ عیسیٰ نفس، وہ چارہ گر رخصت ہوا

ساقیٔ دیرینۂ میخانۂ قال الرسول زمزمہ سنجِ حدیث ونکتہ آرائے اصول
گلشنِ اسلام کا وہ عندلیبِ خوشنوا جسکے منہ سے موعظت کے ہر نفس جھڑتے تھے پھول
کھو گیا وہ گوہرِ نایاب، مردِ بے مثال
ختم جس کی ذات پر ہے فن اسماء الرجال

ہمدمِ سینہ فگاراں، ہمنوائے بسملاں چارہ سازِ درد منداں، مرہمِ خستہ دلاں
ہادمِ ایوانِ باطل، پاسبانِ قصرِ حق سربراہِ اہلِ عرفاں، سرگروہِ عاقلاں
اُسوۂ اسلاف، فقہِ بوحنیفہ کا امیں
حق تو ہے کہئے اسے، احناف کا حصنِ حصیں

تھا وہ یکتائے جہاں تاریخ میں تفسیر میں اس کا ثانی تھا نہ کوئی وعظ میں تقریر میں
قابلِ صد آفریں تھا اس کا کلکِ زر نگار تھا وہ مشہورِ زمانہ خوبیٔ تحریر میں
برگِ آوارہ کو چن چن کے گلستاں کر گیا
گوہر الفاظ سے کاغذ کا دامن بھر گیا

اس کی تالیفات ہیں موسوم کتنے نام سے کر چکیں حاصل خراجِ داد، خاص و عام سے
عبد رزاق[1] المطالب[2] اور شیبہ[3] درکنار حق کو واضح کردیا رکعات[4] اور اعلام[5] سے
اس نے جو کچھ لکھ دیا وہ حرفِ آخر ہوگیا
زندۂ جاوید نامِ بوالمآثر ہوگیا

ذات سے اس کی، دوبالا ہوگئی شانِ عجم اس کی عظمت کے عرب والوں نے چومے ہیں قدم
اپنی آنکھوں میں جگہ دی ہے سلیماں[6] نے جسے تھا نگاہِ تھانوی[7] میں جو عزیز ومحترم
ہے دعا گو اس کے حق میں یہ امیرؔ خاکسار
اس کے مرقد پر ہو نازل، رحمتِ پروردگار

۱۔ مصنف عبدالرزاق ۲۔ المطالب العالیہ ۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ ۴۔ رکعات تراویح ۵۔ اعلام مرفوعہ ۶۔ سید سلیمان ندویؒ ۷۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

ذکرِ حبیب

مولانا عطاء الرحمن عطاؔ مفتاحی

نبی کے پیارے حبیب داور حبیب رحمٰن اعظمی تھے
حقیقتاً وارث پیمبر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

امام فنِ حدیث وقرآں، حدیقۂ مصطفی کے نگراں
سراپا حقانیت کے پیکر حبیب رحمٰن عظمی تھے

حدیث رگ رگ میں جنکی پنہاں، حدیث ہی جنکا دین وایماں
حدیث ہی جن کا تکیہ بستر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

درود ہر دم لبوں پہ جاری اسی میں گزری ہے عمر ساری
فدائے ذات رسول انورؐ حبیب رحمٰن اعظمی تھے

غزالیؔ وبیہقیؔ دوراں، تھے باغ نعمانؔ کے نگہباں
کہ بحر تحقیق کے شناور حبیب رحمٰن اعظمی تھے

عقیدتوں کا خراج دے کر گئے ہیں خود جن کو شیخ ازہرؔ
ائمہ فن کے ایسے محور حبیب رحمٰن اعظمی تھے

یہ شیخ بو غدہؔ شیخ ایمنؔ یہ بادہ نوشانِ حکمت وفن
گئے ہیں جنکے یہاں سے پی کر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

وہ ساقئ جام مصطفی تھے، وہ چشمۂ فیض باخدا تھے
ہجوم پیاسوں کا جن کے در پر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

وہ بزم رشد وہدیٰ کی زینت، وہ شیخ کامل شہ طریقت
تکہ رہبرانِ ہُدیٰ کے رہبر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

کتابؔ زہد ومصنّفینؔ ومطالبؔ ومسند حمیدیؔ
ہے جن کی تعلیق ان کتب پر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

سعید منصور کی سننؔ ہو یا کشفؔ استار علم وفن ہو
بکھیرے ہیں جس نے ان پہ گوہر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

لکھی گئیں شرحیں برطحاویؔ ہے آپ کی شرح سب پہ حاویؔ
نگار علمی کے آئینہ گر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

ادائے فقران کو ایسی بھائی، نہ سوئے دولت نظر اٹھائی
غنا وصبر ورضا کے خوگر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

محقق بے مثال کہیے، محدث باکمال کہیے
مفسر وحئ ربّ اکبر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

نہ پوچھئے بس مقام ان کا عطاؔ ہے ادنیٰ غلام ان کا
سپہر عظمت کے مہر انور حبیب رحمٰن اعظمی تھے

آہ! امیر الہندؒ

ابوالمآثر محدث کبیر علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ

منشی عبداللہ منظرؔ

نائبِ مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو، چل سنبھل کے اے قلم

میکشوں کے ہے لبوں پر العطش اور الاماں
بوالمآثر محفلِ اسلام کے پیرِ مغاں
چار سو ہے شورِ ماتم ہر طرف شورِ فغاں
ہے عجب ہنگامہ آرائی کا عالم اب یہاں
بزم علم دیں کا گویا لٹ گیا جاہ وحشم

نائبِ مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو، چل سنبھل کے اے قلم

اے وقارِ قوم وملت! اے منارِ علم وفن!
اے امام المسلمیں! اے نائبِ شاہِ زمن
زہد وتقویٰ کے امیں، مہرِ نبوت کی کرن
بزم علمِ دیں میں آخر کون ہوگا ضوفگن
بعد رحلت آپ کے یہ لوگ کہتے ہیں بہم

نائبِ مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو، چل سنبھل کے اے قلم

عظمتوں کے تاج والے آپ کا جب دَور تھا
ذرّے ذرّے گلفشاں تھے مہکی مہکی تھی فضا
کتنے پاکیزہ تھے لمحے کیا تھا منظر خوشنما
آہ! لیکن آج ہر سو ایک قیامت ہے بپا
ایک عالم غرق ماتم آنکھ ہے ہر ایک نم

نائبِ مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو، چل سنبھل کے اے قلم

اللہ اللہ ایکساں وہ سب پہ رحمت آپ کی
اور وہ بے لوث ہر طلباء پہ شفقت آپ کی
سب کی آنکھوں میں بسی ہے اب بھی صورت آپکی
کرگئی برپا قیامت آہ رحلت آپ کی
خادم شرعِ متیں اے صاحبِ ذی محترم

نائبِ مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو، چل سنبھل کے اے قلم

درحقیقت دونوں آنکھیں تھیں شرافت کی امیں
روئے زیبا تھا متانت کی چھبن سے دلنشیں
جنبشِ لب پر دہن سے جھڑتے گلہائے حسیں
وسعتِ شفقت کی عنایت آفریں صد آفریں
قدِ طوبیٰ خوشنما اللہ رے سیکھے قدم

نائبِ مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو، چل سنبھل کے اے قلم

خندہ پیشانی سے ملتے آپ سب سے صبح وشام
نام لیتے تھے ادب سے آپ کا ہر خاص وعام
عظمتوں کے تاج والے لائق صد احترام
لیجیے منظرؔ کا اپنے روز مرقد میں سلام
چھوڑ کر او جانے والے ہم کو یوں با چشم نم

نائبِ مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو، چل سنبھل کے اے قلم

□□

بخاریٔ وقت، امیر الہند ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ کے

انتقال کا آنکھوں دیکھا حال

از: منشی نیاؔز

جیسے ہی عشرۂ رحمت گیا دسواں رمضان
دارِ فانی سے گیا دیکھ حبیب الرحمن

ساری دُنیائے عرب جس پہ رہی ہے قربان
ناز کرتا رہا جس پر مرا 'ہندواستھان'

گر پڑی جیسے ہر انسان پہ غم کی چٹان
ریڈیو سے ہوا جب موت کا ان کی اعلان

انتقال ان کا ہوا عین بوقتِ افطار
ہونے والی تھی مساجد میں بھی مغرب کی اذان

یوں تو 'بھارت کا امیر' ان کا لقب تھا لیکن
مانتی تھی انھیں دُنیائے عرب بھی سلطان

ان کے دربار میں جھکتی نظر آئی دُنیا
سرنگوں سامنے ان کے تھے کلکٹر، کپتان

ان سے میں جب بھی ملا مجھ کو خدا یاد آیا
ہے حدیثوں میں بزرگوں کی یہی تو پہچان

وہ محدّث، وہ مفکر، وہ فقیہِ دوراں
جن کی تفسیر سے ہوتا ہے بخاری کا گمان

ایسی تشریح کہ تسلیم زمانہ کرلے
کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں حدیث وقرآن

آپ سے دور رہا کرتی تھی بددینی بھی
آپ کی بات سے ہوجاتا تھا تازہ ایمان

سونی سونی سی ہے اب علم و ادب کی محفل
آ گیا علم کے بازار میں ادبی بحران

یوں تو حضرت نے کئی ایک کتابیں لکھ دیں
جس سے امت پہ جو مشکل تھی ہوئی وہ آسان

یادگار ان کی ہیں 'مفتاح العلوم' و 'مرقاۃ'
جس جگہ ہوتی ہے تعلیم حدیث و قرآن

اس قدر بھیڑ تھی حضرت کے جنازے میں نیاؔز
جن و انساں کا سمندر تھا مَلک کا طوفان

جس گلی میں بھی گزر جایئے طوفانِ بشر
جس سڑک پر بھی نکل جایئے لاکھوں انسان

سارے بازار بھی اس روز تھے اس غم سے نڈھال
بند اُس دن تھی مئوناتھ کی اِک اِک دُکان

ناز ہے شہر مئو تجھ پہ نیاؔز احمد
تیری آغوش میں ہے کتنا مبارک انسان

جن کے دیدار کو انساں کیا؟ مَلک تک ترسے
اُن کی تربت پہ الٰہی تری رحمت برسے

تاریخ وفات

ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمن اعظمی نوراللہ مرقدہ

از: جناب شوؔق اعظمی
استاذ جامعہ اثریہ دارالحدیث مئو

بوالمآثر حیف از دُنیا گذشت رہنمائے ملتِ بیضا گذشت
از جہانِ رنگ و بو سیر آمدہ در مقامِ ارفع و اعلیٰ گذشت
جسم او پنہاں شدہ در زیرِ خاک روحِ پاکش برسرِ طوبیٰ گذشت
تابِ ہجرانش مریداں را نہ بود صبرِ دلہا، راحتِ جانہا گذشت
از زمیں تا آسماں از فرطِ غم نالہ و فریاد و واویلا گذشت
درحقیقت او فقیہِ وقت بود علم دیں را عاشق و شیدا گذشت
یادگارِ اوست 'مرقاۃ العلوم' چشمۂ بگذاشتہ مارا، گذشت
زندۂ جاوید ہر تالیفِ او چیست جائے غم اگر از ماگذشت
شد مبارک فال بہرِ آخرت در مبارک ماہ از دُنیا گذشت
روزِ دوشنبہ، دہم رمضاں بہ شام از جہاں در جنت الماویٰ گذشت

فکر تاریخ وفاتش بود شوؔق
گفت ہاتف: ''عالمِ یکتا گذشت''
۱۹۹۲ء